ادب اُردو کا باتصویر ماہوار رسالہ

ادیب

مرتبۂ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

جلد ششم

(جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۲ء)

جسمیں

اسّی نامور اہلِ قلم کے قریب ایک سو مضامین نظم و نثر

تین سو صفحات پر درج ہیں

اور پچاس سے زائد رنگین و سادہ ہاف ٹون تصاویر شامل ہیں

مطبوعۂ انڈین پریس الہ آباد

فہرست مضامین جلد ششم

نثر

نظم

فہرست تصاویر

جولائی۔ (۱) منظرِ شام رنگین (۲) مرزا غالب دہلوی (۳) مسٹر ولیم اسٹیڈ (۴) بابو پرتاپ چندر موزمدار (۵) خواجہ امان (۶) اخبار نویسان لاہور (۷) نواب محمد صفدر علی خاں بہادر صفدر (۸) عہد شاہجہانی کی ایک تصویر (۹/۱) قطعات قلمی۔ **اگست**۔ (۱) سیتاجی۔ رنگین (۲) ہنرآنر سرجان ہیوٹ (۳) جناب لیڈی ہیوٹ صاحبہ (۴) شہنشاہ اورنگ زیب شکارگاہ میں (۵) شہنشاہ اورنگ زیب کا جلوس سواری (۶) مرحوم شہنشاہ جاپان (۷) راون کا دربار (۸) منشی امیر احمد صاحب بدایونی (۹) برسات۔ **ستمبر**۔ (۱) جنم اشٹمی۔ رنگین (۲) نواب سالار جنگ ثالث (۳) نواب عمادالملک بہادر (۴) مرزا حاتم علی مہر (۸/۵) سانچی کے مناظر (۹) شکنتلا و دشینت۔ **اکتوبر**۔ (۱) بھیشم کا عہد۔ رنگین (۲) حضور نظام خلد اللہ ملکہ (۳) حضور نظام مع اسٹاف (۴) سر سالار جنگ اعظم (۵) جنرل ولیم بوتھ (۷/۶) کمشنر بوتھ ٹکر و مسز بوتھ ٹکر (۸) ڈاکٹر اے ایچ ایونگ مرحوم (۹) جنرل نوگی (۱۰) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ **نومبر**۔ (۱) ڈانٹی اور عالمِ خواب۔ رنگین (۲) مولوی چراغ علی صاحب مرحوم (۳) ڈلائی لامہ (۴) دربار نواب میر نظام علی خاں (۵) ہوائی جہازوں کے چھ مختلف نمونے (۶) پوجا۔ **دسمبر**۔ (۱) کیکئی اور منتھرا۔ رنگین (۲) ولادتِ مسیح (۳) نظیر اکبرآبادی (۴) سیتاجی اور سرما (۵) آیۃ الکرسی (۶) مولانا شوکت میرٹھی (۷) کھلنا و دمن پتی (۸) رائے بہادر مسٹر مدھولکر (۹) میر امجد حسین صاحب ماہ عظیم آبادی۔

منظر شام

انڈین پریس الہ آباد
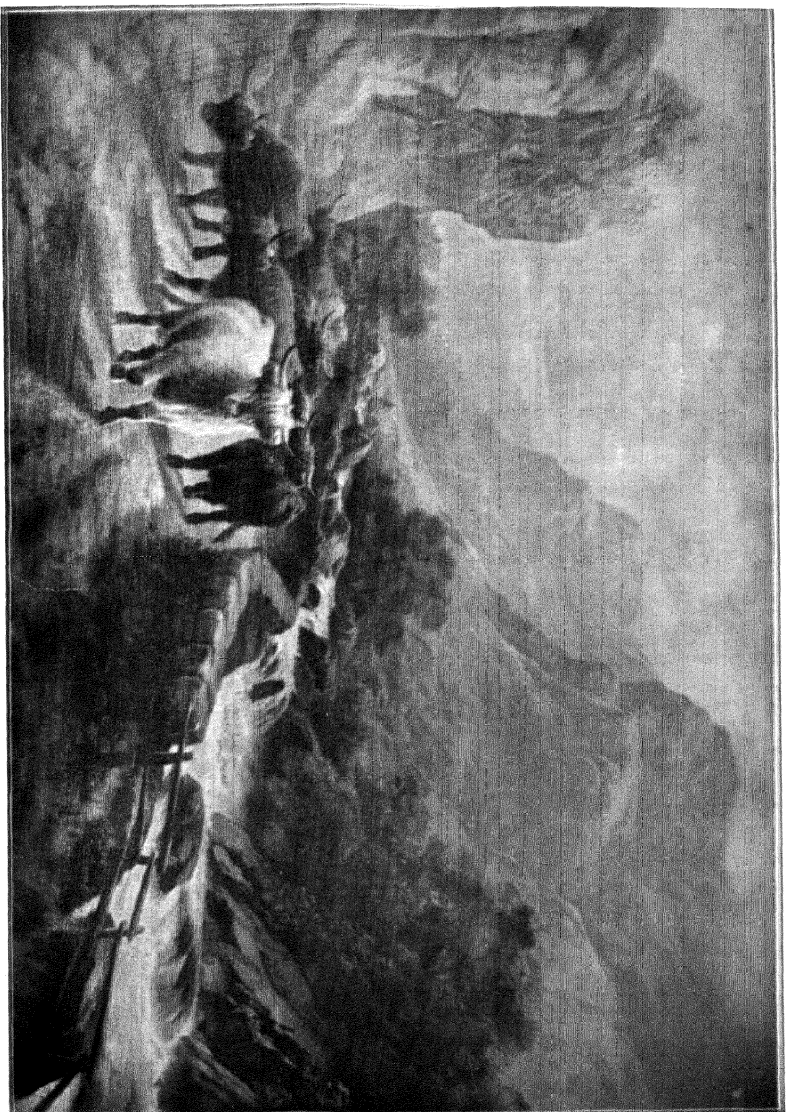
مرزا غالب دہلوی

اُن لوازمات میں جو کسی متمدن ملک یا مہذب قوم کی عظمت و شان میں چار چاند بنکر چمکتے ہیں، اور جن کے بغیر کوئی قوم اور کوئی ملک تہذیب و تمدن میں حصہ دار بننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، لٹریچر کو صفِ اوّل میں جگہ دی گئی ہے۔ اور اس زمانہ میں تو جبکہ ترقی کا معیار بہت اونچا ہوگیا ہے، اسکی اہمیت کا احساس بدرجۂ غایت کیا جاتا ہے۔ لٹریچر یا علم ادب آجکل ایک آئینہ ہے جس میں انسانی سوسایٹی کی تصویر اور معاشرت و مدنیت کے اصلی خط و خال بلا کم و کاست نظر آتے ہیں کسی نے کہا ہے، اور سچ کہا ہے، کہ جو قوم علم ادب میں اوروں سے پیچھے ہو اُسے ہر بات میں پھسڈی سمجھ لو۔ گویا قومی اعزاز اور کامیاب زندگی ایک ترقی یافتہ لٹریچر کے بغیر حاصل ہونا بعید از امکان ہے۔ مبارک ہیں وہ اقوام جو اس صفِ خاص میں دوسروں کے لئے سرمایۂ رشک بنی ہوئی ہیں، اور جن کے ہزاروں اور لاکھوں افراد اپنے چمنستانِ ادب میں ہمہ تن مصروف اور اُس کی بقا کا سامان مہیا کرنے پر ہر طرح جد و جہد کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں؛ اور قابلِ رحم ہیں ہم، ہماری قوم، اور ہمارا ملک، جہاں قومی ادب کی خدمت کرنے کا خیال تو ایک طرف رہا، اُن بزرگوں کی مساعی جمیلہ کی داد بھی عملی طور سے دینا امرِ محال سمجھا جاتا ہے جنھوں نے کسی ذاتی طمع کے بغیر بے غرضی کے ساتھ، اپنی ہمدردانہ کارگزاریوں سے ہمارے لٹریچر کو درست کرنے میں، اپنی جانب سے کوئی بات نہیں اُٹھا رکھی۔ ہم کاہل و مجہول ہونے کے ساتھ ہی ناشکر گزار بھی ہیں، اور ہماری یہ افسوسناک حالت اُس وقت سے قایم ہے جب سے ہم اپنی ادبی و لسانی ضروریات سے غافل ہوئے۔ سودا ہوں یا میر ذوق ہوں یا غالب، یہ اُردو و علمِ ادب کے حقیقی بہی خواہ اور خادم تھے لیکن ہماری حق ناشناسی اُن بزرگوں کا نام بھی عزت کے ساتھ لینے میں ہمیں متامل کرتی ہے۔ جو قومیں آج علم و فن میں ہم سے بہت آگے ہیں، اُن کو دیکھیئے کہ وہ اپنے مشاہیر کے لافانی کارناموں کی شہرت و بقا کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہے۔ اُن کے سپوت ہونے کی شہادت، اگر

واقعاتِ عالم نہیں دے سکتے تو کیا ویسٹ منسٹر ایبے کی شاندار عمارت
کے مجسمے بھی نہ دینگے، جن کے دلوں میں اس عالمِ سکوت میں بھی اپنے اخلاف
کے سعادتمندانہ جذبات کو دیکھکر مسرت واطمینان کی کیا کچھ کیفیت
نہ پیدا ہوتی ہوگی۔ اگر روح کا دنیا میں آکر اپنے گھر بار اور آل اولاد کی
حالت کو دیکھنا صحیح ہے، تو معلوم نہیں کہ ہمارے اسلاف ہماری نالائقی
سے کیا کیا متاثر ہوتے ہوں گے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے زندگی
ہی میں ہم سے کیا پایا، جواب مرنے کے بعد کوئی توقع کریں گے! سودا اور
اسی قسم کے دو چار شعراء سے قطع نظر کس کو فراغبالی نصیب ہوئی؟ اور ملکی
قدردانی کے ہاتھوں کس کی الم آگیں پریشانیوں کا خاتمہ ہوا؟ جب ہم یہ
دیکھتے ہیں کہ غالب ایسا یکتا اور نامور شخص، جو نظم و نثر پر پورے طور پر قابو
رکھنے کے ماسوا قوتِ متخیلہ کی سحر آفرینیوں کی ایک زبردست مثال بھی
تھا، اربابِ زمانہ کی بیوفائی اور ناقدردانی اور ابنائے وطن کی عیر مآل
اندیشی سے ہمیشہ مفلوک و محتاج رہا، اور افکارِ دنیوی اور ترددات
معاش سے اُسے بمشکل کسی دن اطمینان حاصل ہوا، تو ہمیں اپنے ایک مردہ
اور ماندہ سی قوم ہونے کا خیال پختہ ہوجاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کے
عہد میں اسلامی حکومت عالمِ نزع میں تھی اور اسلامی سوسایٹی پر بالعموم
ادبار و فلاکت کی گھٹا چھارہی تھی، لیکن کیا اُن حکمرانوں کے لئے، جنکی
فضول خرچی اور عیش پسندی نے بالآخر سلطنت کا دیوالہ نکال دیا، یہ نا
ممکن تھا کہ غالب کو کم از کم شکم پروری کی فکر سے آزاد کر دیتے۔

یہ بات ضرور ہے کہ "قدرِ مردم بعد از مردن"۔ اور شاید اُس عہد
میں جبکہ تعلیم اور خیالات اور ارادوں میں نقص اور کوتاہ نظری پیدا
ہوجانے سے، غالب کی رفعتِ شان کو لوگوں نے نہ سمجھا ہو، لیکن مغربی تعلیم
کے فیضان سے مستفید ہونے کے بعد، جبکہ ہم میں اصلی نقلی کی تمیز آگئی ہے،
ہم کونسا علمی قدردانی کا دریا بہا رہے ہیں۔ بیشک مغربی لٹریچر کے رموز
آشنا ہونے کے بعد ہم میں سے اکثر غالب کی عظمت کو جان گئے ہیں، لیکن سچ
یہ ہے کہ جب تک غالب کا دیوان، اور اُن کی قبر اس مبتذل حالت میں
رہیگی کہ اس ہونے سے نہونا بہتر ہے، اسوقت تک ہم اسلاف پرستی کے
دربار میں نمایاں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہوسکتے۔

غالب کیا تھے؟ اور اُن کی شاعری کس درجہ کی ہے؟ اس کا جواب
جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمارے خیالات وجذبات میں صحت
پیدا ہوتی جائے گی، توں توں اُن کی ذاتی منزلت اور اُن کی شاعری کے
مدارج پر روشنی پڑتی جائیگی۔ ولی سے لیکر آج تک اردو شاعری نے کئی دور
طے کئے ہیں۔ لیکن درجہ بدرجہ اصلاح و ترقی کے اسباب و نتائج پر غور
کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ غالب ایسا فطرت شناس سخن گو آج تک
پیدا نہیں ہوا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی ایک صنفِ کلام میں اُن کا درجہ کسی سے
کم ہو، لیکن اردو شاعری پر لکیر کا فقیر بننے کا جو الزام عاید ہو رہا تھا اگر
اُس کا کچھ ازالہ ہوا ہے تو غالب کے دماغ و قلم سے۔ خیالات کی جدت
اور مضامین کی تازگی کی جو روح افزا کیفیت غالب کے کلام میں موجود ہے،
وہ کہیں اور مشکل ملے گی۔

یہ بات مسلّمہ ہے کہ شاعری بغیر مقامی رنگ کے اربابِ نظر کے
سامنے کبھی وقار نہیں حاصل کرسکتی۔ اردو اس بارے میں سب سے زیادہ
بدقسمت ہے۔ ایک تو ہندوستان میں قدرتی طور پر وہ سامان مفقود ہیں
جو ایک شاعر کے دل میں سچے جذبات موجزن کرسکیں، دوسرے ہمارے
شعراء نے آنکھ بند کرکے فارسی کا تتبع کیا اور اس میں اس درجہ غلو ہوا کہ

> بہادری کا میدان رستم و سام کو دیا حالانکہ وہ بھیم و ارجن کا حق تھا
> ۔۔۔۔ حسن و جمال کے شبستان میں لیلیٰ و شیریں آگئیں، اور جب وہ آئیں
> تو رانجھے کی جگہ مجنوں و فرہاد کیوں نہ آتے۔ مجنوں و فرہاد کی گنگا تو یہ
> نہ سکیں مجبوراً جیحوں سیحوں ہندوستان میں آگئے۔ ہمالیہ اور بندھیاچل کو
> چھوڑکر کوہ بیستون قصرِ شیریں کوہ الوند سے سر پھوڑتے ہیں۔

مناظرِ قدرت کی تصویریں تو اردو میں نام تک کو نہیں۔ اسکی کمی

ایک حد تک ہندی شاعری میں بھی ہے، لیکن اس کی تلافی دوسری صورت
میں ہوگئی ہے۔ اردو میں اگر عشق و محبت ہی کے جذبات ہندی کی طرح
نیچرل اور صحیح ہوتے تو اُس میں تاثیر کا کوئی اور ہی عالم ہوتا۔ ہمیں اس بات کا
اعتراف ہے کہ ہمارے اسلاف نے فارسی کی تقلید میں بھی ایجاد کا لطف
پیدا کر دیا ہے، اور جس چیز کو اُنھوں نے مستعار حاصل کیا اُسے بالآخر اپنا
بنا لیا۔ یہ صفت عُقلا کی ذہنی و دماغی قابلیت کی دلیل ہے، لیکن کاش وہ
ذرا دُور بینی سے کام لیتے تو اُنھیں معلوم ہو جاتا کہ جس چیز کو وہ ایران سے
لائے وہ خود اُن کے پہلو میں موجود تھی۔ الفت و دوستی کی صبر شکن تصویریں
جو ہندی میں کھینچی ہوئی ہیں، اُن کی طرف ہمارے شعرا نے نگاہ تک نہیں
اُٹھائی، اور یہ عیب چینیوں کے لئے گرفت کا اتنا موقع نہ ہوتا، اور اس کے اکثر
نقائص دور ہو جاتے۔

غالب کی نظر وسیع اور بلند تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اُن کی آنکھ اردو کی پست
حالت پر نہ پڑتی۔ وہ ایجاد پسند تھے۔ تقلید سے وہ اس قدر متنفر تھے کہ جب
اُنھیں یہ معلوم ہوا کہ کوئی اور شخص بھی اسد تخلص کرتا ہے تو آپ نے اپنا تخلص
اسد سے بدل کر غالب رکھ لیا۔ اس حالت میں کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی اُن
غیر معمولی قوتوں سے کام نہ لیتے جو فطرت سے ودیعت ہوئی تھیں، اور جن کے
ذریعہ سے اردو شاعری میں انقلاب آنا مقدر تھا۔ بیشک وہ پرانے ڈھرے
سے جدا نہیں چلے، لیکن انھوں نے اپنے اچھوتے تخیل کے زور سے ثابت کر دیا کہ
اردو شاعری میں ابھی بہت کچھ اصلاح و ترقی کی گنجایش ہے۔

قدرت کے کرشمے عجیب ہوتے ہیں۔ غالب، جو آگرہ میں پیدا ہوئے
اور جن کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی اصولاً نہ ہوئی تھی، جنھیں پانچ برس کی عمر میں
باپ، اور نو برس کی عمر میں شفیق چچا کی افسوسناک موت کا داغ اٹھانا پڑا، اور جنھیں
ابتدا ہی سے وارستہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی، اُن کو کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک دن
تلامیذ الرحمٰن کے تخت نشین پر صدر کی حیثیت سے متمکن ہوں گے۔

خاندانی عظمت اور نسبی فضیلت کے لحاظ سے غالب کا پایہ بہت
بلند تھا۔ وہ ایبک قوم کے تُرک تھے اور اُن کا سلسلہ تور ابن فریدون تک
پہنچتا ہے۔ سلجوقیوں کے انتزاع کے بعد اِن کے جدِّ بزرگوار ہندوستان آئے۔
شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ اُس وقت سلطنت کا صرف ڈھانچہ باقی تھا۔ تاہم
اُن کو فوج میں ایک عہدہ مل گیا۔ شاہ عالم کے بعد شطرنجِ حکومت کا تختہ
اُلٹ گیا اور مہرے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ
کو تلاشِ معاش کی ضرورت ہوئی۔ اُس وقت لکھنؤ متلاشیانِ روزگار کے
خیال میں منزلِ مقصود تھا۔ سخی داتا آصف الدولہ کے خوان کرم سے اُنھیں
بھی کچھ عرصہ تک ریزہ چینی کا موقع ملا۔ پھر وہاں سے نواب نظام علیخاں
کے عہد میں حیدر آباد وارد ہوئے، جہاں اُنھیں ایک فوجی خدمت مل گئی
لیکن آب و دانہ وہاں کا بھی نہ تھا۔ بعض خانہ جنگیوں کی بدولت اُنھیں
حیدر آباد کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ واپس آکر چندے آگرہ میں ٹھہرے اور
پھر راجہ بختاور سنگھ والی الور کے یہاں ملازمت پا گئے، اور وہیں ایک معرکے
میں کام آئے۔ راجگڈھ میں مدفون ہیں۔

باپ کے انتقال کے بعد غالب کی غور و پرداخت اُن کے چچا،
نصر اللہ بیگ، نے اپنے ذمہ لی۔ یہ بزمانہ لارڈ لیک، جن کی ملکی فتوحات
تاریخ ہند میں جلی قلم سے لکھی رہیں گی، سرکاری فوج میں عہدہ رسالداری پر
ممتاز تھے۔ بجلدوئے خدمات اُنھیں ضلع آگرہ میں دو پرگنے مرحمت ہوئے
تھے، جن کے محاصل سے وہ اپنی مدتِ حیات تک فائدہ اُٹھاتے رہے۔
سنِ شعور تک غالب آگرہ میں رہے۔ سنہ ۱۲۲۵ھ میں، جب یہ ۱۳ برس کے
تھے، اُن کی شادی نواب مرزا الٰہی بخش معروف کی لڑکی کے ساتھ ہو گئی اور
اس طرح تعلقات قایم ہونے کے بعد، دہلی کی آمد و رفت جاری ہو گئی اور
بالآخر مستقل طور سے یہیں آ رہے۔

غالب کی بیوی نہایت وفا کیش اور نیک بخت خاتون تھیں۔ اُن کی خدمت
میں وہ دل و جان سے ساعی رہتیں۔ مذہبی احتیاط اس درجہ تھی کہ غالب
کے رندانہ طور و طریق کے خیال سے وہ اپنے کھانے پینے کے ظروف جدا

رکھتی تھیں۔ غالب کو بھی اُن سے محبت تھی، اور ان کا پاس کرتے تھے۔ غالب نے متاہلانہ زندگی کا تمسخر اکثر جگہ اپنے رقعات میں اُڑایا ہے لیکن ان کی اصلیت ذرا بھی نہیں۔ مولانا حالی یادگار غالب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر اُن کے کھانے اور دوا ٹھنڈائی اور جڑاول وغیرہ کا انتظام سب گھر سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقت معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے، اور بی بی اور اُن کے رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے اور اپنی جان سے بڑھکر اُن کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، اُن کی زبان وقلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔ صفحہ ۹۶

دہلی گو اُسوقت مٹ چکی تھی، پھر بھی وہ دہلی تھی۔ اور کوئی بات تو رہی ہوگی جس نے غالب کو ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ سسرال کی دلچسپیوں اور رشتہ داروں کی کششِ محبت کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی جو انھیں دہلی کھینچ لائی، اور یہ اُن ستودہ صفات بزرگوں کا مجمع تھا جو حکومت میں ضعف آجانے اور علوم وفنون کا چرچا تقریباً مفقود ہو جانے کے باوجود اپنے دم سے فضل وکمال کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کا عہد ملکی حیثیت سے، خواہ کتنا ہی پُرخطر وتشویشناک رہا ہو لیکن اسمیں شک نہیں کہ اسی زمانہ میں شعر وسخن کا وہ چرچا تھا کہ دہلی کا لڑکا لڑکا بزعم خود میر وسودا کا جانشین تھا۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ حکمران کا رجحانِ طبع جس طرف ہوگا عوام بھی اُسی طرف جھکیں گے۔ حضور نظام خلد مقام میر محبوب علیخاں مرحوم کو جو دلچسپی فنِ شعر گوئی سے تھی، اُس نے نہ صرف اطراف واکنافِ ہند سے اچھے اچھے شاعروں کو اُن کے دار الخلافہ میں اکٹھا کر دیا تھا، بلکہ وہاں عام طور پر شعر وسخن کا وہ چرچا تھا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعرے روزمرہ منعقد ہوتے تھے، جنمیں سے بعض میں خود اعلیٰحضرت مغفور کا کلام بھی آتا تھا۔ شاعروں کی یہ کثرت ہوتی کہ رات کے آٹھ بجے مشاعرہ کا آغاز ہوتا اور بسا اوقات صبح کے دس بجے تک ہوتا رہتا۔ یہی حال دہلی کا رہا ہوگا۔ اور چونکہ اُسوقت شاعری لڑکوں کا کھیل نہیں سمجھی جاتی تھی، اور اساتذہ کے سامنے دریدہ دہنی سے یاوہ گوئی کی جراءت بھی ہر کس وناکس کو نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے یہ خیال بیجا نہیں کہ غالب کو برگزیدہ اصحاب کی صحبت میں خصوصیت کے ساتھ دلبستگی ہوئی ہوگی۔ جبتک ذوق زندہ تھے، ظفر کے کلام کی اصلاح دیتے رہے۔ انکے انتقال کے بعد یہ مشورۂ سخن کی عزت غالب کے حصہ میں آئی۔ اس سرافرازی سے پیشتر ہی غالب کی رسائی دربارِ معلیٰ میں ہوچکی تھی۔ سہرے کا قضیہ بھی اسی زمانہ کی بات ہے، جب ذوق مرحوم حین حیات تھے۔ بادشاہ سلامت بھی غالب پر خاص طور سے مہربان تھے، اور انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ سہرے کے معاملہ میں البتہ غالب سے کسی قدر کشیدہ خاطری ہوگئی تھی۔ لیکن ان کی "معذرت" کے بعد شاید معاملہ بالکل رفع دفع ہوگیا تھا۔ سنہ ۱۲۶۶ھ میں بادشاہ نے انھیں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور چھ پارچہ خلعت سے ممتاز فرمایا۔ خاندان تیموریہ کی تاریخ مرتب کرنے کا کام بھی ان کے سپرد کیا گیا، اور اس کے عوض عـہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ غالب کے قطعات ورباعیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے مقربانِ شاہی کی طرح ان کے یہاں بھی، بادشاہ کی جانب سے ہدایا اور تحفے آیا کرتے تھے۔ ایک قطعہ میں "بیسنی روٹی" کا شکریہ ہے، ایک رباعی میں "شاہ پسند دال" کا اور ایک دوسری میں "تیم کے بیجوں" کی رسید ہے۔ اس التفات آمیز توجہ کے باوجود غالب کی وہ قدر نہیں کی گئی، جس کا مستحق ایسے اعلیٰ پایہ کا اہلِ کمال قدرتی طور پر ہو سکتا ہے۔ تاہم غالب ایسے آزاد منش اور بے فکرے آدمی کے لئے جو کچھ تھا بہت تھا۔ وہ اسی کو بڑی قدردانی سمجھتے تھے کہ حضور نے قصیدہ سُن کر یہ تو فرمایا کہ "ہاں! تم پڑھتے خوب ہو!"۔

نجم الدولہ دبیرالملک مرزا نوشہ اسداللہ خاں صاحب غالب دہلوی

انڈین پریس الہ آباد

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اُس وقت کی سوسائٹی کا رنگ خوب بھانپ لیا تھا۔ پھر وہ ناقدروں سے حوصلہ افزائی کی کیا امید کرسکتے تھے! اس کے علاوہ بادشاہ کو بھی جانتے تھے کہ اس کی وقعت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں۔ وہ بہت بڑے ظرف کے آدمی تھے، لیکن انسان سب تکالیف برداشت کرسکتا ہے، مگر پیٹ کی آگ نہیں بجھا سکتا۔ اس سے وہ مجبور ہوجاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا جو تھوڑا بہت وظیفہ مقرر تھا، وہ بھی سلطنت کی بے انتظامیوں اور عمال کی غفلت کاریوں سے انھیں وقت پر نہیں ملتا تھا۔ ورنہ یہ کہنے کی ضرورت لاحق ہوتی ؎

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھکو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

- - - - - - - - - - - - -

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

انسان کا فطری خاصہ ہے کہ وہ اپنے کاموں کی داد طلب کرے۔ شہرت پسندی اور نمایش سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ غالب نے بھی باوصف زمانہ کا حال پورے طور پر جاننے کے، بہادر شاہ سے اس بات کی تمنا کی تھی کہ شاہجہاں نے کلیم کو سیم و زر سے وزن کیا تھا، آپ میرے کلام ہی کو کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیں! اللہ اللہ! کیا حسرت بھری خواہش ہے، اور اس سے ظاہر ہے کہ زمانہ کی ناقدری نے اس شاعر بے بدل کے دل پر مایوسی اور حرماں نصیبی کا کس قدر گہرا نقش بٹھا دیا تھا۔ اپنی چیز کو کون بُرا سمجھتا ہے، اور کون اپنی سُبکی چاہتا ہے، اور اس پر غالب ایسا خود دار شخص! وہ اپنے آگے، کلیم کیا معنی، کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھ لیا کہ اُن کی دماغ سوزی اور جگر کاوی کی داد مسلّماً ملنا محال ہے تو یہی تمنا کی کہ کاش اُن کا کلام ہی کلیم کے کلام کے مقابل میں لایا جاسکے!

شاہی تقرب گو حقیقی معنوں میں برائے نام ہی کیوں نہ رہا ہو، لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس کے سبب سے غالب کو ایک طرح کی بےفکری تھی۔ پر غدر کے ہنگامہ کے بعد یہ تعلق قطع ہو جانے پر وہ سچ مچ فلاکت وعسرت کا نشانہ بن گئے۔ ادھر بادشاہ کی طرف سے جو وظیفہ مقرر تھا وہ بند ہوگیا، اُدھر برٹش گورنمنٹ سے جو پنشن ملتی تھی وہ بھی بعض شکوک کی بنا پر مسدود ہوگئی۔ باپ دادا کی کمائی اور ننہیال کی دولت پہلے ہی پھونکی جا چکی تھی۔ اب کیا تھا، نام اللہ کا۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:۔

اس ناداری کے زمانہ میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا، سب بیچ بیچ کر کھا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے، اور میں کپڑا کھاتا تھا۔

دو سال تک، اپنے ہی قول کے مطابق "کپڑے" کھا کھا کر بسر کی۔ لیکن پھر رامپور کے شریف پرور اور علم دوست نواب یوسف علیخاں مرحوم نے، جو فنِ شعر گوئی میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے اور غالب کے شاگرد بھی تھے، ان کا سو روپیہ ماہانہ کا استمراری وظیفہ مقرر کر دیا، جو ان کے آخر دم تک جاری رہا۔ غالب بھی نواب رامپور کے اُستاد تھے، اسلئے گرامی قدر شاگرد اُنھیں بہت عزت کی نظر سے دیکھتا تھا، اور دونوں میں نہایت بےتکلفانہ روابط قایم تھے۔ نواب چونکہ معارف پرور اور شرفا نواز بھی تھے، اسلئے غالب کی توقیر بدرجۂ کمال ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں اس باب میں وہ خود روشنی ڈالتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رامپور میں ہوں تو دو سو روپیہ پاؤں اور دلّی میں رہوں تو سو روپے۔ بھائی! سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ

و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔

نواب یوسف علیخاں مغفور کے انتقال پر غالب بتقریب ادائے تعزیت رامپور گئے۔ اُس وقت مسندِ حکومت پر نواب کلب علیخاں ایسا فراخ حوصلہ اور قدر شناس امیر متمکن تھا۔ اُنھوں نے بھی ان پر خاص الطاف و عنایات فرمائے اور جو تنخواہ اِن کے لئے عہدِ سابقہ میں معین تھی، وہ جاری رکھی جو زندگی بھر انھیں ملتی رہی۔

رامپور کا وظیفہ اور سرکاری پنشن، بقدر سات سو روپیہ سالانہ کے جو اُن کے چچا کی خدمات کے صلے میں ان کو اور دوسرے ورثار کو ملتی تھی اور جو تین سال تک بند رہنے کے بعد، رفع شبہات ہونے پر بدستور پھر جاری ہو گئی تھی، یہ دونوں رقمیں اس قدر تھیں کہ غالب متوسط زندگی بسر کرسکتے تھے، لیکن اُن کے خیالات بلند اور ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ ہمیشہ تنگدستی کی مصیبت میں مبتلا رہے اور عسرت نے کبھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے ساتھ وہ شگفتہ طبیعت واقع ہوئے تھے ؛ ان تکالیف کو خیال میں نہ لاتے تھے، اور اس عالی ظرفی سے انھیں جھیلتے تھے کہ پیشانی تک میلی نہ ہوتی تھی۔

غالب کے ہندو دوستوں اور شاگردوں کی معقول تعداد تھی اور یہ اُن کے آڑے وقت میں ہمیشہ کام آتے رہے۔ غدر کے بعد جب انھیں فاقہ کشی کی نوبت آچکی تھی، تو جن لوگوں نے ان کی خبر گیری کا بار اپنے سر لیا، وہ ان کے ہندو احباب تھے۔ مسلمان اُس ہنگامہ کے بعد ایسے کھوئے گئے تھے کہ خود اپنی خبر نہ رکھتے تھے۔ اور ایک طرح سے دہلی مسلمانوں سے بالکل خالی تھی۔ اگر ہندوؤں نے غالب سے ہمدردی نہ کی ہوتی تو معلوم نہیں انھیں کیا پیش آتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کس درجہ خوشگوار تھے۔

ہندو شاگردوں نے اپنے اُستاد کی خدمت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر انھیں مستقل امداد دیتے تھے، جیسا کہ "اُردوئے معلیٰ" کے اکثر خطوط سے ثابت ہوتا ہے۔ غالب بھی ان کو اپنی اولاد سے زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ حریص و طامع نہ تھے، لیکن اُن کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ شاگردوں کے پیشکش کو وہ کس بے تکلفی سے قبول کرتے تھے، گویا وہ خود انھیں کا تھا۔ دیکھئے منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں کس اسلوب سے لکھتے ہیں:

سو روپیہ کی ہنڈی وصول کرلی۔ ۲۴ روپیہ داروغہ کی معرفت
اُٹھے تھے، وہ دئے۔ پچاس روپے محل میں بھیج دیئے۔ ۲۶ باقی رہے،
وہ بکس میں رکھ لئے.... خدا تمکو جیتا رکھے اور اجر دے....

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی زندگی گوناگوں آلام و تکالیف کا مجموعہ تھی، اور زمانہ کی بیوفائی اور ناقدری کے ساتھ اُن کی فضول خرچی و مے پرستی سونے پر سوہاگے کا کام دیگئی۔ اوائلِ سن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھا۔ شعور کے درجہ پر پہنچنے نہ پائے تھے کہ چچا مفارقت کر گئے۔ دہلی میں آکر رہے۔ بادشاہ نے مددِ معاش کے طور پر تاریخ نویسی کا کام ان کے ذمے کیا، اور یہ پچاس روپیہ ماہوار پانے لگے، لیکن بہت جلد اُنھیں اس سے ہاتھ دھونا پڑا۔ غدر میں منجملہ اور مصائب کے چھوٹے بھائی کی وفات کا حادثہ ایسے عالم میں واقع ہوا کہ جب نفسی نفسی کا عالم تھا۔ مرزا یوسف ان کا نام تھا، اور تیس ۳۰ برس کی عمر سے وہ مجنون ہو گئے تھے۔ جب غالب دہلی آئے تو اُنھیں بھی ہمراہ لیتے آئے تھے۔ ۵۷ء کے ہنگامہ میں یہ ایک جُداگانہ مکان میں رہتے تھے، وہیں انتقال کیا۔ اُس وقت نہ کفن کا کپڑا مِل سکتا تھا، نہ غسال و گورکن تھے۔ اُنھیں کے ہمسایوں نے جیسے تیسے تجہیز و تکفین کی رسم ادا کی۔ غالب کو اُن سے بیحد محبت تھی اور بہت چاہتے تھے۔ ایک جگہہ کہتے ہیں ؎

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے، غالب! یوسفِ ثانی مجھے

بھائی کے انتقال کی تاریخ "دریغ دیوانہ" نکالی ہے اور اس میں سے "آہ" کے اعداد کا تخرجہ کیا ہے۔ اس حادثہ کا اثر غالب پر ناگفتہ بہ پڑا۔ انھیں اس کس مپرسی اور بیکسی کی موت کا اور بھی قلق تھا۔

اولاد کی جانب سے بھی غالب بہت بدقسمت تھے۔ سات بچے ہوئے لیکن زندگی کسی نے نہ پائی۔ زین العابدین خاں عارف (جو اُن کی بیوی کے بھانجے تھے) کے دونوں لڑکوں کو جنھیں صغر سنی ہی میں یتیمی کا داغ اُٹھانا پڑا تھا، آغوش میں لے لیا تھا، اور اُن کے ساتھ غایت الفت کرتے تھے۔ یہ دونوں ہونہار اور صاحب اقبال تھے۔ لیکن غالب کی وفات کے بعد ہی، یہ دونوں بھی، عین عنفوانِ شباب میں گزر گئے۔

زین العابدین خاں عارف، جن کا مرثیہ دیوان غالب کے بہتر نشتروں میں نہایت درد انگیز چیز ہے، نہایت خوش فکر و نازک خیال سخنگو تھے۔ غالب اُن کو بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ اُن کا حسرتناک نوحہ اس بات کی کافی دلیل ہے کہ اُن کی جوانامرگی غالب کے لئے فی الواقع غیر متوقع مصیبت ثابت ہوئی ہوگی۔ غور کیجئے یہ اشعار کس الم آگیں کیفیت اور قیامت آفریں حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ان ناگزیر صدموں، اور دنیوی افکار، اور اُن کی بے اعتدالی نے وقت سے پہلے غالب کے دل و دماغ کو ضعیف اور قویٰ کو مضمحل کر دیا تھا رفتہ رفتہ اُن کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ مردان خانہ سے بمشکل گھر میں جا سکتے تھے چلنا پھرنا بہت کم کر دیا تھا، ثقلِ سماعت کی شکایت بڑھ گئی تھی۔ ان سختیوں کے مقابلہ میں اگر وہ اپنی موت کے ہر وقت متمنی رہتے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی، جو اسوقت اپنی عام شہرت اور اجتہادی قابلیت کی بدولت، فارسی کے بہترین شاعر کی حیثیت سے، مستغنی عن التوصیف ہیں، غالب مرحوم سے اپنی ملاقات کا حال یوں بیان فرماتے ہیں۔ چونکہ ان واقعات سے غالب کی اخیر عمر کے حالات پر صحیح اور سچی روشنی پڑتی ہے، اسلئے یہ خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ جناب عزیز فرماتے ہیں:-

"ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے۔ اتفاق سے کچھ دیر کے لئے دہلی اُتر پڑے۔ سرائے میں قیام کیا۔ پھر اسٹیشن پر جانیکے لئے اڈگڑے سے گاڑی منگوائی ابھی گاڑی آئی تھی کہ یکایک ہمکو خیال ہوا کہ حسن اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیئے۔ فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے۔ کچھ دور چلکر لوگوں سے پتہ دریافت کیا۔ اس میں ایک صاحب مُلاقاتی مل گئے۔ خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلئے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں۔ مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا۔ ایک بڑا پھاٹک تھا، جس کی بغل میں ایک کمرا، اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اسپر ایک نحیف الجثہ آدمی گندمی رنگ، اسی بیاسی برس کا ضعیف العمر لیٹا ہوا۔ ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالب دہلوی ہیں، جو بگمان غالب دیوان قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا، لیکن بہرے اس قدر تھے کہ اُن کے کان تک آواز نہ گئی۔ آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی، اور ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سلام کیا۔ بمشکل چارپائی سے اُتر کر فرش پر بیٹھے۔ ہمکو بھی اپنے پاس بٹھایا۔ قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ دیا اور کہا آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سُنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پُوچھوں، اُسکا جواب لکھکر دو۔ نام ونشان پوچھا۔ ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے، ہرچند اُنھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سُود ہوئی۔ جب ہم نے نام و پتہ لکھا تو کہا تم سے ملنے کے لئے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوگے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ۔"

ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سُننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا کلام سُناتے رہے۔ پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سُناؤ۔ ہم نے یہ مطلع سُنایا ؎

مہ مصر است داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

عجیب لُطف اور مزے سے اس مطلع کو دُہرایا اور حد سے زیادہ تعریف کی۔ پھر آدمی سے کہا "کھانا لاؤ"۔ ہم سمجھے یہ بہ خیالِ مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ کہہ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے دہلی اُتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے، اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے، اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ بابرکاب آپ سے ملنے آئے تھے، اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے "آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہی تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچاننا نہیں ہوتا۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سُنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں، اور کتنا کھاتا ہوں۔ اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے"۔ اتنے میں کھانا آیا، دو پھلکے اور ایک طشتری میں بُھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا باریک پرت لیکر، دو چار نوالے بمشکل کھائے۔ اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدارِ خوراک پر کیونکر بسر کرتے ہیں..... [۵۱]

مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی، تو پردہ ہو جاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے کپڑے اُتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا، چوکی پر چڑھنا، چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا، اور پھر چوکی سے اُتر کر پلنگ تک آنا ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا [۵۲]

اس عالم میں بھی خطوط نویسی کا سلسلہ قایم تھا۔ جس روز انتقال ہوگا اُس سے شاید ایک دن پہلے..... نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ اُنھوں نے لوہارو سے حال پُوچھا تھا۔ اُس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر، جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا [۵۳]۔ مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

اس افسوسناک اور پُرصعب حالت کا اندازہ کیجئے اور پھر ان کا یہ شعر پڑھئے، تو عبرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے، اور اس عالمِ ہستی کے مصائب کا نقش دل پر گہرا جم جاتا ہے۔ اللہ اللہ! کس مایوسی اور ارمان کے ساتھ کہتے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزرے غالبؔ
ہم بھی کیا یاد رکھیں گے کہ خدا رکھتے تھے

آخر ان مصیبتوں کے خاتمے کا وقت آگیا، اور ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اس جہانِ فانی سے رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ غالبؔ کی ولادت شب ہشتم ماہ رجب المرجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی تھی اس حساب سے ۷۳ برس اور چار مہینے کی عمر پائی۔ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ العزیز کی درگاہ میں مدفون ہوئے۔ "آہ غالبؔ بمُرد" مادۂ تاریخ وفات ہے۔

غالبؔ ذاتی عادات وخصائل کے لحاظ سے اُن تمام اوصاف کا دلپذیر مجموعہ تھے، جو ایک شریف اور وضعدار آدمی کی زندگی کا جزو لاینفک

---

[۵۱] یہ حالات ہمیں خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی اعانت سے دستیاب ہوئے ہیں۔ [۵۲] [۵۳] ملاحظہ ہو "یادگار غالبؔ"۔ صفحہ ۹۹ - ۱۰۰

ہوسکتی ہیں۔ اخلاق، مروّت، فراخدلی، انکسار، حفظ وضع، نیک مزاجی،
یہ صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ وہ
انتہا درجہ کے خود دار تھے۔ ان کی زندگی خواہ کیسی ہی گزری ہو،
لیکن اُنھوں نے کسی سے دب کر بات نہیں کی۔ خاندانی عزّت
کو آخر وقت تک نباہا۔ وہ اپنے ملنے والوں سے ٹوٹ کر ملتے
تھے۔ کسی کا متمردانہ برتاؤ اُن کی گردن کو کبھی جھکا نہیں سکتا تھا
اپنی آن کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے، اور کبھی کوئی بات ایسی نہ
کرتے تھے، جس سے اُن کی وقعت میں کمی آنے کا احتمال ہو۔

سفر کلکتہ کے اثنا میں اُنھیں چند روز لکھنؤ بھی رہنا پڑا
تھا۔ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ رؤسا و عوام بہت خاطر سے
پیش آئے۔ روشن الدولہ سے بھی، جو نائب سلطنت تھے، ملاقات
کی صورت نکل آئی تھی۔ لیکن محض اسوجہ سے عملاً ظہور پذیر نہ ہوئی کہ
غالب نے اس کے متعلق یہ دو شرطیں پیش کی تھیں کہ (۱) نائب
میری تعظیم دیں، اور (۲) میں نذر سے معاف رکھا جاؤں۔

اسی طرح دہلی کالج کی پروفیسری کا واقعہ ہے۔ کالج کے
لئے ایک فارسی پروفیسر کی نئی جگہہ قایم ہوئی تھی، اور کسی قابل
شخص کا انتخاب ہونے والا تھا۔ مسٹر طامسن، سکرٹری گورنمنٹ
ہند، اس کام پر مامور تھے۔ اُنھوں نے غالب کو طلب کیا۔ یہ پالکی
پر سوار ہو کر اُن کی فرودگاہ پر پہنچے، اور اس انتظار میں کھڑے رہے
کہ صاحب سکرٹری اُن کی پیشوائی کرینگے۔ مسٹر طامسن کو جب یہ معلوم
ہوا تو وہ باہر آئے، اور اُن سے کہا کہ "جب آپ دربار گورنری
میں تشریف لائیں گے تو آپکا اُسی طرح استقبال کیا جائے گا۔ لیکن
اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں۔ اس موقع پر وہ برتاؤ
نہیں ہوسکتا۔" انھوں نے کہا کہ "گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ
اسلئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو، نہ اسلئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق
آئے۔" صاحب نے جواب دیا کہ "ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔" غالب یہ
کہکر چلے[1] آئے کہ "مجھکو اس ملازمت سے معاف رکھا جائے۔"

مروت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے انکار کا لفظ اُن کی زبان سے
نکلتا۔ جو شخص غزل بغرض اصلاح لاتا اُسے کبھی مایوس نہ کرتے۔ آخر
عمر میں بھی، جب کہ آنکھوں سے بینائی بھی رخصت ہو چلی تھی، خط وکتابت
اور اصلاح کلام کا سلسلہ جاری تھا۔

دوستوں کے حفظ مراتب کا انھیں بہت خیال رہتا تھا، اور چونکہ
وہ بہت فراخ مشرب واقع ہوئے تھے، اس لئے ہر کس و ناکس سے بلا
تفریق عقاید ملتے تھے۔ شاگردوں سے اُنھیں پدرانہ اُنسیت تھی۔ اہل و
عیال کے حقوق کا بھی کماحقہ خیال رکھتے تھے۔

شراب نوشی کی مذموم عادت اُنھیں ضرور تھی، لیکن اس کے
نقصانات کے وہ خود قائل تھے۔ اُن کے بعض خیالات میں الحاد
کی جھلک، بادی النظر میں، موجود ہے لیکن وہ صوفی منش اور صاف
دل شخص تھے۔ ظرافت کا مادہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اکثر
اُن کے تمسخر واستہزا کو لوگ امر واقعی سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

طبیعت میں آزادی اس قدر تھی کہ دہلی میں متواتر پچاس
سال کے قریب قیام پذیر رہنے کے باوجود اپنا ذاتی مکان کوئی نہیں بنوایا۔
کرایہ کے مکانات لیکر رہا کرتے تھے۔

ظریف ایسے تھے کہ بمشکل کوئی بات ظرافت کی چاشنی سے خالی
ہوتی۔ انھیں شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی، اور کبھی کبھی بازی لگا
کھیلتے تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کوتوال شہر کو، جو ان سے عداوت رکھتا تھا،
بدلہ لینے کا موقع مل گیا[2]، اور انھیں تین ماہ تک قید میں رہنا پڑا۔ رہائی
کے بعد میاں کالے صاحب[3] کے مکان میں رہتے تھے۔ یہ واقعہ مرزا غالب

۱؎ آب حیات ص۴۸۳ ۲؎ "یادگار غالب" ص۳۱ - حضرت محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب مولانا شیخ فرید الدین قدس سرہ کے پوتے تھے۔

ایسے وضعدار آدمی کے لئے موت سے کم نہ تھا' اور اس کا ملال وقعی اُنھیں ایک عرصہ تک رہا۔ لیکن اس کے باوجود بھی فطری ظرافت بدستور قایم تھی۔ ایک صاحب نے آکر رہائی کی مبارکباد عرض کی۔ آپ نے فرمایا "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھے' اب کالے کی قید میں ہوں۔"

مختصر یہ کہ عجب خوبی کے آدمی تھے۔ ایسے پاک نفس لوگ روز بروز نہیں پیدا ہوتے۔ غالب کی موت سے جہاں ہندوستان کو ایک نامور شاعر کھونا پڑا' وہاں اُردو شاعری کو ایک بے غرض محسن اور حقیقی سرپرست سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اگر غالب کو کچھ چین' زندگی میں حاصل ہوا ہوتا اور چند روز باطمینان کٹے ہوتے تو معلوم نہیں کہ اُن کی دماغی سحر آفرینیاں ادب اُردو میں کن کن جواہر ریزوں کا اضافہ کرتیں۔ بیشک' ایک طرف ہم بدنصیب ہیں اور دوسری طرف ہماری شاعری' جسے سوہاگ ہی میں سوگ کے کپڑے زیب تن کرنے پڑے۔ (باقی آیندہ)

سکہ جات سلاطین بیجاپور

نویں صدی کے خاتمہ پر جب کہ ظہیر الدین بابر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد قایم کرنے میں مصروف تھا تو کوہستان بندھیاچل کے نیچے ایسے انقلاب پیش آئے کہ مسلمانان دکن کا پہلا دور ختم ہوکر ایک نیا دور شروع ہوا۔ بہمنیوں کی عظیم الشان سلطنت جو دو صدیوں تک شاہان دہلی کی مدمقابل بنی ہوئی تھی تباہ ہوگئی اور اُسکے بڑے بڑے سرداروں نے ملک کو آپس میں تقسیم کرکے پانچ چھوٹی چھوٹی حکومتیں قایم کرلیں[1] جنکے فرمانروا دو صدیوں سے کچھ زاید عرصہ تک حکمرانی کرتے رہے اور گوداوری کے مخرج سے لیکر کرشنا کے دہانے تک شمالی دکن کا تمام علاقہ ان کے قبضے و تصرف میں رہا۔

دور طوائف الملوکی میں شاہان عادل شاہی کو ممتاز درجہ حاصل تھا۔ ان کی سلطنت یوں تو پہلے ہی سے بڑھی ہوئی تھی مگر دسویں صدی کے اخیر ایام میں جب سلطنت بیجانگر تباہ و تاراج ہوئی تو اسکو اور بھی وسعت حاصل ہوگئی اور اُس کے حدود شمال میں دریاء کرشنا سے لیکر جنوب میں آبنائے منار تک پھیل گئے اور اس میں سارا شہر کرناٹک' میسور و ملیبار کا تمام ملک شامل ہوگیا۔

اس سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ روم کے سلاطین عثمانیہ کی اولاد سے تھا۔ بیجاپور کی مشہور مستند تاریخ بساتین السلاطین میں لکھا ہے کہ سلطان مراد (۸۲۴ھ–۸۵۵ھ) کے دو بیٹے تھے محمد خاں و یوسف خاں۔ باپ کے مرنے پر ۸۵۵ھ میں جب بڑا لڑکا محمد خاں فاتح قسطنطنیہ تخت نشیں ہوا تو چھوٹے بھائی کے قتل کا حکم دیدیا۔ لیکن ماں نے شاہی افسروں کو کچھ رشوت دے دلاکر لڑکے کی جان بچائی اور خواجہ علاءالدین گرجستانی کے حوالہ کیا تاکہ اُسے لیکر بھاگ جائے۔ علاءالدین یوسف کو لیکر ترکی دارالحکومت سے نکلا اور ساوہ میں آکر پناہ گزیں ہوا۔ یہاں سے تجارت کے لئے ہندوستان آیا اور سلطان محمد شاہ بہمنی

---

[1] ان پانچ سلطنتوں کی تفصیل یہ ہے :-

(۱)	عماد شاہی	برار	سنہ ۸۹۰ھ	سنہ ۹۸۰ھ
(۲)	نظام شاہی	احمد نگر	سنہ ۸۹۶ھ	سنہ ۱۰۰۴ھ
(۳)	برید شاہی	بیدر	سنہ ۸۹۷ھ	سنہ ۱۰۱۸ھ
(۴)	عادل شاہی	بیجاپور	سنہ ۸۹۵ھ	سنہ ۱۰۹۷ھ
(۵)	قطب شاہی	گولکنڈہ	سنہ ۹۱۸ھ	سنہ ۱۰۹۸ھ

(۸۶۶ھ ۸۸۸ھ) کے زمانہ میں احمد آباد و بیدر پہونچا اور خواجہ محمود گاوان سے یوسف کا سارا حال کہہ کر درخواست کی کہ اُسے شاہی غلاموں میں شامل کردے۔ چنانچہ محمود گاوان نے یوسف کا نام شاہی غلاموں میں شریک کردیا۔ یوسف چونکہ پڑھا لکھا اور قابل آدمی تھا اسلئے بہت منظورِ نظر ہوگیا۔ ۸۸۳ھ میں جنیر کا صوبہ دار مقرر ہوا اس کے بعد بیجاپور کا سر لشکر قرار پایا۔ محمود شاہ بہمنی (۸۸۸ھ ۹۲۴ھ) کے زمانہ میں جب سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب ہوگئی تو نظام الملک ملک احمد کی تحریک سے اس نے اپنی مستقل حکومت قایم کرلی اور ۸۹۵ھ کو بیجاپور کی جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔

یوسف عادل شاہ کے بعد اُس کے خاندان میں یکے بعد دیگرے نو بادشاہ برسرِ حکومت ہوئے جن کے سنین جلوس اور شجرۂ نسب ذیل میں درج ہیں:۔

سنین جلوس سلاطین عادل شاہی

۱	یوسف عادل شاہ بانیِ سلطنت	۸۹۵ھ	۹۱۶ھ م ۱۴۸۹ء ۱۵۱۰ء
۲	اسمٰعیل عادل شاہ	۹۱۶ھ	۹۴۱ھ م ۱۵۱۰ء ۱۵۳۴ء
۳	ملو عادل شاہ	۹۴۱ھ	(۷ ماہ) م ۱۵۳۴ء ۱۵۳۵ء
۴	ابراہیم عادل شاہ اوّل	۹۴۱ھ	۹۶۵ھ م ۱۵۳۵ء ۱۵۵۷ء
۵	علی عادل شاہ اوّل	۹۶۵ھ	۹۸۸ھ م ۱۵۵۷ء ۱۵۸۰ء
۶	ابراہیم عادل شاہ ثانی	۹۸۸ھ	۱۰۳۷ھ م ۱۵۸۰ء ۱۶۲۷ء
۷	محمد عادل شاہ	۱۰۳۷ھ	۱۰۶۷ھ م ۱۶۲۷ء ۱۶۵۶ء
۸	عادل شاہ ثانی	۱۰۶۷ھ	۱۰۸۳ھ م ۱۶۵۶ء ۱۶۷۲ء
۹	سکندر عادل شاہ	۱۰۸۳ھ	۱۰۹۷ھ م ۱۶۷۲ء ۱۶۸۶ء

سکندر عادل شاہ سلطنت بیجاپور کا اخیر فرمانروا ہی۔ اسکے زمانہ میں اورنگ زیب (۱۰۶۹ھ ۱۱۱۸ھ) نے ملک پر قبضہ کرلیا اور ۱۰۹۷ھ ۱۶۸۶ء سے عادل شاہی سلطنت مغلیہ مقبوضات میں شامل ہوگئی۔

شجرۂ سلاطین عادل شاہی

(۱) ابو المظفر یوسف عادل شاہ
- دختر — زوجہ برہان نظام شاہ
- دختر — زوجہ احمد شاہ بہمنی
- (۲) اسمٰعیل
  - (۳) ملو
  - (۴) ابراہیم
    - طہماسپ
      - اسمٰعیل
      - (۶) ابراہیم ثانی
        - (۷) محمد
          - (۸) علی ثانی
            - (۹) سکندر
    - (۵) علی
  - دختر — زوجہ علاء الدین عماد شاہ

فارسی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں سب سے پہلے اپنے نام کا سکہ تیار کرایا اس کے بعد انقراض سلطنت تک تمام بادشاہوں کے سکے برابر مضروب ہوتے رہے۔ مورخ ابراہیم زبیری نے سلطان محمد عادل شاہ کے حالات میں ضمناً سکہ جات کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دار السلطنت کے سوا صوبوں کے صدر مقامات پر بھی دار الضرب تھے اور اُن میں جو سکے مضروب ہوتے تھے باعتبار وزن اور قیمت کے اُن کی حسب ذیل قسمیں تھیں[1]۔

ذہبی سکے (۱) ہون[2] (۲) نصف ہون (۳) ربع ہون

فضی سکے (۱) روپیہ (۲) اٹھنی (۳) چوانی

نحاسی سکے (۱) چھ جیتل[3] تین جیتل دو جیتل ایک جیتل

موسیو ٹیورنیر نے جو ۱۶۴۳ء سے ۱۶۵۳ء تک ہندوستان میں معروف سیر و سفر تھا ہون پگوڈا کے متعلق اس طرح لکھا ہے۔

اُن دو کانوں میں جو علاقہ بیجاپور میں راءل کُرٹ کے پاس ہیں نئے پگوڈا میں ہیروں کی قیمت دیجاتی ہے۔ اس پگوڈا پر بادشاہ بیجاپور کا سکہ مسکوک ہے کیونکہ وہ مغلوں کا تابع نہیں ہے۔ بالکل نئ

[1] بساتین السلاطین طبع حیدرآباد دکن ۱۳۱۰ھ صفحہ ۳۰۵ [2] سنسکرت میں ہون کے معنی سکہ یا زرِ نقد ہیں۔ لیکن دکن میں راجگان تلنگانہ و کرناٹک کے ذہبی سکے ہون کہلاتے تھے جب مسلمانوں نے اپنے ذہبی سکے تیار کرائے تو وہ بھی ہون کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اور پھر یورپین سیاحوں نے ان کا نام پگوڈا رکھدیا۔ [3] پہلے زمانہ میں اہل دکن پیسہ کو جیتل بولتے تھے۔

نوشتہ قلندر

نوشتہ حافظ محمد ابراهیم

قطعات قلمی

انڈین پریس الہ آباد

ان الفاظ میں لکھتا ہے۔

"دور اولین روز جلوس لفظ علیاً ولی اللہ در کلمات اذان مزید نمود
وخطبہ باسقاط اسامی خلفا واثبات اسامی حضرت آئمہ طاہرین علیہ السلام
خوانده شد۔ وہمگی رسم وقانون عہد پدر را برہم زده احیائے مراسم
جد وفرجد نموده و در ترویج ملتِ تشیع وتربیت شیعان باقصی الغایت کوشید
تا آنکہ دربایۂ تخت او مردم خوب از ایران و توران و کرمان وخراسان
فراہم آمدند وسہ ہزار کس ازیں مردم ملقب بہ تبرائیاں مامور بود ند
بہ گفتن تبرایاتِ العظیم بر روس الا شہا دچہ در سواری وچہ در دربار
وچہ در کوچہ وچہ در بازار گویند در تمامی شہر دراں وقت دریک مسجد
جامع نماز جمعہ بطریق اہل تسنن ادا می شد۔ آنہم بصد دشواری اختیار خاں
گجراتی نامی از امرائے معتبر وسنیان متعصب بود ودر تدین وتشرع
وتثبت تمام داشت در روز جمعہ مع اقوام واقارب وتوابع خویش مسلح
ومستعد در مسجد جامع قدیم حاضر شده ودر دروازه مسجد را بہ کمال استحکام بند
فرموده وجزائل وتفنگ ودیگر آلات حرب بر سقف مسجد نصب کرده
وجوانان جری ومردانہ برآں گماشتہ خود مع جماعت خطبہ نماز ادا میکرد۔
اگر بند وبست بایں آئین نمی آورد ممکن نہ بود کہ اسامی خلفا بر روس
ممبر بر زباں جاری۔"[۵۱]

علی عادل شاہ کو شیعیت میں یہاں تک غلو ہو گیا تھا کہ اُسنے اپنے سکے بھی حضرت علیؓ کے نام پر مضروب کرائے اُن پر حسب ذیل عبارت منقوش تھی:۔

رخ اول علی ابن ابی طالب

رخ دوم اسد اللہ الغالب

اس عبارت میں دو تلمیحات ہیں۔ علی سے علی عادل شاہ اور اسد سے اسد خاں لاری کی طرف اشارہ ہے۔ اسد خاں سلطنت بیجاپور کا اعظم الامرا اور نائب السلطنت تھا۔ مورخ ابراہیم زبیری نے حسب ذیل الفاظ میں اسکے محاسن بیان کئے ہیں۔

"از کتب تواریخ انچہ احوال اسد خاں لاری مفہوم ومعلوم میگردد
ہمیں قدر ہست کہ او از امرائے عظام ووزرائے کرام نیک محضر فرخ سیر
حمیده خصال پسندیده افعال بود۔ در شجاعت وسخاوت کہ گزیده ترین
ملکات نفسانیہ وفاضل ترین صفات انسانیہ اند نظیر نداشت ودر
تدبیر وصواب اندیش بے مثل ودر کنکایش وعقیده کشائی بیقرین ودر
خوش نصیبی وفرخ طالعی عدیم المثال گوئی تائیداتِ آسمانی وعنایاتِ
سبحانی علی الدوام شامل حال او بود وفتح نصیبی ونصرت یابی ہمیشہ ملازم
روزگار او گاہے ہرگز آسیب عین الکمال بدو نہ رسیده ودر ہر مشکلے
کہ اقدام می نمود ہرچند کہ از روئے عادت مستبعد می نمود بہ برکاتِ
حسن نیت او راست ودرست شده بروجہ دلخواه بحصول می انجامید۔
اما انیکہ الحال مشاہده می شود کہ درگاہِ او مثل درگاه اولیائے عظام و
مزارش ہم چو مزارات مقبولانِ حق زیارت گاہِ خاص وعام باشد
واز قبر او مانند قبور مردانِ خدا مردم تبرک جو نید وفیضہا یابند وکرامت
اظاہر وخدمہ ومجاورین روز وشب حاضر واعراس وفاتحہ خوانی وعود
وگل ونذر منذور برمثالِ روضات صالحین وآستانہائے سفر بین
کاملین جاری ومستمر۔ وبہ ولایت وکشف وکرامات او قایل مقر ومطواف
انام از ہنود واہل اسلام برسوخ دلی واعتقاد قلبی تردد وآمد وشد داشتہ باشند۔"[۵۲]

نمبر(۲) سکہ ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸ھ۔ ۱۰۳۷ھ

ب

ج

ان سکوں (دیکھو نمبر ۲) کی عبارت حسب ذیل ہے۔

---

[۵۱] بساتین السلاطین صفحہ ،، [۵۲] بساتین السلاطین صفحہ ۲۴

قوسین کی عبارت اچھی طرح پڑھی نہیں جاتی اور نہ اسکا کچھ مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ بعض سکوں میں صاف طور پر ملا ۹ ایلی مندرج ہے (دیکھو خاکہ نمبر ب) اور بعض میں بجائے ل کے ن ظاہر ہوتا ہے جس کی بنا پر یہ جملہ ملا ۱۱ ثنی یا ملا ۱ ثین ہوسکتا ہے (دیکھو خاکہ نمبر ج)

سنہ [illegible]ھ میں ابراہیم عادل شاہ نے شہر نورسپور کی بنیاد ڈالی۔ دورانِ تعمیر میں ایک دن وہاں گیا تو کسی نے ایک شیشہ شراب لا دی اور جب اُسے پیا تو ایسا سرور رہا کہ اس سے پہلے کسی شراب میں نہ ہوا تھا۔ خوش ہو کر کہنے لگا "مارا کیفی نو رسیدہ" پھر اُسے لفظ نورس کچھ ایسا پسند آیا کہ ہر چیز کو جو اُسے مرغوب ہوتی تھی نورس کہنے لگا سکہ کا نام بھی نورس رکھ دیا جو بیجاپور میں مدت تک مستعمل رہا۔ مورخ ابراہیم زبیری نے اس اجمال کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

در روزے کہ ایں شہر نو اساس را بنیاد مے نہادند شخصے از ساکنان قریۂ نورہ کہ ہم دراں حدود واقع است شیشۂ مے خوش گوار پیشکش ابراہیم عادل شاہ نمود۔ اتفاقاً چوں آں را بکار بردند حالتے عجیب و غریب کہ ندیدہ بود و نہ شنیدہ ازاں یافتند۔ چہ وصفیکہ مبرا بودہ از عیوب و نقایص کہ در مے ہائے متعارفہ یافتہ میشود از خمار و سرگرانی وغیرہ کیفیتِ نشاط و فرح و تر دماغی مضاعف ازاں یافتند کہ در شراب ہائے متداولہ حاصل مے شود۔ پس تفحص فرمودند کہ ایں از کجاست و در کدام جا ساختہ پرداختہ شدہ است۔ آرندہ گفت کہ در ہمیں قریہ ترتیب یافتہ بادشاہ سرورمند و فرح ناک گشتہ فرمودند امروز مارا کیفی نو رسیدہ چوں دراں وقت پر نشاط زبان الہام ترجمان ایں لفظ صدور یافت آں را بہ تفاؤل گرفتہ ایں شہر نو اساس را بہماں لفظ نامیدہ شہر نورسپور نام گذاشتند و محلِ نورس را شہرت دادند چوں محلِ نورس مقرر شد مدار مہمات ملکی و مالی براں قرار دادہ رواں داشتند و معاملات داد و ستد و محاسبہ دفاتر بہ حساب نورس مقرر فرمودند۔ طبع رنگین بادشاہ کہ نورس چمنِ مکنت و سلطنت و نو بادۂ گلشن جہانداری و خلافت بودہ لفظ نورس را چناں خوش کردہ بود کہ در ہرجا و ہر چیز استعمال آں لفظ بکار برد۔ سکۂ نورس نام مہرِ خاص کہ بر عقیق یمنی بجائے نام مبارکش ایں لفظ رقم یافتہ امروز برکت خاص بادشاہی دیدہ می شود۔ و علمِ نورس و نشانِ نورس کہ ہر یک زر و نشان عادل شاہیان است۔ و محلِ خاص کہ از سائر مردم محل کہ بزیادتی منظوری و مقبولی اختصاص یافتہ ہم بنورس موسوم گردیدہ۔ و کتابے کہ بزبان دہریت در فنِ موسیقی تالیف یافتہ و آنرا بہ بادشاہ مخصوص میکند ہم بنورس مشہور است و فلوس کہ ازاں عہد تا زمانِ حال مشہور و مروج است ہم بہ فلس نورس معروف است و دراہمی نورس در تمامی قلمرو جاری کردند۔ و محلِ نورس کہ قصرے است عالی بہ کمال زینت و زیب بنا یافتہ و عید نورس کہ چوں ماہ نہم روز جمعہ واقع گردد۔ و نورس کہ طوائف و قوالان و سازندگان و نوازندگان نادرہ حق اند۔ تا آنکہ بہ سبب مقبول و مطبوع آمدن ایں لفظ بر خاطر نازک پسند بادشاہ نازک پسندان عصر نیز بموجب الناس علی دین ملوکہم ایں لفظ پسند کردہ باستعمال خود ہا آوردہ اند ملا ظہوری نام دیباچہ کہ در مدح آں ممدوح زمان گفتہ دیباچہ نورس نام گذاشت و محمد قاسم فرشتہ کتاب مولف خود کہ در فن تاریخ پرداختہ نورس نامہ موسوم گردانیدہ و عبدالقادر کہ شاعرِ فصیح گو بود تخلص خویش نورسی قرار دادہ[1]۔

نمبر (۴) سکہ محمد عادل شاہ سنہ ۱۰۳۷ھ تا سنہ ۱۰۶۷ھ

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۲۴۹

ان سکوں پر یہ شعر مسکوک ہے:۔

جہان زاین دو محمد گرفت زینت و جا　یکے محمد مرسل دوم محمد شاہ

ملکہ تاج جہاں بیگم محمد عادل شاہ کی چھوٹی بیوی تھی۔ اس شعر میں لفظ جہان سے اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جہان (دنیا) نے حضرت محمد رسول اللہ سے زیب و زینت حاصل کی تو تاج جہاں بیگم نے محمد عادل شاہ سے۔

محمد عادل شاہ شاہان بیجاپور میں بڑے کروفر کا بادشاہ گذرا ہے۔ شاہجہاں اپنی خط و کتابت میں اسکو ہمیشہ سلطان محمد لکھا کرتا تھا[۱]۔ اس کا مقبرہ جو آجکل گول گنبد مشہور ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ روئے زمین کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے اور اسکے برابر وسیع اور عظیم الشان گنبد دنیا میں نہیں ہے۔ اسکی بلندی ۲۰۰ فیٹ اور رقبہ ۱۸۳۳۸ مربع فیٹ ہے۔ اتنی بڑی زمین تمام دنیا میں کسی گنبد کے نیچے نہیں پائی جاتی۔ اس کے بعد دنیا میں سب سے بڑا روم کے پانتھین کا گنبد ہے جسکی بنیاد ۱۵۸۳۳ مربع فیٹ رقبہ اراضی پر تعمیر ہوئی ہے[۲]۔

نمبر (۴) سکہ علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۶ھ۔ ۱۰۸۳ھ

سکہ پر حسب ذیل عبارت مسکوک ہے:۔

رخ اول　غلام حیدر صفدر
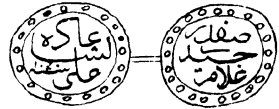
رخ دوم　علی عادل شاہ ۱۰۸۰

علی عادل شاہ ثانی کے سکوں پر تاریخ لکھی ہوئی ہے جس سکہ کا ہم نے خاکہ درج کیا ہے وہ ۱۰۸۰ھ میں تخت نشینی کے تین سال بعد مضروب ہوا ہے۔ سوا اس کے چند سکے ایسے بھی ہیں جو اس سے دو سال پہلے ۱۰۶۸ھ میں مضروب ہوئے ہیں اور ان دونوں کا سانچہ بالکل ایک جیسا ہے۔

نمبر (۵) سکندر عادل شاہ ۱۰۸۳ھ ۱۰۹۷ھ
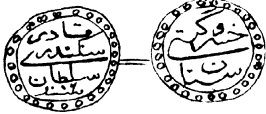
سکہ پر حسب ذیل عبارت مسکوک ہے:۔

رخ اول　خسرو گیتی ستان

رخ دوم　سلطان سکندر قادری ۱۰۸۳

رخ اول کی عبارت خسرو گیتی ستان نادر شاہ اور محمود شاہ درانی کے سکوں پر بھی مسکوک ہے۔

سکندر عادل شاہ نے باپ دادوں کے برخلاف سنی مذہب اختیار کر لیا تھا اور اُسے اولیا اللہ سے بے حد عقیدت تھی جس کی وجہ سے بیجاپور میں ان لوگوں کا گروہ کثیر جمع ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں شاہ نعیم اللہ حسینی جو شاہ سید ہاشم کے خلیفہ تھے بڑے بااثر بزرگ مانے جاتے تھے۔ بادشاہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور طریق قادریہ کے موافق خرقہ خلافت بھی حاصل کیا تھا[۳]۔

بارھویں صدی ہجری میں خلیج فارس سے لیکر سیلون تک لار کے شاہان سلف کا ملبا اور بعدہٗ اسکا رائج تھا۔ وہ تمام سوداگر جو ساحلی مقامات پر رہتے تھے اسی میں خرید فروخت کیا کرتے تھے۔ عادل شاہیوں کی مملکت میں کوکن اور ملیبار کے ساحل پر بہت سے تجارتی بندرگاہ تھے۔ مثلاً چول، دابل (زمانہ حال کا رتناگری)، سنداپور (گوا)، ہنا ور (ہونور) کلیکوٹ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں غیر ممالک کے سوداگروں کی ہروقت آمد و رفت رہتی تھی اور روزانہ لاکھوں کا لین دین ہوا کرتا تھا۔ ان شہروں میں جب عادل شاہی سکہ رائج نہ ہو سکا اور لاری سکہ بدستور جاری رہا تو سلاطین بیجاپور نے سونے چاندی کے ایسے سکے بھی مضروب کرائے

[۱] سلسلہ آصفیہ جلد ہشتم صفحہ ۷۸　[۲] "ہندوستانی و مشرقی فن تعمیر کی تاریخ" مصنفہ ڈاکٹر جے فرگسن۔ مطبوعہ ۱۹۱۰ء۔ جلد دوم ص ۲۷۴　[۳] روضۃ الاولیاء بیجاپور۔ بساتین السلاطین صفحہ ۴۴۵

جو لاری سکوں سے بالکل مشابہ تھے۔

نمبر (۱) سکہ ابراہیم عادل شاہ ۹۸۸ھ-۱۰۳۷ھ

والطوار ا عاداساہ

لاری دا لکر شلہ

طہ ا را سہ عادا

الاری دا لکر

نمبر (۲) سکہ علی عادل شاہ ۱۰۶۶ھ-۱۰۸۳ھ

لطان عاعاد

لاری دا لکر

اعاعاداساہ سنہ

لاری دا لکی

یہ اسوقت تک صرف ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ-۱۰۳۷ھ)

اور علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۶ھ-۱۰۸۳ھ) کے عہد کے دستیاب ہوئے ہیں[1]۔ مگر ان کی حالت اس قدر خراب ہے کہ کسی کی بھی پوری سکوکہ عبارت پڑھی نہیں جاتی۔ کسی پر ایک لفظ پڑھا گیا۔ کسی پر دوسرا کسی پر تیسرا، اسی طرح متعدد سکوں کا باہم مقابلہ کرنے سے ان پر مفصلہ ذیل عبارت کا مسکوک ہونا معلوم ہوتا ہے۔

نمبر (۱) ابو المظفر ابراہیم عادل شاہ

ضرب لاری دانگے سنہ

نمبر (۲) سلطان علی عادل شاہ

ضرب لاری دانگے

ابراہیم عادل شاہ کے سکے ۱۰۰۹ اور ۱۰۱۶ کے ملے ہیں۔ علی عادل شاہ کے سکوں پر ۱۰۷۱ اور ۱۰۸۱ مضروب ہے۔ شاہان مابعد کے سکے ابھی تک دیکھنے میں نہیں آئے لیکن گمان غالب ہے کہ اگر انکی تلاش وجستجو کی جائے تو ملیبار کے بڑے بڑے شہروں میں مل جائیں گے کیونکہ بعض سیاحوں کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں اب سے سو برس پہلے تک ان کا رواج تھا۔

لاری سکہ کو نہ صرف عادل شاہیوں بلکہ سنگلدیپ کے راجاؤں نے بھی مضروب کرایا تھا۔ مشہور سیاح ملا عبد الرزاق سمرقندی جو ۸۴۶ھ سے لیکر ۸۴۸ھ تک دکن کے جنوبی علاقوں میں مصروف سیر وسفر رہا ہے، ایک موقع پر لکھتا ہے کہ

> سنگلدیپ (سیلون) اور اُس کے قرب وجوار میں وہاں کے راجہ چاہتے ہیں کہ اپنے قلمرو میں اسلامی سکہ جاری کریں جو تجارتی لین دین میں کثرت سے چلا کرتا ہے[2]

شمس اللہ قادری

[1] عادل شاہیوں کے لاری سکے ڈاکٹر جی - پی - ٹیلر - پی - ایچ - ڈی اور ڈاکٹر احمد مرزا ایم - ڈی - بی - ایس - سی کے یہاں موجود ہیں۔ ڈاکٹر احمد مرزا کے سکے ہم نے دیکھے ہیں۔ صاحب ممدوح ان کو فضول اور بیکار چیز خیال کرتے تھے مگر جب ہم نے کوشش کرکے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ان میں دو سکے علی عادل شاہ کے ہیں اور چھ سکوں پر ابراہیم ثانی کا نام مسکوک ہے۔ [2] تاریخ ہندوستان مصنفہ ایلیٹ صاحب۔ جلد دوم ص ۲۲۱۔

تصریح تصاویر - عہد شاہجہانی کی ایک تصویر - یہ تصویر شاہجہاں بادشاہ کے کسی درباری مصوّر کی بنائی ہوئی ہے - یہ چار اشخاص کا ایک گروپ ہے تصویر کے نیچے تین کے نام لکھے ہیں، جو بائیں جانب سے حسب ذیل ہیں (۱) خواجہ عبد اللہ (۲) ملا شاہ (۳) سلیمان شاہ میر چوتھی تصویر کا نام نہیں لکھا۔ تصویر بہت نفیس ہے، اور مغلیہ دور میں جس قسم کی تصویریں بنائی جاتی تھیں، انکا یہ بہترین نمونہ ہے - اصل تصویر کلکتہ کی فائن آرٹ گیلری میں موجود ہے۔

نواب محمد صفدر علیخاں بہادر صفدر مرحوم خلف نواب محمد سعید خاں بہادر رئیس رام پور، اپنے زمانہ کے ایک خوشگو شاعر تھے حضرت امیر سے آپ کو تلمذ تھا اخیر میں جناب امیر مینائی کو بھی اپنا کلام دکھایا ہے۔ کسی آیندہ اشاعت میں ہم آپ کے کلام کا مختصر سا انتخاب ہدیۂ ناظرین کرینگے۔

خواجہ امان کے حالات انکی مترجمہ کتب حدائق الانظار، ریاض الاخبار، اور بوستان خیال میں ملاحظہ فرمائیے۔

اُردو

ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت سے

۵

لیکن بعض ایسے عالم بھی ہیں جو فارسی و عربی حروف تہجی کو علم اللسان کے اصول کے لحاظ سے اُردو کے واسطے جس کا شمار حقیقۃً آریہ زبانوں میں ہوتا ہے ناموزوں سمجھتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نہایت مشہور بزرگ اور میرے عزیز اور پُرانے دوست شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی بھی ہیں جنھوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب تمدن عرب کے معرکتہ الآرا مقدمہ میں اس کے متعلق حسب ذیل خیالات ظاہر فرمائے ہیں:-

پہلوی اور جدید فارسی کی طرح اُردو بھی اُن بدنصیب زبانوں میں ہے جن کے حروف ہجا اجنبی اقوام کے بنائے ہوئے ہیں اور یہ بات قدرتاً اس زبان کے خواص کے خلاف ہے اور اس سے تمام اصوات بھی ادا نہیں ہوتیں، اُردو حروف کثیر الاصوات ہونے کے ساتھ ہی نامکمل بھی ہے۔ کئی حروف سے یکساں آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسپر بھی بہت سی آوازیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ آریہ زبانوں میں یہ ایک مفید امتیاز ہے کہ حرکات کا اظہار حرفوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ حالانکہ سمقطی زبانوں میں جُداگانہ علامات زیرؔ، زبرؔ، پیشؔ اور تنوینؔ وغیرہ سے ایسا ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ آریہ زبان کا پڑھنا سمقطی زبان سے زیادہ آسان ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربی کی سی زبان میں بلا صرف و نحو کی قابلیت کے ایک فقرہ بھی صحیح پڑھنا ممکن نہیں حالانکہ ایک نوآموز بھی سنسکرت، یونانی، اور لاطینی کے حروف ہجا سیکھ کر اُن کا ایک ایک جملہ پڑھ سکتا ہے باوجودیکہ وہ اس کے معنی بھی نہ سمجھتا ہو۔ یہ بات بہ آسانی محسوس ہو سکتی ہے کہ غیر طبعی طرز تحریر نے اُردو کی ضروریات کو غیر معمولی طور پر کس طرح دشوار بنا دیا ہے اور اس بات سے کسی کو متعجب نہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے بچوں کو اپنی مادری زبان روانی کے ساتھ پڑھنے کے لئے دو سال سے زیادہ لگ جاتے ہیں اُردو پڑھ لینے کی یہ مشکل مسلمانوں کی کمی تعلیم کا سب سے بڑا سبب رہ چکی ہے اور اب بھی ہے*۔

(تمدن عرب ص ۲۴-۲۶)

اگر اُردو علم ہجا واقعی ایسا ہی ناقص ہے اور اسلامی تعلیم کے فقدان کا یہی سب سے بھاری سبب ہے جیسا کہ ہمارے شمس العلماء موصوف فرماتے ہیں تو میں اسکے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے مسلمان برادران ملک اُس کو جس قدر جلد ترک کر سکیں کر دیں اور کوئی دوسرا رسم الخط جو موزوں تر اور زبان کی طبعی ضرورت کے لحاظ سے مفید اور جس کا پڑھنا اور حاصل کرنا زیادہ سہولت آمیز ہو اختیار کریں۔ بایں ہمہ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شمس العلماء، جن کی علم اللسان کی صحیح واقفیت محتاج تصریح نہیں اُن کے یہ خیالات انگریزی کے حروف و اصوات پر بھی بجنسہٖ مساوی عاید ہوتے ہیں جس کے ساتھ جیسا کہ میں بہ تکرار بتا چکا ہوں اُردو کئی پہلو سے ایک حیرت خیز مماثلت رکھتی ہے۔ انگریزی زبان کے حروف اصوات اس درجہ ناقص اور بے ترتیب واقع ہوئے ہیں کہ میرے ایک جرمن پروفیسر ہمیشہ اُن کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے اور اسکے باوجود اُس کے بولنے اور لکھنے والے سنسکرت زبان سے تعداد میں کہیں زیادہ ہیں حالانکہ موخر الذکر اپنے قواعد صرف و نحو اور اصوات کے اعتبار سے دنیا کی مکمل ترین زبان خیال کی جاتی ہے۔ حکومتوں کی طرح زبانوں کی کامیابی خیالی تکمیل پر نہیں بلکہ عملی فوائد پر منحصر ہوتی ہے ورنہ سنسکرت یا

---

* باوجود تلاش "تمدن عرب" نہ مِل سکی لہذا یہاں انگریزی اقتباس ہی کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ مترجم

یونانی اقوامِ عالم کی زبان ہوتی اور افلاطون کی کتاب "رِی پبلک"[1] یا مور کی تصنیف اٹوپیا تمام عالم کی سلطنتوں کی بنا قرار دی جاتی جبتک عوام اُردو اور انگریزی کا لکھنا پڑھنا آسان اور کار آمد پائیں گے وہ یقیناً سنسکرت کے مقابلے میں مرجح طور پر اُنھیں حاصل کریں گے کیونکہ سنسکرت خیالی طور پر مکمل ہونے کے باوجود اُسوقت تک ناقابل حصول ہے تاوقتیکہ ڈاکٹر آلوٹ شریڈر (ڈایرکٹر آڈیر لائبریری مدراس) کے ظاہر کردہ خیالات کے بموجب اُسے سہولت آمیز نہ بنا دیا جائے۔ اُردو کے کار آمد ہونے اور اُس کی نفاست کے متعلق میرے خیالات کی تائید مسٹر جان بمیس کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے :-

مختصر یہ ہے کہ مقامی بُعد کے رفع اور مختلف اقطاعِ ملک کے تعلقات زیادہ تر آزادو مستقل ہوجانے پر یہ صاف و سادہ، خوش وضع، لوچدار اور سہل الاظہار زبان جو اَب بھی اکثر حصص ہند کی لینگوا فرینکا اور حکمراں قوم کی اس لحاظ سے موردِ عنایات ہے کہ کئی ضروری حیثیات سے اُن کی خاص زبان سے مشابہ ہے بلا شبہ اگر سب نہیں تو بہت سی مختص المقام زبانوں کی جگہ لے لیگی اور تمام ہندوستان میں ایک مشترک اور ملکی ذریعۂ تقریر رائج کر دیگی گویا عالم ہند کی انگریزی ہو جائیگی۔

میں بالکل شروع میں انگریزی زبان کے ہندوستان کی قومی زبان ہونے پر پسندیدگی ظاہر کرچکا ہوں لیکن اگر اُردو یا ہندوستانی "عالمِ ہند کی انگریزی" بن جائے جیسا کہ مسٹر بمیس ارشاد فرماتے ہیں تو بھی گویا وُہی بات ہوئی۔

ذیل میں انھیں آرا کی تائید مزید پیرس کے پروفیسر گرسین ڈی ٹاسی کی جانب سے جو اول الذکر سے بھی زیادہ مستند ہے ملاحظہ ہو:-

اوّل تو یہ کہ مستعمل زبانوں کی حیثیت سے ہندوستانی کو تمام ایشیا میں فصاحت و شستگی کے باعث ایشیا میں وہ تفوق حاصل ہے جو کسی اور زبان کو نصیب نہیں۔ ایک عام مثل کے مطابق مسلمان عربی کو تمام اسلامی مشرقی زبانوں کی بنیاد اور مکمل ترین زبان اور ترکی کو علوم و فنون اور تفریحی لٹریچر کا مجموعہ اور فارسی کو شاعری اور تاریخ کا گنجینہ سمجھتے ہیں لیکن جس زبان میں انسانی سوسائٹی کی عام ضروریات کے اعتبار سے ان تینوں زبانوں کی خوبیوں کو یکجا کرنے کی قابلیت موجود ہے وہ ہندوستانی ہے جو اُن کے لئے روزمرہ کی بولی ہونے اور عملی پہلو سے ہر طرح قابلِ ترجیح ہے۔ درحقیقت ہندوستان کی یہ عام بول چال اظہارِ خیالات کا بہترین ذریعہ اور نہایت شیریں زبان ہے۔ اور ساتھ ہی بالعموم مستعمل ہونے سے اسکا جاننا حد درجہ کار آمد ہے۔ اور جب سے اس نے محاکم و عدالت میں دفتری زبان کی حیثیت سے فارسی کی جگہ پائی ہے اُسوقت سے صوبجات شمال او شمال و مغرب میں اسے خاص وقعت حاصل ہوگئی ہے۔

پروفیسر گرسین ڈی ٹاسی آگے چلکر مندرجہ ذیل خیالات خاص طور سے اُردو اور فارسی کے رسم الخط کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

ہندو فارسی رسم الخط کے شاکی ہیں اور ناگری کو ترجیح دیتے ہیں لیکن حقیقت میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ تعصب سے آدمی ایسا ہی اندھا ہوگا جو فارسی کے رسم الخط بلکہ شکستہ تحریر پر بھی جس کا پڑھنا نہایت دشوار ہوتا ہے بدہیئت مروجہ ناگری کیتھی کو (میرا مطلب یہاں دیوناگری کے خوبصورت حرفوں سے نہیں) ترجیح دیگا۔

یہ خیالات ہیں دو معتقد رعالموں کے جنمیں سے ایک انگریز اور دوسرا فرانسیسی ہے ہندوستانی زبان اور ہندوستان میں اُسکے اغلب مستقبل کے بارے میں۔ اسپر بھی ڈاکٹر آلوٹ شریڈر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ انڈین ریویو

---

[1] ان دونوں کتابوں میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ بہترین حکومت کس قسم کی ہو سکتی ہے۔ لیکن بقول فاضل مضمون نگار کے محض خیال ہی خیال ہے عملی طور پر اُن سے فائدہ اُٹھانا کم از کم ابھی تک غیر ممکن رہا ہے۔ مترجم

بابت جون ۱۹۱۰ء کے صفحات میں اسی مسئلہ پر بحث کر کے ان الفاظ کے ساتھ اُردو کے ہندوستان کی لنگوا فرینکا ہونے کے دعاوی کا فیصلہ کرتے ہیں:-

> آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ اُردو اُس قابل رحم حالت کا آئینہ ہے جو ہندوستان پر طاری ہے۔ اُس کے اختیار کرنے سے آپ جلد تر زوال پذیر ہو سکتے ہیں لیکن اپنی قوم کو عروج پر نہیں پہنچا سکتے۔

۶

کیوں؟ یقیناً اس وجہ سے نہیں کہ یہ ایک مخلوط زبان ہے نہ اس لئے کہ یہ ایک سہل الحصول علمی زبان ہے جب کہ خود ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ایک انگریز بھی نسبتاً بہت قلیل عرصہ میں اسے سیکھ سکتا ہے کیونکہ برخلاف اسکے اس زبان کے مخلوط اور لچکدار الفاظ اُسکے سہل قواعد صرف و نحو گویا جن باتوں میں اُردو کو انگریزی کے ساتھ قریبی مشابہت ہے جس کے خود ڈاکٹر صاحب معترف ہیں یہی اسباب ہیں جنکی بنیاد پر اُس کے "لنگوا فرینکا" بلکہ ہندوستان کی قومی زبان بنائے جانے کی سفارش کرتی ہے۔ پھر کیا اس کا باعث اس کے سمقطی اجزا رہیں؟ مگر یہ سمقطی عنصر بھی اس میں صدیوں سے ہیں اور اس کا اُردو سے خارج کرنا اُسی طرح ناممکن ہے جس طرح انگریزی سے نارمن فرنچ الفاظ کا۔ اُسکا وجود ہی اسکی اختلاط پسند طبیعت پر دال ہے اور اگرچہ صحیح غور و فکر سے فارسی و عربی عنصر کسی قدر کم ہو سکتا ہے جیسے کہ گذشتہ سو سال کے اندر نارمن فرنچ انگریزی سے کم ہو چکا ہے۔ تاہم اُردو بغیر سمقطی عنصر ہندوستان کی قومی زبان اسی طرح نہیں ہو سکتی جس طرح ہندوستان میں بلا اسلامی آبادی کے باضابطہ شمول و اشتراک کے ایک متحدہ قومیت نہیں قایم کیجا سکتی۔ یا اسکی وجہ موجودہ علم ادب اُردو کی پست حالت ہے؟ اس میں صحت کی بہت گنجایش ہے لیکن یہ ایک ایسا نقص ہے جسکا علاج اُس صورت میں بہ سہولت ہو سکتا ہو کہ اُردو ایک دفعہ ملک کی قومی زبان تسلیم کر لیجائے اور تعلیم یافتہ ہندو مسلمان اور پارسی عیسائی اپنی روحانی ضروریات اور مباحث اخلاق کیلئے اسے ذریعۂ اظہار قرار دے دیں۔ اس نقص کی وجہ یہی ہے کہ اُردو ابتک اپنی ابتدائی حالت میں ہے یا یوں کہو کہ عہد طفولیت کے خوشنما لباس میں ہے اور اسکا سبب یہ ہے کہ اسکے حقیقی محافظوں اور سرپرستوں نے باستثنا چند جدید سائنس اور علوم کی طرف رُخ نہیں کیا اور اسلئے اُردو ملک کی دیگر بڑی بڑی زبانوں از قسم بنگالی مرہٹی، گجراتی کے دوش بدوش نہیں چل سکتی۔ اس بات سے چاہے کوئی متحیر کیوں نہو تاہم یہ بالکل سچ ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان کا علم ادب جسمیں اُردو بھی شامل ہے صرف انگریزی کے ذریعہ آگے ترقی کر کے تکمیل کے بلند تر درجہ تک پہنچ سکتا ہے یعنی یورپ کے جدید خیالات، جدید نظریہ، جدید علوم، جدید فلسفہ، جدید تجارت، اور جدید مصنوعات کے اجتماع سے۔ اور ان چیزوں پر ہمیں ہندوستان میں دسترس حاصل کرنا کلیتہً زبان شاہنشاہی کے توسط سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اگرچہ دیگر دیسی زبانوں نے جنکا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اپنی ترقی و اصلاح کی قابلیت دکھائی ہے تو اُسکی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے مغربی خیالات اور کمالات کو اپنے آپ میں جذب اور انھیں اپنی مخصوص زبان کی خصوصیات اور نیز اپنے قومی جذبات قایم رکھکر منتقل کر لینے میں اُردو سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ علم ادب کی ترقی کے کم سے کم تین مدارج ہیں، ترجمہ، تالیف، اور تصنیف اور جس طرح تالیف ترجمہ سے بہتر ہوتی ہے اسی طرح تصنیف ترجمہ اور تالیف دونوں سے رتبہ میں بلند ہوتی ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے اُردو نے اسوقت تک ترجمہ کی منزل باقاعدہ طور پر بمشکل طے کی ہوگی۔ جو کتابیں ابتک اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں وہ زیادہ تر انگریزی کے بے وقعت اور مبتذل ناول اور قصے

ہیں اور میں اکثر اس خیال سے لرزہ براندام ہو جاتا ہوں کہ آخر اس
قسم کے تراجم کے مطالعہ سے لڑکے اور لڑکیوں کے کم تجربہ اور اثر پذیر
قلب کی کیا حالت ہوتی ہوگی جنھیں نفیس اور سریع الہضم غذا کے
نہونے سے چُونی اور بھُس پر گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے تو یہیں
بہتر ہوتا کہ ہم اپنی قدیم عزیز کتابوں الف لیلہ اور باغ و بہار سے تجدید
تعلقات کر لیتے کہ یہ اشتعال انگیز اور سم آلود فضلہ جو کباب
اور پلاؤ کی شکل میں دستر خوان پر چنا گیا ہے زہر مار نکرنا پڑتا۔

نظر بریں اس بات کی ضرورت ہے کہ انگریزی کی تمام
مفید کتب جو تاریخ وسائنس وفلسفہ پر ہوں اور بہترین ناول بھی تالیف
کے ذریعہ جیسا کہ بنگال میں پچاس سال پہلے کیا جا چکا ہے، فصیح و
عام فہم اردو میں لے آویں اور اُردو کو پھر جلد یہ فخر کرنیکا موقع
مل جائیگا کہ اُس میں بھی ودیا ساگر سا فاضل، مادھو مُند سا شاعر،
بنکم چندر سا ناولسٹ اور رومیش چندر دت سا مورخ موجود ہے۔
ہندوستانی لٹریچر میں اپنے طرز کی بہترین کتاب ڈاکٹر سید علی بلگرامی
(مرحوم) کی مشہور تمدن عرب ہے جو ڈاکٹر لی بان کی فرنچ تالیف
لا سویلزشن ڈی عربس کا قابل قدر ترجمہ ہے۔ اگر اس قسم کی کتابوں
میں بسرعت اضافہ ہوتا رہتا تو ہندوستانی علم ادب یقینی طور سے
چند سال میں خاصی ترقی کر جاتا۔

۶

لیکن باوجود اپنی مخصوص لسانی صفات اور معاشرتی و
ملکی فوائد کے جو واضح طور پر اُسے حاصل ہیں اردو کبھی ہندوستان
کی قومی زبان نہیں بن سکتی تا وقتیکہ اُس کے قدرتی محافظ اور موروثی
نگراں کار اُن صفات اور فوائد کا استعمال ٹھیک طریقے اور صحیح طور
پر نکریں۔ ملکی سرپرستی خواہ کتنی ہی قیمتی چیز ہو کسی زبان کی ترقی پر اُس وقت
تک گہرا اثر نہیں ڈال سکتی تا وقتیکہ وہ قوم یا فرقہ جو اُسے برتتا ہے
گورنمنٹ کا ساتھ نہ دے۔ یہ ایک پُرانی مثل ہے کہ کسی زبان کی
ترقی یا کسی قوم کا عروج جو عموماً دوش بدوش ہوا کرتے ہیں خارجی
اثرات کے بہ نسبت فی الحقیقت زیادہ تر ذاتی مساعی سے ترقی پذیر اور
مستقل سمجھے جاتے ہیں۔ معمولاً قدرتی نشو و نما کا مادہ دونوں میں موجود
ہوتا ہے لیکن اُس کے اجزائے لا یتجزّٰی ہی وہ چیز ہیں جو اُن کی
ترقی کو تیز یا سُست کر سکتے ہیں۔ ان اجزا کے ہاتھوں ہندوستانی
کی نشو و نما صرف اُسی حالت میں بڑھ سکتی ہے کہ اُن کی کوششیں
عاقلانہ اور اُن اُصول کے ساتھ ہوں جو بالعموم تمام زبانوں اور
بالخصوص ہندوستانی کے عروج پر حاوی سمجھے جا سکتے ہیں۔ وہ اُصول
کون سے ہیں جو ہندوستانی کی آیندہ ترقی اور مستقل عروج کو مجتمع کرکے
اُس کے ہندوستان کی قومی زبان بنائے جانے کی صورت پیدا کر سکتے
ہیں۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ ہندوستانی کے جزو غالب زیادہ تر ہندی،
فارسی، اور عربی ہیں۔ اُس مشابہت کو جو اُسے انگریزی کے ساتھ
ہے پیش نظر رکھتے ہوئے اُس میں ہندی کا وہی درجہ ہے جو اینگلو سکسن
کا انگریزی میں، اور فارسی معہ عربی متعلقات کے بمنزلہ نارمن فرنچ
کے ہے۔ اور بعینہ جیسے کہ انگریزی نہ صرف جزایر انگلشیہ کی بلکہ گریٹ
برٹن ماورای البحر کی بھی قومی زبان بن گئی ہے جہاں کے لوگ اپنے
جرمنی النسل اجداد کے خالص اینگلو سکسن الفاظ اور جملوں کے
استعمال سے اُنھیں نظموں کا مطالعہ کرتے اور اُنھیں گیتوں کو گاتے
ہیں اسی طرح ہندوستانی اس طریقے سے ہندوستان کی قومی زبان
ہو سکتی ہے کہ اُس میں حتی الوسع قدیم ہندی کلاسیکل الفاظ استعمال
کیے جائیں جن سے برج بھاشا یا قدیم مغربی ہندی بافراط معمور
رہ چکی ہے۔ اسکے بعد ہندوستانی آبادی کا کثیر حصہ خواہ وہ ہندو
ہو یا مسلمان اسے سمجھنے لگے گا اور اسکے بغیر یہ امر ناممکن ہے لیکن
فارسی و عربی کو اپنا استحقاقی حصہ پانا چاہیے کیونکہ یہ اُسی کُل کا ایک

عهد شاهجهانی کی ایک تصویر

انڈین پریس الہ آباد

لازمی جزو ہیں لیکن جہاں ان کی شرکت اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اُسکا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ طرز تحریر نہایت دقیق اور ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہہ مسلمہ امر ہے کہ کسی زبان یا علم ادب کی ترقی اُس کے شستہ، سہل، اور قابل فہم ہونے کے تناسب سے ہوتی ہے۔ دوسرا نکتہ جو ہندوستانی ادب کے ترقی خواہوں کو دلنشین رکھنا چاہیئے یہ ہے کہ اُس میں اُسی مرز بوم کے خواص پیدا کئے جائیں۔ یعنی اُسی کی زمین، درختوں، پھولوں، کیڑوں، جانوروں، ندیوں، پہاڑوں، جرگوں، قوموں، مردوں، اور عورتوں، کا ذکر ہو۔ بقدرِ خواہش عربی اور فارسی کی تحصیل میں کوئی ہرج نہیں لیکن ہندوستانی مصنف یا شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے خیالات، استعارات اور تلمیحات، زیادہ ہندوستان کی زمین اور یہاں کے باشندوں سے اخذ کئے جائیں اور حتی الوسع اُنھیں فارس و عرب کے تشبیہات وغیرہ پر ترجیح دی جائے ورنہ علم ادب کم وبیش غیر ملکی سمجھا جائیگا اور اُسکا اثر اُن کثیر التعداد ناظرین کے قلوب پر مطلق نہ پڑسکے گا جن کے لئے وہ حقیقت میں وجود میں لایا جاتا ہے۔ اسیطرح ہندوستانی شاعر یا ناولسٹ پر فرض ہے کہ وہ اپنے ہیرو یا ہیروئین کا تعلق اپنے وطن کی تاریخ سے جس قدر قریبی دکھاسکے دکھائے نہ کہ غیر ممالک کی تاریخ سے گو یہ ممالک مذہب وعقاید کے رُو سے ایک ہوں۔ بلاشبہ مذہب اقوام کو مربوط کرنے کے لئے ایک مضبوط بندش ہے لیکن ہموطنی کا شیرازہ زیادہ تر مضبوط، موثر، اور نیچرل ہوتا ہے اور مشترکہ حکومت کے تاثرات قومیت سے بھی زیادہ گہرے اور اُستوار ہوتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ والے جنکا حُبِ وطن مثالی طور پر مشہور ہے اُس میں تین قومیں شامل ہیں جرمن، فرانسیسی، اور اطالی، یہ لوگ جب اپنے اپنے ملکوں میں رہتے تھے تو ان کے باہمی تعلقات خوشگوار نہ تھے اسکے سوا یہ لوگ دو مختلف مذہبی عقاید کے پیرو ہیں یعنی رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ، اور ازمنۂ گذشتہ میں ان دونوں میں باہمی میل جول اتنا بھی نہ تھا جتنا آجکل ہمارے ہندوستان کے بعض مذاہب میں ہے۔ انگلینڈ اور انگلش قوم کو دیکھئے۔ فتوحات کے بعد کیا سیکسن اور نارمن پشتہا پشت تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہیں رہے۔ اسکے باوصف بتدریج اُنھوں نے سابقہ دُشمنی اور بُغض کی باتیں بُھلا دی ہیں اور اب ایک دوسرے میں ملنے کے بعد وہ دنیا کی قوی ترین اور محب الوطن قوم بنگئے ہیں ...... زمانۂ حال کے ایک اعلی تعلیم یافتہ اور آزاد خیال مسلمان بزرگ نے جو سنسکرت کے فاضل ہونے کے ماسوا ہندوؤں کی قدیم تاریخ اور علم ادب سے اپنے دیگر ہم مذہبوں سے زیادہ ماہر ہیں ایکمرتبہ ایک دوستانہ و بے تکلفانہ گفتگو کے دوران میں مجھ سے جواباً کہا تھا کہ وہ اپنے ہندی النسل ہونے پر بہ نسبت عربی النسل ہونیکے زیادہ نازاں تھے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ اُن کی رگوں میں ہندی خون موجود ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تعلیم یافتہ و مہذب مسلمان ہندوستان میں ایسے اور بھی موجود ہیں جو مساوی طور پر ہند و نسل ہونے پر فخر اور مادرِ ہند کے ساتھ عزت و محبت کے جذبات دلوں کے اندر پیدا کرنے میں ہندوؤں سے کسی طرح کم نہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ مسٹر علی امام پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی صادق حُب الوطنی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

ہم تعلیم یافتہ مسلمانان ہند اپنے مولد سے کچھ کم محبت نہیں کرتے۔ ہمارے تعلقات صدہا سال کے قیام سے مضبوط ہوگئے ہیں۔ ہم مادر وطن کی محبت و وقعت کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہماری تمام اُمیدیں اور حوصلے عام ترقی سے وابستہ ہیں جس سے اُسکی تمام اولاد کو بلا کسی ادنیٰ تفریق کے حفاظت و ترجیح حاصل ہو۔

۸

آؤ ہم سب ملکر ان خیالات پر تہ دل سے آمین کہیں۔ اگر تمام تعلیم یافتہ مسلمان مسٹر علی امام کے خیالات اور اُمیدوں میں جو یہاں درج کئے اور تھوڑے ہی دن ہوئے انڈین یونین سوسائٹی آف لندن کے سامنے دُہرائے جا چکے ہیں شریک ہوں اور ہندوستانی زبان کے ذریعہ اُن کے اظہار کی کوشش کریں تو اُسکی شان اُس الزام سے بالا ہو جائیگی جو اُسپر آئے دن ہوتے رہتے ہیں کہ نہ تو اُسکا لٹریچر قدر کے لایق ہے نہ آجکل کی ضروریات پورا کرنے کی قابلیت اس میں پیدا کی گئی ہے یا یہ کہ اس میں دربار دہلی و لکھنؤ کی دقیانوسی روایتیں اس درجہ بھری ہوئی ہیں کہ ہندوستان کی نئی پود کے طبایع پر کامیابی کے ساتھ وہ موثر نہیں ہو سکتا۔ دربار کی آب وہوا کبھی قومی علم ادب کی آزادانہ نشوونما کے لئے دنیا میں موافق ثابت نہیں ہوئی خاصکر اس صورت میں کہ درباری زبان بھی غیر ملکی ہو جیسا کہ دلی و لکھنؤ کے درباروں میں بلاشبہ فارسی تھی۔

لا کلام دہلی و لکھنؤ کے شعراء نے اعلیٰ درجہ کی فارسیانہ اُردو لکھی ہے جسے صرف وہ خود اور اُن کے شاگرد اور وہ دربار جس سے اُن کا تعلق تھا حقیقی معنوں میں سمجھتے اور اُن کا لُطف اُٹھاتے تھے۔ وہ نہایت پُر تصنع طرز تحریر تھی جو شاید اُسوقت کے حالات کے لحاظ سے ناگزیر تھی لیکن اب آجکل وہ بالکل بیوقت کی راگنی ہے، اور اگر اُردو ادب کو نئے اور ترقی یافتہ طریقوں پر بڑھنا ہے تو اسے ترک کر دینا چاہیئے، اور ہندوستانی کو تمام ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے لئے اُس میں ہند کے متعلق عمیق جذبات اور اعلیٰ درجہ کے خیالات پیدا کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہندوستانی اہل قلم کو سب سے پہلے قومی و مذہبی تعصبات سے کنارہ کر لینا چاہیئے۔۔۔۔۔ ہندوستانی لٹریچر کی خوش قسمتی سے گذشتہ صدی کے دوران میں چند ایسے مصنفین گذر چکے ہیں جنھوں نے نئی زمینوں میں قلبہ رانی کر کے راستہ بتا دیا ہے جس پر چلکر دوسرے لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں یہ مصنفین اُس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستانی لٹریچر کا پانچواں اور سب سے آخری دور کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلا اور سب سے افضل نام سر سید احمد خاں (دہلی و علیگڈھ) کا ہے جنھیں مذہبی، معاشرتی، سیاسی و علمی ریفارمر کی حیثیت سے شمالی ہند کے مسلمانوں میں وہی منزلت حاصل ہے جو راجہ رام موہن رائے کو بنگال میں، بلکہ میں کہونگا کہ ہندوستان بھر کے ہندوؤں میں یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جب وہ بمشکل ۱۲-۱۳ برس کے ہوں گے اس ہندو ریفارمر کی ایک جھلک اُسوقت دیکھی تھی جب موخر الذکر بعض ملکی معاملات کی بناء پر ۱۵- نومبر ۱۸۳۰ء کو یورپ جانے سے پیشتر اکبر شاہ ثانی سے ملنے دہلی گئے تھے۔ رام موہن رائے جو ایک مسلمہ باعظمت ہندو مصلح قوم اور سنسکرت کے عالم تھے فارسی و عربی کے بھی ماہر کامل تھے اور حلقہ ہائے بغداد و نیشاپور کے نازک فن منطق وغیرہ میں اس درجہ دستگاہ رکھتے تھے کہ اُن کے مسلمان احباب جنکی تعداد بہت تھی اُنھیں "زبردست مولوی" کہا کرتے تھے۔ اُنھوں نے کئی رسالے وحدت الوجود کے اثبات میں بزبان فارسی مرتب کئے تھے جنمیں سے "تحفۃ الموحدین" بہت مشہور رہے۔ لیکن اسی سلسلہ میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہو گی کہ اُنھوں نے ان میں سے بعض رسالوں کو ہندوستانی میں بھی شایع کیا تھا۔ گویا سر سید احمد خاں کے دوش بدوش رام موہن رائے کا بھی انصافاً اُن لوگوں میں شمار ہو سکتا ہے جنھوں نے سب سے پہلے سنجیدہ مسایل پر ہندوستانی زبان میں لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا ہے۔

۹

سید احمد خاں کے رفیق اور سوانح نگار مولوی الطاف حسین حالی

کوئی معمولی نثار و شاعر نہیں - اسکی تصدیق اُن کی متعدد تصانیف سے پوری پوری ہوتی ہے - فی زمانہ وہ "علی گڈھ اسکول" کے مسلمہ سرگروہ ہیں - مولوی نذیر احمد اور مولوی شبلی کا بھی تعلق اسی گروہ سے ہے - یہ دونوں بزرگ بھی دولت آصفیہ کے نمک خوار رہ چکے ہیں - ناولسٹوں کے زمرہ میں سرشار اور شرر بہت مشہور ہیں لیکن مین اُن تصنیفات سے اتنی کم واقفیت رکھتا ہوں کہ کوئی رائے اُن کے متعلق نہیں قایم کرسکتا - لیکن سید احمد خاں کے بعد جو ہندوستانی مصنف اپنی وسیع الخیالی اور سہل و آسان طرز تحریر کے ذریعہ سب سے زیادہ میری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے وہ مولوی محمد حسین آزاد ہیں جنکی دو کتابیں آب حیات اور دربار اکبری ہندوستان میں منجملہ تمام ہندوستانی تصانیف کے نہایت متداول ہیں - کتنی تاسف خیز بات ہے کہ ایسے عالی دماغ اور روشن خیال مصنف نے اسقدر جلد اُس فرق کو اُٹھا دیا جو عقل و حواس اور مجنونیت کے درمیان حایل سمجھا جاتا ہے - اور اب اُس وقت سے ابتک اُن کے بقیہ زندگی کے ایام بالکل بیکار گذر رہے ہیں - لیکن اُسی شہر میں جہاں محمد حسین آزاد عربی و فارسی ادب کے پروفیسر تھے یعنی لاہور میں ہمارے لئے ڈاکٹر محمد اقبال پی - ایچ - ڈی ایسا نوجوان موجود ہے جو علمی شہرت کے مدارج طے کر رہا ہے جنکی مختصر لیکن شیرین نظم "ہندوستان ہمارا" تمام ہندوستان میں نہایت کیفیت انگیز چیز سمجھی جاتی ہے - مین اپنے اس مضمون کو اُسی حُبِّ وطن کے راگ کے چند اشعار نقل کرکے اس اُمید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ زمانۂ حال کے دوسرے ہندوستانی شعرا بھی انھیں کے نقش قدم پر چلنے اور اپنے اشعار میں یہی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کرینگے - ق

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا	ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہیں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں	سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا	وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اُسکی ہزاروں ندیاں	گلشن ہے جنکے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھکو	اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا	ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے	ابتک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری	صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(ترجمۂ انگریزی) **سید محمد فاروق**

مسٹر ولیم اسٹیڈ

وسط اپریل گذشتہ میں دنیا کے سب سے بڑے سب سے پر آسایش، سب سے نفیس مسافر جہاز ٹائی ٹینک کی ہولناک غرقابی کی دل کو دہلانے والی خبر ناظرین ادیب پڑھ چکے ہیں، جو اس خوفناک حادثہ کے بعد ہی موسم گرما کی آگ کی طرح مہذب دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی اور اثر پذیر طبایع میں سنسنی پیدا کی - اسلئے راقم السطور اسکا اعادہ نکریگا، جس سے طبیعت پر ناخوشگوار اثر ہوتا ہے، بلکہ اس شخص کے حالات ہدیۂ ناظرین کریگا جس کی وفات سے بنی آدم کو نقصان کثیر پہنچا ہے - جہاز مذکور الصدر میں بہت بڑے بڑے تاجر، نامی گرامی اور مشہور زمانہ مدبر اور وقایع نگار سوار تھے، جو سب کے سب

نہنگِ اجل کا لقمہ ہوئے۔ تاریخ عالم کی ورق گردانی کرتے چلے جاؤ مگر کوئی حادثہ اور کوئی واقعہ ایسا نہیں نظر آتا جس سے بنی نوع انسان کو اپنے افرادِ متعدد کے اتلاف سے اتنا نقصان کثیر برداشت کرنا پڑا ہو جتنا جہاز ٹائی ٹینک کی بربادی سے تمام دنیا کو ایک صدمۂ عظیم کا متحمل ہونا پڑا ہے۔ جنگ امریکہ و ہسپانیہ کے دوران میں یعنی ۱۸۹۸ء میں اوّل الذکر طاقت کا ایک عظیم جنگی جہاز "مین" نامعلوم اسباب سے برباد ہوا تھا۔ مگر اسکی تباہی اس عظیم الشان ساز جہاز کے سامنے جسے تیرتا ہوا محل کہنا بجا ہوگا ہیچ ہے۔ کیونکہ اُسکے ساتھ صرف ساڑھے سات سو جانیں غرق ہوئی تھیں اور اسکے ساتھ ساڑھے سولہ سو نفوس ملکِ عدم میں پہنچے۔ اس بدنصیب جہاز پر بنی آدم کے فخر، آزادی کے حامی، کمزوروں کے وکیل، راستی کے شیدا، کارہائے رفاہِ عام کی روحِ رواں، اور اخباری دنیا کے شاہِ بے تاج مسٹر ولیم اسٹیڈ، شہرۂ آفاق رسالہ "ریویو آف ریویوز" کے مقتدر بانی مبانی اور نامی گرامی ایڈیٹر بھی سوار تھے، جنکی انوکھی طرز تحریر اور آزادانہ وقایع نگاری کی برسوں سے دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دھوم تھی۔

ولیم ٹی اسٹیڈ ۵ جولائی ۱۸۴۹ء کو قصبہ امبلٹن واقعہ ضلع نارتھمبرلینڈ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار مسیحیوں کے کانگری گیشنلسٹ فرقہ کے خادم الدین تھے، جو اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ بڑے دیندار، خدا ترس، اور نیک مرد تھے۔ ولیم نے ایسے خدا پرست گھرانے میں جنم لیکر گویا خدا ترسی، زہد، اور دینداری ورثہ میں پائی۔ قاعدہ کے مطابق شروع چند سال کے دوران میں تعلیم و تربیت گھر میں والدہ کے زیر نگرانی ہوتی رہی بعد ازاں جب ذرا ہوش سنبھالا تو ویک فیلڈ کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ چند سال تک وہاں معمولی نصابی تعلیم حاصل کرتے رہے مگر والدین روپیہ پیسہ کے اعتبار سے بہت آسودہ حال نہ تھے۔ اسلئے اسکولی تعلیم کی تکمیل کے بعد یہ سلسلہ بند کرکے اپنی روٹی کی آپ فکر کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چنانچہ چودہ برس کی عمر میں شہر نیوکیسل کی ایک تجارتی کوٹھی میں ملازم ہو گئے، جو روسی قنصل خانہ بھی تھی۔ آپ اور نوجوانوں کی طرح اپنا وقت فضولیات میں ضایع نہیں کرتے تھے بلکہ دفتر سے فارغ ہوکر جب اپنے مکان میں جاتے تو بڑے بڑے مصنفوں کی مشہور تصانیف کا بڑی محنت، شوق، اور ہوشیاری سے مطالعہ کرتے تھے۔ جو کمی تحصیل علم میں بوجہ افلاس رہ گئی تھی اسکی پوری تلافی کرنے کے ہمیشہ درپے رہا کرتے تھے۔ اسی طرح آپ نے چند سال کے عرصہ میں تاریخی، ادبی، اور علمی تصنیفات پر عبور حاصل کرلیا اور خود کو اُس بڑے مقصد کے انجام دینے کے لئے تیار کیا۔ مثل مشہور ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"، ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ولیم نے اپنے لڑکپن میں آنے والی بزرگی کے کیا علامات ظاہر کئے اور فطرتِ انسانی کے اسرار کے ماہروں، بالغ نظر بزرگوں اور نکتہ رس دانشمندوں کو اپنی غیر معمولی طبعی ذکاوت اور طباعی کی بابت کیا خیال کرنے کا موقع دیا

اس زمانہ میں آپ نے اپنے فرایض کو کمال ایمانداری، جانفشانی اور انہماک کے ساتھ انجام دیا۔ جس کام کو ہاتھ لگاتے اُسے کبھی ادھورا نہ چھوڑتے بلکہ ختم کرکے دم لیتے۔ اپنا وقت لایعنی اور فضول باتوں میں نہ لگاتے تھے۔ ایک کام چھوڑتے دوسرا شروع کردیتے۔ اسے ختم کرکے کبھی اور کوئی کام کی طرف رجوع ہوجاتے۔ آپ طبیعت کے بے چین، مستقل مزاج، ثابت قدم، اور دھن کے پکے تھے۔ یہ خیال نہ کرتے کہ دنیا کیا کہے گی، بلکہ اسے ایک پاک فرض سمجھکر انجام دینے میں دل و جان سے مصروف ہوجاتے تھے۔ اس قسم کی باتیں تھیں جو آپ نے بارہ اور اٹھارہ سال کی عمر کے درمیان ظاہر کی تھیں اور جنکی بنا پر اہلِ نظر نے آپ کے شاندار اور نیکنام مستقبل سے بڑی

بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں-ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ یہی وہ ملکہ ہے، جو فطرت کی طرف سے ایسے چیدہ اشخاص کو ملتا ہے جنھیں وہ تماشا گاہِ عالم کی نہایت ضروری ایکٹری کے لئے منتخب کرتی ہے اور جس کی بدولت وہ دنیا میں عروج و اقبال اور شہرت و نام پیدا کرتے ہیں-یہی وہ زادِ راہ ہے جس پر فرزندانِ شہرت اور پسرانِ اقبال، آڑے وقتوں میں وثوقِ کلی رکھتے ہیں-جس لڑکے کے مزاج میں استقلال، ارادت میں قوت، عقل میں غیر معمولی جولانی، دل میں ایمان، اور طبیعت میں چنچلاپا ہے وہ کوئی معمولی کینڈے کا نہیں ہے- اسکی تقدیر میں شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں ایک وقیع جگہ پُر کرنا لکھا ہے-جو پختہ نظر اور فطرت کے اُتار چڑھاؤ کا واقف کار اُسوقت ولیم کو دیکھتا وہ بلا تامل انھیں تقدیر کا منظورِ نظر قرار دیتا-

جبتک کوٹھی میں رہے۔ گاہے بگاہے اپنے والد کا رفاہِ عام کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے رہے-ان کی کلیسیا کی فلاح کے لئے بہت سی مفید تجاویز وضع کرکے انھیں عملی صورت دی-اسطرح نیکنامی اور ہر دلعزیزی حاصل کی گو وہ اسکی چنداں پروا نہ کرتے تھے-اگر انھیں فکر تھی تو صرف اپنے فرض کی ادائیگی اور بندگانِ خدا کی خدمت گذاری کی-منفعتِ ذاتی اور شہرت طلبی کے بھوکے نہ تھے؛ گو بلاواسطہ یا بالواسطہ یہ بھی انسان کے نام و کام کے ساتھ شامل ہوجایا کرتی ہیں-

غیر معمولی ذہانت کے نوجوان طبیعت کے بے چین واقع ہوتے ہیں-وہ ایک ہی حالت میں دیر تک رہنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنے اردگرد کے حالات پر مطمئن نہیں رہ سکتے-انکے دماغ میں عجیب تخیلات تولد ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ایک نرالا خیالی عالم بنا لیتے ہیں اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو اس عالم کے باشندے بننے کو مجبور کرتے ہیں-ولیم اس سے مستثنیٰ نہ تھے-وہ اپنے تکیفات کو نقص سے مبرا نہ سمجھتے تھے-یعنی طبیعت میں نکتہ چینی کا مادہ بہت غیر معمولی قسم کا تھا اسلئے اصلاح کے درپے رہتے تھے-

آپنے محرری کے دوران میں اخبار "نادرن ایکو" (Northern Echo) میں جو شہر ڈارلنگٹن سے شایع ہوتا تھا، مختلف معاملات کی بابت مضامین لکھنا شروع کیا-آپ کی طرز تحریر پرمغز بلیغ اور بہت نرالی تھی-اور ڈھنگ راستی لئے ہوئے آزادانہ تھا-جس بحث پر قلم اُٹھاتے اسے بڑی قابلیت اور وسیع معلومات کے ساتھ نبھاتے-جسکی وجہ سے پڑھنے والوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر ہونے کے علاوہ انھیں خاص لطف بھی حاصل ہوتا تھا-۱۸۷۱ء میں آپ کا بائیس سال کا سن تھا کہ اخبار محولہ بالا کے ایڈیٹر مقرر ہوگئے اور ۱۸۸۰ء تک اس کام کو بڑی جانفشانی، آزادی، قابلیت، عاقبت اندیشی اور معاملہ فہمی کے ساتھ انجام دیتے رہے-مشرقی معاملات پر جب ۱۸۷۷ء میں روس و ٹرکی کے درمیان خوفناک جنگ جاری تھی مسلسل مضامین لکھے جنکی بے حد قدر ہوئی کیونکہ آپ نے ان جاندار تحریروں میں بڑا تدبر، راستبازی، اور معاملہ فہمی ظاہر کی تھی-اس کی وجہ سے مسٹر گلیڈسٹون نے جو اس زمانہ کے ایک چوٹی کے مدبر زبردست عالم، اور ایک نہایت مشہور اہل قلم تھے ان تحریروں کی تعریف میں ایک مبارکبادی خط لکھا جس میں یہ خیالات ظاہر کئے تھے:-

> میں آپ کی اعلیٰ قابلیت اور پبلک اسپرٹ (فلاح عامہ کا خیال) کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا جو آپنے اپنے مضامین میں ظاہر کی ہے-کاش! ہمارے سب وقایع نگار آپ کی طرح راستی، انصاف پسندی، اور ایمانداری کے لئے مشہور و ممتاز ہوں-

شائقین! ذرا غور کیجئے-اُسوقت ولیم اسٹیڈ بالکل جوان اور عمر میں مسٹر گلیڈسٹون کے چھوٹے لڑکے سے بھی چھوٹے تھے-باوج

اس سن وسال کے اُس نامآور مدبر، فصاحت و بلاغت کے پتلے نے جو ایک مرتبہ پہلے انگلستان کے لبرل وزیر اعظم رہ چکے تھے آپکی تحریروں کو بڑی عزت و قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا بلکہ اصل یہہ ہے کہ "بلغاری مظالم" کے بارہ میں ۱۸۷۶ء میں جو مضامین ولیم اسٹیڈ نے لکھے تھے انھوں نے مسٹر گلیڈسٹون کو عزلت نشینی چھوڑکر میدان میں آنے کی تحریک کی، اور انھوں نے اسکے خلاف اپنی آگ لگانے والی فصاحت سے جہاد شروع کیا تھا - بات کیا تھی ؟ اسٹیڈ کے قلم میں ایک خاص آزادانہ روانی تھی جیسا مشہور عالم نقاد مصنف اور شاعر میتھیو آرنلڈ (Matthew Arnold) نے ایکدفعہ کہا تھا "اسٹیڈ نے بالکل نئی قسم کی وقایع نگاری وضع کی ہے"۔ اور اسمیں انوکھا پن کیا تھا ؟ اسٹیڈ عوام کے میلان طبع کو دیکھا کرتے تھے، بلکہ اسکا خاص مشاہدہ کیا کرتے تھے : اور پھر اسکے مطابق چلتے تھے۔ ایک خاص گروہ کے مذاق کی اعانت روا نہ رکھتے تھے بلکہ سب قسم کے لوگوں کے ذوق کا لحاظ کیا جاتا تھا - اہل فکر کے شوق کے سامان بہم پہنچانا اخبار نویس کا نہیں بلکہ فلاسفروں اور حکیموں کا کام ہے عوام کی رائے کی رہنمائی کرکے انکی قوت کو راستی اور انصاف کی راہ پر ڈالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے - تاہم اس اہم کام کی انجامدہی کا سہرا ولیم اسٹیڈ ہی کے سر بہ اتفاق رائے سے باندھا گیا ہے -

ہم نے بیان کیا کہ "نادرن ایکو" کی ایڈیٹری کے زمانہ میں جو مضامین آپ نے مختلف معاملات پر لکھے تھے انھیں دور و نزدیک بہت ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہوئی - اور آپ کی نیکنامی بحیثیت آزاد نویس ایڈیٹر بہت بڑھ گئی - اہل نظر آپ کی اعلیٰ لیاقت اور تحریر کی جدت و قوت کے قائل ہوگئے، اور آپ کو بڑی عزت و وقعت سے دیکھنے لگے - ۱۸۸۰ء میں مسٹر جان مارلے جو اسوقت مشہور رسالہ "فورٹ نائٹلی ریویو" کے ایڈیٹر تھے، "پال مال گزٹ" کے بھی ایڈیٹر مقرر ہوئے وہ آپ کو لندن لے گئے اور اُس مشہور لبرل آرگن کی ایڈیٹری کیلئے آپ کو اپنا معاون و مددگار بنایا - لندن جانے سے آپ کا ستارہ چمکا - لندن اخباری دنیا کا مرکز، علمی چرچوں کا گھر، پولیٹکل جھمیلوں کا اکھاڑا، اور نامیوں کا مرجع و مسکن تھا اور اب بھی پال مال گزٹ ایک بہت وقیع و با اثر اخبار ہے - اسکی وجہ سے اسٹیڈ کو بڑے بڑے مدبروں، عالموں، سفرائے دول خارجہ اور ہر فن کے اہل کمال سے تعارف اور دوستی قایم کرنیکا ایک نہایت مفید موقع مل گیا - آپ کی زندگی کا شاید یہ سب سے بڑا واقعہ ہے - کیونکہ ایک چھوٹے مفصلی شہر کے بجائے لندن آپکے آنے والے زمانہ کی مصروفیتوں کا مرجع بنگیا جہاں آپ اپنے مرنے سے ایک ہفتہ پیشتر تک رہے - وہاں آپ نے سیکڑوں مفید تجاویز وضع کیں اور ہزاروں معاملات کو طے کیا، بیسیوں انقلابات سے دوچار ہوئے - اسی شہر سے آپ کی شہرت کی شعاعیں مہذب دنیا کے انتہائی گوشوں تک پہنچیں - اسی جگہ قیام اختیار کرکے رسالہ ریویو آف ریویوز جاری کیا جو ہر قسم کی دلچسپیوں کا مخزن اور بنی نوع انسان کی فلاح و آزادی کا وکیل ہے -

ماتحت کی حیثیت سے زیادہ تو کچھ نہ کرسکے مگر اپنی آزاد نویسی اور پر مذاق تحریروں سے پہلے سے زیادہ شہرت پائی لیکن جب ۱۸۸۳ء میں جان مارلے (جو اب لارڈ مارلے آف بلیک برن ہیں) اس سے علیحدہ ہوکر پارلیمنٹ میں داخل ہوتے ہی آئرلینڈ کے چیف سکرٹری مقرر ہوئے تو ایڈیٹری کی تمام ذمہ داریوں کا بوجھ آپ کے کندھوں پر آپڑا - اور اصل یہ ہے کہ جس جس قابلیت کے ساتھ آپنے اس نازک فرض کی انجامدہی سے سُرخ روئی حاصل کی، وہ بےمثل ہے - آپ اسکی پالسی کی ۱۸۸۹ء تک ہدایت کرتے رہے، اور اس اثنا میں کئی وقایع نگاری کمال حاصل کئے، جنپر ہر ایک سچا آزاد طبع،

اور رفاہ عام کا خیر خواہ فخر و ناز کر سکتا ہے۔ آپ نے ایڈیٹری کا
بیڑا اُٹھاتے ہی "انٹرویو" (مکالمہ) کا قاعدہ جاری کیا اس سے
پیشتر اس سے کوئی واقف نہ تھا۔ آپ مشہور آدمیوں سے جا کر
ملاقات کرتے اور معاملات عامہ پر ان کی رائے لیتے اور پھر اُسے
اخبار میں شایع کرتے، اس سے پڑھنے والوں کو اور نیز ملکی مدبروں کو بیحد
فائدہ ہوتا۔ بلکہ بعض دفعہ اہم ضروری معاملات کا رُخ پلٹ گیا۔
مثلاً سوڈان میں شورش مہدی سے ۱۸۸۳ء میں پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں
اور گورنمنٹ حیران تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ تو آپ ساؤتھمپٹن
میں جنرل گارڈن سے ملے اور معاملات سوڈان کی بابت ان کی
رائے لیکر شایع کی جس سے گورنمنٹ نے انھیں مہم خرطوم کا کمان افسر
مقرر کرکے ۱۸۸۴ء میں ادھر بھیجا (جنرل موصوف پہلے وہاں کے گورنر
رہ چکے تھے) الغرض "انٹرویو" (Interview) کے آپ موجد،
اُستاد یکتا، اور خاتم تھے جس سے آپ نے اپنی قوم کو براہ راست
اور دنیا کو بالواسطہ بہت فائدہ پہنچایا۔

اسٹیڈ کی نام آوری اور شہرت کی ایک بڑی وجہ ان کی
طرفداری اصلاح بھی تھی۔ سوشل، پولیٹیکل، تعلیمی، دینی وغیرہ ہر قسم کی
قباحتوں کے استیصال کے بیحد طرفدار تھے۔ وہ بڑے نیک نیت
تھے اور ہر ایک کام نیک نیتی سے کیا کرتے تھے۔ جہاں کوئی خرابی
نظر آتی جھٹ اسکی بیخ کنی پر قدمے سخنے آمادہ ہو گئے اور جبتک
اسکا عملی اثر پیدا ہوتا برابر اسکے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے رہتے۔
جس زمانہ میں آپ "پال مال گزٹ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے بحری
سپاہ کی بہت بری حالت تھی۔ آپ نے اسے ایک قومی فرض سمجھا پر
کئی مسلسل مضامین لکھے اور ایک رسالہ بہ عنوان "بحری سپاہ کا کچا چٹھا"
لکھا جس سے گورنمنٹ کو اسکی طرف مائل کیا اور اُسنے اس میں ضروری
رد و بدل شروع کر دئے جنکی تکمیل بالآخر ۱۸۸۹ء کے نیول ایکٹ یعنی
قانون سپاہ بحری کے نفاذ میں ہوئی۔ پھر آپ نے بعض سوشل خرابیوں
کی طرف عنان توجہ پھیری اور ایک رسالہ "بابل جدید کا خراج دوشیزگان"
شایع کیا جس سے سنسنی پیدا ہو گئی۔ لندن کے بعض بدمعاش نوعمر
بھولی بھالی لڑکیوں کو ورغلا کر گھر سے لیجاتے اور برآن، پیرس
اٹلی وغیرہ میں لیجا کر رنڈیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ یہ مذموم
کام ایک وسیع پیمانہ پر ہوتا تھا۔ بدمعاشوں نے یورپ کے تمام
بڑے بڑے شہروں میں اپنی خفیہ ایجنسیاں کھول رکھی تھیں۔ روس سے
لڑکیوں کو ورغلا کر فرانس اور فرانس سے انگلستان وغیرہ لیجاتے اور
فاحشہ عورتوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ آپ نے اس خوفناک
سوداگری کو موقوف کرنے کے لئے دل و جان سے کوشش کی مضمون
پر مضمون لکھکر خیر خواہان قوم و ملک کو اس طرف متوجہ کیا۔ آپنے
تجربتہً ایک لڑکی کو لندن سے پیرس کو بھگانے میں مدد دی، اور پھر
اسے واپس لندن بلوایا اور اس طرح بدمعاشوں کی بدمعاشی کی قلعی
کھولی گو آپنے نیک نیتی سے بدمعاشوں کے ہتھکنڈوں کو افشا کرنے
کے لئے یہ کام کیا تھا مگر خلافِ قانون فعل تھا۔ جس سے آپ کو تین ماہ
کی قید بھگتنا پڑی۔ مگر آپ کا مقصد پورا ہوا۔ گورنمنٹ نے قانون
فوجداری میں ترمیم کی جس سے تجارت شنیع کا راستہ بہت کچھ مسدود ہوگیا
۱۸۸۶ء میں آئرلینڈ کو حکومت اختیاری دلانے کی حمایت
میں معرکتہ الآرا مضامین لکھے جنکا بہت اچھا اثر ہوا گو مقصد پورا نہوا۔
۱۸۸۸ء میں آپ روس گئے اور وہاں کے حالات لکھکر یورپ کو
روسی حکام کی بدعنوانیوں سے واضح کیا جس سے اس ملک کی حکومت میں
کچھ اصلاح ہوئی۔ ۱۸۸۹ء میں روم گئے اور تقدس مآب حضرت پوپ
کا نیاز حاصل کرکے وہاں کے حالات شایع کئے۔

اوپر بیان ہوا کہ ولیم اسٹیڈ کو تین ماہ کی قید بھگتنا پڑی
تھی، جس کی بڑی وجہ انکا جوش اصلاح تھا۔ چنانچہ اس سے آپ

پال مال گزٹ" کی ایڈیٹری سے محروم ہوگئے - اور ایکماہ بعد یعنی جنوری ۱۸۹۰ء میں اپنے خیرخواہوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد اپنا مشہور رسالہ "ریویو آف ریویوز" جاری کیا! اسوقت آپ کو اخبار نویسی کرتے ہوئے بیس سال گزرگئے تھے - پہلا پرچہ انگلستان اور دیگر ممالک کے بڑے بڑے عالموں، مدبروں، اہل قلم، اور روسا وشرفا کے پاس بھیجا - ان سب نے مبارکبادی خطوط لکھے اور رسالہ کی کامیابی کے لئے دعا رخیر کی - ان میں اس وقت کے پرنس آف ویلز ملک معظم ایڈورڈ ہفتم مرحوم، ملکہ وکٹوریہ مرحومہ، مسٹر گلیڈسٹون، لارڈ سالسبری، روزبری، ڈیوک آف ڈیون شائر، وغیرہ تھے - آپنے سب خطوط جمع کرکے مع فوٹو ایک کتاب میں شایع کردئے - یہ رسالہ حسب ذیل مقاصد سے جاری کیا گیا تھا:-

(۱) بین الاقوام اخوت، جسکی بنیاد انصاف پرستی اور قومی آزادی پر ہو - امریکہ کے ساتھ خاص رشتہ ہو اور برطانی نوآبادیوں کا انگلستان کے ساتھ گہرا رابطہ رہے - محکوم اقوام اور ممالک محروسہ کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ ہو - بین الاقوام تنازعات کا تصفیہ ایک بین الاقوام پنچائت کے ذریعہ سے ہو -

(۲) مذاہب کا اتحاد - قوانین ربانی کی جو عالم موجودات اور ارواح میں جاری ہیں، تحقیقات کی جائے، اور جو لوگ محبت کی خدمت میں دکھ اٹھانے کو تیار ہوں وہ سب ملکر ایک ہوجائیں اور یہی اتحاد حقیقی ہے -

(۳) عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق ملنے چاہئیں -

(۴) جمہور کی حالت سنواری جائے - "اپنے کو ان کی جگہہ تصور کرکے ان کی ضروریات اور مصائب کا اندازہ ہوسکتا ہے"

(۵) عوام کی زندگی کو خوش حال بنایا جائے اور انھیں نیک کاموں کی تحریک کی جائے جس کے لئے کتب خانے، تربیت جسمانی، تفریح، موسیقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں -

رسالہ "ریویو آف ریویوز" کے ذریعہ سے اسٹیڈ صاحب نے صرف سلطنت برطانیہ ہی کی خدمات حسنہ انجام نہ دیں - بلکہ ہندوستان، ترکی، بوئران، اور روس کو بھی بہت فائدہ پہنچایا - ۱۸۹۸ء میں آنجناب موجودہ شہنشاہ روس کی بارگاہ میں شرف حاصل کیا اور اسکا انجام یہ ہوا کہ زار نے دول عالم کی تجاویز سوچنے کے متعلق ایک گشتی اعلان بھیجا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۹ء میں ہیگ کی اول کانفرنس برائے قیام امن "معرض وجود میں آئی - اب جو مستقل پنچائت امن عالم کے لئے قایم ہے اسکے لئے اسٹیڈ ہی کو تحسین و آفریں دی جاتی ہے - قیصر جرمنی سے بھی ملاقات حاصل کرنے کا فخر حاصل کیا اور ۱۹۰۵ء میں زار روس نے آپ کو طلب فرمایا اور پارلیمنٹ کھولنے کے لئے صلاح مشورہ طلب کیا - یہ قدردانی لاثانی ہے جو پہلے کسی اخبار نویس کو حاصل نہیں ہوئی - شاید آگے کو بھی نہ ملے - ترکی میں آئینی حکومت قایم ہونے کے بعد آپ وہاں گئے اور موجودہ سلطان کا نیاز حاصل کیا - اسکے بعد ہی آپ ترکوں کے بڑے طرفدار بنگئے اور یہ جوش حمایت اتنا بڑھا کہ جب ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر غاصبانہ حملہ کیا تو آپ نے جوانان ترکی کو وفد لیکر دول یورپ کے پاس وادخواہی کے لئے جانے کی تحریک کی اور اس تحریک میں بڑا حصہ لیا - جب ۱۸۹۹ء میں جنوبی[۱] افریقہ کی ڈچ جمہوریوں سے انگلستان کی جنگ چھڑی تو آپ نے سخت مخالفت کی بلکہ مخالفت جنون کے درجہ تک پہنچ جانیکے باعث آپ کے رسالہ کے خریدار اور پرانے ہمدرد فرنٹ ہوگئے اور حامیان جنگ نے آپ کو غدار ملک قرار دیا - گو بہت نقصان اٹھایا اور اپنی شہرت کو جوکھوں میں ڈالا مگر آخرکار آپ کی مساعی حسنہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

[۱] اسٹیڈ کی پابندی اصول اور آزاد منشی کا ایک بہت قوی ثبوت یہ ہے کہ سیسل روڈس نے اپنی وصیت آپ کے صلاح مشورہ سے بنائی اور دس لاکھ پونڈ علیحدہ کئے اور اسٹیڈ کو [illegible]

مسٹر ولیم-ٹی- اسٹیڈ مرحوم

انڈین پریس الہ آباد

بالفور صاحب کی گورنمنٹ نے بوئروں سے باعزت صلح کر لی۔

جنوری ۱۹۱۱ء کو "ریویو آف ریویوز" کے اجرا کی اکیسویں سالگرہ منائی گئی گویا وہ انگریزی قانون کے مطابق بالغ ہوا۔ بڑے بڑے رئیسوں، مدبروں، عالموں اور مشہور آدمیوں نے مبارکباد کے خطوط لکھے اور تار بھیجے۔ ملکہ معظمہ الگزنڈرا نے ایک خاص تار برقی بھیجکر اظہار خوشنودی فرمایا اور دعائے خیر دی۔ مسٹر اسٹیڈ نے اس موقع پر اپنی چالیس سالہ اخباری زندگی اور اکیس سال کی وقایع نگاری کی نظر ثانی کی اور اُن مقاصد کی تکمیل پر اطمینان ظاہر کیا جنکو ملحوظ رکھکر رسالہ جاری کیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ جنوری ۱۹۱۱ء کے پرچہ میں یوں لکھتے ہیں۔

جب سے رسالہ ہذا جاری ہوا ہے مین برابر اسے چلاتا رہا صرف ۹۳-۱۸۹۴ء میں چند ماہ تک بوجہ علالت جنوبی افریقہ اور شکاگو کو چلا گیا تھا۔ اور اس اثنا میں میرے بھائی اور میرا بیٹا اسے چلاتے رہے۔ مین اپنی چالیس سالہ اخباری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہ لوگ نظر نہیں آتے جنکے اعمال اور الفاظ کی مین نے ۱۸۷۱ء میں تنقید کی تھی۔ بادشاہوں میں صرف شہنشاہ آسٹریا، وقایع نگاروں میں سرایڈورڈ رسل صاحب لورپول میں، اور لارڈ مارلے بحیثیت وزیر حیات ہیں۔ اکسٹھ سال کی عمر میں آج مین اپنے کو تن تنہا پاتا ہوں۔ میرے سب آشنا رخصت ہو گئے ہیں۔ اس سے بہت رنج ہوتا ہے۔ مگر تاہم یہ امر موجب مسرت ہے، کہ گو باقی سب مر کھپ گئے مگر مین تو جیتا جاگتا موجود ہوں۔ گو چالیس سال سے یہ جانکاہ کام کرتا ہوں مگر اپنے کو ویسا ہی مستعد اور جوان ہمت پاتا ہوں۔ جو جوش و خروش شروع میں تھا وہ اب بھی موجود ہے۔ نئی نئی باتوں کی ٹوہ میں رہتا ہوں۔ اشتیاق تجسس پہلے سے دو چند ہے خدا پر ایمان بہت مستحکم ہو گیا ہے۔ تجربہ سے مین عورت کی نیکی اور پاکیزگی کا قایل ہو گیا ہوں۔ چالیس سال میں جو بھلائی مجھ سے ہوئی مین اسپر شکر آمیز طمانیت ظاہر کر سکتا ہوں میرے اصول طرز عمل یہ ہیں ایمانداری سب سے اچھی شے ہے۔ اپنے کو اوروں کی جگہ رکھکر دیکھو کہ وہ کیا سمجھتے ہیں۔ دوسروں سے ایسا برتاؤ کرو جیسے تم چاہتے ہو۔ کہ وہ تمھارے ساتھ کریں۔ اس پر کاربند ہونے سے مین بہت سی ٹھوکروں سے بچا ہوں۔ مین نے اپنے کاروبار میں خدا اور اسکی حضوری کو مدنظر رکھا۔ اور یہ خیال کرتا رہا کہ ہم اُس کے ادنیٰ بندے ہیں۔ اس سے مین بہت سی آزمائشوں سے بچا ہوں۔ جن مقاصد سے رسالہ جاری کیا تھا وہ برابر ملحوظ ہے ...... حب وطن کی وجہ سے جنگ بوئران کی سخت مخالفت کیگئی تھی۔ انگریزی بولنے والی اقوام کے اتحاد کو مستحکم کیا اور ایک عظیم بین الاقوام سلطنت کے لئے سعی کی۔ جسکے معرض وجود میں آنے کا امکان ہے۔

ہیگ کانفرنس پر مسٹر اسٹیڈ کو بہت فخر تھا جسے وہ دنیا کی پارلیمنٹ کا مصدر تصور کرتے تھے۔ ۱۸۹۹ء میں اس کے لئے مشہور امریکن مخیر کروڑپتی کارینگی کو ڈیڑھ کروڑ روپیہ دینے کی تحریک کی تھی۔ انھوں نے تین کروڑ دیا۔ جنگ بوئران کی مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آج جنرل بوتھا جنوبی افریقہ کی تمام ریاستوں کے وزیر اعظم ہیں۔ اسوقت انگریز آپ کو غدار ٹھہراتے تھے مگر اب آپ کے ہمخیال ہیں۔ برطانیہ اور صوبجات متحدہ امریکہ کے درمیان پینی ٹکٹ جاری کرانے میں بہت مدد دی اور سیسل روڈس کے یادگاری وظائف کی امریکہ تک توسیع ہوئی۔ اس طرح اتحاد کا کام ہوا۔ وینزویلا کے معاملہ پر ۱۸۸۶ء میں امریکہ اور برطانیہ کی جنگ ہو جاتی مگر اسٹیڈ صاحب کی عقلمندی اور مستعدی وہاں بھی آڑے آئی۔ روس سے دوستانہ قایم کرنے پر آپ ہی نے زور دیا تھا۔ پھر جرمنی سے دوستی پیدا کرنے کی

تحریک کی۔ وہاں کے ایڈیٹر انگلستان میں اسٹیڈ ہی کی تجویز سے بلائے گئے تھے۔ بین الاقوام مہمان نوازی کے لئے ایک فنڈ کھلوایا جسکا صرفہ گورنمنٹ نے دینا منظور کیا۔ اہل ہند کی نیک خواہشوں کی پوری تائید کرتے رہے۔ جتنے جابرانہ قانون جاری ہوئے انکی آپ نے سختی سے مخالفت کی اور ہر طرح اہل ہند کے ہمدرد و حامی رہے۔ دو سال پیشتر آپ کانگریس کے موقع پر آنے کو تھے مگر بوجوہ چند در چند رُک گئے تو بھی وہ اس ملک کے معاملات میں گہری دلچسپی ظاہر کرتے رہے، جسکی وجہ سے اس ملک کو آپ کی وفات سے ایک سخت صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

انگلستان میں بڑی اصلاحات کو ریویو آف ریویوز کے مضامین سے بہت گہرا تعلق ہے اور مسٹر اسٹیڈ تحسین و آفریں کے مستحق ہیں۔ عورتوں کے حقوق کی حمایت، غربا کے قوانین کی ترمیم، بڈھوں کی پنشنوں کا تصفیہ، دار الامرا کے اختیارات کی تجدید وغیرہ کام آپ ہی کی کوششوں کے طفیل ہوئے۔

ولیم اسٹیڈ نہایت زبردست شخص اور عجیب و غریب آزاد نویس تھے۔ وقایع نگاری کے کارناموں نے آپ کی شہرت کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیا۔ وہ کمزور و مظلوم اقوام کے بڑے حامی و وکیل تھے جسکی وجہ سے ہر ملک میں آپ کی بڑی عزت و حرمت ہوتی تھی۔ جب جہاز ٹائی ٹینک کے ساتھ آپ کے غرق ہونے کی خبر مشتہر ہوئی تو تمام مہذب دنیا نے اظہار حسرت و ملال کیا۔ آپ کی خدمات حسنہ پر لمبے لمبے تعریفی مضامین شایع کئے۔ آپ کے اوصاف حمیدہ اور صفات ستودہ کو نہایت موزوں الفاظ میں سراہا گیا۔ ہندوستان میں سخت صدمہ محسوس ہوا۔ اتنا جہاز کی بربادی کا رنج نہیں ہوا، جتنا آپ کے ناگہانی انتقال سے افسوس ہوا۔ اور کیوں نہوتا؛ وہ اہل ہند کے خاص دوست اور انکی تمناؤں کے بڑے حامی تھے اور انھیں حکومت اختیاری عطا کرنے کے بڑے طرفدار تھے۔ سب سے پہلے لاہور کے اخبار نویسوں نے ایک جلسہ میں اظہار تاسف کا ریزولیوشن پاس کیا۔ پھر کلکتہ کے ایڈیٹروں نے اسٹیڈ کی بیوقت مرگ پر رنج و افسوس کا اظہار کیا۔

ولیم اسٹیڈ گوناگوں خوبیوں اور لیاقتوں کے آدمی تھے۔ اسوجہ سے انکی ذہنی دلچسپیاں اور اخلاقی وابستگیاں بھی مختلف النوع تھیں۔ آپ بڑے نیک دل، خدا ترس، ہمدرد بنی آدم، ضمیر پرست، مخیر اور فیاض طبع تھے۔ کوئی نیک کام نہ تھا جسکی حمایت جوش و خروش سے نکرتے۔ کوئی مفید عام تحریک نہ تھی جو آپ کی ہمدردی و مستعدی حاصل کئے بغیر رہ سکتی۔ آپ میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ چند منٹ میں متکلم کے دل پر اپنا پورا اعتبار بٹھا لیتے اور اس کا اعتماد حاصل کر لیتے۔ اس وجہ سے ہر قسم کے سیکڑوں آدمی آپ کے پاس امداد کے لئے آتے۔ ان نوجوانوں کے بڑے مربی تھے جو اخبار نویس بننے کے خواہشمند تھے۔ سیکڑوں کو فیض پہنچایا۔ مجلس وزرا کے اراکین بالانفراد آپ سے تخلیہ میں ضروری معاملات میں مشورہ لیتے۔ مصیبت زدہ عورتیں صلاح و مشورہ کے لئے جایا کرتی تھیں۔ الغرض آپ کے دفتر میں دن بھر لوگ آتے جاتے رہتے۔ آپ نے خفیہ طور پر سیکڑوں کو مشکلوں سے نکالا اور بیسیوں شرارتوں کو طشت از بام ہونے سے پہلے رفت گذشت کر دیا۔

امیر البحر لارڈ فشر مئی کے ریویو آف ریویوز کے یادگاری نمبر میں لکھتے ہیں۔ "مسٹر اسٹیڈ ایک چند فٹ انسان کی صورت میں ڈریڈ ناٹ (ہولناک) جنگی جہاز تھے۔" لارڈ ملز لکھتے ہیں سنہ ۱۸۸۰ء کے بعد انگلستان میں بعض اہم ملکی معاملات معرض بحث میں آئے اور قوم کو فیض پہنچانیکے باعث ہوئے ان سے مسٹر اسٹیڈ کا خاص واسطہ تھا۔ گورنمنٹ کی بحری پالیسی کو آپ ہی نے موجودہ صورت دلائی۔

دول خارجہ کے مجموعی بیڑوں سے دُگنے جہاز بنانے کا خیال آپ
ہی کی اختراع تھی - مسٹر اسٹیڈ روحانیات کے قائل تھے اور اسکی
حمایت کے لئے ایک رسالہ بورڈر لینڈ جاری کیا تھا اور مُردوں
کی روحوں سے گفتگو کرنے کے لئے ایک دفتر لندن میں کھول رکھا
تھا۔ سنہ ۱۹۰۹ء کے معرکۃ الآرا بجٹ کے موقع پر آپ نے گلیڈسٹون،
بیکنسفیلڈ، چرچل، برائٹ، سالسبری وغیرہ مشہور و معروف مدبروں
کی روحوں سے اسکی بابت گفتگو کی اور اسے اخبار میں شایع کیا۔
یہ قاریخ نگاری کی نہایت نرالی ترتیج تھی جو اور اخبار نویسوں کی شہرت
کی بربادی کا باعث ہوئی - وہ مشرق و مغرب کے درمیان مساوات
کا میل جول دیکھنے کے خواہشمند تھے - جو لوگ ان سے ملنے کو گئے وہ
ان کے حسن اخلاق کی تعریف کرتے کرتے نہیں تھکتے - الغرض
کہانتک اسٹیڈ کی خوبیوں اور وقایع نگاری کے کارناموں کو بیان
کیا جائے - ہم اور بہت کچھ لکھنے کے خواہاں تھے مگر بخوف طوالت
اس ارادہ سے دست بردار ہونا پڑا - اب آپکا نامور رسالہ
آپ کے بھائی کے زیر اہتمام نکلے گا، گو وہ اُن دلچسپیوں سے محروم
ہوگیا ہو جو آپ کی ذات خاص سے مخصوص تھیں -

> بڑے بڑے آدمیوں کے سوانحی حالات پڑھنے سے
> ہمارے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے، کہ ہم بھی اپنے کو ان کی
> مانند بنائیں - (لارڈ میکالے)

جے - آر - رائے

پرتاپ چندر موزمدار

ہندوستانیوں میں ایک بہت بڑے آدمی کا انتقال
ہوگیا۔ یہ الفاظ تھے جو ۲ - مئی سنہ ۱۹۰۵ء کو بابو پرتاپ چندر موزمدار
کی وفات کے متعلق ایک قابل مضمون نگار نے لکھے - حقیقت یہ
ہے کہ ان کی موت کے ساتھ ہی برہمو تحریک کے بڑے لیڈروں
کا سلسلہ ختم ہوگیا - اس میں کلام نہیں کہ اس وقت بھی برہمو سماج
کے دائرہ میں بڑے بڑے قابل اور لایق آدمی موجود ہیں تاہم
باوصف ان سب خوبیوں کے جو ان کے اندر پائی جاتی ہیں وہ بابو
پرتاپ چندر کا مقابلہ نہیں کر سکتے - یا یہ بات ہے کہ ان قابلیتوں
کا جو ان کے اندر موجود ہیں ابھی تک کامل طور پر اظہار نہیں ہوا -
مسٹر موزمدار نہ صرف اُس مختصر جماعت سے تعلق رکھتے
تھے جو انھیں اپنا لیڈر تصور کرتی تھی بلکہ ان کا تعلق حقیقت میں
سارے ملک اور ایک خاص معنوں میں ساری دنیا سے تھا - انکی
ہمدردی نہایت وسیع اور ان کا علمی اور مشنری اثر بہت دور تک
پہنچنے والا تھا - ان کی بعض نہایت اہم کتابیں امریکہ میں شایع
ہوئیں اور وہیں انھوں نے بعض معرکہ کی تقریریں کی ہیں - جس قدر
ان کے مداح اور معترف ان کے وطن میں پائے جاتے ہیں ان سے
زیادہ نہیں تو اتنے ہی انگلستان اور امریکہ میں موجود ہیں - ان کی
تحریریں ہرچند کہ (مجبورًا) برہمو سماج کے نقطہ خیال سے لکھی گئیں
تاہم اثری اور نظری اعتبار سے وہ اس قدر وسیع ہیں کہ حد درجہ کا
اختلاف رائے رکھنے والے لوگ انھیں یکساں فائدہ کے ساتھ پڑھ
سکتے ہیں - سوائے دو مختصر بنگالی رسالوں کے ان کی تمام تحریریں بڑی
شاندار انگریزی میں ہیں اور ان معنوی خوبیوں کے علاوہ جو ان میں
محفوظ ہیں ان کی علمی چاشنی ایک خاص لطف رکھتی ہے - بنی نوع
انسان کے ایک ایسے ہوا خواہ کے حالات زندگی اور اس کی

تعلیم کے متعلق کم و بیش واقفیت حاصل کرنے کی یقیناً ہر شخص کو خواہش ہو گی اور اس اعتبار سے اس جگہ اسکا مختصر طور پر ذکر کرنا بے محل نہو گا جیسا کہ اکثر علمی اور مذہبی مذاق کے لوگوں کی حالت میں دیکھا جاتا ہے بابو پرتاپ چندر کی زندگی میں کوئی اہم اور خاص طور پر قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا - نہ ان کے حالات کسی خود نوشت یا غیر نوشت سوانح عمری میں مذکور ہیں - اس مضمون میں ان سوانحی حالات سے بہت کچھ مدد حاصل کی گئی ہے جو ان کی کتاب Heart-beats کے دیباچہ میں درج ہیں - یہ دیباچہ پادری ایس - جی - بیروز نے لکھا تھا جو شکاگو کی مذاہب عالم کی پارلیمنٹ کے پریسیڈنٹ اور ان کے مداحوں میں سے ایک ہیں -

بابو پرتاپ چندر موزمدار بنگال کے ایک معزز وید خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بابو کیشب چندر سین مشہور مصلح بنگال سے بھی ان کا بعید کا رشتہ تھا - سین اور موزمدار خاندانوں کا آبائی وطن موضع گریفہ ہے جو کلکتہ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے - لیکن بابو پرتاپ چندر اپنے ماموں کے گھر موضع بانس بیریا میں جو کلکتہ سے ۴۰ میل شمال کی جانب واقع ہے پیدا ہوئے تھے - وہ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بوقت مرگ انکی عمر ۶۵ سال کی تھی - مسٹر بیروز نے مسٹر موزمدار کے بچپن کے جو مختصر سے حالات لکھے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ پرتاپ بابو کے والد ہرچند کہ ایک بہت قابل آدمی تھے تاہم زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے - ان کی عمر ابھی نو ہی سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی بیوہ ماں کو ان کی پرورش کرنا پڑی - مسٹر موزمدار کے دل میں اپنی ماں کی بہت بڑی عزت تھی - ایک موقعہ پر وہ اس کی تعریف میں لکھتے ہیں -

وہ ایک خوبصورت، جوان، ذہین، سمجھ دار، اور ملکہ نما عورت تھی - اس زمانہ کی عورتوں کی طرح وہ بھی غیر تعلیم یافتہ تھی - البتہ تربیت اسے اعلیٰ درجہ کی حاصل تھی - پچیس سال کی عمر میں وہ بیوہ ہو گئی اور اس کے بعد مجھ سے اس طرح محبت کرتی رہی جیسے کوئی غمزدہ بیوہ عورت اپنے بڑھتے ہوئے بچہ سے کر سکتی ہے -

اسی طرح بہت کچھ لکھنے کے بعد بابو پرتاپ چندر موزمدار نے اپنی والدہ محترمہ کے آخری وقت کا ذکر کیا ہے - یہ حالات نہایت درد انگیز اور موثر ہیں نیز ان سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کیونکر مسٹر موزمدار رات کو ادھر ادھر مارے مارے پھرے اور انھیں ڈاکٹری امداد کہیں سے نہ مل سکی - چنانچہ وہ فرماتے ہیں :-

وہ اکثر حد سے زیادہ کام کر کے اپنے آپ کو تھکا لیا کرتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے موت کے سوائے اور کسی چیز کی خواہش نہیں - آخر کار اسکی موت کا دن آ گیا - جولائی ۱۸۵۸ء میں اس کے پندرہ روزہ برت کا دن تھا - میں کیشب بابو کے گھر سے ذرا دیر کر کے لوٹا جب مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے اور اس کے معدہ میں کچھ تکلیف ہے - چونکہ اس قسم کی شکایت اسے اکثر رہا کرتی تھی اس لئے میں نے اسے ایک معمولی بات سمجھا اور سو رہا - رات کا ایک بجا ہو گا کہ مجھے جگایا گیا اور معلوم ہوا کہ اس کی تکلیف بڑھ گئی ہے - جب میں اس کی چارپائی کے قریب پہنچا تو اس کی زبان بند ہو چکی تھی - کانوں سے کچھ سنائی نہ دیتا تھا اور رنگت زرد ہو رہی تھی - درحقیقت اسے بدترین قسم کا ہیضہ ہو گیا تھا - میرے چچا کے سوائے جو ہمارے خاندان کا کرتا تھا باقی سب لوگ جاگ اٹھے تھے - لیکن معلوم ہوتا تھا کسی کو ڈاکٹر کے بلانے کی پروا نہیں - بظاہر ہر شخص اس کی موت کے لئے آمادہ تھا - میری مصیبت اور حیرانگی کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے - میں اپنے چچا کے کمرہ کی طرف دوڑا گیا لیکن مجھے اندر داخل ہونے سے

روکدیا گیا۔ کسی نوکر تک کو اس بات کی پروا نہ تھی کہ جا کر ڈاکٹر کو بُلا لائے۔ میں بحالتِ یاس دیوانہ وار بازار میں نکلا اور کیشب اور دیگر دوستوں کو جگانے کی کوشش کی۔ لیکن رات زیادہ گذر چکی تھی اس لئے ہر گھر کا دروازہ بند نظر آیا۔ پاس ہی ایک ڈاکٹر کا مکان تھا۔ میں اس طرف کو دوڑا گیا لیکن نوکر نے مجھے وہاں سے بھی نکال دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا میں کتنے گھروں میں جا کر اپنی ماں کے لئے امداد کا طلبگار رہا لیکن بہر نوع مجھے کہیں سے بھی ڈاکٹری مدد نہ مل سکی۔ جب میں گھر واپس آیا تو پو پھٹ چکی تھی اور میری والدہ بے ہوش اور جاں بلب تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا گویا وہ خود سمجھتی تھی کہ اب بچنے کی کوئی امید نہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ دن کے آٹھ بجے تھے کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ۱۹ سال کی عمر میں میں یتیم رہ گیا۔ اب اگر میں دنیا کی سخت دلی اور سنگدلی پر افسوس کرتا تو بیفائدہ تھا۔ اگر اس سلوک پر جو بیکس ہندو بیواؤں سے روا رکھا جاتا ہے نفریں کہتا تو لاحاصل تھا۔ میرے رشتہ داروں کے نزدیک وہ ایک معمولی بیوہ تھی مگر میرے لئے وہ عزیز ماں، واحد محافظ، اور سارے عالم میں تنہا مونس تھی۔

پاٹ شالا اور مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوجوان موزمدار پریسیڈنسی کالج میں داخل ہوئے۔ اس جگہ وہ عرصہ دو سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے اور اس اثنا میں ریاضی کے علاوہ انھوں نے ہر ایک شعبہ میں ترقی حاصل کی۔ مسٹر موزمدار اس کمزوری کو اس بات سے منسوب کیا کرتے تھے کہ اسکول میں انھیں بہت جلد جلد ترقی دی جاتی رہی تھی، اور اس کمزوری ہی کی وجہ سے انھیں ڈگری حاصل کئے بغیر کالج کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس کے بعد وہ پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کرتے رہے یا اپنے دوستوں اور آشناؤں کے اثرات سے متاثر ہوتے رہے۔ کچھ مدت تک ان کی صحبت ایسے لوگوں سے رہی جن کا یقیناً ان کی زندگی پر اچھا اثر نہ پڑتا لیکن قدرت نے بہت جلد ان کا تعلق دو پاک روحوں سے پیدا کر دیا۔ ہماری مراد مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر سین سے ہے۔ دیویندر ناتھ کا کیرکٹر ہر طرح پر مکمل اور اس قابل تھا کہ لوگ اسے تعریف کی نظر سے دیکھیں اور اس کی تقلید کریں۔ کیشب چندر بھی اس زمانہ میں ایک شاندار کیرکٹر قایم کرتے جا رہے تھے۔ مسٹر موزمدار فرماتے ہیں:۔

> ان کا تعلق ہر وقت ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ ان کی ہر بات قدرتی اور زمین اور ہوا کی مانند خوشگوار ہوتی تھی۔ وہ ایسے صادق، مضبوط، گرمجوش، ارفع خیال، اور مقناطیسی اثر رکھنے والے تھے کہ حقیقت میں میرا جزو اعظم و جزو بہتر بن گئے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ترقی کی، گو دونوں کی سمت میں کسیقدر اختلاف ضرور تھا اور میں اس اختلاف سے واقف بھی تھا۔ لیکن باوجود اس اختلاف کے ہمارے درمیان ایک ایسا تعلق قایم تھا جو موت کے بعد بھی جاری رہا۔

مسٹر موزمدار کی شادی ۱۸ سال کی عمر میں ہو چکی تھی۔ لیکن باوجود صغرسنی کے یہ شادی فریقین کے لئے برکت ثابت ہوئی۔ مسٹر موزمدار بیان کرتے ہیں:۔

> سوداسنی جس سے میری شادی ہونے والی تھی، قریباً گیارہ سال کی عمر کی تھی اور بلا شبہ اس زمانہ کی اکثر لڑکیوں کی طرح غیر تعلیم یافتہ تھی۔ شادی سے پہلے میں نے اسے ایک دو بار سرسری طور پر دیکھا تھا لیکن رسم شادی ادا ہو چکنے کے بعد میں اس کی محبت میں سرشار ہو گیا ...... شادی کی رات سے لیکر جسے ۳۳ برس گذر چکے ہیں آج تک مجھے اپنی بیوی سے ایسی محبت رہی ہے گویا میں نے اسے دنیا بھر کی عورتوں میں سے منتخب کیا ہو۔ لیکن میری اُس سے جو محبت تھی وہ

باوجود صادق ہونے کے اس لازوال اور ترقی پذیر خدمت کے مقابلہ میں بالکل بے حقیقت ہے جو اس نے زندگی بھر میرے لئے کی
مسٹر موزمدار نے اپنی بیوی کی وفادارانہ خدمات کا ذکر اسی طرح کے تعریفی الفاظ میں بعض دیگر مقامات پر بھی کیا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں مسٹر موزمدار نے برہمو سماج کے قایم کردہ اصول کی پابندی اختیار کی۔ اس سے ان میں اور ان کے رشتہ داروں میں کسی قسم کا قطع تعلق نہیں ہوا لیکن ۱۸۶۲ء میں جب وہ کیشب چندر سین کی برہمو سماج کے منسٹر مقرر ہونے پر اپنی بیوی کو مہرشی دیویندر ناتھ ٹھاکر کے مکان پر لے گئے تو انھیں مختلف قسم کی تکالیف پہنچائی گئیں۔ ٹھاکر خاندان کے متعلق مشہور تھا کہ برہمو سماج کے دایرہ میں آنے سے پیشتر اُن پر اسلام کا بہت کچھ اثر پڑ چکا ہے اور اس لئے انھیں ذات پات سے خارج گنا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب نوجوان موزمدار اپنی بیوی کو لیکر ٹھاکر خاندان کے مکان پر چلے گئے تو ان کے رشتہ داروں نے انھیں ایک خط لکھا کہ تم چونکہ ہمارے منشا کے خلاف اپنی عورت کو ایک ذات باہر خاندان کے گھر میں لے گئے ہو اس لئے اب اپنے آبائی مکان میں واپس نہ آنا۔ لیکن موزمدار نے

اپنے حقوق کی خاطر مردانہ وار مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ انھوں نے کہا میں ضرور دہلیز کے اندر قدم رکھوں گا۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ انکی بیوی بیچاری بید کیطرح لرزتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ عورتیں اس قدر ناراض ہو رہی ہیں میں کیونکر ان کے سامنے جا کر منہ دکھاؤں گی۔ لیکن شوہر کا ارادہ مصمم تھا۔ نواحات کے تمام مکانات میں بیحد ہجوم تھا۔ گھروں کی چھتیں عورتوں سے لدی ہوئی تھیں اور دروازوں میں جا بجا مرد کھڑے تھے۔ لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ دیکھیں کیا تماشہ ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی علانیہ سختی نہیں ہوئی البتہ برادری نے مل کران کا حقہ پانی بند کر دیا۔ کھانا پکانے کو کوئی رسوئیا نہ مل سکتا تھا۔ کوئی نوکران کے کپڑوں کو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ آس پاس کے لوگ ان سے بات چیت تک نہ کرتے تھے۔ یہ سب باتیں واقعی تکلیف دہ اور شرمساری دلانے والی تھیں لیکن اس مصیبت کے وقت میں مسٹر موزمدار کی بیوی نے معاملات کو اس تندہی، استقلال اور محنت سے نباہا جو اس کی فطرت سے مخصوص تھی۔

برہمو سماجی بننے والوں کے ساتھ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ سختی کا سلوک ہوا ہے لیکن غنیمت ہے کہ مسٹر موزمدار کے ساتھ اسی پر اکتفا کیا گیا۔ گو اس میں شک نہیں کہ یہ تکالیف بجائے خود کسی طرح کم نہیں۔

بابو پرتاپ چندر کچھ عرصہ کے لئے بنک آف بنگال میں ملازم رہے لیکن بہت جلد انھوں نے اپنے حقیقی کام کو اختیار کر لیا جو مذہبی اشاعت تھا اور اس میں بڑی محنت اور جانفشانی کو کام میں لانے لگے۔ ان کے والد مرتے دم کم وبیش پندرہ ہزار کی جائداد چھوڑ گئے تھے لیکن اس میں سے بہت کچھ ان کے سرپرست کی بدانتظامی کی وجہ سے ضایع ہو چکی تھی اس لئے ان کے ہاتھ اس میں سے صرف دس ہزار کی مالیت کی جائداد ہی آئی۔ اس روپیہ سے انھوں نے کیشب چندر سین کی للی کاٹیج کے قریب ہی راحت منزل خرید لی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور مکان دارجلینگ سے نیچے کرسیانگ میں بنوا کر اس کا نام "شیل آشرم" رکھا۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں مسٹر موزمدار کا خاص شغل اخبار انڈین مرر کا مطالعہ کرنا اور اس کے لئے مضامین لکھنا تھا اس زمانہ میں یہ اخبار کیشب چندر سین اور ان کے دوستوں کی نگرانی میں پندرہ روزہ نکلا کرتا تھا گو بعد میں وہ ہفتہ وار ہو کر روزانہ ہو گیا اور اب تک روزانہ نکلتا ہے۔ ان دنوں انھیں جنرل لٹریچر اور فلسفہ کے مطالعہ کا زیادہ شوق تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں ناول پڑھنے کا

بہت شوق تھا اور جہاں کوئی قصہ ان کے ہاتھ آیا وہ اسے ختم کئے
بغیر دم نہ لیتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انگریزی زبان پر انھیں اتنا
کامل عبور حاصل تھا۔ انڈین مرر کے ساتھ ان کا جو تعلق رہا (اور یہ
تعلقات بسا اوقات ایڈیٹری کی صورت اختیار کرلیا کرتے تھے)
اس سے بھی ان کی تحریر بہت کچھ شستہ ہو گئی تھی۔

۱۸۶۵ء میں مسٹر موزمدار معہ بعض دیگر اصحاب کے بابو
کیشب چندر سین کی لیڈری میں آدی برہمو سماج سے علیحدہ ہو گئے۔
اس سے اگلے سال ایک نئی برہمو سماج کی بنا ڈالی گئی۔ کیشب بابو
اس کے سکرٹری اور مسٹر موزمدار اسسٹنٹ سکرٹری بنے۔ وہ سماج کے
واعظ بھی مقرر ہوئے اور ان کی پیراتھنا اور اپدیش کو سامعین
بڑے ذوق وشوق سے سنا کرتے تھے۔ ابتدا میں تو وہ بنگالی
اور ہندی زبانوں میں اپدیش کیا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انگریزی
میں تقریر کرنے کے قابل ہو گئے۔ اور آخرکار وہ بنگال کے نہایت
فصیح وبلیغ مقرر مشہور ہو گئے اور ان کی تقریریں نہ صرف ہندوستان
بلکہ انگلستان وامریکہ میں بھی بڑے شوق سے سنی جانے لگیں۔ وہ
آہستہ لیکن باوقار اور موثر طریقہ پر تقریر کیا کرتے تھے۔ ان کے الفاظ
چیدہ اور استعارات وتشبیہات پرلطف ہوتی تھیں اور ان کے
کلام میں گہری اُمنگوں اور روحانیت کی ایک دلفریب جھلک پائی
جاتی تھی۔

۱۸۷۲ء (یا اس کے قریب ہی کے کسی سال) میں انھوں نے
مذہبی اور مشنری کاموں اور خیالات کا ایک سالانہ رسالہ
Theistic Annual کے نام سے شائع کرنا شروع
کیا اس کو کچھ مدت بعد سہ ماہی کرکے انھوں نے اسکا نام
Theistic Quarterly Review اور پھر ماہوار اور
پندرہ روزہ کرکے Interpreter نام رکھا۔

برہمو سماج کے بنگالی زبان کے آرگن دھرم تتو میں بھی
ان کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ جب انڈین مرر برہمو لیڈروں
کے ہاتھ سے نکل گیا اور کیشب بابو کی سماج کا نیا آرگن
(The Liberal and the new Dispensation)
جاری ہوا تو مسٹر موزمدار اس کے لئے بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔
برہمو سماج کے اصولوں کے متعلق ان کے مضامین گاہ بگاہ اینگلو
انڈین۔ انگریزی اور امریکن رسالوں میں بھی چھپا کرتے تھے غرض
۱۸۸۳ء تک جبکہ ان کی پہلی قابل ذکر کتاب شائع ہوئی ان کے
علمی مشاغل زیادہ تر مختلف رسائل کی مضمون نگاری پر مشتمل تھے۔

۱۸۷۸ء میں کیشب چندر سین کی سب سے بڑی لڑکی کی شادی
نوعمر مہاراجہ کوچ بہار سے ہوئی جس پر برہمو سماج میں ایک تفرقہ پڑ گیا
اور سادھارن برہمو سماج کی بنا ڈالی گئی۔ پنڈت بجے کرشن گوسوامی
جو کیشب چندر کے بہت بڑے معتقد تھے معہ بعض دیگر اصحاب
کے جو ان سے کم وبیش تعلق رکھتے تھے اس نئی سماج میں داخل
ہو گئے۔ ممکن تھا کہ مسٹر موزمدار بھی ایسا ہی کر گذرتے۔ کیشب چندر
سے ہرچند کہ ان کی بہت بڑی محبت تھی اور انھوں نے ان سے
بہت کچھ سیکھا تھا تاہم ان کی نسبت مشہور تھا کہ وہ ایک آزاد خیال
تھنکر ہیں اور کبھی اپنے رہبر کی تقلید آنکھیں بند کرکے نہیں کرتے۔
اس شادی کو بھی جس سے سارا بکھیڑا پیدا ہوا وہ پسند نہ کرتے تھے
لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ ان کے ساتھ لگے رہے اور
انھوں نے اس تفرقہ پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے
قابل ہے کہ یہ تفرقہ محض اس شادی ہی کی وجہ سے پیدا نہ ہوا تھا۔
شادی کے علاوہ اس کا باعث یہ بھی تھا کہ کیشب اور ان کے دوست
بڑے بڑے عہدوں اور اختیارات کو اپنے ہاتھ میں رکھتے چلے آرہے
تھے بجائیکہ کثیرالتعداد جماعت یہ چاہتی تھی کہ وہ ان عہدوں سے

ریٹائر ہوجائیں۔ جب اس پارٹی نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ ایک جلسہ منعقد کرکے کیشب اور ان کے دوستوں سے جواب طلب کیا جائے تو مسٹر موزمدار نے جو نائب سکرٹری تھے اس وقت تک اس جلسہ کے انعقاد کو ملتوی کرنا چاہا جب تک کہ وہ گڑبڑ جو شادی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی دُور نہ ہوجائے۔ مسٹر موزمدار کی یہ کارروائی فریق ثانی کو خلاف اصول نظر آئی اور آخر انھوں نے اس بات کا فیصلہ کرلیا کہ جدید برہمو سماج کی بنا ڈالی جائے اور سابقہ سماج کو مطلق العنان لیڈروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے مسٹر موزمدار نے اس تفریق کے خلاف بہت کچھ جد وجہد کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے گہرے اثرات کا احساس سب سے بڑھ کر ان کو ہوا تھا۔ لیکن فریق ثانی نے ان کی ایک نہ سُنی در اصل شادی کے معاملہ میں کیشب سے جو غلطی سرزد ہوچکی تھی اسکی حمایت کرتے ہوئے انھوں نے ان لوگوں کو قطعی طور پر اپنا مخالف بنالیا تھا۔ آخر کار تفریق عمل میں آگئی لیکن باوجود اس کے مسٹر موزمدار کی تقاریر اور ان کے اپدیشوں میں جو خاص لطف پایا جاتا تھا اس کا مزا لینے کے لئے ان لوگوں میں سے بعض پہلی سماج کے جلسوں میں بھی شریک ہوجایا کرتے تھے۔ ایک بار سادھارن برہمو سماج کے لیڈروں نے انھیں ترغیب دیکر اپنے مندر میں بلالیا اور ان سے اپدیش کروایا۔ لیکن باہمی اختلافات روز بروز بڑھتے گئے اور گو مسٹر موزمدار کیشب چندر کے معتقدوں میں سے زیادہ آزاد خیال تصور کئے جاتے تھے تاہم حقیقت میں وہ سادھارن سماج میں اپنے دوستوں اور مداحوں سے علیحدہ ہی رہے۔

۱۸۸۲ء میں مسٹر موزمدار کی سب سے اوّل وزندار کتاب شائع ہوئی اس کا نام The Faith and Progress of the Brahmo Samaj تھا اور جس میں زیادہ تر ان کی پبلک تقاریر اور اس قسم کے مضامین تھے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے تھے۔ اس کے تین حصے تھے یعنی (۱) خیالات اور اصول میں (۲) عبادت اور عملی کارروائی کے متعلق (۳) جدید قایم شدہ سماج۔

مضامین کی اس تقسیم سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب درحقیقت برہمو سماج کے ڈیفنس میں لکھی گئی تھی اور اس میں اس کے مشنری و دیگر کاموں کا ذکر درج ہے۔

قبل ازیں ہم یہ درج کرنا بھول گئے کہ مسٹر موزمدار ۱۸۷۴ء میں پہلی مرتبہ انگلستان گئے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں وہ دوبارہ انگلینڈ گئے اور وہاں سے امریکہ میں پہنچے۔ ڈاکٹر بیروز لکھتے ہیں:۔

> ان کی اول مرتبہ کی تشریف آوری کے موقعہ پر جس جوش و خروش کا اظہار ہوا تھا وہ ابھی بہت سے لوگوں کو یاد ہوگا۔ واپسی کے موقعہ پر وہ سین فرانسسکو سے روانہ ہوکر جاپان ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے تھے۔

مغرب کی ان دونوں سیاحتوں کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ انھوں نے اپنی دلچسپ کتاب Sketches of a Tour round the World میں لکھا ہے۔ اسی سال انھوں نے اپنی کتاب ORIENTAL CHRIST شایع کی۔ ڈاکٹر بیروز فرماتے ہیں:۔

> اس عجیب و غریب کتاب کے متعلق معاً تسلیم کرلیا گیا کہ وہ ایک ذہین، سمجھ دار، اور عالی دماغ شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ حضرت مسیح کے متعلق جس قدر کتابیں اس وقت تک لکھی جاچکی تھیں، اس سے اُن میں ایک گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔

اس کتاب میں مسٹر موزمدار نے حضرت مسیح کے اقوال اور افعال کو اپنے روحانی تجربات کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس لحاظ سے

بابو پرتاپ چندر موزمدار

یہ ایک قابل قدر کتاب ہے اور یقیناً سب لوگ اسے غور اور دلچسپی سے پڑھیں گے۔

جب مسٹر موزمدار مغرب کی دوسری سیاحت سے واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے ایڈر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس وقت سے ان کی زندگی کے مضطرب اور تشویش ناک زمانہ کا آغاز ہوا۔ انکے اکثر دوستوں نے جو ان کی طرح کیشب بابو کے مقلد تھے نہ صرف انھیں کیشب کا جائز جانشین تسلیم نہ کیا بلکہ مرحوم کی یاد میں برہمو مندر کی گدی کو ہمیشہ خالی رکھنے کا تہیہ کر لیا۔ یہ لوگ اس بات پر بھی مصر تھے کہ جو طریق عبادت کیشب بابو نے قایم کیا تھا اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہونے دی جائے۔ غرض اسی قسم کے اور بہت سے آپس کے اختلافات تھے جن کا ذکر اس جگہ غیر ضروری ہے لیکن تاہم ان کا اثر مسٹر موزمدار پر بہت کچھ پڑا اور اس سے ان کی زندگی کا یہ حصہ بہت بدمزگی اور بے چینی سے بسر ہوا۔ مگر باوجود اس اختلاف کے ان کے بعض ہمراہی ایسے بھی تھے جو ہر معاملہ میں ان کی تقلید پر آمادہ نظر آتے تھے اور جنھوں نے انھیں اپنے منشا کے مطابق کام چلانے میں بہت کچھ مدد دی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعد میں خود مسٹر موزمدار کو سماج کے لئے خاص ضوابط قایم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی مگر وہ اس کام میں اپنی زندگی کے اندر کامیاب نہ ہو سکے۔

کیشب بابو کے انتقال پر مسٹر موزمدار نے ان کی ایک دلچسپ سوانح عمری لکھی لیکن لوگ اس سے کچھ خوش نہ ہوئے۔ بایں ہمہ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں اس مشہور برہمو لیڈر کے حالات اور ان کی تعلیم کا ذکر صحیح طور پر درج ہے۔ اس کے بعد مسٹر موزمدار نے انگریزی میں ایک کتاب Aids to Moral Character نوجوانوں اور بنگالی میں ایک اور کتاب استری چرتر سنگتن عورتوں کے لئے لکھی۔

۱۸۹۳ء میں مسٹر موزمدار تیسری اور آخری مرتبہ مغرب کو گئے۔ شکاگو میں مذاہب عالم کی جو پارلیمنٹ منعقد ہوئی تھی وہ اس میں شریک ہوئے اور وہاں انھوں نے ایک مضمون "مذہبی طور پر دنیا ایشیا کی کس قدر ممنون احسان ہے" کے عنوان سے پڑھا۔ ڈاکٹر بیروز لکھتے ہیں :-

> بوسٹن میں انھیں لاول انسٹی ٹیوٹ کے روبرو چار لکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا۔ لوگوں نے ان کے لکچروں سے اس قدر دلچسپی کا اظہار کیا کہ انھیں وہی مضمون بوقت صبح ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے دوہرانا پڑا۔ ان لکچروں کو اخبار کرسچن رجسٹر کے لئے رپورٹ کیا گیا تھا اور وہ اسی میں چھپے تھے۔

بعد میں انھیں لاول لکچرز کے عنوان سے کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا۔

جن دنوں مسٹر موزمدار امریکہ میں تیسری مرتبہ دورہ کر رہے تھے انھوں نے اپنی کتاب Heart-beats شایع کی جس کا حوالہ قبل ازیں دیا جا چکا ہے، اور اس کے تھوڑے عرصہ بعد ان کی کتاب The Spirit of God پبلک کے روبرو آئی۔ اول الذکر میں چھوٹے چھوٹے پارے اس قسم کے درج ہیں جن میں مذہبی و دیگر معاملات پر غور کیا گیا ہے اور ان کے علاوہ روحانی امور کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر بیروز تعلیم کرتے ہیں کہ طامس کیمپس کے زمانہ کے بعد میرے خیال میں یہ سب سے زیادہ قابل ذکر عبادت کی کتاب ہے۔ دوسری کتاب The Spirit of God مسٹر موزمدار کی بہترین انشا پردازی کا نمونہ ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ خدا کا وجود زندگی اور فطرت کے ہر شعبہ میں پایا جاتا ہے۔ بایں ہمہ کتاب جس ڈھنگ پر لکھی گئی ہے وہ ایسا ہے کہ اس سے اس شخص کی تشفی نہیں ہوتی جو خدا کی ذات سے منکر ہو البتہ جو اسکی ہستی کو مانتا ہو اسکے دل پر

یہ ایسا اثر کرتی ہے کہ اسکا عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے - اس کتاب کے اندر جا بجا مسٹر موزمدار نے ہندو فلسفہ اور روحانیت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے - گو اس میں شک نہیں کہ ویدانت کے مسئلہ کے متعلق ان کے خیالات غیر یقینی ہیں -

اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان کی سب سے بڑی خواہش "آشیش" نام کی ایک بنگالی کتاب شایع کرنے کی تھی جس میں بعض دعائیں اور خود نوشت سوانح عمری درج ہے - چھپی ہوئی کتاب کا نسخہ جب ان کے پاس ان کی موت سے چند دن پیشتر لایا گیا تو انھوں نے اسے سر آنکھوں پر رکھا - واقعی یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر شخص اسے سر آنکھوں پر رکھے کیونکہ اس میں اس اعلیٰ اسپیکر اور بہت بڑے تھنکر کے خیالات اور تجربات نہایت دلچسپ اور پسندآمیز طریقہ میں بیان کئے گئے ہیں

تیرتھ رام

کیفرِ کردار

(۱)

اعظم گڈھ کے ضلع میں سرجو ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا میدان ہے - اس کے دوسری طرف ایک بہت بڑی جھیل ہے جو یہاں سے ایک میل مشرق کی طرف چلکر سرجو ندی سے مل گئی ہے تیسری طرف ایک دشوار گذار، اتھاہ دلدل ہے - چوتھی طرف ندی کے نشیب و فراز میں ہوتی ہوئی ایک پتلی سی پگڈنڈی ہے جس نے اس میدان کو دنیا کا ایک حصہ بنا رکھا ہے - اسلئے گو یہ میدان جغرافی اصطلاح میں نہ جزیرہ تھا نہ جزیرہ نما، شاید جغرافیہ میں اس کے لئے کوئی اصطلاح موزوں نہیں ہے، مگر فی الواقعی وہ ایک غیر آباد، ویران جزیرہ تھا جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ پڑا ہوا تھا - کچھ عرصہ سے ایک اہیر نے اس ویرانے کو آباد کر رکھا تھا - نہیں معلوم زمیندار نے اُسے گانوں سے نکال دیا، یا کسی وجہ سے اُسے آبادی سے دُور رہنا پڑا - اُس غریب نے اِس دلدلی مقام میں سکونت اختیار کی تھی یہاں ایک چھوٹا سا جھونپڑا، چند گائیں بھینیں، بھیڑ بکریوں کے گلّے چرتے ہوئے نظر آتے تھے - اُس حوصلہ مند اہیر نے جسے شیورام کہتے تھے ایک چھوٹی سی کشتی بھی بنا رکھی تھی جسپر بیٹھکر وہ قریب کے قصبہ میں اوپلے، گھی، اور دودھ بیچنے کے لئے جایا کرتا تھا - کبھی کبھی مچھلیوں کا شکار بھی کھیلتا - شیورام کو اس ویرانے کا آباد کرنا مبارک نہ ہوا - یہاں آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اُسکی بیوی ملیریا کی نذر ہو گئی اب اُسکی صرف ایک لڑکی تھی جسکے سر پر گرہستی کا سارا بوجھ تھا - شیورام اس تاک میں تھا کہ کہیں سگائی ٹھہر جائے تو بیچاری گورا کے سر سے یہ بلا ٹلے - مگر خدا جانے کیوں برادری میں لوگ اُسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے - یہی سبب تھا کہ گورا کی اُس نے ابتک شادی نہیں کی تھی - یہ ایک سانولے رنگ کی، بھولی صورت والی نازنین تھی، جسے حسین تو نہیں کہہ سکتے، مگر دلفریب ضرور کہہ سکتے ہیں - گورا کے لئے یہ جھونپڑا قیدخانہ سے کم نہ تھا - صبح سے شام تک شیورام یا تو مویشیوں کے ساتھ رہتا، یا بازار کرنے جاتا، یا مچھلیاں پکڑتا، اور گورا سارے دن اکیلی بیٹھی کبھی گھر کا کام کاج کرتی، کبھی لیٹتی، کبھی اُکتا کر روتی - مگر جھونپڑے سے باہر اُسے نکلنے کی ممانعت تھی اور نہ وہ نکل سکتی تھی - ہاں اب اس قید تنہائی سے جلد رہائی ملنے والی تھی کیونکہ گورا کی منگنی ایک نوجوان اہیر سے ہو گئی تھی جو سرجو کے لب ساحل ایک دوسرے گانوں میں رہتا تھا - لیکن

جب گورا سوچتی کہ مجھے اب یہاں سے جانا پڑے گا تو اُسکا دل بیٹھ جاتا، اور وہ ایشور سے مناتی کہ یہ قید تنہائی ہمیشہ قایم رہے۔

ایک دن شام کے وقت گورا اپنے جھونپڑے میں بیٹھی ہوئی آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھ رہی تھی۔ اُسکے سُسرال سے ایک سُرخ ساری اسکے لئے آئی تھی۔ گورا نے اُسے زیب بر کیا تھا، اور آئینہ میں دیکھ رہی تھی کہ یہ مجھ پر کھلتی ہے یا نہیں۔ کبھی وہ آنچل کو آدھے سر تک رکھتی، کبھی ماتھے تک۔ اُسکا چہرہ بہت شگفتہ تھا، کیونکہ ایسی خوشرنگ ساری اُس نے کبھی نہیں پہنی تھی اور نہ وہ خود اپنی نگاہوں میں ایسی حسین معلوم ہوئی تھی۔ اُسے اپنے بھولے بھالے حُسن کا آج کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوا، اور آئینہ کے سامنے سے ہٹی تو اُسکی آنکھوں میں اطمینان اور غرور کی دلاویز جھلک موجود تھی۔ اُسے یاد نہیں آتا تھا کہ اپنے سے زیادہ اچھی صورت کبھی دیکھی ہے یا نہیں۔

اتنے میں اُسے دروازہ پر کسی کے پانوں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اُس نے سمجھا میرے باپ آگئے۔ جلدی سے ماتھا چھپا لیا اور آئینہ کو اُٹھا کر چارپائی کے نیچے ڈالدیا۔ مگر جب بجائے اُسکے باپ کے ایک اجنبی صورت کے نوجوان نے دروازہ کھول کر کمرہ میں جھانکا تو گورا کے مُنہ سے ایک چیخ نکل آئی اور دل دھڑکنے لگا اس نے کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا "تم کون ہو؟" اور یہ کہکر ہاتھ میں ایک سونٹا لیکر کھڑی ہوگئی۔

نوجوان کمرہ کے اندر چلا آیا، اور بہت منت آمیز لہجہ میں بولا "تم ڈرو مت، مین تم سے کچھ نہیں بولونگا، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو دو۔ بھوک سے مرا جاتا ہوں"۔

گورا۔ "تم کون ہو؟ کہاں سے آتے ہو؟"

نوجوان۔ "ایک بدنصیب آدمی ہوں اور کون ہوں۔ دن بھر سے جنگل کی خاک چھان رہا ہوں۔ سیکڑوں آدمی میری تلاش میں گھوم رہے ہیں۔ گانوں کا گانوں میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ کل رات کو ہردت پور میں ایک بڑا ڈاکہ پڑا۔ وہاں کا نمبردار اُس ڈاکہ میں مارا گیا۔ اب مجھ غریب پر لوگ شبہ کر رہے ہیں۔ مگر مین ایشور سے کہتا ہوں کہ مین اس گناہ میں بالکل نہیں شریک تھا۔ یہ میرے دشمنوں کی شرارت ہے۔ اسوقت مجھے قسمت یہاں لے آئی۔ مگر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ جدھر جاتا ہوں پانی اور دلدل کے سوا کچھ نہیں سُوجھتا۔ اگر اُسی راستہ سے لوٹ جاؤں جدھر سے آیا ہوں تو ضرور گرفتار ہو جاؤنگا کیونکہ لوگ میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ تم مجھے کچھ کھانے کو دیدو، اور تب مجھے یہاں سے جان لیکر بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ بتا دو۔ تمہارے دل میں رحم ہے۔ ایشور تمھیں اس نیکی کا بدلہ دیں گے"۔

گورا یہ سرگذشت سُنکر کانپ اُٹھی۔ اُسے اس نوجوان کی بیگناہی کا یقین نہ آیا۔ "ضرور یہ قاتل ہے، اور میں اس سُنسان جگہہ میں اسکے سامنے کھڑی ہوں، یہ مجھے بھی مار ڈالے اور یہاں کی ساری چیزیں اُٹھالے جائے تو کیا کرونگی۔ فریاد بھی تو نہیں کر سکتی۔ یہاں کون بیٹھا ہوا ہے۔ دادا نہ معلوم کب تک آئیں گے۔ یا ایشور تو میری مدد کر!" اس طرح دل میں سوچ کر اُس نے نوجوان سے کہا "مین تمھیں کھانے کو دیدوں تو تم بھاگ جاؤ گے نہ؟ اگر جلد نہ بھاگو گے تو میرے باپ آکر تمھیں پکڑ لیں گے"۔ نوجوان نے جواب دیا۔ "کیا تمہارے باپ جلد آجائیں گے؟"

گورا۔ "ہاں وہ آتے ہی ہوں گے۔ تم کھانا کھالو اور فوراً بھاگ جاؤ"

یہ کہکر اس نے تھوڑا سا دودھ اور چند روٹیاں ایک تھالی میں رکھکر اُسے دیدیں۔ نوجوان کھانے پر ایسا ٹوٹا گویا کبھی دانہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ جبتک وہ کھاتا رہا گورا سونٹا مضبوطی سے

پکڑے ہوئے اسکی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ اُسکا دل دھڑک رہا تھا اور کان شیو رام کے قدموں کی آہٹ سننے کے لئے بیقرار ہو رہے تھے۔ جب نوجوان کھا چکا تو گورا نے دیکھا کہ وہ اِدھر اُدھر شرارت آمیز نگاہوں سے تاک رہا ہے۔ گویا کسی لاٹھی کی تلاش میں ہے۔ گورا نے ڈانٹ کر کہا "اب تم یہاں سے چلے جاؤ"۔

نوجوان۔ "جان من۔ میں گھڑکیاں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ تمہارے ہاتھ میں سونٹا دیکھکر میں ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ میں چاہوں تو ابھی تمہارے ہاتھ سے وہ ہتھیار چھین لوں۔ مگر تم نے میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ اسلئے میں تمھیں زیادہ تکلیف نہ دونگا۔ تم چلکر مجھے راستہ بتا دو"۔

گورا کا خون سرد ہوگیا۔ نوجوان نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ بولی۔ "یہاں سے کہاں جاؤگے۔ کہیں راستہ نہیں ہے"۔

نوجوان۔ "ندی کے کنارے کوئی ناؤ نہیں ہے؟"

گورا۔ "میرے باپ کی ناؤ ہے۔ مگر تم اُسے لیجاؤگے تو واپس کون لائیگا"۔

نوجوان۔ "اُس سے مجھے کچھ سروکار نہیں ہے۔ بس تم مجھے اُس ناؤ تک پہنچا دو"۔

گورا کے لئے مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ سونٹا لئے ہوئے ندی کے کنارے چلی۔ نوجوان پیچھے پیچھے اسکے ساتھ چلا۔ کنارے پر پہنچکر یکایک وہ درشت لہجہ میں بولا "اپنے کپڑے اُتار کر مجھے دیدو۔ زنانہ بھیس میں مجھے کوئی نہ پہچان سکیگا۔ کیوں کیا سوچتی ہو۔ یہ میری شرافت ہے کہ جس چیز کو بزور لے سکتا ہوں اسکے لئے تم سے فقیروں کی طرح سوال کرتا ہوں۔ کیا ایک انسان کی جان بچانے کے لئے تم اتنی سی تکلیف بھی برداشت نہ کروگی"۔

بیکس اور بے بس گورا نے اس نوجوان سے زیادہ سوال و جواب کرنا فضول سمجھا۔ روتے ہوئے اُس نے اپنی خوشرنگ ساری اُتار کر اُسے دیدی، اور جلدی سے اُس صافہ کو جسے نوجوان نے اُسکی طرف پھینک دیا تھا پہن لیا۔ تب اُس ظالم نے ساری پہنی اور لمبا سا گھونگھٹ نکال کر کشتی کی طرف چلا۔ یکایک کچھ سوچکر وہ مڑا، اور تیزی سے لپک کر گورا کے ہاتھ سے ڈنڈے کو چھین لیا۔ گورا خوف سے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی، اور تب نوجوان نے اس بیہوشی کو دیر تک قایم رکھنے کے لئے زور سے ایک ڈنڈا اُسکے سر پر مارا، اور کشتی پر بیٹھکر ایک طرف کو چلدیا۔ "اب اگر تمہارا باپ آیا بھی تو تم نہ بتا سکوگی کہ میں کون ہوں اور کدھر گیا"۔

(۲)

نوجوان ڈاکو تیزی سے ڈانڈا چلاتا ہوا چار میل تک چلا گیا اور تب اُسے کنارے پر ایک گانوں کے آثار نظر آئے۔ جابجا دُھندھلی روشنی کے چراغ ٹمٹما رہے تھے جنکا عکس پانی میں گلفشانی کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گھاٹ پر کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ کچھ نہا رہی تھیں۔ ملاحوں کے جھونپڑوں میں چولھے جل رہے تھے۔ کشتیاں میخوں سے بندھی ہوئی پانی میں ہلکورے لے رہی تھیں۔ نوجوان نے یہاں رات بسر کرنے کی نیت سے کشتی کنارے پر لگا دی، اور اُسے ایک میخ سے باندھکر لپکتا ہوا گانوں میں جا پہنچا۔ گانوں میں بالعموم لوگ سرِ شام ہی سے سو جایا کرتے ہیں۔ ہاں جابجا بوڑھے آدمی بیٹھے اپنے حقّے سے دل بہلاتے ہوئے نظر آتے تھے، جس سے زیادہ ہمدرد اور غمگسار عالمِ ضعیفی میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ڈاکو کا منشا یہ تھا کہ اندھیرے میں کوئی بھلا انس مِل جائے تو اُسپر ہاتھ صاف کروں کہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے، اور قسمت جو کچھ دلائے اُسے لیکر ندی کے کنارے اپنی کشتی پر جا بیٹھوں، اور دو گھنٹہ رات رہے پھر اُٹھکر آگے کو چلدوں۔ وہ انھیں منصوبوں میں تھا کہ دفعتاً ایک نوجوان لالٹین ہاتھ میں لئے سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

خواجه بدرالدین خاں صاحب عرف خواجه امان مترجم بوستان خیال

انڈین پریس الهآباد

اُس نے اس زنانے ڈاکو کو دیکھا تو چونک پڑا اور بولا "کون ہے گورا؟ تم یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟" یہ وہی آدمی تھا جس سے گورا کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ خوش رنگ ساری جو اسوقت ایک قاتل کے گناہوں پر پردہ ڈالے ہوئے تھی اُسی نے گورا کے لئے بھیجی تھی۔ گانوں میں اس وضع کی ساری کسی دوسری عورت کے پاس نہیں تھی۔ اس لئے اُسے معاً خیال گذرا کہ شاید یہہ گورا ہے۔ اُسکا باپ کسی کام سے یہاں آیا ہوگا۔ اُسکے ساتھ وہ بھی چلی آئی ہوگی۔ نوجوان ڈاکو یہہ آواز سنتے ہی چونکا اور قدم تیز کر دیئے تاکہ کسی تاریک گلی میں پہنچ جائے مگر اُس دیہاتی نوجوان نے لپک کر اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "گورا! اسوقت مت شرماؤ۔ تم یہاں کیسے آئیں۔ تمہارے دادا بھی آئے ہیں؟"

ڈاکو نے اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دیا تاکہ بھاگ جائے۔ مگر اُس دیہاتی جوان نے اُسے خوب مضبوط پکڑا تھا۔ اُس نے گھونگھٹ ہٹا دیا اور ایک مرد کا چہرہ دیکھکر قہقہہ مار کر ہنسا "واہ! آپ تو کوئی بھلے جی معلوم ہوتے ہیں۔ یہہ زنانہ بھیس کب سے لیا؟ آیئے چوکیدار کے یہاں ذرا آپ کی مزاج پرسی کروں۔ آج آپ کسی منحوس آدمی کا مُنہ دیکھکر اُٹھے تھے۔ گوبردھن کے ہاتھ میں پھنسکر چوروں کا کچومر نکل جاتا ہے۔ سر کے ایک بال بھی نہیں رہتے۔ وہی گت تمہاری ہوگی۔ تمنے میری پیاری گورا کے گھر میں سیند ڈالی ہے۔ یہہ وہی ساری ہے جو مینے کل اُسکے لئے بھیجی تھی۔ کیوں ہے نہ یہی بات؟"

ڈاکو سمجھ گیا کہ اب یہاں سے چھٹکارا پانا غیر ممکن ہے۔ قسمت نے کہاں لاکر پٹکا۔ بولا "ایشور گواہ ہے۔ گورا نے مجھ پر ترس کھا کر یہہ ساری مجھے دیدی ہے۔ مین نے اُس کے گھر میں سیند نہیں ماری۔ مین چور نہیں ہوں۔ ایسی بھولی عورت کو مین نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ چاہے چور یا قاتل ہی کیوں نہ ہوتا۔ جس آدمی کی حالت پر گورا نے رحم کیا ہے کیا گورا کا منگیتر اُسی آدمی کے گلے پر چھری پھیرے گا؟ مین قسمت کا ستایا ہوا غریب آدمی ہوں۔ بھولتا بھٹکتا گورا کے جھونپڑے تک جا پہنچا۔ اُس نے میری رام کہانی سُنی۔ اُسے رحم آگیا۔ یہہ ساری مجھے دیدی کہ کسی طرح اسکی جان بچ جائے۔ مین بالکل سچ کہتا ہوں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔"

گوبردھن پھر ہنسا اور بولا "بیشک آپ بہت سچے اور دھرماتما آدمی ہیں۔ کچھ اپنا حال مجھ سے بھی کہو۔ تمہارا گھر کہاں ہے۔ شیورام کے مکان پر کیسے پہنچے۔ یوں مین نہیں چھوڑنے کا سمجھ گئے۔"

ڈاکو - "مین ساری کہانی کہہ دونگا۔ کل رات کو ہردت پور مین ایک ڈاکہ پڑا۔ نمبردار مارا گیا۔ ڈاکو بھاگ گئے۔ مگر وہاں لوگوں کا شبہہ ہے کہ مین بھی اُس ڈاکہ میں شریک تھا۔ مگر یہ دشمنوں کی کارستانی ہے۔ خواہ مخواہ میرے سر یہہ الزام تھوپ دیا۔ مجبور ہوکر مین بھاگ نکلا۔ کل سارے دن نالوں اور گڈھوں میں چھپتا پھرا ورنہ اسوقت تمہارے سامنے کھڑا ہوتا۔"

گوبردھن - "اچھا تو آپ ہردت پور کے ڈکیتوں میں ہیں۔ یہہ کہئے۔ گورا شاید بڑی رحمدل ہے جو ڈکیتوں کی جان بچاتی پھرتی ہے۔ اچھا یہی سہی۔ مگر اُس نے اپنی پرانی ساری کیوں نہیں دی۔ وہ نئی ساری کیوں دی جو مین اُسکے لئے برہل گنج سے تین روپیہ میں لایا ہوں اور جسے پہنکر وہ رانی معلوم ہوتی ہے۔ یہہ بتاؤ۔ کوئی اپنی منگیتر کی دی ہوئی چیز کو یوں لٹاتا پھرتا ہے؟"

ڈاکو کچھ سٹ پٹا گیا۔ مگر سنبھلکر بولا "تمہاری دی ہوئی ساری تو وہ خود پہنے ہوئے ہے۔ وہ بھلا مجھے کیوں دیتی۔ یہہ ساری بالکل اُسی رنگ کی ہے۔ یہہ اسکے باپ نے اُسے دی ہے۔ دونوں ساریاں بالکل ایک رنگ کی ہیں۔"

گوبردھن - "اچھا یہہ بھی سہی۔ تو اُس نے اپنے باپ کی ناؤ تمھیں کیوں دیدی؟ کیا وہ اتنا نہیں جانتی کہ ناؤ آپ ہی آپ اپنے ٹھکانے پر

نہیں چلی آتی۔ اسکا جواب دیجئے۔ اُسکو اگر نقصان کا خیال ہوا تو کیا اپنے باپ کا خوف بھی ہوا؟"

ڈاکو اب چوکنا ہو گیا تھا۔ بولا "اُس نے مجھسے کہا تم ناؤ لیجاؤ میرے دادا پوچھیں گے تو مین کہدوں گی کہ ایک پُرانی ناؤ کے کھو جانے سے اگر کسی بیگناہ کی جان بچ جائے تو اُسکا افسوس نہیں کرنا چاہیئے مین تو خود اسے نہیں لیتا تھا۔ مگر اُس نے زبردستی مجھے اسپر بٹھا دیا اور کہنے لگی میرے دادا ایسے لالچی اور خود غرض نہیں ہیں۔ تم اسے لیجاؤ۔ اگر ہو سکے تو کل تک کسی معتبر آدمی کی معرفت بھیج دینا۔

گوبردھن کو اپنے اعتراضات کا جواب تو ملا، مگر دل کو اطمینان نہوا۔ بولا "بھائی سُنا! مجھے تمہاری باتوں پر وشواس نہیں آتا۔ مجھے شک ہے کہ تم نے ضرور شیورام مہتو کا گھر لوٹا۔ اور شاید گورا کو مار بھی ڈالا ہو تو تعجب نہیں۔ تم ڈاکو ہو۔ تمہارا یہی پیشہ ہے۔ اسلئے جبتک اُس کی زبان سے تمہاری باتوں کی تصدیق نہوگی مین ہرگز نہ مانونگا۔ ابھی بہت رات نہیں گئی ہے۔ دس بجتے بجتے ہملوگ پہنچ جائیں گے۔ مجھے گورا کے دیکھنے کا ایک بہانہ ہاتھ آجائیگا۔ دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنونگا، اچھے اچھے کھانے کھاؤنگا، اور صبح لوٹ آؤنگا۔ لیکن اگر تم نے اسکا بال بھی بیکا کیا ہے تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔ کُتوں سے بوٹی بوٹی نچوا لونگا۔"

یہ کہکر گوبردھن نے اپنی ماں کو گھر میں سے بُلایا، اور چند لفظوں میں صورت حال بیان کرکے بولا کہ مین شیورام مہتو کے گھر تک جاتا ہوں۔ رات کو نہ آؤنگا۔ کواڑ بند کر لینا۔ بڈھی عورت نے منع کیا کہ رات کو مت جا۔ ڈاکو ہے نہ جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے۔ صبح کو جانا۔ مگر گوبردھن نے اسکی تشفی کی، اور ڈاکو کو کھینچتا ہوا گھاٹ تک لایا۔ اُسکی کشتی کھولی، اور اُسے اُس میں بٹھا کر خود ڈانڈا ہاتھ میں لے لیا۔ پانی کی دھار تیز تھی، اور کشتی کو چڑھاؤ کی طرف جانا تھا آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

(۳)

آدھ گھنٹہ تک ان دو آدمیوں میں سے ایک بھی نہ بولا۔ یکایک ڈاکو نے پوچھا "اگر تمھیں ثابت ہو جائیگا کہ مین نے شیورام کے گھر میں سیند نہیں ماری تو مجھے چھوڑ دوگے نہ؟"

گوبردھن۔ "مین ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہاں چلکر بتاؤنگا۔"

ڈاکو۔ "مین وہاں تک اسی شرط پر چلونگا کہ اگر مین نے شیورام کے گھر میں سیند نہ ماری ہو، اور گورا کو کوئی تکلیف نہ دی ہو تو تم مجھے چھوڑ دوگے۔ ورنہ مین یہیں ندی میں کود پڑونگا اور تیر کر کہیں نکل جاؤنگا۔ پولیس کے ہاتھوں میں مین نہیں جانا چاہتا۔"

گوبردھن۔ "تمہارا اختیار ہے جی چاہے پانی میں کود پڑو، یا اپنا سر پٹک لو۔ تمہاری خاطر سے اتنا کہتا ہوں کہ اگر تم نے یہاں کوئی شرارت نہیں کی ہے تو تمھیں پولیس کے حوالے نہ کرونگا۔"

ڈاکو۔ "قسم کھاؤ۔"

گوبردھن۔ "تمہارے سر کی قسم"

ڈاکو خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کشتی کنارے پر لگی اور ایک آواز سُنائی دی۔ "دادا! آج تم نے اتنی دیر کیوں کی؟"

گوبردھن نے آواز پہچان لی اور خوش خوش، ڈاکو کا ہاتھ پکڑے ہوئے کشتی سے اُتر کر بولا "کیا ابھی تمہارے دادا نہیں آئے۔ آدھی رات ہونے آئی ہے۔ کیا تم یہاں دیر سے کھڑی ہو؟"

گورا نے گوبردھن کو ڈاکو کے ساتھ دیکھا تو مارے شرم کے عرق عرق ہو گئی۔ اُس نے سر جھکا لیا اور وہاں سے ذرا ہٹ گئی۔ گوبردھن نے دیکھا کہ اُسکی ساری گھٹنے سے اوپر تک آکے رہ گئی ہے۔

گھونگھٹ نکالنے کی کوشش میں اُلٹی بیٹھی کھلی جاتی تھی۔ گورا اسوقت وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اپنے منگیتر کے سامنے اس بُری حیثیت سے وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ مگر گوبردھن ڈاکو کا ہاتھ پکڑے ہوئے گورا کے سامنے آیا اور بولا "دیکھو گورا! اسوقت شرم اوست۔ جب مہتو آویں تو جی بھر کر لجا لینا۔ تم اس عورت کو جانتی ہو؟"

گورا نے آہستہ سے کہا "ہاں"

گوبردھن "اُس نے تمہارے یہاں سے کوئی چیز چرائی؟"

گورا۔ "نہیں"

گوبردھن "تم نے اپنی ساری اسے دیدی؟"

گورا۔ "اُس نے مجھ سے چھین لی"

ڈاکو نے بولنا چاہا۔ مگر گوبردھن نے ڈانٹ کر اُسے خاموش کر دیا اور پھر گورا سے جرح کرنے لگا۔ "تم نے اپنی ناؤ اسے دی؟"

گورا۔ "اُس نے زبردستی کھول لی۔ میں تو منع کرتی رہی"۔

گوبردھن "تمھیں اس نے مارا تو نہیں؟"

گورا زبان سے نہ بولی۔ مگر اس کی دھیمی دھیمی سسکی سنائی دی۔ گوبردھن سے اب صبر نہو سکا۔ اس نے وہی ڈنڈا اُٹھا لیا جو ڈاکو نے گورا سے چھینا تھا اور ڈاکو کے پیچھے دوڑا۔ ڈاکو جان بچا کر بھاگا اور اُس طرف جدھر اتھاہ دلدل تھا تیزی سے بھاگتا ہوا چلا گیا۔ صبح کو جب لوگوں نے جا کر دیکھا تو دلدل میں اُنھیں پیروں کے نشان نظر آئے۔ اسکے بعد ایک گڈھا سا دکھائی دیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ یہی اُس ڈاکو کی قبر ہے۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی!"

نواب رائے

جدید مطبوعات

جلوہ ایثار مصنفہ منشی نواب رائے (انڈین پریس الہ آباد۔ قیمت عہر)

یہ دلکش اور پرمعنی ناول منشی نواب رائے کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور اسمیں محض حسن وعشق کے جھگڑوں سے گذر کر ایثار اور حب الوطنی کے سبق کے تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کا جو کچھ حاصل ہے اسکی جھلک پہلے ہی صفحہ سے نظر آتی ہے۔ جب سُباما دیوی جی سے "سپوت بیٹا مانگتی ہے جو اپنے دیس کا اُپکار کرے" پرتاپ اور برجن کی محبت' برجن کی دوسرے سے شادی ہونا' اور اپنے دل کی اُمنگوں کو اپنے فرض پر سے قربان کردینا' پرتاپ کا کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمالیہ کے مہاتماؤں سے روحانی تعلیم حاصل کرنا' یہ تمام داستان نہایت بیساختہ اور دلکش پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ ہاں ناول میں ایک نقص ضرور ہے اور وہ یہ کہ پرتاپ کے ایثار کا قصہ اور دیش کے اپکار کی داستان کو اس قدر مختصر کردیا ہے کہ وہ گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس کام کے لئے ۲۷ فصلوں اور ۸۸ صفحوں میں تیاری کی گئی ہے اس کو دو تین صفحوں میں مجمل طریقہ سے ٹال دینا فن ناول نویسی کے اصول کے خلاف ہے۔ پڑھنے والے کو یہ انتظار ہے کہ جس کام کے لئے ایسی ایسی تیاریاں کی گئیں وہ جب ہوا تو کیا ہوا اور کیونکر ہوا۔ منشی نواب رائے صرف اس قدر بتلاتے ہیں کہ بالاجی نے گئوشالا اور رارجن سبھائیں قایم کیں اور بس۔ اس مصنف کے دل میں درد اور قلم میں زور ہے' اور یہ ابتدائی کوشش بتلاتی ہے کہ اگر اصول سے کام لیا گیا اور اپنے حسن وقبح کو خود جانچنے کی کوشش کی گئی تو تجربہ اور مشق اُن چند نقائص کو جلد دور کردیگا جو بہت سی خوبیوں کے ساتھ جلوہ ایثار میں پائے جاتے ہیں۔

سنہری کمخواب مترجمہ مس لولو رقیہ بیگم بلگرامی (انڈین پریس الہ آباد قیمت ۶ر)

سنہری کمخواب پچاس صفحہ کا ایک مختصر مگر دلچسپ قصہ ہے، جو اصل میں ارمنی زبان میں لکھا گیا تھا۔ ارمنی سے اسکا ترجمہ انگریزی میں ہوا، اور اب شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم کی صاحبزادی، مس لولو رقیہ بیگم بلگرامی، نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ قصہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان کو، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، کوئی نہ کوئی ہنر ضرور سیکھنا چاہئیے۔ اندرپرست کا شہزادہ، اسد، عصمت نامے ایک چرواہے کی لڑکی پر عاشق ہوتا ہے۔ یہ لڑکی قالین بننے کے کام میں فرد ہے، اور جب بادشاہ کی طرف سے اس کے پاس شادی کا پیام پہنچتا ہے تو وہ اس شرط سے منظور کر سکتی ہے کہ شہزادہ اسد پہلے کوئی ہنر سیکھ لے۔ چنانچہ اسد کمخواب کا کام سیکھنے کے بعد اپنی مراد کو پہنچتا ہے اور عصمت سے اسکی شادی ہو جاتی ہے۔ اور جب ایک شقی القلب ہنت کے فریب میں آکر اسد قید ہو جاتا ہے تو وہ اسی ہنر کی بدولت اپنی بیوی کو اپنے حالات سے آگاہ کرتا ہے اور آخر کار عصمت کی کوشش سے آزادی حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں قصہ دلکش ہے اور اس کی زبان شستہ اور صاف ہے۔ تاہم اس میں ایسی چند لغزشیں ہیں جن سے مس صاحبہ کو آگاہ کر دینا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں مثلاً آج سے ہزار برس پہلے اندرپرست میں مسلمان بادشاہ حکومت نہیں کرتے تھے اور اسی وجہ سے زیادہ مناسب ہوتا اگر بجائے اندرپرست کے کسی اسلامی شہر کو شجاع الملک کا تخت گاہ قرار دیا جاتا۔ تاریخی فسانہ نگاری کا یہ ایک مشہور اصول ہے کہ اگر کسی خاص تاریخی مقام کا ذکر کیا جائے تو قصہ میں کوئی ایسی بات نہ آنے پائے جو اس مقام کے مستند تاریخی حالات کے قطعاً خلاف ہو۔ شجاع الملک کی نشانہ بازی کے ضمن میں بندوق کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ آج سے ہزار برس پہلے ہندوستان میں بندوق کا وجود نہیں تھا۔ جب اسد ہنت کے یہاں قید ہوا ہے تو چونکہ اس سے کمخواب بنوانا منظور تھا اس لئے اس کو ایک ہوادار کمرہ رہنے کو اور عمدہ غذائیں کھانے کو دیجاتی تھیں چنانچہ انھیں غذاؤں کی بدولت اسکے ساتھی عنبر کی صحت درست ہو چلی تھی باوجود اس کے جب ملکہ عصمت نے ان کو قید سے چھڑایا تو "وہ دبلے اور شل کانٹے کے تھے" اسی طرح شہزادہ اسد عصمت سے پہلی مرتبہ ملنے کے بعد جیسے ہی لوٹ کر گھر آتا ہے ویسے ہی اس کے مصاحب عنبر کی طلبی بادشاہ کے حضور میں ہوتی ہے اور بادشاہ اس سے اسد کی کیفیت پوچھتا ہے اور کہتا ہے کہ "اس کا (یعنی اسد کا) رنگ روز بروز تبدیل ہوتا جاتا ہے" اور اسد اس تغیر کی وجہ یہ بتلاتا ہے کہ "شاہزادہ اسد ایک چرواہے کی لڑکی پر عصمت جسکا نام ہے فریفتہ و شیدا ہے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان کچھ دنوں کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اور اس عرصہ میں بادشاہ کو اسد کی حالت کا احساس ہوا ہے اس لئے فسانہ نگار کو چاہیئے تھا کہ وہ بادشاہ کے حضور میں اسد کی طلبی اسد اور عصمت کی پہلی ملاقات کے دن سے کچھ زمانہ بعد کراتیں۔ ہم کو امید ہے کہ اپنی آیندہ تصانیف میں مس بلگرامی ان باتوں کا لحاظ رکھیں گی۔

اقوال بدھ مترجمہ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب (انڈین پریس الہ آباد قیمت ۱۲)

یہ کتاب بودھ مت کی مشہور کتاب دھم پد کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے شروع میں مترجم نے ایک مختصر سا دیباچہ گوتم بدھ کے حالات پر لکھا ہے۔ جن لوگوں کو مذہبی تحقیقات سے دلچسپی ہے، وہ اس کتاب کے مطالعہ سے ضرور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

واسدیو شاستری

امثال: اردو و پنجابی ضرب الامثال کی مبسوط کتاب جس میں ضرب الامثال پر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے مفید اور کارآمد ہونے کے لئے اسکے لایق مصنف، خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب

اخبار نویسان لاہور

انڈین پریس الہ آباد

(ریاست بھاولپور پنجاب) کا نام کافی ضمانت ہے۔ مرزا صاحب علمی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ کتاب کی تصنیف سے مصنف کی غرض یہ ہے کہ اُردو میں زیادہ حصہ پنجابی زبان کا شامل ہے پنجابی زبان قابل اصلاح اُردو ہے اور اُردو اصلاح شدہ پنجابی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اُردو میں سب سے زیادہ پنجابی زبان ہے اسکے بعد ہندوستان کی اور مختلف زبانیں حقیقت میں اُردو ایک ایسی دلچسپ اور ہر دل عزیز زبان ہے جسکے دعویدار تمام ہندوستان کے لوگ ہو سکتے ہیں اور اسی بنیاد خیال پر اسکا آغاز ہوا ہے۔ لیکن اس کتاب میں مصنف کے فلسفیانہ خیالات نے پرانی شلوں میں نئی روح پھونکدی ہے۔

ضرب المثل یا کہاوت کیا چیز ہے؟ اسکے متعلق مختلف حکماکے اقوال نقل کئے ہیں۔ کہاوت کی وجہ تسمیہ لکھی ہے۔ امثال کے وضع کرنے کا قاعدہ لکھا ہے۔

امثال اور اقوال کا فرق دکھایا ہے۔ دوہوں میں ضرب الامثال کا ہونا ثابت کیا ہے۔ محاورات اور امثال کی نسبت بیان کی ہے۔ امثال کا محل استعمال بتایا ہے۔ اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ضرب الامثال سے چال چلن، عادات، معاملات، رفتار زندگی، اخلاق اور معاشرتی امور پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ امثال پر جو تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ بعض امثال کی بہت واضح تشریح کی ہے۔ مصنف کی رائے ہے کہ اگر پنجاب کی کل کہاوتیں جمع کی جائیں تو پندرہ بیس ہزار سے کم نہوں لیکن کتاب میں صرف ملتان، جالندھر، میانوالی کی کہاوتیں جمع کرنیکا موقع ملا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ لایق مصنف اس کمی کو بھی پورا کر دیں گے اور پنجاب کی کل مثلیں جمع کر دینگے۔ آخر میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ لایق مصنف نے اپنی اس بیش بہا تصنیف میں اُردو کی فصاحت زبان کا کافی خیال نہیں رکھا اور بہت سے غیر فصیح الفاظ مثل شیئں اشیا کی جگہ، لکھوں لاکھوں کی جگہ اور ڈاہری ڈاڑھی کی جگہ لکھے ہیں جو زبان کے لئے مضر ہیں۔ ۱۶۳ صفحہ پر کتاب ختم ہوئی ہے ۱؍ قیمت۔ مصنف کے پتہ سے مل سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں اپنے موضوع پر اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب لکھی گئی ہے جو ہر طرح قابل قدر ہے۔

ملیریل فیور یعنی موسمی تپ: مولفہ ڈاکٹر محمد شریف خانصاحب اسسٹنٹ سرجن، ہوشیارپور۔ اس کتاب میں مصنف نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ موسمی بخار وبائیہ امراض سے ہے اور اسکا باعث وہ کیڑے ہیں جو متعدی امراض، پانی، ہوا، یا اور سببوں سے انسان کے جسم تک پہنچتے ہیں۔ اور ان کی شناخت یہ ہے کہ تپ اوقات مقررہ پر آتی ہے۔ اسباب امراض کے متعلق تحقیق سے کام لیا ہے۔ بخار کے کیڑوں کی قسموں کا بیان کیا ہے۔ بخار پیدا کرنے والوں مچھروں کا بیان تفصیل سے کیا ہے۔ مدافعت کی عمدہ تدبیریں لکھی ہیں۔ موسمی بخار پیدا کرنے والے کیڑوں کی مختلف تصویریں دکھائی ہیں۔ مچھروں کی تصویریں بھی دی ہیں۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ اُردو زبان میں اس قسم کی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ ان تمام خوبیوں کے لحاظ سے آٹھ آنہ قیمت بہت کم ہے۔

گل صد برگ یعنی صد رباعیات رنجور: مولفہ شمس العلما خان بہادر مولانا محمد یوسف جعفری عظیم آبادی، چیف مولوی بورڈ آف اگزامنرز کلکتہ۔ ان رباعیوں میں مصنف نے اخلاق و حکمت کے مسائل نظم کئے ہیں۔ رباعیوں کے نفس مطالب وہی ہیں جو عام اخبارون میں مسلمان اُن کی طرف سے پیش ہوتے رہتے ہیں یا اخلاق و پند کے مضمون بہت اختصار سے لے لئے ہیں لیکن رباعیوں نے نظم کی وقعت نہیں حاصل کی۔ مولانا اگر انھیں باتوں کو بوضاحت نثر میں لکھتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہم دو ایک رباعیاں لکھتے ہیں جنمیں شاعری کی

کمزوری کے ساتھ طنز بھی کیا گیا ہے۔

صاحب بننے کا شوق تجکو ہے اگر کر آنکھیں کرنجی اور گلٹ چہرے پر
بھورے کر بال سر کے اور مونچھوں کے یہ سب ہو تو پھر تجکو کہیں ہم مسٹر

کہتے ہو شدھی میں ہیں سلم شامل دعویٰ یہ تمہارا ہے سراسر باطل
سرکار کو معلوم ہے سلم کیا ہیں کیا چاند پہ خاک ڈالنے سے حاصل

بیفائدہ کیوں طاعتِ معبود کرو یا قوم کی کچھ بھی فکر بہبود کرو
لندن سے تو ہو آئے بن بے کیا غم ہے بندر کی طرح خوب اچھل کود کرو

اسی طرح لایق مصنف نے اور بھی رباعیاں لکھی ہیں لیکن ادبِ اردو کے لحاظ سے ایسی الجھی ہوئی نظم سے نفس مطلب کا اردو نثر میں ادا کردینا بہت مفید ہوتا۔ کتاب مصنف کے پتے سے ملسکتی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

غنچۂ نوبہار: سید حسن مرتضیٰ صاحب شفق عمادپوری رفیع گنج ضلع گیا کی ردیف وار رباعیوں کا مجموعہ ہے جو پاکٹ سائز پر چھپا ہے۔ مولوی شفق صاحب امیر مرحوم کے شاگرد ہیں۔ یہ دوسو رباعیوں کا مجموعہ ہے جس میں حمد و نعت منقبت، عاشقانہ، رندانہ، صوفیانہ، قومی، اخلاقی، سب طرح کی رباعیاں موجود ہیں۔ گو ردیف وار کی قید نے بعض رباعیوں میں شاعری کا اچھا رنگ نہ آنے دیا تاہم مجموعی طور پر کلام اچھا ہے۔ قیمت ۴ر

تحقیق سخن: مصنفہ شفق عمادپوری۔ اصلاح سخن اور اردو میں صحیح مذاق شاعری پیدا کرنے کی غرض سے کتاب لکھی گئی ہے۔ عیوب شاعری، تعقید، حشو زوائد، مقدرات، بے محل شتر گربہ، ذم کا پہلو، مبتذل، قیود سخن، متروکات محاورات، تذکیر و تانیث، عطف و اضافت، قوافی اور اصناف شعر کا بیان وضاحت سے لکھا ہے۔ اکثر تو وہی باتیں ہیں جنکو شوق نیموی مرحوم اپنے رسالہ ایضاح میں لکھ چکے ہیں لیکن بعض بعض جگہ مصنف نے مزید تحقیق سے کام لیا ہے۔ نو مشق شعرا کے لئے بالخصوص اور شعرا کے لئے بالعموم یہ کتاب مفید ہے اور جناب شفق کی کوشش اور محنت قابلِ داد ہے مولف سے ۸ر قیمت پر ملسکتی ہے۔

اتالیق بی بی: مصنفہ چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار و رئیس ردولی ضلع بارہ بنکی جس میں بی بی کی شوہر پر بیجا حکومت اور ناقابل برداشت نکتہ چینیوں کا خاکا اڑایا گیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک کتاب زن مرید مطبوعہ نولکشور پریس کا اختصار ہے جسکو مولف نے نہایت قابلیت سے مختصر کیا ہے۔ تصنیف کو قدیم کہو یا عبارت آرائی کے لحاظ سے جدید لیکن مصنف کی محنت ہر طرح قابل داد ہے۔ قیمت ۸ر دلگداز پریس لکھنؤ سے ملسکتی ہے۔ کتاب مستورات کے پڑھنے کے لایق ہے۔

بھیشم پتامہ: مصنفہ ٹھاکر سکھرام داس چوہان مالک اخبار راجپوت گزٹ لاہور۔ اس میں بھیشم کے مقتدر کارناموں اور زبردست بہادریوں کا مفصل ذکر ہے اور ہر ایک برہم چاری کے دیکھنے کے لایق ہے۔ مولف نے اس کتاب کو مہا بھارت سے اخذ کیا ہے اور غلط واقعات کی تردید کرکے اصل حالات کو روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ جابجا تصویریں بھی دی ہیں۔ زبان آدھی اردو اور آدھی ٹھیٹھ ہندی ہے۔ ہمارے نزدیک اگر ہندو احباب خواہ مخواہ اردو کے گلے پر چھری چلاتے ہیں اور زبردستی اس میں ٹھیٹھ ہندی الفاظ بھر دیتے ہیں صرف ہندی زبان میں کتابیں تصنیف کیا کریں تو اردو پر احسان کریں لکھائی چھپائی معمولی ہے قیمت ۸ر

تعرضِ اٹلی و مظلوم طرابلس: حاجی محمد اسمٰعیل خانصاحب صبر بلبل تسلیم" (محلہ کنڈہ۔ رام پور) نے کریما پر مصرع لگا کر اٹلی کے مظالم کو نظم کیا ہے اور ترکوں اور عربوں کی بہادری دکھائی ہے۔ ہماری رائے میں اس قسم کے واقعات کو نظم میں لکھنا ملک کے لئے مفید نہیں ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ مصنف نے بہت محنت سے کریما کو مسدس

کیا ہے اور واقعات کو شیخ سعدی کے کلام سے مطابقت دینے میں جو تکلیف گوارا کی ہے وہ ہر طرح قابلِ داد ہے۔ قیمت ۳ر

سوانح عمری شہنشاہ جارج پنجم: مصنفہ پنڈت اودے نراین صاحب باجپئی۔ جس میں شاہ معظم کے عالم طفلی سے تخت نشینی تک کے مفصل حالات سادہ عبارت میں لکھے ہیں مگر زبان بہت کمزور اور غیر فصیح ہے تسپر۔ جدے جدے دے وغیرہ ایسے الفاظ استعمال کئے گئے جنسے زبان اردو پر بدنما دھبہ آتا ہے۔ واقعات کے اعتبار سے کتاب اس قابل ہے کہ طلبا میں تقسیم کی جائے تاکہ وہ اپنے بادشاہ کے حالات پڑھکر استفادہ حاصل کریں۔ اس کے مطالعے سے ان کے دل میں وفاداری کا نقش مستحکم ہو گا۔ کتاب کا سائز بھی اسکولی کتابوں کے برابر ہے۔ شروع میں شہنشاہ معظم کی تصویر بھی لگائی گئی ہے۔ قیمت ۴ر کتاب ملنے کا پتہ پنڈت رام پرتاپ سنگھ یتواری ساکن اوریا ضلع اٹاوہ۔

ع۔ ع۔ لکھنوی

کلامِ شاد

(از یمین السلطنت مہاراجہ بہادر سرکشن پرشاد صاحب مدارالمہام ریاست نظام باقبالہم)

جام اک بھر کے دے اے پیرِ خرابات مجھے
کردے اب بہرِ خدا مستِ مے ذات مجھے

محو فی الذات ہیں خورشید سے نسبت ہے انھیں
نظر آتے ہیں جو اُڑتے ہوئے ذرّات مجھے

یار بر میں ہے ادھر جام لئے ہے ساقی
کس لئے راس نہ آئے گی یہ برسات مجھے

واعظا پند و نصیحت یہ کسے کرتا ہے
دل لگے جس سے سنا ایسی کوئی بات مجھے

چشمِ موسیٰ یہی کہتی ہے کہ لے جلوۂ طور
یاد اب تک ہے وہ اندازِ ملاقات مجھے

ذکر میرا وہ کیا کرتے ہیں کس خوبی سے
بھری محفل میں سنا دیتے ہیں صلوات مجھے

زلف اور رُخ کے تصور میں گذرتی ہے مری
جی بہلنے کا یہی شغل ہے دن رات مجھے

رند مشرب ہوں نہیں زہد و عبادت سے غرض
شاد آتی نہیں پابندیِ اوقات مجھے

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
روح تھا تو، اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
صورتِ روحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ! تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر* میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیٔ دلسوزیٔ پروانہ ہے

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرہ ذرہ میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

اقبال

غالب

غالبِ گل افشاں کے گل بن سے ہے آب آبرو رنگِ کلام دیکھ کر، رنگِ رخِ شباب زرد
نثر کی گرمیٔ بیاں، جس سے ہے آفتاب سرد نظم میں کثرتِ سرور، جس سے شرابِ ناب گرد

حُسنِ کلام اس قدر، جس سے ورق ورق حسیں
نورِ بیاض اس قدر، جس سے عرق عرق جبیں

معنی و لفظ کی یہ شکل، بو ہو سمن میں جس طرح نور نظر میں جس طرح، لطف سخن میں جس طرح
نغمہ ہوئے میں جس طرح، حرف دہن میں جس طرح نشہ ہوئے میں جس طرح، روح بدن میں جس طرح

شوخ ادا سے ہو خجل، دیدۂ نازآفریں
جوشِ صفا پہ کہہ اُٹھے، آئینہ ساز "آفریں"

خامے میں بانکپن کی نوک، موئے مژہ ہے جس سے خم فکرِ رسا وہ تیز رَو، جس سے ہے سرنگوں قلم
طبعِ لطیف، رنگ سے، رو کشِ گلشنِ ارم صرفِ خیال تا فلک، ظرفِ دماغ جامِ جم

صوفیٔ صاف دل کو وجد، مسلکِ صوفیانہ پر
محوِ خیالِ نغمہ سنج، خوبیٔ ہر ترانہ پر!

حُسنِ بیاں کو "غالب" آج، فخر ہے تیرے نام پر لطف سے ہو کلیم کو، وجد ترے کلام پر
تیرے سوادِ نظم کو فوق اودھ کی شام پر تیزیٔ خامہ، تیز دست، خنجرِ بے نیام پر

شاہِ قلمروِ سخن، تیرا قلم، جہان میں
نام ترا بلند ہے، مثلِ علم، جہان میں

رونقِ بزمِ علم و فن، ہے، تو تری رقم سے ہے تختۂ گل، زمینِ شعر، ہے تو ترے قلم سے ہے
دامنِ بحر، پُر گہر، تیرے یمِ کرم سے ہے پیکرِ معنوی میں جان، تیری زباں کے دم سے ہے

قوتِ سحرِ سامری، آئی تری زبان میں
بول اُٹھا کلام خود، جان پڑی بیان میں

عنصرِ نظمِ عنصری تیری زباں کے ساتھ ہے نورِ بیانِ انوری تیرے بیاں کے ساتھ ہے
بحرِ سخن، برنگِ موج، طبعِ رواں کے ساتھ ہے حُسنِ کلام، مثلِ لب، تیرے دہاں کے ساتھ ہے

قوتِ ناطقہ کی شان نطق سے تیرے بڑھ گئی

---

* ویمر وہ مقام ہے جہاں جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے مدفون ہے۔

اوج سے ہر زمینِ شعر عرشِ بریں پہ چڑھ گئی

گو اسدی کی نظمِ رزم تیرے کلامِ نظم میں   نظمِ نظامیہ کی شان تیرے نظامِ نظم میں

حوتِ فلک، سمک کی طرح ہے ترے دامِ نظم میں   مستیٔ فہم کے لئے مے ترے جامِ نظم میں

لوحِ جبینِ عشق و حسن، تیری رقم کے بس میں ہے

طائرِ سدرہ کی زباں تیرے قلم کے بس میں ہے

معنیٔ نو بہ نو سے، تو، نظم میں جدت آفریں   صورِ صریرِ کلک سے، ہاتھ، قیامت آفریں

قدرتِ طبع، قدرت، قادرِ قدرت آفریں   معرکۂ سخن میں تو، غالب نصرت آفریں

قوتِ جاذبہ میں آج تیرا کلام فرد ہے

شمس کشش میں گھٹ گیا، رنگ اسی سے زرد ہے

زور ترے دماغ کا از درِ خدا سے صرف کم   شور ترے کلام کا حشر کے شور سے بہم

لفظ میں صورتِ دماغ، قوتِ جوشِ عشق ضم   حرف میں مثلِ مردمک حسن کی شکل مرتسم

زیر ہے زورِ ضربِ برق، تیری خرد کے زور سے

راز کو کھولے تیری فکر پردۂ چشمِ مور سے

گرچہ ترے خیال میں بال و پرِ ملک نہیں   سرعتِ سیر میں، مگر، رشک ہو ملک کو شک نہیں

نورِ بیاں کے سامنے برق میں کچھ چمک نہیں   بحرِ سخن میں، تو ہے، جزر کا نام تک نہیں

اوجِ سخن پہ داغ داغ رشک سے سینۂ فلک

بحرِ سخن میں ہو گیا غرق "سفینۂ" فلک

گردِ جہاں ہے کس لئے، گردشِ تیز تیزِ چرخ   پائی زک اوجِ طبع سے، بچ کے ہے یہ گریزِ چرخ

تیرے فروغ سے ہے داغ خسروِ صبح خیزِ چرخ   رنگِ سخن سے فق ہوا چہرۂ رنگ ریزِ چرخ

تیری بلند نظم کو پیش اگر کرے قلم

فہمِ دبیرِ چرخ کو زیر و زبر کرے قلم

بحثِ معانی و بیاں، تجھ سے مطول اس قدر   جس کی رقم کو دو جہاں مثلِ دو ورقہ مختصر

شمس ہے دو حدوں میں قید، نور اسی پہ منحصر   نور ترے خیال کا کون و مکاں میں جلوہ گر

ارض و سما کی صورتیں یوں ہیں ترے خیال میں

جیسے پھنسے ہوئے طیور جمع ہوں ایک جال میں

تیرے قلم کا ٹھیک صف ہے، تو زباں راز ہے   تیری رقم کا دائرہ، دیدۂ نیم باز ہے

تیرا بیانِ عشق و حسن باعثِ فخر و ناز ہے   عشق کا دل گداز ہے، حسن کا دل نواز ہے

قلتِ سستیٔ سخن، جس سے نہ ہو کلام سست

کثرتِ چستیٔ سخن، جس سے سخن تمام چست

اپنی شکست سے نجوم، جوئیں ہیں شرر فشاں   سوزشِ دل کے ساتھ ہے شمس زمیں پہ زر فشاں

کھا کے تپانچہ ہوا، شاخِ شجر ثمر فشاں   دامنِ صفحہ پر مگر ہنس کے ہے تو گہر فشاں

نثر پہ چل رہے ہیں لب، نظم پہ چل رہے ہیں لب

پھول کھلا رہے ہیں لب، لعل اگل رہے ہیں لب

تیرا تصور سریع، سیر پہ کچھ پھڑک گیا   رخ جو کیا زمیں کے رخ، سطح سے تا سمک گیا

سوئے فلک چلا، تو کیا، صرف سرِ فلک گیا   بلکہ خدائے پاک کے پردۂ راز تک گیا

قلب میں آئے جو رموز، قلب کے زورِ طلب سے

صفحے کو سب وہ دے دئے، کلک نے تیکے قلب سے

بہرِ ثبوت نورِ حسن، خط ترا خود گواہ ہے   صفحے پہ ہے سوادِ خط یا شبِ نیم ماہ ہے

نقطۂ نوں ہے داغِ ماہ، نون بشکل ماہ ہے   نقطۂ نوں ہے یوسف، اور، نون کا حلقہ چاہ ہے

تیرا قلم ادا شناس حسن کی ہر سرشت کا

زائچہ کھینچتا ہے وہ عشق کی سرنوشت کا

فطرت اگر ہے قفل، تو، کلک ترا کلید ہے   عشق نگاہ کے لئے حسن رقم نوید ہے

رنگ ترے کلام کا، رنگِ رخِ امید ہے   نور تری بیاض کا، خندۂ صبحِ عید ہے

آنکھ میں تیرا لفظ لفظ مردمکِ سیاہِ **شوق**

شوق سے جوشِ شوق پوچھ، شوق ہے خود گواہِ **شوق**

احمد علی شوق

برکھارت کی آمد

ہے طبعِ رواں کو جوشِ ساقی!   آیا دمِ نائے و نوشِ ساقی!

پیاسے ہیں سال بھر کے ساقی!   لا جام پہ جام بھر کے ساقی!

کم ہو جو شراب ارغوانی　دیدے تھوڑا ملا کے پانی
ساقی! دل کی لگی بجھا دے　بوتل کوئی برف میں لگا دے
ٹھنڈی ٹھنڈی پلا گلابی　رنگت ہوئی زرد لا گلابی
برکھا رُت اب ہے آنیوالی　گرمی کی ہے فصل جانیوالی
لیکر ابرِ سیہ کی چھاگل　بھر دیگا فلک زمیں کو جل تھل
ساقی! دریا دلی دکھا دے　کیا دیر ہے خم کے خم لنڈھا دے
آتے ہیں آندھیوں کے جھونکے　صر صر کے چل رہے ہیں پنکھے
کھولا ہے سمندروں کا پانی　اُٹھتے ہیں ابخرے دُخانی
گردوں پہ دھواں سا چھا رہا ہے　اُڑ اُڑ کے غبار جا رہا ہے
سورج کے اب ہیں نت نئے روپ　ہلکی ہے کبھی۔ کبھی کڑی دھوپ
مُنہ پر کبھی گرد کا ہے آنچل　سر پر کبھی ابر کا ہے کمّل
کیا جانے کب کا ہے بروگی　بنتا ہے بھبھوت مَل کے جوگی
اُمڈینگی اب گھٹائیں گھنگھور　بن سے نکلیں کے ناچتے مور
بوندیں بھی برسینگی جھما جھم　ہوں گے نئے تال اور نئے سم
جھینگر کے سُریلے ساز ہوں گے　کیا نغمۂ دلنواز ہوں گے
پُر درد پپیہوں کی فغاں سے　ہلجائیں گے قلب "پی کہاں" سے
برسیں گے گرج گرج کے بادل　مچ جائیگی آسماں پہ ہلچل
گونجینگے رعد بھی کڑک کر　کوندیگی برق بھی چمک کر
ندی نالے اُبل پڑیں گے　فوارے بھی سب اُچھل پڑینگے
بھر لینگے خزانے حوض و تالاب　ہو جائیں گے مرغزار شاداب
شاخیں لائیں گی سبز کوپل　صحرا میں بچھیگا فرش مخمل
ہوگی قوسِ قزح کی محراب　ہالے کی طرح نثار مہتاب
پھیلے گی نکھر کے چاندنی صاف　بلّور کا طشت جیسے شفاف
دُھلجائیگی سطح آسمانی　پہنے گی زمیں لباس دھانی
لہرائیگا پائمال سبزہ　ہو جائیگا اب نہال سبزہ

بکھرائے گا کالے بال سنبل　پھیلائیگا اپنے جال سُنبل
بننے کو عروس بزم گلشن　ہونٹوں پہ مسی ملیگی سوسن
آنکھیں ملتی اُٹھے گی نرگس　کاجل ڈوروں میں دیگی نرگس
دیکھے گا تو ہو گا باغباں دنگ　جوہی کی قبائے نازک و تنگ
جوڑا بدلے گی یاسمن بھی　پہنے گا تاج نارون بھی
لالہ باندھے گا سُرخ دستار　اوڑھینگے ردائے سبز اشجار
بنجائیگا خضر سرو آزاد　دو ہاتھ بڑھے گا اور شمشاد
قمری بھی گلے میں طوق ڈالے　سر حلقۂ جیب سے نکالے
منصور کے بھیس میں سر دار　حق حق کا دم بھریگی ہربار
کھا کھا کے ہوائے دامنِ گل　پھولے نہ سمائے گی جو بلبل
ارمان نکالنے کو جی کا　چومے گی مُنہ کلی کلی کا
پھولوں سے چھا کے آشیانہ
گائے گی شفق کا یہ ترانہ
برسات کی رُت ہے پیاری پیاری　دُربار ہے ابرِ فیض باری
پودے سرسبز۔ کھیت شاداب　جھیلیں لبریز۔ نہریں جاری
صحرا۔ گلزار۔ دشت۔ کہسار　سب میں ہے نئی شگوفہ کاری
نرگس۔ سوسن۔ بنفشہ۔ سنبل　تصویر مرقعِ بہاری
صف بستہ کھڑے ہیں سرو و شمشاد　آتی ہے بہار کی سواری
ہنستا ہے جو کھلکھلا کے غنچہ　کہتی ہے صبا "میں تجھ پہ واری"
شاعر ہو تم شفق کہ ساحر
یہ شاعری ہے کہ سحر کاری

شفق عمادپوری

رباعی شاکر

روتا ہوں میں دوستو! مجھے رونے دو　دامن پہ ہے داغِ معصیت دھونے دو
اب نزع کی حالت میں وصیت کیسی　جاؤ بھی! ہٹو! غل نہ کرو، سونے دو

چہرۂ جاناں

دلِ فریفتہ اکدن جو بیقرار رہا   حدیثِ دردِ محبت کا راز دار ہوا

مرا تحیرِ پُر ذوق لے اُڑا مجھکو   اُڑا تو کوچۂ دلدار کا غبار ہوا

ضیائے جلوۂ قدرت تھی رہنما میری   فرازِ عرش پہ جا کر بھی اشکبار ہوا

شہودِ عالمِ اظہار تھی مرے دل میں   مین گھر کو چھوڑ کے اپنے خراب و خوار ہوا

شناخت اپنی رُخِ یار کا تعارف ہے   ہوا جو مستِ تدبر تو ہوشیار ہوا

مری تلاش میں تھی چشمِ یار عشق پسند   پڑی وہ آنکھ جو مجھ پر تو مین شکار ہوا

نمودِ حُسن بنی مجھکو ناوکِ دلدوز   مرا ہی تیرِ نظر میرے دل کے پار ہوا

ہر ایک شے ہی مجھے برق طور جلوۂ یار   قدم قدم پہ مین ہر چیز پر نثار ہوا

صنم کدہ ہی حرم بھی اگر نہ صاف ہو دل   جنابِ شیخ کہاں جا کے شرمسار ہوا

گدازِ سوزِ محبت دلِ صفا کے لئے

چراغِ نور ہے اک رویتِ خدا کے لئے

نہیں ہے چہرۂ جاناں سے بے نیاز کوئی   نہ ہو غرورِ عبادت پہ مست ناز کوئی

فزودِ ہوش کی خاطر بنا رکوع و سجود   خلوص و صدق و صفا سے پڑھے نماز کوئی

ہے واقفانِ صفا و وفا کا یہ معراج   کرے تو علم و جہالت میں امتیاز کوئی

تصوراتِ خیالی کی احتیاج کہاں   تشخصاتِ مجازی بھی ہیں مناز کوئی

کہاں وہ نورِ مجرد کہاں تصورِ شیخ   سکھا رہا ہے یہ کیسی زمانہ ساز کوئی

عیاں نمودِ حقیقت جو لاالہ میں ہو   تو کیوں یہاں پہ بنے عاشقِ مجاز کوئی

ہمارے دامنِ دل میں ہے دولتِ توحید   ستائیگا ہمیں کیا اب فسانہ باز کوئی

فروغِ حسنِ حسیناں سے بے نیاز ہیں ہم

اب اپنے عالمِ جاں میں نظارہ باز ہیں ہم

لڑی ہے جا کے محبت مری نگاہ کہاں   نکالی آہ دلِ مبتلا نے راہ کہاں

کہاں یہ کھولی تھی مین نے زبانِ زمزمہ سنج   کیا ہے جا کے فرشتوں نے واہ واہ کہاں

مین دیکھے دل انھیں ہر غم سے ہو گیا آزاد   اس انبساط کو پائیں گے بادشاہ کہاں

نیاز مند بنا مین تو سر بلند ہوا   لگا ہے جا کے مرا گوشۂ کلاہ کہاں

ہے چشمِ یار نہاں ہیں کھلی ہوئی ہر سو   فریبِ نفس کو محکوم کو پناہ کہاں

اگر یہ علم ہو حاصل کہ ہے وہ یار بصیر   تو آدمی سے بھلا ہو سکے گناہ کہاں

ہمیں نیاز کی عادت تجھے ہے ناز اے شیخ   ہمارا ساتھ ترے ہو بھلا نباہ کہاں

مقامِ عشق میں گنجایشِ غرور نہیں

کرے وہ ناز بیاں پر جسے شعور نہیں

مخل تو شیخ مری لذتِ فنا میں نہ ہو   تو سنگِ راہ رہِ شایقِ بقا میں نہ ہو

ترے تصورِ حادث کی بخ نہیں اسلام   نہ کہہ وہ بات جو تعلیمِ انبیا میں نہ ہو

نگاہِ محوِ تجلیِ یار کو ہے فریب   ترا ضمیر کسی اور ہی ہوا میں نہ ہو

طوافِ کوئے حرم کو چلا ہے تو گھر سے   صنم کدہ کہیں لیکن تری قبا میں نہ ہو

وہ رازِ ہوش ہو جسکی تجھے تلاش یہاں   نہاں کہیں وہ دلِ رندِ باصفا میں نہ ہو

خدا کیواسطے اے چارہ گر نہ چھیڑ مجھے   دعائیں مانگ رہا ہوں اثر دوا میں نہ ہو

یہ افترا ہے کہ سچی خوشی نہیں ملتی   یہ بات کہہ کے مخل بزمِ اصفیا میں نہ ہو

چھپا ہی رنج اُٹھانے میں رازِ عیش دوام   محال ہے کہ خوشی اُلفتِ خدا میں نہ ہو

دلوں میں ہائے مگر جذبۂ صفا ہی نہیں

سوا بتوں کے کسی سے وہ آشنا ہی نہیں

ستم ہے رہروِ آئینِ مصطفےٰ ہو کر   غلامِ ہمتِ سالارِ انبیا ہو کر

دلوں سے باندھکے قولِ وفائے عہدِ الست   زباں سے کیشِ صفا کے سخن سرا ہو کر

جہاں میں بنکے رفیقِ امانتِ توحید   امینِ دولتِ محبوبِ کبریا ہو کر

رسولِ پاک کی باتوں پہ دل کو کر کے گواہ   جمالِ چہرۂ جاناں کے آشنا ہو کر

اسیرِ زلفِ بتاں ہو گئے انیس خدا   بجھا یا شمعِ خرد کو چراغِ پا ہو کر

نگاہ جسپہ کروہے وہ قیس اور فرہاد   یہ پھر رہے ہیں یہاں کس کے مبتلا ہو کر

بڑھا ہے سارے زمانہ میں انکا فسق و فجور   خدا سے دُور ہوئے بندۂ خدا ہو کر

نگاہِ لطف رسولِ امیں خدا کے لئے   کہ رہ گئی ہے تری قوم کیا سے کیا ہو کر

حمید بیدل و مضطر ہے مبتلائے الم   یہ کہہ رہا ہے وہ حافظ کا ہمنوا ہو کر

غلام نرگس مست تو تاجدارا نند
خراب بادۂ لعل تو ہوشیارا نند

قاضی حمید الدین احمد حمید

کلام اکبر

بذریعہ بابو نراین چندر چٹرجی

جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا
اب خشک فراج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا

ناوک فگنی سے ظالم کی جنگل میں ہے اک سناٹا سا
مرغان خوش الحاں ہوگئے چپ آہو نے اچھلنا چھوڑ دیا

کیوں کبر وغرور اس دور پہ ہے کیوں دوست فلک کو سمجھا ہے
گردش سے یہ اپنی باز آیا یا رنگ بدلنا چھوڑ دیا

بدلی وہ ہوا گذرا وہ سماں وہ راہ نہیں وہ لوگ نہیں
تفریح کہاں اور سیر کجا گھر سے بھی نکلنا چھوڑ دیا

وہ سوز وگداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

کیا دین کو قوت دیں یہ جواں جب حوصلہ افزا کوئی نہیں
کیا ہوش سنبھالیں یہ لڑکے خود اس نے سنبھلنا چھوڑ دیا

اقبال مساعد جب نہ رہا رکھے یہ قدم جس منزل میں
اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے ابلنا چھوڑ دیا

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار ونشاں سب قایم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ میں چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سر سبز شجر امید کا تھا
جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

اس حور لقا کو گھر لائے ہو تمکو مبارک اے اکبر
لیکن یہ قیامت کی تمنے گھر سے جو نکلنا چھوڑ دیا

فصل بہار کا آخری گلاب

اک زمانہ تھا پھول کھلتے تھے — غنچے ہنس ہنس کے باہم ملتے تھے
رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں — پتیاں تالیاں بجاتی تھیں
الوداع اب تو کہہ رہی ہے بہار — ہیں نمایاں خزاں کے سب آثار
باد صرصر اجاڑتی آئی — رنگ گلشن بگاڑتی آئی
دامن سبزہ چاک چاک ہوا — آتش غم سے جل کے خاک ہوا
آفریں تجھ پہ اے گلاب چمن — پر بہار اب بھی ہے ترا جوبن
گرچہ تو بھی کھڑا ہے سینہ فگار — تجھ سے باقی ہے یادگار بہار
تو انوکھا تھا تو نہال چمن — تجھ پہ موقوف تھا جمال چمن
حسن کا تیرے وہ اجالا تھا — مہ ترے رخ کا گویا ہالا تھا
اب تو ہے اور چمن کی تنہائی — نہ وہ باقی ہے شان برنائی
غنچہ ہے اب نہ پھول ہے کوئی — جو کرے آکے تیری دلجوئی
کوئی ہمدرد ہے نہ کوئی انیس — اٹھ گئے اس جہاں سے تیرے جلیس
دل میں میرے لگا ہے یہ کھٹکا — ہوگا انجام تیرا آخر کیا
کیا سموم خزاں سے تو بچکر — اے عروس چمن کے لخت جگر
زندگی پائے گا۔ نہیں ممکن — ق — جاں سے بچ جائیگا۔ نہیں ممکن
صدمے کب تک اٹھائیگا یوں ہی — کب تلک سر ہلائے گا یوں ہی
خون سب خشک ہوگیا ہے ترا — اور چہرے کا رنگ روپ پھرا
پتیاں تیری سب پریشاں ہیں — خاک ہونے کے سارے ساماں ہیں
آ تجھے بھی سلادوں چپکے سے — جس جگہ ساتھی سو رہے ہیں ترے
ایک ہی باغ میں کھلے تھے تم — ایک گہوارہ میں پلے تھے تم

نواب محمد صفدر علیخاں بہادر صفدر مرحوم

میں ہوں کسی وارفتہ کی تصویر پریشاں * آئینہ بھی صحبت سے مری ہوگیا حیراں

کیوں نہ تربت بھی ہو قریب قریب   کیوں جدائی ہمیں کبھی ہو نصیب

آمدِ موسمِ بہار کا صور   جب کریگا چمن میں شورِ نشور
ق
ایک گوشہ سے سب کے سب اُٹھنا   پھر اُسی طرح کھیلنا ہنسنا

آرزو بس یہی ہے میری بھی   آخرت ہو نصیب تیری سی

جبکہ احباب کوچ کرجائیں   ہم بھی دنیا سے پھر گذر جائیں

ہو نہ جینا جو شادمانی سے   فائدہ ایسی زندگانی سے
ق
یار رخصت ہوں خیر سے سارے   ہم پھریں اس جہان میں مارے

(ٹامس مور)

جے دیال سکینہ

منظر شام

شعاعیں پڑگئیں زرد آفتاب ہے لبِ بام   کہ دن کی عمر کا لبریز ہو چکا ہے جام

سوادِ دشت میں تاریک ہو رہا ہے مقام   تمام ہو گیا دن چھا گیا سکوتِ شام

غروب ہوگیا مغرب میں مہرِ گیتی فروز   سوادِ شام سے پھیکی ہے روشنائی روز

طپش سے دھوپ کی اب دل کو پیچ و تاب نہیں   ہوا کے جھونکوں میں گرمیٔ آفتاب نہیں

نظر فریب فضا دشت و کوہسار میں ہے   اور ایک طرفہ مہک بادِ خوشگوار میں ہے

چلی جو پھولوں میں بس کر نسیم عطر آگیں   فضائے دشت میں پھیلی شمیم عطر آگیں

یہ لطف دیکھکے کیونکر نہ دل کو فرحت ہو   کہ ہے نشاط فراخندۂ گلِ خود رد

سرور دل میں تری چشم پُر بہار میں ہے   کہ سازو برگِ فرح رنگ سبزہ زار میں ہے

نہیں ہے چرخ پہ سورج کی گرمیٔ بازار   تری سے ابر کے بھیگا ہے دامن کہسار

شفق بھی پھول کے گردوں پہ دے رہی ہے بہار   تمام گوشۂ مغرب بنا ہے لالہ زار

سحر کے ڈوبے ہوئے شام کو اُچھلنے لگے
ستارے ساحتِ گردوں پہ پھر نکلنے لگے

پہاڑ پر سے جو یہ آبشار جھرتا ہے   تمام دشت میں اٹھکھیلیوں سے پھرتا ہے

اُچھل رہا ہے کہیں پر کہیں پہ گرتا ہے   ہزار طرح سے چشمے کا پانی پھرتا ہے

کہیں تو اُسکا بھنور میں وہ گھوم کے پھرنا   کہیں وہ اُسکا لبِ جو کو چوم کے پھرنا

وہ آکے موج میں اُسکا کہیں پہ لہرانا   دکھا کے جوش کہیں پتھروں سے ٹکرانا

سوادِ شام سے پانی کی بڑھگئی ہے آب   نکھر گئی ہے سیاہی میں اور چادرِ آب

وہ دن کی طرح پپیہوں کا اژدحام نہیں   کنارِ آب کہیں آدمی کا نام نہیں

حواس باختہ اب مچھلیاں نہیں پھرتیں   کہ جوئے آب میں مرغابیاں نہیں گرتیں

وہ غل وہ شور وہ ہنگامہ وقتِ شام نہیں   خموش ہے لبِ جو کوئی تشنہ کام نہیں

سوادِ شام سے پُر دیکھکر ایاغِ شام   جلائے غول بیاباں نے بھی چراغِ شام

تمام کوہ و بیاباں سے اُڑ گیا ہے نور   سیاہی پھیل گئی روشنی ہوئی کافور

سب اپنے اپنے ٹھکانے لگے وحوش و طیور   کہ شب کو راحت و آرام ہے انھیں منظور

چرند چلدئے جنگل سے سب مکانوں کو
پرند اُڑگئے صحرا سے آشیانوں کو

حفظ الکریم حفیظ

سرزمین وطن

اے وطن کی سرزمیں کتنی بہار افزا ہے تو   باغِ عالم میں شگفتہ اک گلِ رعنا ہے تو

واقعی میرے لئے کاشانۂ جنت ہے تو   موجبِ عیش و طرب - سرمایۂ راحت ہے تو

تجھسے حاصل ہیں مجھے دنیائے فانی کے مزے   لوٹتا ہوں میں بہارِ زندگانی کے مزے

اے وطن کی سرزمیں اے گلشنِ عیش و نشاط   اے بہار بیخزاں - اے آسمانِ انبساط

تو ہے کوئی حور پیکر یا حسینِ مہ جبیں   مجھکو تڑپاتی ہے تیری ہر ادائے دلنشیں

عیش و عشرت میں رہوں یا بزمِ رحمت میں رہوں   رنج و غم یا حسرت و اندوہ و کلفت میں رہوں

پھرتی ہے ان آنکھوں میں رہ رہ کے روپوشی تری   ہو نہیں سکتی کسی صورت فراموشی تری

جا گزیں ہے یاد تیری عالمِ غربت میں بھی   عمر بھر بھولا نہیں تجھکو کبھی راحت میں بھی

وہ نسیمِ روح پرور - وہ ہوائے خوشگوار   وہ شمیمِ عنبر افشاں وہ بہارِ لالہ زار

سحر آگیں ہائے دلکش نغمہائے عندلیب   وہ ترو تازہ چمن - وہ نالہائے عندلیب

ہائے کیونکر بھول سکتا ہے مرا رنجور دل   ہو گیا ہے بادۂ اُلفت سے اب مخمور دل

تو بہارِ بیخزاں ہے - او وطن کی سرزمیں　　غیرتِ قصرِ جناں ہے - او وطن کی سرزمیں

عالمِ غربت میں گو حاصل ہو مجھکو انبساط　　بادۂ اُلفت سے ہو لبریز گو جامِ نشاط

سرزمینِ غیر کا دلکش ہو گو رنگِ بہار　　گو دکھائیں نوعروسانِ چمن اپنا نکھار

آہ ان میں تیری رعنائی کہاں سے آئیگی

دلربائی - جلوہ آرائی کہاں سے آئیگی

اوج گیاوی

آم

منظور ہے کہ آم کی کچھ داستاں لکھوں　　ٹپکے زباں سے رال وہ نادر بیاں لکھوں

بور آئے آم بولے یہ کویل کو دیکھکر　　لے رو سیہ بسنت کی ہے کچھ تجھے خبر

اور جب ہوا نمود تو اک آہ سرد بھر　　بولے کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے مگر

اُبھرے جب اور کچھ تو کہا دانت پیسکر　　ہم انبیا ہیں ہم سے ہے کیا نسبتِ بشر

تھوڑے ہی دن میں ایسے وہ کچھ سنگدل ہوئے　　ہمدم و ہمنشین و ہمراز سل ہوئے

خود سُر شرو تو تھے ہی کسی نے جو کہدیا　　گویا کہ نون مرچ یہ اوپر سے دی لگا

بدلا جو رُخ تو لاکھ لگائے کوئی صدا　　کانوں میں تیل ڈال کے بیٹھے سب ایک جا

کیا دیکھتے ہی دیکھتے رنگت بدل گئی　　اک وہ بھی کچی عمر کی مدت نکل گئی

پکے ہوئے اب ایسے نکل آئے بر ملا　　دھو ڈالی ساری شرم لگی اور ہی ہوا

بن ٹھن کے جب دُرست ہوئے کرچکے سنگار　　شاہ و گدا ہر ایک ہوا دل سے خواستگار

شیریں دہن رنگیلے رسیلے بنے ہوئے　　نیراں ملے کسی سے نہ اسپر تنے ہوئے

سرچڑھکے آئے پنجہ میں پھیلے تو کچھ دبے　　پہلو میں گدگدایا تو فوراً ہی کھل پڑے

گھونگٹ اُٹھا دیا جو بصد ناز و پیار سے　　فرصت ملی نہ بات کی بوس و کنار سے

اے تاج گورے رنگ پہ اسکے جو آگیا

مُنہ سے لگا نہیں کہ وہیں مُنہ کی کھا گیا

رام پرشاد

ایڈیٹوریل

ترقیِ اُردو کی نسبت ایک خیال | آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مرحوم جب پنجاب کے دوسرے سفر میں امرتسر تشریف لیگئے اور خان بہادر حاجی خان محمد شاہ صاحب مرحوم کے مکان پر لیکچر دیا تو اسکے دوران میں آپ نے فرمایا تھا کہ

اگر یہ خیال کیا جائے کہ ملکی ترقی کے واسطے ایک خاص زبان چاہیئے تو ترقی معدوم سمجھو - البتہ ضرورت وقت خود بخود ایک ایسی زبان پیدا کردیگی جو ہندوستان کے علاوہ قرب وجوار کے ممالک میں بھی مایۂ ناز سمجھی جائے گی وہ دن دُور نہیں جبکہ وہی زبان جس کو دہلی والے اُردوئے معلیٰ کہتے ہیں اور جسکو پنجاب میں پروفیسر آزاد اور مولانا فیض الحسن مرحوم نے اس معراج تک پہنچایا ہے کہ یہاں کی سرکاری زبان قرار پائی ہے' اصول علم اللسان کے مطابق' علی مسجد سے لیکر راس کماری تک اور کچھ سے لیکے ڈھاکہ اور آسام تک اس آسانی اور سہولت کے ساتھ سمجھی جائیگی کہ لوگ اسکو ہندوستان کی لنگوا فرینکا کہنے لگ جائیں گے - مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر ڈائلکٹ کے شید یا کوئی ایسی قوم و جماعت جو اپنی زبان کو ٹکسالی زبان کہکر دوسروں کے ساتھ اختلاط کرنے سے محترز ہوں گے تو اسکا نتیجہ وہی ہوگا جو کسی وقت مسلمانوں نے ہندوؤں سے الگ رہ کے خمیازہ اُٹھایا ہے -

حال میں ایک بنگالی علم ادب کے دلدادہ' بابو سریش چندر سماج پتی' نے اُردو لٹریچر پر رائے زنی کرتے وقت اپنے ایک مضمون کے دوران میں بنگلہ زبان کے مشہور رسالہ ساہتیہ میں تحریر کیا ہے -

گورنمنٹ برطانیہ کے ظلِ عاطفت میں ہندوستان کی تین زبانوں نے زیادہ ترقی کی ہے - منجملہ ان کے اُردو کی روزافزوں ترقی ایسی ہے کہ اگر ہم اسے ملکی زبان کے بجائے صرف مسلمانوں ہی کی زبان کہیں تو بیجا نہو گا - شمالی ہند کے مشہور سرحدی شہر پشاور سے لیکے سلہٹ تک کے تعلیم یافتہ مسلمان

جس خوش اسلوبی اور فصاحت کے ساتھ اسے بولتے اور سمجھتے ہیں، دوسری زبان کو نہیں سمجھ سکتے۔ اُردو بنگلہ زبان سے بھی بدرجہا جاندار ہے۔ بپن اسلام کے سارے خیالات اس کے ایلم میں موجود ہیں۔ اس نے بنگلہ زبان کی نئی نئی خوبیوں کو بھی لوٹ لیا ہے۔ دربار آصفی، سرکار رامپور اور دیگر اسلامی ریاستیں اس کی خاص امداد کرتی ہیں۔ علیگڈھ کالج میں اس کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے شعراء نے اسکو اپنے جواہر زواہر سے چوتھی کی دلھن بنا رکھا ہے۔ اچھی اچھی تاریخیں اس میں موجود ہیں۔ اظہار خیالات وجذبات میں اسکے روزمرّہ میں خاص لطف ہے۔ بنگلہ اخبار وں کی بہ نسبت اُردو اخبارات کا اثر دن بدن زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ عاشقانہ اور رزم و بزم کے اشعار جس قدر اُردو میں پُر اثر ہیں، دوسری زبانوں میں یہ اعجاز نہیں ہے۔ جس زبان پر بنگالی فخر کرتے ہیں، دیکھ لینا، کسی زمانہ میں اُردو اس پر بھی مسلط و حاوی ہوجائیگی۔

ان کے علاوہ اُردو کے سند الوقت مایۂ ناز شمس العلماء حالیؔ فرماتے ہیں کہ "اُردو کی ترقی جس قدر گذشتہ دس سال میں ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے بیس سال کے عرصہ سے کہیں زیادہ ہے، اور پھر اس گذشتہ دس سال کے آخری حصّے میں جب سے ماہوار رسالے جاری ہوئے اسکو اور بھی زیادہ ترقی ہوئی ہے"۔

گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری کے زمانہ میں مسٹر ڈبلیو۔ بیل (جو بعد میں پنجاب کے صیغۂ تعلیم کے ڈایرکٹر مقرر ہوئے) ایکدن ماسٹر پیارے لال صاحب ایم اے (اسسٹنٹ پروفیسر) سے فرمانے لگے۔

جس طرح انگلستان کے وسطی صوبوں کی زبان دوسرے صوبوں کی زبان پر قابو پا کر ملکی زبان قرار پاگئی ہے، دیکھنا، ایک نہ ایک دن الہ آباد سے لیکے لاہور تک کی زبان ہندوستان کی دیگر زبانوں پر خاص فوقیت حاصل کرے گی....

اس کے جواب میں ماسٹر صاحب موصوف نے فرمایا:۔

یہ سب کچھ سہی، مگر یہاں تو مقامی نحو و محاورات کے دلدادہ زبان کی خاص وقعت و عزت کو چھوڑکر، صوبوں کی زبان کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تنگ خیالی نے ایسا سکہ جما یا ہے کہ وہ پراونشیل ڈائلکٹ کی زنجیروں میں زبان کو جکڑنا احسن خیال کرتے ہیں۔

بیل صاحب نے فرمایا "زمانہ ایک اعلیٰ ادیب ہے۔ اگر اُردو زبان ملک کی لنگوا فرنیکا بننے کا فخر حاصل کرنا چاہتی ہے تو دیکھ لینا کہ وہ ان سدِراہوں کو سستی مفتوح اقوام کی طرح طے کرکے اپنے محل مقصود تک پہنچ جائیگی"

باوجود ان سب باتوں کے جب ہم آجکل ہندوستان کی زبان کے بجائے صوبہ کے محاورات کی آواز سُنتے ہیں تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ جس بات کا رونا برسوں پیشتر سرسید اور مسٹر بیل رو چکے ہیں، وہ خرابی ابھی تک دُور نہیں ہوئی ہے، بلکہ وہی مشرق و مغرب کا فرق چلا جاتا ہے۔ اور جب تک زمانہ تقلید پسندوں سے خالی نہیں ہوگا، اسوقت تک یہ قضیۂ نامرضیہ ضرور برہم رہیگا۔

ایک پُرانی بات کا نیا ثبوت رامائن کے زمانہ سے کوئی پانچسو برس پہلے ایک اعلیٰ پایہ کے طبیب، رادھا سوامی، اُسی سرزمین میں نام پا چکے ہیں جو بعد میں گوتم بُدھ کی جائے ولادت کے نام سے مشہور ہوئی۔ رادھا سوامی کو قدیم ہندو ویدک میں یدطولےٰ حاصل تھا۔ اُس نے اپنے برسوں کے تجربہ سے جڑی بوٹیوں کے بہت سے خواص دریافت کئے تھے، اور نیز متعدی امراض کے متعلق بھی تحقیقات کی تھی کہ اُن کے نام کیا ہیں، اور وہ کس کس طرح پھیلتے ہیں۔ اُس نے اپنے جمع کردہ ذخیرہ کے اندر چند باتیں دِق اور سِل کے متعلق بھی لکھی ہیں۔ اُس نے ان امراض سے بچنے کا سب سے بھاری علاج یہ بتایا ہے کہ جن لوگوں کو یہ مرض لاحق ہو اُن سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے۔ اُن کے ساتھ کھانا پینا گویا گناہ ٹھہرایا گیا ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ شاید یہی وجہ بعد میں ایسا کام کرگئی جس سے چھوت چھات کا مسئلہ

جاری ہوگیا۔ رادھا سوامی کے تجویز کردہ اصول کی تو کسی کو کیا اطلاع ہوتی جبکہ خود اُسکا نام ہی گویا دنیا سے مٹ چکا ہے، مگر جو یورپین اطبا آجکل انھیں باتوں کو ظاہر کرتے ہیں اُنھیں خوب شہرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا چکے ہیں۔

حال میں امریکہ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے حفظان صحت کے متعلق رپوٹ شائع کی ہے جسمیں تپ دق پر بھی خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رپوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مقام میں پانچ ایسے مریض بچے رکھے گئے جنکی عمر ۸ ماہ سے ۳ سال تک کی تھی اور جنکو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہکر تپ دق کے جراثیم کا حصہ مل چکا تھا۔ یہ بزرگ نہیں جانتے تھے کہ اُنکا پیار سے بچوں کو چومنا اُن کے حق میں زہر ثابت ہوگا۔ ان مریض بچوں میں ایک ۸ ماہ کی لڑکی تھی۔ اس کی بابت لکھا ہے کہ اس کا تھوک ۱۲۔ فروری ۱۹۱۱ء کو دارالتجارب میں ایک ڈاکٹر کے ذریعے لایا گیا۔ خوردبین سے دریافت کرنے کی کوشش کیگئی تو اجرام کا پتہ نہیں لگا۔ لیکن جب وہی تھوک ایک جانور کے اندر پہنچایا گیا تو وہ تپ دق کی علامتیں ظاہر کرکے مرگیا۔ مزید تحقیقات نے ثابت کیا کہ اسکی دادی کچھ عرصہ پیشتر تپ دق سے مرچکی تھی۔ مرنے سے پہلے اُس نے لڑکی کو بلواکر پیار کیا تھا۔ وہ خود تو مرگئی، مگر اُس کے چومنے سے تپ دق کے کئی کیڑے اُس لڑکی کے نازک ہونٹوں پر رہ گئے تھے، رفتہ رفتہ اُسکے سارے جسم میں پھیل کر اُسکی ہلاکت کا باعث ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی اِس رپورٹ اور اس کے فوری اثر کا تذکرہ جابجا ہو رہا ہے۔ مگر [illegible] کو کوئی نہیں جانتا۔ افسوس! اسی طرح ہمارے ملک کے بہت سے جواہر زواہر کچھ ایسے معدوم ہوگئے ہیں کہ آنے والی نسلیں اُن کے ایجاد و اختراع سے محروم ہو رہی ہیں۔

اخبار ہمدرد | کچھ عرصہ ہوا لاہور سے ایک اُردو ہفتہ وار اخبار ہمدرد کے نام سے، نکلا کرتا تھا، مگر وہ بند ہوچکا ہے۔ کامریڈ کے فاضل ایڈیٹر، مسٹر محمد علی (آکسن) اس نام سے ایک روزانہ اُردو اخبار دہلی سے جاری کرنے والے ہیں۔ یہ اخبار ذاتی ملکیت نہوگا بلکہ ایک خاص مشترکہ سرمایہ سے نکالا جائیگا۔ پراسپکٹس میں جس قسم کے مضامین شایع کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، اُن کے لحاظ سے یہ ایک سیکنڈ رین جرنل ہوگا، اور اُمید کی جاتی ہے کہ فاضل ایڈیٹر کی سحر آفرینی کے باعث مسلمانوں میں زندہ دلی اور بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ مگر "ہمدرد" اُسی صورت میں ہمدرد قوم یا نیشن ہوسکتا ہے، کہ وہ ملک کا سچا ہمدرد ہو، اور اسکا اصل اصول، بقول لارڈ میکالے، کسی خاص مذہب یا قوم کی جانب داری نہو، بلکہ بقول مسٹر اسٹیڈ مرحوم من حیث المجموع وہی اخبار ایک اخبار ہونے کا مستحق ہوسکتا ہے جسمیں تعصب کی بو نہ پائی جائے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ بعض پنجابی اخبارات کی طرح "ہمدرد" بھی باہمی مخالفت اور منافرت کا شکار ہوکر پارٹی فیلنگ کی مجسم تصویر نہ بنے گا۔

انجمن اخبار نویساں | لاہور کی "جرنلسٹس ایسوسی ایشن" نہایت عمدہ تحریک ہے، جو خوشگوار اُمیدوں سے ماموز نظر آتی ہے۔ اگرچہ ابھی تک اسکا کوئی خاص نتیجہ ظاہر نہیں ہوا مگر امید ہے کہ اس کے ذریعہ سے اخبار نویسوں میں محبت، اعتماد اور صلاحیت پیدا ہوگی۔ بدقسمتی سے لاہور کے اخبار نویس، زیادہ تر انھیں صفات سے معرا ہیں۔ ہندو اخبارات مسلمان اخبارات پر، اور مسلمان اخبارات ہندو اخبارات پر بلکہ بعض اوقات آپس میں بھی ایک دوسرے پر ایسے ناپاک اور رکیک حملے کرتے ہیں کہ انسانیت اسکی اجازت نہیں دیتی۔ جبتک وہ خود ذاتی جھگڑوں، غیر ضروری تنازعوں اور آئے دن کے مجنصوں کی پریشان کن الجھنوں سے نہ نکلیں گے، اُسوقت تک وہ ہرگز کسی اہم ملکی یا قومی مقصد میں عہدہ برآ نہوسکیں گے۔ خدا کرے کہ یہ مفید تحریک زور کے ساتھ جاری رہے اور اسکی کوششیں بارآور ہوں۔ ہم وہ مبارک دن دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں جبکہ

سیتاجی (اشوک بن میں)

انڈین پریس الہ آباد

ہندوستان میں زنانہ تعلیم کا مسئلہ

سیاسی اور اقتصادی مسائل سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نیچ ذاتوں کی اصلاح کے واحد مسئلہ کے علاوہ تعلیم نسواں کے برابر اہمیت رکھنے والا اور کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ ان چند اہم مسایل میں سے ایک ہے جنھیں اطمینان بخش طریقہ پر حل کرنے سے قومی تعمیر کی بنا قایم ہوسکتی ہے۔ ہر چند کہ یہ مسئلہ گذشتہ ۵۰ یا ۶۰ سال سے پبلک کے پیش نظر ہے تاہم یہ بات مجبوراً تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اسے عملی طور پر حل کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس صورت میں لازم ہے کہ ہم اس پر نہ صرف عقلی بلکہ عملی نکتۂ خیال سے غور کریں اور دیکھیں کہ اس کا بہترین اور مفید ترین حل کیونکر ممکن ہے۔

اس جگہ یہ بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اس مسئلہ کے تاریخی پہلو پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر نہ تو ہم قدیم ہندوستان میں عورتوں کی ترقی یافتہ تعلیمی حالت یا ان کی بہترین سوشل پوزیشن پر رائے زنی کریں گے اور نہ ہمیں ان بواعث کے تذکرہ سے سروکار ہوگا جو ان کے زوال کا موجب ثابت ہوئے۔ ہمارا بیان تعلیم نسواں کی صرف اس ترقی تک محدود ہوگا جو گذشتہ ۵۰ یا ۶۰ سال کے عرصہ میں عمل میں آئی ہے، اور اس کے علاوہ ہم ان کی موجودہ تعلیمی حالت اور مختلف تعلیمی ذرایع کی کوششوں اور نتایج، راستہ کی مشکلات، اور ان پر غالب آنے کے وسائل، کا ذکر کریں گے۔

عورتوں کی سابقہ تعلیمی حالت

زمانہ ماضی قریب میں یعنی اس وقت جبکہ ہندوستان میں انگریزی عملداری ابھی مستحکم نہ ہوئی تھی عورتوں کی تعلیم پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں دیہات میں مقامی مدارس موجود تھے جن میں اکّا دکّا لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں اور بڑے بڑے گھرانوں میں لڑکیوں کو برائے نام مذہبی تعلیم کے علاوہ گھر کے کاروبار سنبھالنے اور حساب رکھنے کے معمولی طریقے سکھائے جاتے تھے تاہم لڑکیوں کو اسکول میں اس قسم کی باقاعدہ تعلیم

والانے کا خیال جوان کی تربیت کا ایک ضروری جزو سمجھی جائے بہت
ہی تھوڑے عرصہ سے پیدا ہوا ہے۔

تعلیم نسواں کے سب سے اوّل حامی مسیحی مشنری تھے جنھوں
نے ۱۸۴۰ء میں اس میدان میں قدم رکھا اور سب سے پہلے مسیحی اور
بعد میں ہندو لڑکیوں کے لئے مدارس قایم کئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ
نے اس طرف توجہ کی اور سرکاری پالیسی کا اعلان اول مرتبہ ۱۸۵۴ء
کی مشہور مراسلت میں ہوا جس پر ہندوستان کے سارے موجودہ تعلیمی
سسٹم کی بنا قایم ہے۔ کچھ عرصہ سے ان کوششوں میں بعض ترقی یافتہ
ریاستوں، فیاض سوسائیٹیوں، اور محب وطن لوگوں نے بھی ہاتھ بٹایا
ہے۔ ۱۸۸۳ء کی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ مظہر ہے کہ

احاطہ مدراس میں تعلیم نسواں کی کوشش نے ان معنوں میں
جو زمانہ موجودہ کے نکتہ خیال سے صحیح تصور کئے جاتے ہیں ابتداء میں
یہ صورت اختیار کی کہ چرچ مشنری سوسایٹی نے تناولی میں اس قسم
کے بورڈنگ اسکول قایم کئے جہاں صرف مسیحی لڑکیاں تعلیم حاصل
کرسکتی تھیں۔ اس کے بعد ۱۸۴۱ء میں سکاٹش چرچ کے مشنریوں
نے مدراس کی ہندو لڑکیوں کی تعلیم کا فرض اپنے ذمہ لیا چنانچہ جب
۱۸۵۴ء کی مراسلت کا نفاذ ہوا تو احاطہ مدراس اور نواحی علاقے
میں کم وبیش ۸ ہزار لڑکیاں مشنری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتی
تھیں۔ احاطہ بمبئی میں بھی اس تحریک کے بانی مشنری ہی تھے۔
چنانچہ ۱۸۲۳ء سے لیکر ۱۸۵۴ء تک بمبئی میں تعلیم نسواں عملی طور پر
مسیحی مشنوں ہی کے ہاتھ میں رہی۔ آخرالذکر سال میں ہندوستانی
اس میدان میں قدم رکھنے لگے۔ اس زمانہ میں طلبا کی لٹریری
و سائنٹیفک سوسایٹی نے چند زنانہ اسکول قایم کئے جو انقلابات
زمانہ میں سے گذرتے ہوئے بھی تعلیم نسواں کے معاملہ میں بہت
کچھ خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء کی سرکاری
مراسلت کے موقعہ پر بمبئی میں ۶۵ زنانہ اسکول تھے جنمیں ۳۵۰۰
لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

آگے چلکر کمشنروں نے لکھا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ شمالی وجنوبی ہند میں زنانہ تعلیم کے
معاملہ میں ابتدا کرنے والی مشنری سوسائٹیاں ہی رہی ہیں اور بحالت
موجودہ بھی اس بارے میں انھیں سب سے اہم درجہ حاصل ہے۔
۱۸۵۴ء کی مراسلت کے موقعہ پر ممالک مغربی شمالی و اودھ میں
مشنریوں کے قایم کردہ ۱۷ زنانہ اسکول تھے جنمیں ۳۸۶ لڑکیاں
تھیں۔

احاطہ بنگال میں گورنمنٹ نے مشنریوں کو ان کے کام میں
بہت کچھ مدد دی چنانچہ ۱۸۵۴ء میں وہاں ۲۸۸ زنانہ اسکول تھے جنمیں
۶۸۶۹ لڑکیاں تھیں، بحالیکہ پنجاب میں اس کام کی ابھی ابتدا ہی
ہوئی تھی۔

اس وقت تک ہر چند کہ بعض افسر انفرادی طور پر تعلیم نسواں
کے لئے خاصی کوشش کرتے رہے تھے تاہم گورنمنٹ نے اس معاملہ پر
سنجیدہ طور سے توجہ نہ دی تھی۔ تعلیم نسواں کے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی
کا اظہار واضح طور پر اول مرتبہ ۱۸۵۴ء کی مراسلت میں ہوا جس میں
اس کے متعلق ذیل کے الفاظ درج تھے۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی اہمیت کو جہاں تک تسلیم کیا جائے
کم ہے اور اس بارے میں جو کوششیں ہو رہی ہیں ہمیں ان سے
پوری دلچسپی ہے۔ نواب گورنر جنرل نے باجلاس کونسل گورنمنٹ
بنگال کے نام اپنی ایک مراسلت میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ
گورنمنٹ کو ہندوستان میں تعلیم نسواں کے معاملہ میں پوری امداد
اور ہمدردی سے کام لینا چاہئے۔ ہم اس سے تہ دل سے متفق ہیں۔

لیکن جیسا کہ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا باوجودیکہ گورنمنٹ

نے اپنے منشا کو اس قسم کے واضح اور حوصلہ افزا الفاظ میں ظاہر کر دیا۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں نے کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسکی بہت بڑی وجہ لوگوں کی عدم توجہی تھی۔ پردہ سسٹم اور صغر سنی کی شادی کے رواجات انھیں کچھ نہ کرنے دیتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حکام نے اس طرف ویسی توجہ جیسی چاہیئے تھی نہ دی۔

ذیل کے اعداد اس نوٹ سے لئے جاتے ہیں جو مسٹر ہڈول نے ۱۸۶۶ء میں ہندوستان کی تعلیمی حالت پر لکھا تھا:۔

صوبہ	اسکول	طالبات
بنگال	۲۷۸	۵۵۱۰
بمبئی	۹۰	۴۰۳۰
مدراس	۷۵	۳۱۰۹
صوبجات متحدہ	۵۹۵	۱۲۰۰۲
پنجاب	۹۵۰	۱۰۵۳۵
صوبجات متوسط	۱۳۲	۳۶۶۲
	۲۱۲۰	۳۸۸۴۸

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان میں سے اکثر اسکول لوئر پرایمری درجہ کے تھے۔

رپورٹ مظہر ہے:۔

بہ ہیئت مجموعی معلوم ہوتا ہے کہ سال زیر ریویو تک تعلیم نسواں کے متعلق گورنمنٹ کی وہ امداد اور ہمدردی جس کا وعدہ ۱۸۵۴ء میں کیا گیا تھا عملاً کام میں نہ لائی گئی تھی۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ سنہ رواں میں اس سمت میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہوئی ہے۔ اگر ان نتائج پر غور کی جائے جو کسی دوسری جگہ درج کئے گئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کی راہ میں جو خاص مشکلات حائل ہیں وہ تربیت یافتہ قابل استانیوں کا نہ ملنا اور کافی طور پر معائنہ نہ ہونا ہیں۔ فی الحقیقت اُن صوبجات میں بہت بڑی ترقی حاصل ہوئی ہے جہاں حکام ضلع و افسران تعلیم نے اس تحریک میں ذاتی طور پر دلچسپی لی ہے۔ یہ بات موجب ابتہاج و امتنان تصور کی جاسکتی ہے کہ چند سال کے عرصہ میں ایک ایسے معاملہ میں جو مختلف مجلسی تعصبات سے محصور تھا کسی قدر کامیابی حاصل ہو سکی ہے۔

یورپین اور ہندوستانی طالبات کا تناسب

اب ہم اس مسئلہ کے دوسرے مرحلہ میں پہنچتے ہیں جب کہ ۱۸۸۲ء کی تعلیمی کمیشن انعقاد پذیر تھی اس زمانہ کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں۔

صوبہ	اسکول	طالبات
مدراس	۵۵۷	۳۵۰۴۲
بمبئی	۳۴۳	۲۶۷۶۶
بنگال	۱۰۱۵	۴۱۳۴۹
صوبجات متحدہ	۳۰۸	۸۸۸۳
پنجاب	۳۱۱	۹۳۵۳
صوبجات متوسط	۷۹	۳۲۲۵
	۲۶۱۳	۱۲۴۶۱۸

ان اعداد کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ گو احاطہ مدراس و بمبئی میں نمایاں ترقی ہوئی تاہم صوبجات متحدہ و پنجاب میں بہت کچھ کمی واقع ہوگئی تھی۔

ان اعداد میں آسام اور کورگ وغیرہ علاقوں کو بھی شامل کیا جائے تو میزان علی الترتیب ۲۶۹۷ و ۱۲۷۰۶۶ بنتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکول جانے کے قابل عمر کی لڑکیوں میں سے بلحاظ آبادی صرف ۵۸ ،،۰ فیصدی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

تعلیم نسواں کی یہ حالت ۱۸۶۶ء اور ۱۸۸۲ء میں تھی۔ اب

۴۰ سال کا عرصہ گذرنے پر اس کی حالت پر غور کی جائے تو معلوم
ہوتا ہے کہ اس میں بہت کچھ ترقی عمل میں آچکی ہے۔ اسکولوں کی
تعداد سیکڑوں سے ہزاروں اور طالبات کی ہزاروں سے لاکھوں
تک پہنچ چکی ہے۔ پرانے تعصبات بہت کچھ دور ہو چکے ہیں تعلیم
یافتہ جماعتیں بہ ہیئت مجموعی اگر عملی طور پر نہیں تو کم از کم قیاسی طور پر
تعلیم نسواں کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگ گئی ہیں اور عام رائے
بہت کچھ اس مسئلہ کے حق میں نظر آتی ہے۔ تعلیم نسواں کے میدان
میں بہت سے نئے کام کرنے والے پیدا ہو چکے ہیں اور بعض ترقی
یافتہ ریاستوں مثلاً بڑودہ، میسور، ٹراونکور، میں اور بعض مذہبی
ومجلسی سوسائیٹیوں مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج، اور سیوا سدن
کی طرف سے اس بارے میں جو کوششیں عمل میں آرہی ہیں وہ
قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کو مدنظر رکھکر جب ہم اس ترقی
پر جو گذشتہ ۵۴ سال کے عرصہ میں ہوئی ہے غور کرتے ہیں تو وہ
چنداں طمانیت بخش نظر نہیں آتی۔ ملک کے اندر اعلیٰ تعلیم یافتہ
عورتوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اوسط طبقہ کی عورتیں
جو تعلیم یافتہ گنی جاتی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ صرف اس قابل
ہوتی ہیں کہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ سکیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ بحالات
موجودہ جاہل عورتوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے۔ حساب
لگایا گیا ہے کہ ہندوستانی عورتوں میں ۷ فی ہزار لکھ پڑھ سکتی ہیں
اور ایک فیصدی سے کم تعلیم یافتہ کہلا سکتی ہیں۔ برٹش انڈیا میں
جو لڑکیاں یا عورتیں زیر تعلیم ہیں ان میں سے ۶۰ فیصدی سے کم
ایسے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں جو صرف عورتوں کیلئے
مخصوص ہیں اور ۴۰ فیصدی سے زیادہ مشترکہ اسکولوں میں زیر
تعلیم ہیں۔ عرصہ پنج سالہ سنہ ۱۹۰۲ء تا سنہ ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کے اندر
ایسی طالبات کی تعداد ۶۴۵۰۲۸ تھی اور اس کے بعد اس تعداد
میں اور بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے چنانچہ گذشتہ پنج سالہ عرصہ میں اس
تعداد میں ۸۵۵۰۰۲ طالبات کا اضافہ ہوا ہے۔

بحالت موجودہ برٹش انڈیا کے مختلف صوبجات میں اسکول
جانے کی عمر کی لڑکیوں کی تعداد کے مقابلہ میں طالبات کا تناسب
حسب ذیل ہے۔

صوبجات	اسکول جانے کی عمر کی لڑکیوں کی تعداد کے مقابلہ میں طالبات کا تناسب
برہما	۸٫۱۴
بمبئی	۵٫۹
مدراس	۵٫۷
مشرقی بنگال و آسام	۴٫۵
بنگال	۳٫۲
پنجاب	۲٫۶
صوبجات متوسط و برار	۱٫۹
صوبجات متحدہ	۱٫۲

کل ہندوستان کے لئے [illegible] ۳٫۱۵ کا تناسب ہے

ذیل میں ان لڑکیوں کی تعداد درج ہے جو برٹش انڈیا میں
یوروپین اسکولوں کے علاوہ زیر تعلیم ہیں:۔

مدراس	۱۶۱۰۹۷
بمبئی	۱۰۶۴۶۸
بنگال	۱۲۴۱۸۱
مشرقی بنگال و آسام	۷۹۱۴۳
برہما	۶۱۳۵۱
صوبجات متحدہ	۳۸۲۵۷
پنجاب	۳۵۹۸۶
صوبجات متوسط و برار	۱۹۰۰۳

هز آنر سرجان پرسکات هیوت بالقابہ

جی سی ایس آئی - سی آئی ای - آئی سی ایس - لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھہ

انڈین پریس الہ آباد

اعلیٰ درجہ کی نسوانی تعلیم کا اندازہ کرنے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر یوروپین، یوریشین، مسیحی، اور پارسی، لڑکیوں کی تعداد کو مجموعہ میں سے تفریق کر دیا جائے تو باقی ماندہ اعداد بالکل بے حقیقت رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ آرٹ کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والی ۱۶۰ طالبات میں سے ۸۴ یوروپین اور یوریشین ہوتی ہیں ۴۳ مسیحی اور ۳۳ پارسی۔ ایسے ہی میڈیکل ڈگری کے امتحانات کی تیاری کرنے والی لڑکیوں میں ۷۶ میں سے ۷۰ اور چھوٹے درجہ کے ڈاکٹری امتحانات میں داخل ہونے والی لڑکیوں میں ۱۶۸ میں سے ۱۴۱ ان اقوام ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب ہم سیکنڈری تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی لڑکیوں کے لئے اس قدر ہائی اسکول نہیں ہیں جتنے یوروپین لڑکیوں کے لئے ہیں اور یہ بیان مشرقی بنگال و آسام کے علاوہ ہر صوبہ پر صادق آتا ہے۔ انگریزی سیکنڈری مدارس میں کل ۲۹۳۹۴ طالبات تعلیم حاصل کرتی ہیں جن میں سے ۱۱۵۰۲ یوروپین اور ۱۰۷۲۵ مسیحی ہیں البتہ پرائمری یا ورنیکولر تعلیم میں ہندی لڑکیوں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ ورنیکولر اسکولوں کی اونچی جماعتوں میں بودھ مذہب کی لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے چنانچہ مڈل ورنیکولر اسکولوں میں ۲۲۴۶ بودھ اور ۱۳۷۴ برہمنی مذہب کی لڑکیاں ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برہما میں تعلیم نسواں نسبتاً زیادہ پھیلی ہوئی ہے اور وہاں لڑکیاں زیادہ عمر تک تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ مڈل ورنیکولر سے نچلے درجہ کے پرائمری اسکولوں میں بودھ لڑکیوں کی تعداد کم، مسلمان لڑکیوں کی اس سے زیادہ، اور ہندو لڑکیوں کی سب سے زیادہ ہے۔ لیکن ان میں بھی زیادہ تر غیر برہمنی اقوام کی لڑکیاں ہیں۔

جب ہم لڑکیوں کی سکنڈری اور پرائمری تعلیم کی طرف توجہ دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ باستثنائے یوروپین اسکولوں کے سارے ہندوستان میں صرف ۱۲۰۰۸ لڑکیاں ایسی ہیں جو ۵۶۰۲۶ زیر تعلیم لڑکیوں میں سے سکنڈری اسکولوں کے اونچے درجہ میں تعلیم پاتی ہیں اور ان میں سے بھی ۵۶۳ احاطہ بمبئی کی ہیں۔ انگریزی کے درجہ مڈل میں ۴۳۳۲ اور ورنیکولر کے درجہ مڈل میں ۳۰۳۹ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں جن کا مجموعہ ۸۵۹۹ بنتا ہے۔ ہرچند کہ یہ تعداد بہت کم ہے اور اسی درجہ میں تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں کی تعداد کا تیرھواں حصہ ہے تاہم اب سے پانچ سال اُس طرف جو تعداد تھی اس میں تعداد ۸۴ فیصدی اضافہ ہو چکا ہے۔ پرائمری اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی تعداد یکساں یعنی ۵۴۵۰۹۱ ہے بجالیکہ ۱۹۰۲ء میں ۳۴۶۵۱۰ تھی۔ اس سے ۱۹۸۵۸۱ کا اضافہ ثابت ہوتا ہے۔ تعلیم نسواں کے اخراجات کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۸۸۱-۲ء	۸۴۷۰۰۰ روپیہ
۱۸۹۰ء	۲۶۹۰۰۰۰ روپیہ
۱۹۰۷-۸ء	۴۴۳۴۰۰۰ روپیہ

یہ خرچ لڑکیوں کے پبلک انسٹی ٹیوشنوں کا ہے اس کے علاوہ مشنری لیڈیوں کے گھروں پر تعلیم دینے اور زنانہ کلاسیں جاری کرنے سے بھی تعلیم نسواں کو بہت کچھ فایدہ پہنچا ہے۔ ہرچند کہ اس بارے میں سارے ہندوستان کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہو سکتے تاہم اندازاً معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب اور بنگال میں اس سسٹم نے بالخصوص ترقی حاصل کی ہے۔ فی الحقیقت تعلیم نسواں کی راہ میں صرف دو مشکلات حائل ہیں یعنی صغر سنی کی شادی اور پردہ سسٹم اگر انھیں دور کیا جا سکے تو تعلیم بہت تیزی سے ترقی کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے خانگی تعلیم اور زنانہ کلاسیں زیادہ مقبول ہوتی جا رہی ہیں لیکن اس میں بھی ایک خاص مشکل یہ نظر آ رہی ہے کہ نہ صرف

تربیت یافتہ اُستانیاں کم ملتی ہیں بلکہ کم تعلیم یافتہ اور غیر تربیت یافتہ اُستانیاں بھی بمشکل ہاتھ آتی ہیں۔

ذیل کے اعداد سے جو گذشتہ ماہ مارچ میں شایع کئے گئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تعلیم نسواں کس قدر ترقی حاصل کرتی جا رہی ہے۔

	سنہ ۱۹۰۷ء	سنہ ۱۹۱۱ء
آرٹ کالج	۸	۸
ہائی اسکول	۱۱۲	۱۳۰
پرایمری اسکول	۹۹۸۳	۱۲۰۰۲

طالبات کی مجموعی تعداد ۹۳۴۱۶۵ سے بڑھ کر ۷۹۳۶۴۶ پر پہنچ گئی اور اسکول جانے والی عمر کی لڑکیوں کے مقابلہ میں طالبات کا تناسب فیصدی ۲،۴ سے بڑھ کر ۲،۴ تک پہنچ گیا۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی موجودہ حالت کا یہ مختصر بیان ہے۔ ہر چند کہ وہ کام جو ہمارے پیش نظر ہے بہت وسیع اور مشکل ہے تاہم یہ دیکھنا اطمینان بخش ہے کہ اس باب میں جو ترقی عمل میں آ رہی ہے وہ گو سُست اور تدریجی ہے مگر حقیقی اور پائدار بھی ہے جس سے عنقریب نمایاں ترقی کے نتائج ظہور میں آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

زنانہ تعلیم کی مشکلات

اُن بواعث پر بحث کرنے سے پیشتر جو اس ملک میں تعلیم نسواں کی راہ میں حایل ہیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ میں ان مختلف ایجنسیوں کا ذکر کر دیا جائے جو آجکل اس بارے میں کوشاں ہیں کہ ان مشکلات کو دور کیا جا سکے اور جن کی انتھک محنت اور کوشش سے وہ ترقی جو ہم آجکل دیکھ رہے ہیں عمل میں آئی ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے اس کام میں سب سے بڑی کوشش گورنمنٹ اور مشنریوں کی طرف سے عمل میں آئی ہے لیکن کچھ عرصہ سے بعض ترقی یافتہ ریاستوں میں بھی تعلیم نسواں کے مسئلہ پر توجہ دی جانے لگی ہے جن میں خاص طور پر قابل ذکر ریاستہائے بڑودہ و تراونکور ہیں۔ افسوس ہے کہ مختلف ریاستوں کے متعلق صحیح اعداد و شمار حاصل نہیں ہو سکتے اور اس لئے ہم اس کے متعلق یقینی طور پر صرف اسی قدر بیان کر سکتے ہیں کہ تعلیم یافتہ مستورات کی تعداد فیصدی آبادی کے اعتبار سے ریاست تراونکور سب پر فوقیت رکھتی ہے اور بڑودہ کی ترقی یافتہ ریاست کا نتیجہ بھی کچھ کم شاندار نہیں۔ ریاست بڑودہ میں ایک زنانہ ٹریننگ کالج، ایک زنانہ ہائی اسکول، اور صدر مقام و مفصلات میں متعدد مدارس ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد دیہاتی اسکولوں اور مشترکہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں اسکول جانے والی عمر کی لڑکیوں میں سے ۸ فیصدی سے زیادہ تعلیم حاصل کرتی تھیں اور یہ تعداد برہما کی تعداد سے ملتی جلتی ہے جو تعلیم نسواں کے اعتبار سے برٹش انڈیا کا سب سے ترقی یافتہ صوبہ ہے۔ گذشتہ ۶ سال کے عرصہ میں بڑودہ کے اندر تعلیم نسواں نے خاص ترقی حاصل کی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں بڑودہ میں ۷۳۸۴۴ لڑکیاں اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتی تھیں جو صوبجات متحدہ اور پنجاب کی طالبات کے مجموعہ سے زیادہ ہے بحالیکہ ان دونوں صوبوں میں سے ہر ایک کی آبادی اور رقبہ ریاست بڑودہ سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ جب ہم اشاعت تعلیم نسواں کی دیگر ایجنسیوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسیحی مشنریوں کو چھوڑ کر باقی تمام مذہبی اور فلاح عامہ کی کوشش کرنے والی جماعتوں میں سے اور کسی نے زنانہ تعلیم کی اشاعت میں اس قدر کوشش نہیں کی جس قدر آریہ سماج نے (بالخصوص شمالی ہند میں) کی ہے۔ اسکی طرف سے صوبجات متحدہ و پنجاب کے قریب قریب تمام بڑے بڑے شہروں میں زنانہ اسکول قایم ہیں اور جالندھر اور ڈیرہ دون میں جو کنیا مہا ودیالہ قایم ہیں وہ موڈل

اسکولوں کا درجہ رکھتے ہیں اور لوگوں کو ان کے انتظام پر ہر طرح اطمینان ہے۔ آریہ سماج کے علاوہ ملک کے دیگر حصص میں مختلف سوسائٹیاں مثلاً برہمو سماج، تھیا سوفیکل سوسایٹی، سیوا سدن اور سنگھ سبھائیں، اس بارے میں پوری خدمت سرانجام دے رہی ہیں۔ شہر فیروزپور میں جو سکھ کنیا مہا ودیالہ ہے وہ خالصہ جماعت کی انتھک کوششوں کا بہترین نمونہ اور اس امر کی بین مثال ہے کہ بے غرضانہ خدمت کسی اوسط درجہ کے شخص کی طرف سے بھی ہو تو اپنا پھل لائے بغیر نہیں رہتی۔ ہم امید کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے کامیاب انسٹی ٹیوشن زمانہ مستقبل کی نسلوں کو کمر ہمت باندھ کر حصول مدعا میں محو ہونے کے لیے آمادہ کرنے کا موجب ثابت ہونگے۔

اس جگہ تک ہم نے تعلیم نسواں کے مختلف مدارج کی ترقی بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے لیکن اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان مشکلات اور رکاوٹوں کا کسی قدر ذکر کر دیا جائے جو ان لوگوں کی راہ میں حائل رہی ہیں جو گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں تعلیم نسواں کی تحریک کو قایم رکھتے چلے آئے ہیں۔ ان اسباب کی بہترین شناخت و تشریح انڈین ایجوکیشن کمیشن ۱۸۸۳ء کی رپورٹ میں درج ہے جسکے چند فقرات کا اقتباس ذیل میں کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی راہ میں بعض خاص مشکلات حائل ہیں یہ مشکلات کچھ تو اس وجہ سے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے لڑکوں کی تعلیم کے مسئلہ پر توجہ دینے کے ایک مدت بعد اس معاملہ پر توجہ دی۔ لیکن سب سے بڑی دقت جو اس بارے میں پیش آتی ہے وہ طاقت بالادست کے کسی قسم کی کارروائی کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ خود لوگوں کے رواجات سے تعلق رکھتی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آبادی کے زنانہ حصہ میں اس امر کی خواہش مطلق نہیں پائی جاتی کہ حصول تعلیم کو ذریعہ معاش بنایا جائے دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان میں صغرسنی کی شادی کا رواج ہے اور خوشحال طبقہ کی عورتیں اپنی شادی شدہ زندگی حد درجہ کے پردہ میں بسر کرتی ہیں یہ باتیں اس قسم کی ہیں جن سے تعلیم نسواں کے حامیوں کو ہر قدم پر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تیسری بات یہ بھی ہے کہ لڑکوں کے اسکولوں کی نسبت لڑکیوں کے مدارس کیلئے اُستانیاں کم تعداد میں اور کمتر قابلیت رکھنے والی ملتی ہیں۔ آخری دقت یہ ہے کہ تعلیمی سسٹم زیادہ تر مردوں ہی کے ہاتھ میں ہے اور گو تھوڑی بہت تربیت یافتہ اُستانیاں اب بتدریج تیار ہو رہی ہیں تاہم تعلیم کی سمت قایم کرنے اور معائنہ کا کام ابھی تک مردوں ہی کے ہاتھ میں ہے اور جو ٹکسٹ بکیں تیار ہوتی ہیں ان میں بھی بہت بڑی حد تک لڑکیوں کے بجائے لڑکوں کی تعلیم ہی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ممبران کمیشن نے اُمور ذیل کی سفارش کی تھی:-

(۱) تعلیم نسواں کا خرچ تمام مقامی میونسپل اور پراونشل فنڈوں کا جزو ضروری سمجھا جائے اور اس پر خاص توجہ دی جائے۔

(۲) لڑکیوں کے اسکولوں کے واسطے ٹکسٹ بکیں تیار کرنے میں حد درجہ کی احتیاط سے کام لیا جائے اور لوگوں کو اس قسم کی کتابوں کی تیاری پر آمادہ کیا جائے۔

(۳) لڑکیوں کے وظایف کے لئے خاص انتظام کیا جائے اور یہ وظایف بعد امتحان دیئے جائیں نیز اس خیال کو مدنظر رکھ کر کہ لڑکیاں زیادہ عمر تک اسکولوں میں رہیں ان وظایف کا معتدبہ حصہ ان لڑکیوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے جو ۱۲ سال کی عمر کے بعد اسکول میں رہیں۔

(۴) اس قسم کے قواعد مرتب کئے جائیں جن کی رو سے تمام

زنانہ مدارس میں بتدریج اُستادوں کی جگہ اُستانیوں کو دی جائے۔

(۵) لوکل گورنمنٹوں کی توجہ زاید نارمل اسکولوں یا جماعتوں کے قیام پر منعطف کرائی جائے۔ جن مدارس کا انتظام پرائیوٹ ہے ان کو خاطر خواہ مدد کی جائے اور اس امداد کا کچھ حصہ اُن انعامات کی صورت اختیار کرے جو امتحان سرٹفکیٹ پاس کرنے والی لڑکیوں کو دیئے جایا کریں۔

(۶) اس قوم کے دیسی شرفا کو جو تعلیم نسواں سے دلچسپی رکھتے ہیں زنانہ اسکولوں کی منتظم کمیٹیوں میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے اور یورپین و ہندوستانی خواتین کو اس قسم کی کمیٹیوں کی امداد پر راغب کیا جائے۔

سطور بالا میں کمشنروں کی بتائی ہوئی تعلیم نسواں کی جو مشکلات بیان کی گئی ہیں وہ اب بھی ویسے ہی صادق آتی ہیں جیسے سنہ ۱۸۸۲ء میں تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معاملہ پہلے کی نسبت اب کسی قدر روبا صلاح ہے۔

چونکہ اس مسئلہ کو عملی طور پر حل کرنے کا وقت اب قریب آگیا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن تجاویز پر جو کمشنروں نے سطور بالا میں پیش کی ہیں اور بھی زیادہ توجہ دی جائے۔

صیغہ پبلک انسٹرکشن کے مختلف ڈائرکٹروں کی تازہ رپورٹوں سے بھی انھیں مشکلات کا وجود ثابت ہوتا ہے جو اوپر بیان کی گئی ہیں چنانچہ مذکور رہے :-

تعلیم نسواں کے انتظام میں خاص مشکلات یہ ہیں کہ نہ تو والدین کو اس بات پر راغب کیا جا سکتا ہے کہ وہ لڑکیوں کو اسکولوں میں بھیجیں اور نہ اچھی تربیت یافتہ اُستانیاں ملتی ہیں اسکے علاوہ اور مشکلات بھی ہیں لیکن وہ سب اسی ضمن میں آجاتی ہیں۔ تعلیم نسواں کی کمیٹیوں کی رپورٹیں زیادہ تر اس اجمال کی تفصیل سے پُر ہوتی ہیں اور انھی مشکلات کو مدنظر رکھ کر مختلف انتظامی تبدیلیاں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ اگر لڑکیوں کو لڑکوں کے مدارس میں داخل ہونے پر آمادہ کیا جا سکے تو غنیمت ہے لیکن اگر وہ جداگانہ زنانہ اسکولوں کو ترجیح دیں تو جداگانہ مدارس کھولے جاتے ہیں۔ پردہ سسٹم کو قایم رکھا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو ان کے گھروں سے گاڑیوں میں بٹھا کر لایا جاتا ہے۔ زنانہ انسپکٹرس مقرر کی جاتی ہیں اور فیس معاف کرکے انعامات دیئے جاتے ہیں۔ وہ باتیں جو لڑکیوں کو اسکول آنے اور وہاں رہنے پر راغب کرنے کی مشکل کو حل کر سکتی ہیں وہی اُستانیوں کی بہم رسانی کی مشکلات کو دُور کریں گی۔ لیکن اس اثنا میں اُستانیوں کو حاصل کرنے کی کوشش جہاں تک ممکن ہوتا ہے قایم رکھی جاتی ہے۔ فی الحقیقت بحالت موجودہ تعلیم نسواں کی ترقی کا دار و مدار طالبات اور اُستانیاں حاصل کرنے کی مشکلات رفع کرنے کے طریقوں پر ہے۔

تعلیم نسواں کی حالت ممالک غیر میں

سطور بالا میں مختصر طور پر ہندوستان کی مستورات کی تعلیمی حالت بیان کی گئی ہے۔ اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند لفظوں میں بعض غیر ممالک کی زنانہ تعلیم کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ اس مطلب کے لئے صرف ۵ ترقی یافتہ ممالک کا ذکر کافی معلوم ہوتا ہے جو حسب ذیل ہیں :- (۱) فرانس (۲) جرمنی (۳) اضلاع متحدہ امریکہ (۴) انگلستان (۵) جاپان

(۱) فرانس میں تعلیم نسواں کی حالت

سنہ ۱۸۸۲ء میں ملک فرانس میں ۶ اور ۱۳ سال کے درمیان عمر کے تمام بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم مفت اور لازم قرار دی گئی تھی

تازہ ترین اعداد و شمار ۱۹۰۶ء کے متعلق دستیاب ہو سکتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۳۳۲۸۲ زنانہ مدارس میں ۲۷۷۶۰۲ لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ کثیر التعداد لڑکیاں (جنکی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی) لڑکوں اور لڑکیوں کے مشترکہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانس میں تعلیم نسواں کے دونوں طریقے مروج ہیں یعنی جداگانہ بھی اور مشترکہ بھی ایک اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ گو پبلک اسکولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم لڑکیوں کی مجموعی تعداد میں سے ۱/۴ پرائیوٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ زنانہ سکنڈری اسکولوں اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق مذکور ہے :-

جمہوری سلطنت (فرانس) کی اہم ترین کامیابیوں میں قابل ذکر امر لڑکیوں کے لئے پبلک سکنڈری اسکولوں کا قیام اور ان کی ترقی ہے۔ دسمبر ۱۸۸۰ء میں جب یہ قانون پاس کیا گیا تو حسب معمول اسکی بہت کچھ مخالفت ہوئی کیونکہ اس سے لوگوں کے دیرینہ رواجات اور مجلسی طریقوں کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ ۱۸۸۰ء میں اس قانون کے پاس ہوتے ہی لائی سی اور کالج قایم کئے گئے ۱۸۸۶ء میں ۱۴ لائی سی اور ۱۷ کالج تھے جن میں طالبات کی تعداد علیٰ الترتیب ۲۲۴۳ اور ۲۷۳۴ تھی۔ تازہ ترین سرکاری اعداد نومبر ۱۹۱۱ء کے شایع شدہ ہیں جبکہ لڑکیوں کے لئے ۴۷ لائی سی اور ۶۱ کالج تھے جن میں علیٰ الترتیب ۲۱۳۵۲ اور ۱۶۶۲۴ یا مجموعی طور پر ۳۷۹۷۶ طالبات تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ سرکاری یونیورسٹیوں میں طالبات کی تعداد ۳۶۰۹ تھی جن میں سے ۱۶۴۳ غیر ممالک کی رہنے والی تھیں۔

(۲) جرمنی میں تعلیم نسواں کی حالت

جرمنی میں بھی ۶ اور ۱۴ سال کی عمر میں تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ درجہ پرائمری میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی صحیح تعداد ہر چند کہ معلوم نہیں ہو سکی تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ بہت بڑی ہے۔ فرانس کی طرح جرمنی میں بھی لڑکیوں کو جداگانہ اور مشترکہ دونوں طریقوں پر تعلیم دی جاتی ہے۔ تاہم ایک معاملہ میں دونوں ملکوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ ناقابل تشریح ہے۔

ہر چند کہ جرمن پریس میں مشترکہ تعلیم کی حمایت کا رجحان بڑھتا جاتا ہے اور سکنڈری اسکولوں اور ہائیر انسٹی ٹیوشنوں میں طالبات کو داخل کر دیا جاتا ہے تاہم اوپرا سکولوں میں اس کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ مشترکہ تعلیم کی جماعتیں زیادہ تر چھوٹے شہروں میں جہاں گریڈ حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے یا دیہاتی علاقوں میں جہاں بغیر گریڈ کے سکول ہوتے ہیں پائی جاتی ہیں۔

جب ہم سکنڈری تعلیم پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں بھی جرمنی دیگر قابل ذکر یورپین ملکوں سے اختلاف رکھتا ہے۔ اس ملک میں زنانہ تعلیم کا معیار انگلستان سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں لڑکیوں کی سکنڈری تعلیم کا انتظام سرکار کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے صرف ایک ہی قسم کے اسکول جائز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جو اس قسم سے مختلف ہوں انھیں گورنمنٹ تسلیم نہیں کرتی۔ ایسے اسکولوں سے بہت سی پابندیاں اور رکاوٹیں عاید کی جاتی ہیں جن سے ان کی ترقی بہت کچھ رکتی ہے۔ فی الحقیقت جرمنی میں عورتوں کی تعلیم کو وسیع پیمانہ پر نہ تو چلایا جاتا ہے اور نہ چلانا مناسب سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اگر آزادانہ طور پر اس قسم کی کوئی کوشش عمل میں آئے تو گورنمنٹ اسکی متحمل ہو رہتی ہے۔ بہت بڑی توجہ اس بات پر دی جاتی ہے کہ کثیر التعداد عورتوں کو ایک خاص قسم کی محدود تعلیم دی جائے۔ ایک محدود حلقہ کو اعلیٰ ترین تعلیم و تربیت دینا مقصود نہیں۔ ڈائرز ولٹ کا یہ قول ہے کہ

سب سے بڑی ضرورت اس بات کی نہیں کہ عورتوں کے لئے

یونیورسٹیاں قایم کی جائیں نہ اس بات کی کہ عورتیں زمانۂ موجودہ کی علمی کوششوں میں شریک ہوں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کثیر التعداد لڑکیوں کو احتیاط کے ساتھ وسیع پیمانہ پر تعلیم دی جائے یا یوں کہنا چاہیئے کہ آنے والی نسل کے لئے مائیں تیار کی جائیں۔

ڈاکٹر وونڈر نے بعض اعداد و شمار جمع کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں ۱۹۰ پبلک سکنڈری مدارس ہیں جن میں ۹ یا ۱۰ سال کا کورس ہوتا ہے۔ باستثنائے ۶ کے ان میں سے سب کے سب موجودہ صدی ہی میں قایم ہوئے ہیں۔ ۱۲۸ مدارس پرشیا میں، ۲۴ شمالی جرمنی میں، اور ۴۴ جنوبی جرمنی میں ہیں۔ پرشیا کی گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم نسواں کے معاملہ میں جس قلیل دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان ۱۲۸ مدارس میں سے صرف ۴ سرکاری ہیں باقی ۱۲۴ یا تو مختلف شہروں کی طرف سے قایم ہیں یا خاص خاص لوگوں کے قایم کردہ ہیں۔ طالبات کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں ہو سکی البتہ ڈاکٹر وونڈر کے بیان کے بموجب ۵۷۹۱۸ ہے۔

(۳) اضلاع متحدہ امریکہ میں تعلیم نسواں کی حالت

اضلاع متحدہ امریکہ کے ہر ایک صوبہ میں از روئے قانون مفت تعلیم دینے کے پبلک اسکول قایم ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے اسکول پرائیویٹ اور خیر خواہان بنی نوع انسان کے قایم کردہ ہیں جون ۱۹۰۸ء میں اندازہ کیا گیا تھا کہ اضلاع متحدہ امریکہ کی مجموعی آبادی ۸۸۸۷۴۹۰۰۷ ہے جس میں سے ۱۲۲۰۹۴۱۰ لڑکیاں ۵ اور ۱۸ سال کی درمیانی عمر کی ہیں اور اس تعداد میں سے ۸۴۸۱۳۷ اسکولوں میں تعلیم پاتی ہیں۔ اس مجموعہ میں سے ۵۱۸۰۹۹ سکنڈری مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والی ہیں اور ان میں سے ۴۷۵۷۶۱ سرکاری اور ۴۲۳۳۸ پرائیویٹ انسٹی ٹیوشنوں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں مشترکہ تعلیم کا سسٹم زیادہ تر مروج ہے اور گو حال میں اس معاملہ پر بہت کچھ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ تعلیم مشترکہ بہتر ہے یا منفردہ؟ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ عام رائے صرف سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے بارے میں منفردہ سسٹم کے حق میں ہے ورنہ پرائمری اسکول ملک کے ہر حصہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یک جائی تعلیم ہی دیتے ہیں۔

(۴) انگلستان میں تعلیم نسواں کی حالت

انگلستان میں ابتدائی تعلیم ۶ اور ۱۴ سال کے درمیان کی عمر میں جبریہ ہے اور گو درجہ پرائمری کی طالبات کے صحیح اعداد حاصل نہیں ہو سکے تاہم اندازاً معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد طلبا سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ سکنڈری تعلیم کے متعلق انگلستان اور ویلز کے اعداد مظہر ہیں کہ ۱۹۰۶ء میں طالبات کی تعداد ۸۵۶۵۸۹ تھی۔ ہر چند کہ امریکہ میں سکنڈری تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کو جداگانہ طور پر دینے کی تحریک زور پکڑ رہی ہے تاہم انگلستان میں معاملہ اس سے بالکل برعکس ہے۔

(۵) جاپان میں تعلیم نسواں کی حالت

جاپان میں تعلیم نسواں کی جو حالت آجکل ہے اس کا ذکر کسیقدر تفصیل کے ساتھ دسمبر ۱۹۱۱ء کے "رسالہ ادیب" میں جنابہ زبیدہ خاتون صاحبہ کے ایک مضمون میں ہو چکا ہے۔ اس لئے اس جگہ اس کا صرف سرسری بیان درج کیا جاتا ہے۔ اس ملک میں بھی لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم جبریہ ہے۔ لیکن ایک عرصہ دراز تک لڑکیوں کی تعلیم کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی۔ لڑکیوں کو اسکول میں لانے کیلئے پورے طور پر کوشش ۱۸۹۰ء میں کی گئی جسکے بعد یہ تحریک اس قدر اشاعت پذیر ہوئی کہ اب لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد اسکولوں میں قریب قریب برابر ہی ہے۔ ۱۹۰۲ء میں ۲۲۵۶۰۵۳ لڑکیاں پرایمری

اور ۲۱۵۲۳ سکنڈری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ طالبات کی مجموعی تعداد جس میں ٹکنیکل اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیاں بھی شامل تھیں ۲۳۵۲۴۴۵ تھی۔ بحالیکہ اس سال ہندوستان میں تمام مدارج کی طالبات کی تعداد صرف ۳۹۳۱۶۸ تھی۔

ان اعداد کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جاپان اور ہندوستان میں اسکول جانے کی عمر کی لڑکیوں کی تعداد کے مقابلہ میں طالبات کا تناسب ۴۹٫۱۷ اور ۲٫۲ فیصدی علی الترتیب تھا۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں لڑکیوں کے لئے ۲۷ پبلک اور پرائیویٹ ہائی اسکول تھے جن میں ۲۱۵۰۰ طالبات تعلیم پاتی تھیں۔ ان کے علاوہ ۴۰۰۰ لڑکیاں متفرق مدارس میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ مسٹر شارپ اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ

> ابھی تک اعلیٰ یا خاص تعلیم یافتہ عورتوں کی مانگ پیدا نہیں ہوئی البتہ صرف اُستانیوں کی ضرورت گاہ بگاہ رہتی ہے گو عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مانگ عنقریب پیدا ہو جائے گی اور گورنمنٹ کو اسے پورا کرنا ہوگا۔ لیکن عام رائے اب سکنڈری تعلیم کی حمایت میں ہے اور بعض صورتوں میں جہاں پُرانی وضع کے والدین اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیجنا نہیں چاہتے تو آخر الذکر خود اسکول جانے پر مُصر ہوتی ہیں۔ نوجوانوں کو بھی اب اسی قسم کی بیویوں کی تلاش رہتی ہے جنھیں خانگی تربیت کے علاوہ لٹریری تعلیم بھی حاصل ہو۔ ہندوستان میں اگر کوئی لڑکا زیادہ امتحانات پاس کرے تو اسکی شادی کا میدان زیادہ وسیع ہو جاتا ہے لیکن جاپان میں جو لڑکیاں سکنڈری اسکولوں کے امتحانات پاس کر لیں ان کی قدر بڑھ جاتی ہے۔

جاپان میں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کا انتظام یا تو مشنری اسکولوں میں ہوتا ہے یا زنانہ یونیورسٹی میں جو سنہ ۱۹۰۱ء سے قایم ہے۔ ابتدا میں اس یونیورسٹی سے متعلق ۴۰۰ طالبات تھیں لیکن تین چار ہی سال کے عرصہ میں ان کی تعداد ۱۱۵۰ تک پہنچ گئی ہے۔ پرائمری درجہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یکجائی تعلیم دی جاتی ہے لیکن سکنڈری اور ہائی کلاسیں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے الگ الگ قایم ہیں۔

سطور بالا میں بعض ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم نسواں کی اصلاح اور بہتری کا جو حال مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے اس سے تین باتوں کی توضیح ہوتی ہے جو موجودہ سسٹم کے لازم اجزا کا درجہ رکھتی ہیں (اولاً) تمام ممالک میں لڑکیوں کی پرائمری تعلیم جبریہ اور کسی حد تک مفت ہے (ثانیاً) لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہوتی ہے اور دونوں کے لئے جبری ہے۔ (ثالثاً) سکنڈری تعلیم کی ترقی کا موجب زیادہ تر سرکاری امداد نہیں بلکہ عوام کی دلچسپی اور جوش ہے۔

یہ وہ راستے ہیں جن پر چل کر مشرق اور مغرب کے ترقی یافتہ ممالک نے تعلیم نسواں کے معاملہ میں بہت کچھ کامیابی حاصل کی ہے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اگر ہم بھی انھیں لائنوں پر چلیں تو کیوں کامیاب نہ ہوں۔ ان حالات میں تعلیم نسواں کی مشکلات رفع کرنے اور اسے ترقی دینے کے لئے سب سے اوّل اس بات کی ضرورت ہے کہ زنانہ پرائمری تعلیم جبریہ کی جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ سنہ ۱۸۸۲ء کی تعلیمی کمیشن نے لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترکہ تعلیم کی تجویز کو ناپسند کیا تھا تاہم بعض لوکل گورنمنٹوں نے اسے بنظر پسندیدگی دیکھا ہے اور ہندوستان کے بعض حصّوں میں یہی طریق مروج ہے۔ فی الحقیقت ۴۰ فیصدی طالبات اس قسم کے مدارس میں پڑھتی ہیں جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو یکجائی تعلیم دی جاتی ہے۔ سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب تک قابل اُستانیاں حاصل نہ ہو سکیں گی اسے پورے طور پر ترقی نہ دی جا سکے گی۔ اس مشکل کا واحد حل صرف یہ ہے کہ اچھے خاندانوں کی تعلیم یافتہ عورتیں روز افزوں تعداد میں

اس شریفانہ پیشہ کو اختیار کرنے لگیں اور اپنی زندگیاں اپنی جاہل بہنوں کی اصلاح و فلاح کے لئے وقف کر دیں - اگر بیوہ عورتوں کو مناسب تربیت دیکر اس کام پر لگایا جائے تو خصوصیت سے بہت کچھ فائدہ ہونے کی توقع ہے -

اس مضمون میں ہندوستان کے اندر تعلیم نسواں کی موجودہ اور گذشتہ حالت بیان کرکے اسے ترقی دینے کی بعض تجاویز پیش کی گئی ہیں - یہ تجاویز بلاشبہ نئی نہیں ہیں تاہم انھیں اگر مدنظر رکھا جائے اور ہمیشہ انھیں عمل میں لانے کی کوشش کی جاتی رہے تو بہت کچھ فائدہ حاصل ہونے کی توقع ہے -

تیرتھ رام

تکوین (۴)

بیسویں صدی کے خیالات

طبعی اور فلکی خیالات کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو خیالات عالموں میں آجکل مانے جاتے ہیں ظاہر کئے جائیں - آجکل دو قسم کے نہایت زبردست خیالات ہیں یعنی ایک فرقہ اہل علم و تحقیق کا وہ ہے جو خدا کی قدرت او ہستی سے منکر ہے، اور دوسرا اسے واجب الوجود اور قادر علی الاطلاق مانتا ہے - ایک گروہ اصول وحدت (Morism) کا قائل اور دوسرا اصول تثنیہ (Dualism) کا معترف ہے - یعنی علما کا ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ مبدآء عالم ایک شے ہے بعض اسے مادہ اور بعض عقل کل سمجھتے ہیں - دوسرا گروہ اسکے خلاف ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ابتدا میں مادہ (Matter) اور عقل کل (Mind) دونوں ہی تھے، جن کے سبب سے عالم و ما فی العالم عالم وجود میں آئے - اہل وحدت کا زبردست قایم مقام

(۱) مادہ پرستوں کے خیالات | جرمنی کا سب سے مشہور محقق ارنسٹ ہیکل ہے - چنانچہ وہ اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے :-

ہئیات اور طبعیات میں جو شاندار ترقی ہوئی ہے، اس سے ہم عالم کے ارتقا اور ترکیب، مادہ کے انقلاب اور استقرار کے باب میں چند نہایت ضروری نتایج اخذ کرتے ہیں (۱) عالم کی وسعت کا کوئی حساب اور شمار نہیں - اسکے اندر خلا محال ہے - ہر جگہ ہیولیٰ سے مملو ہے (۲) دنیا کب تک رہیگی ؟ یہ اندازہ سے باہر ہے - ابد الآباد تک چلی جائیگی - اسکا نہ شروع ہے نہ آخر - یہ ازلی و ابدی ہے (۳) ہیولیٰ ہر جگہ ہے - اسکی حرکت میں کوئی تعطل نہیں ہے - اسکے انقلاب کے تسلسل میں کوئی رخنہ واقع نہیں ہوتا - اسے کسی جگہ سکون اور قرار حاصل نہیں ہے - مادہ کی غیر متناہی مقدار اور انقلاب خیز قوت میں کوئی فرق نہیں آتا - وہ جوں کی توں رہتی ہے (۴) ہیولیٰ کی عالمگیر حرکت ازلی حلقہ کی صورت میں ہوتی ہے - یعنی اسکا سلسلہ ہمیشہ قایم رہتا ہے - (۵) اسکا ارتقا ایک وقت معینہ کے بعد ہوتا ہے - سب سے پہلے ایتھر اور عام ذخیرہ مادہ میں تقسیم و تفریق واقع ہوتی ہے (حرکت استمراری میں جو مادہ کے اندر ہے - کوئی فرق نہیں آتا) (۶) یہ عمل مادہ کے بتدریج انجماد اور تبخیر سے ہوتا ہے - بیشمار ننھے ننھے حلقے بنتے ہیں - اس میں علت فاعلی، ہیولیٰ کے قدیم خواص یعنی حس اور میلان ہوتے ہیں (۷) اور ہر خلائے لامحدود کے ایک حصہ میں ننھے اجسام کے اتحاد و اتصال سے بڑے بڑے جسم بنتے رہتے ہیں - ادھر دوسرے گوشہ میں آپس کے تصادم سے بگڑتے بھی چلے جاتے ہیں (۸) جلدی

جنابہ لیڈی ہیوٹ صاحبہ

جلد ہی حرکت کرنے والے اجسام کی تیز روی سے جو حرارت بکثرت پیدا ہوتی ہے، اس سے تحلیل شدہ اجسام کے ذرّوں میں گروہ پیدا ہوتے ہیں، اور وہ نئے نئے کرے بنانے کے موجب ہوتے ہیں۔ اس طرح کون و فساد کا سلسلہ غیر متناہی جاری رہتا ہے[1]۔ اسکا نہ تو آغاز ہے اور نہ اختتام ہوگا۔ خلائے غیر محدود میں ایک طرف کرے بنتے اور دوسری طرف بگڑتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ارتقا کا عمل بھی برابر جاری رہتا ہے۔

اس طبقہ کے علما ارتقا (Evolution) کے بڑے حامی ہیں، یعنی انکا یہ عقیدہ ہے کہ عالم و مافی العالم جیسے اسوقت نظر آتے ہیں، یکایک پیدا نہیں ہوئے، بلکہ لاکھوں کروڑوں برسوں کے انقلاب کے بعد اس درجہ پر پہنچے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی چند لاکھ سال کے بعد موجودہ رتبہ انسانیت پر پہنچا ہے۔

زمانہ حال کا سب سے بڑا فلاسفر ہربرٹ اسپنسر برعکس اور عالموں کے یہ کہتا ہے کہ "ہم عالم کی علت العلل[2] (Ultimate Cause) معلوم نہیں کرسکتے۔ ہمارے عقل و فہم اسکے معلوم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے"۔ البتہ بعض اور عطائی فرقہ لا ادریہ (Agnostics) علت آخری مادہ قرار دیتے ہیں، ہیکل ایک ہیولی تسلیم کرتا اور اسے مادہ عالم (Substance) قرار دیتا ہے۔ مگر اسکی ماہیت نہیں بتائی جاتی۔ اسکا وجود فرض کرلیا جاتا ہے۔

(۲) خدا پرستوں کے خیالات یہ گروہ اصول تثنیہ کا قایل ہے، یعنی یہ کہ شروع میں مادہ اور عقل کل کا وجود تھا جسکے سبب سے تمام موجودات عالم وجود میں آئے۔ یورپ کے محققوں اور عالموں کا ایک بڑا حصہ

[1] منقول و ماخوذ از "رڈل آف دی یونیورس" (معمۂ عالم) صفحہ ۹۶ مطبوعہ رینشلسٹ پریس ایسوسی ایشن لندن۔

[2] ملاحظہ ہو "فرسٹ پرنسپلز" (اصول اولیہ) صفحہ ۸۴۔

اسکا قایل ہے، اور خدا پرستوں کے زمرہ میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اس گروہ کے بہترین نمائندہ شاید سر آلیور لاج ہوسکتے ہیں جو آجکل کے علمائے طبیعات کے سرتاج ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ اپنے دین کے پابند ہیں۔ آپ نے محدود عقل انسانی کی کوتاہیوں کو تسلیم کرکے بڑے حلم اور انکسار کے ساتھ اپنے خیالات دربارہ تکوین کا اظہار حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے[1]:۔

> ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ سائنس ہمیں مبدأ عالم کی بابت کچھ نہیں بتاتا۔ شروع میں مرغی تھی یا انڈا؟ یہ سوال اس مسئلہ کی جان ہے۔ اس دنیا کا جسمیں ہم رہتے ہیں ہاں اسی دنیا کا جو عناصر کا عظیم مجموعہ ہے کسی زمانہ میں ضرور آغاز ہوا تھا۔ اسکی تاریخ اور اس کے پچھلے حالات دن بدن معلوم ہوتے جاتے ہیں، اور بہت کچھ دریافت بھی ہوگئے ہیں۔ یہ کس زمانہ میں اُبلتے ہوئے مادہ کا ہولناک سمندر تھی اسکی بابت بھی ہم قیاس سے کام لے سکتے ہیں۔ جس طرح چاند وجود میں آیا اسکی بابت بھی بہت کچھ اندازہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ایک معنی میں زمین اور چاند کی ابتدا ہوئی اور یہ دونوں خلاے بے محدود میں نیبیولہ کے اجزا تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی روز نظام شمسی کسی دور افتادہ نہایت ہی بڑے نیبیولہ کے ڈھیر سے ٹکراکر پاش پاش ہوجائے۔ مگر عالم مرئی کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ایسے تصادم آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ عالم کے اندر ہر قسم کے مادہ کے ذخائر ہیں۔ نظام شمسی کی ابتدا اور تباہی کی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے، جسکے ان دونوں واقعات کے وقوع میں کروڑوں برسوں کا اختلاف ہوگا۔ لیکن یہ ازلی و ابدی تکوین کی تاریخ کا ایک ادنیٰ سانحہ ہوگا۔ نظام شمسی کے وجود میں آنے سے پیشتر کچھ تو تھا، جس سے اسے وجود حاصل ہوا۔ حبابوں کا بلبلہ بہت

[1] "مین اینڈ دی یونیورس"۔ نیا اڈیشن اکتوبر ۱۹۱۰ء صفحہ ۲۹-۳۰-۳۱

خوبصورت اور قابل تعریف ہوتا ہے۔ اسکے اندر حسن اور خوبی نظر
آتی ہے۔ وہ ایک قانون کی متابعت کے سبب سے وجود میں
آتا ہے۔ اسکی ہم تاریخ لکھ سکتے ہیں۔ مگر ہم اسکی ابتدا اور اصلیت
سے ناواقف ہیں۔ یہی حال نظام شمسی کا بھی ہے، اور جتنے کرے
مادہ کے آسمان میں ہیں انکا بھی یہی حال ہے۔ وہ ایک قاعدہ
کے مطابق وجود پاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد اپنے مخرج
میں غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسا زمانہ کبھی نہیں آئیگا جب انسان
کا دل وجود ماقبل اور مابعد کے استفسار سے عاجز ہو جائیگا ....
یہ بچوں کے خیالات ہیں۔ اگر ان سوالات کے صحیح جوابات مل
جائیں گے تو بھی ان سے کوئی خاص مقصد حل نہیں ہو سکتا۔ مگر
ان باتوں کی حقیقت پریوں کے قصوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

بحث کا خلاصہ

تکوین کی بابت جو انواع و اقسام کے خیالات اب تک
بیان ہوئے ہیں وہ آج بیسویں صدی کی دنیا میں بھی رائج ہیں،
اور بنی آدم کا ایک بڑا حصہ انکا معتقد ہے۔ یہاں ان کی تقسیم اور
خلاصہ دینا ضروری ہے، جیسے پچھلی بحثوں کا لب لباب سمجھنا چاہیئے۔

اول - لاادری اور طبعی خیالات اس فرقہ کے لوگ اسباب و نتائج
کی تحقیق کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور مظاہر ارضی و سماوی تک خود کو
محدود رکھتے ہیں۔ اسکا موجد فرانس کا نامور فیلسوف آگسٹ کونت
(Compte) تھا۔ جو بات عقل اور تجربہ میں آجائے اس کی
حقیقت کو تسلیم کیا جاتا ہے اور باقی امور کو مسترد کرتے ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر
کے خیالات کو لاادریہ قرار دیا گیا ہے، مگر اصل یہ ہے کہ وہ وحدت
الوجود کا قائل ہے۔

دوم - اہل مادہ کے خیالات یہ منکرانہ اور دہریانہ خیالات ہیں
مادہ پرست بھی اسی گروہ میں شامل ہیں۔ دمقراطس، ابقراس، اور
لکریشس، اور آجکل کے مادیین اسی زمرہ میں داخل ہو سکتے ہیں
اس فرقہ کے علما کسی روحانی وجود ابتدائی کے قائل نہیں ہیں اسواسطے
وہ عالم کا مبدا عناصر کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن آجکل کے نام نہاد مادہ
پرست ہی وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ڈیوڈ اسٹراؤس اور ارنسٹ ہیکل
کے خیالات اسی قسم کے ہیں۔

سوم - ہمہ اوستی خیالات یہ خیالات کئی صورتوں میں رائج ہیں۔ ایک
خیال یہ ہے کہ سرشتی ایک مبدا، ابتدائی کی محتاج ہے، یعنی ایک ہستی
کی قدرت سے وجود میں آئی۔ مگر وہ ہستی اس سے جدا اور خارج نہیں
ہے۔ یا یوں سمجھو کہ واجب الوجود اور عالم کا جوہر اصلی ایک ہی۔ اسی
سے سرشتی ظاہر ہوئی۔ اور ہر جگہ وہ قوت کل محیط ہے۔ جو مختلف خیالات
پیدا ہوگئے ہیں ان کی وجہ واجب الوجود کی ماہیت آخری ہے اور
دوسری بات یہ ہے کہ اس نے بتدریج کون کونسی صورتیں اختیار کی
ہیں جس سے وہ ہستی ہر جگہ آسمان اور زمین میں ظہور پذیر ہے اس
فرقہ میں پانچ مشہور خیالات ہیں۔

(۱) طبعی خیال۔ اس اعتبار سے اسکا تعلق مادہ سے ہے
جس کی وجہ سے اسے مادی ہمہ اوست Materialistic
Pantheism کہنا بجا ہے (۲) وحدت الوجود ذی حیات
سمجھا جاتا ہے (۳) یہ وجود ذی عقل روح کل تسلیم ہوتا ہے اور اسے
آگ سے تشبیہ دی جاتی ہے (۴) اسے ایک ہستی یا ہیولیٰ قرار دیا جاتا
ہے (۵) یہ روحانی وجود ہے یعنی وہ عقل کل بے شخصیت ہی۔ جرمنی
کا فلاسفر ہیکل اسے اسپرٹ (روح) اور شاؤپن ہاؤر اسے ارادت
کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ ہمہ اوستی عقیدہ ادنیٰ صورت میں مادہ
پرستی سے اور اعلیٰ حالت میں توحید سے موافقت کھاتا ہے۔ آخرالذکر
صورت ہیکل کے نئے شاگردوں کے سبب سے حاصل ہوئی ہے۔

چہارم - روحانی خیالات اس طبقہ میں وہ خیالات شامل ہیں جنکے

روسے عالم کی علت آخری ایک روحانی اور ذی شعور ہستی مانی جاتی ہے اسکے تین بڑے فرقے ہیں (۱) ڈی ازم (Deism) اس فرقہ کے مقلد یہ کہتے ہیں۔ خدا نے جہان کو بنایا اور الگ ہوگیا۔ اب اسکا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسان اس سے رفاقت قایم نہیں کرسکتا۔ اس فرقہ کے خیال سے خدا ماورائے فطرت ہے اور الہام غیر ممکن ہے (۲) وحدانیت۔ خدا عالم کا خالق ازلی و ابدی ہے وہ کائنات کے اندر اور باہر یکساں ہے۔ وہ دنیا اور انسان کا اخلاقی فرماں روا ہے (۳) مسیحی تثلیثی خیالات، جو وحدانیت کی اعلی ترین صورت ہے۔ خدا نے زمین و آسمان کو خلق کیا۔ وہ ازلی و ابدی ہے۔ اسکی شخصیت تین خاص خواص منسوب کئے جاتے ہیں

دوسری تقسیم عالم کی بابت جتنے خیالات مشہور ہیں انھیں پھر تین عام گروہوں[۱] میں بانٹا جاسکتا ہے، جو باعتبار ذہنی کیفیتوں کے ہیں (۱) سائنسی خیالات۔ انسان اس دنیا کو موجود فی الخارج ذہن سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کو ایک ہستی اور عالم کو دوسرا وجود سمجھکر سلسلہ اسباب و نتایج، تسلسل، مشابہت، اور تعاصر کے تعلقات پر غور کرتا ہے وہ مشاہدہ اور استقرا سے کام لیتا ہے، اور اعلی ترین اصول ڈھونڈ نکالتا ہے، اور آخیر میں اسے اصول واحد ملجاتا ہے جسکے سبب سے مختلف مظاہر فطرت وقوع میں آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کائنات کو معلول قرار دیکر استدلال انّی یعنی معلول سے علّت کی طرف استدلال کرتے ہیں اور علّت العلل دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے (۲) فلسفی خیالات۔ یہ سائنسی خیالات سے بالکل جدا ہیں۔ نقطۂ دید ذہن ٹھہرتا ہے۔ موجودات پر غور کرتے وقت اسکے تعلق تخیل اور علم سے قایم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وحدت عقلیہ کی بنا پر موجودات کی وحدت آخری قایم کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ "مابعد الطبعی خیالات" (Metaphysical Ideas) قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ یہ دو قسم کے ہیں[۲] (۱) واجب الوجود کا خیال تخیل کی بنا پر موجودات کا مبدا **عقل کل** قرار دی جاتی ہے (۲) حسائۂ اخلاقی۔ احساس اخلاقیہ کی وجہ سے ایک ازلی و ابدی وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو ہماری اخلاقی حسّوں کا مصدر و محرک ہے۔ استدلال لمی سے کام لیکر علت سے معلول ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شروع میں ایک ازلی و ابدی اور قادر مطلق وجود مانا جاتا ہے اور پھر اس کے مظاہر کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ (۳) دینی خیالات۔ یہاں نقطۂ دید احتیاج بالغیر ہے۔ انسان طبعًا خدا کی احتیاج محسوس کرتا ہے اور اسپر وثوق کلی رکھتا ہے۔ جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو خدا سے امداد کا خواہاں ہوتا ہے۔ طبعی اور اخلاقی خواہشوں کی سیری کی بھی اسی سے توقع رکھتا ہے۔ تمام واقعات اور ظہورات طبعی کو اسی سے منسوب کرتا ہے۔

(۵) دنیا کس طرح برباد ہوگی؟

سائنس دانوں کے خیالات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ابتدا کے متعلق روایات، خیالات، قیاسات، اور مفروضات، بیان کرنے کے بعد دنیا اور نیز عالم کی بربادی کی بابت بھی کچھ لکھا جائے۔ اگر مضمون ہذا کے اس پہلو کو بھی انواع و اقسام کے قدیم و جدید "روایات اور خیالات" دیئے جائیں تو یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک ختم نہو گا۔ علاوہ ازیں مجھے دوگنا دماغ سوزی اور دیدہ ریزی سے کام لینا پڑے گا۔ اسواسطے آجکل کے سائنسدانوں کے چند خیالات کے اندراج پر اکتفا کی جاتی ہے۔ شاید پھر کوئی موقع اسی مسئلہ پر رجوع ہونے کا مل جائے۔

---

[۱] ماخوذ از دی کریچن دیو آف گاڈ اینڈ دی ورلڈ (خدا اور دنیا کی بابت مسیحی مذہب کی رائے) مصنفہ ڈاکٹر جیمز آر ص ۶۷-۶۸-۳۶۹

[۲] ہیگل اور کانٹ علی الترتیب ان دونوں خیالات کے موجد ہیں۔

جرمنی کا نہایت نامآور محقق علم الحیوٰۃ و طبیعیات پروفیسر ارنسٹ ہیکل

کششِ ثقل سے بربادی کا اندیشہ

اپنی اسی کتاب[۱] میں دنیا کی بربادی کی بابت لکھتا ہے:۔

> ہماری زمین جو کروڑوں برس پیشتر نظام شمسی کے اجزا کا ایک ٹکڑا تھی لاکھوں برسوں کے بعد سرد ہو جائیگی۔ حیات بخش عنصر زائل ہو جائیگا۔ رفتہ رفتہ اسکا محور بھی چھوٹا اور محدود ہوتا چلا جائیگا اور بالآخر وہ سطح آفتاب پر جا پڑے گی، اور جل کر تحس نحس ہو جائیگی اور دخان خلائی کے ساتھ جا ملے گی۔

یورپ کے کئی عالم ہیئہ[۲] کہتے ہیں کہ کشش سے بہت سے ثاقب سطح آفتاب پر ہزاروں کی تعداد میں گرتے رہتے ہیں، جس سے حرارت شمسی کا ذخیرہ قایم رہتا ہے۔

دنیا کی بربادی کی بابت عوام میں طرح طرح کے توہمات اور

بربادی کی بابت توہمات

احتمالات مختلف وقتوں میں رائج ہوتے رہے ہیں۔ ۱۸۹۹ء کے شروع میں مارچ کی کسی تاریخ کو دنیا کی بربادی کی پیشین گوئی ہوئی تھی۔ پھر تین چار برس بعد اسی قسم کی افواہ اڑی تھی، اور پھر ۱۹۰۸ء میں بھی مشہور ہوئی۔ جس سے جہلا اور ضعیف الاعتقاد لوگ بہت خائف ہوئے تھے۔ ایسا بیسیوں مرتبہ ہوا۔ یورپ میں بھی مختلف وقتوں میں عجیب اندیشناک توہمات پھیل چکے ہیں۔ جب ۱۰۰۰ء شروع ہونے کو تھا تو عام خیال ہوا کہ دنیا برباد ہو جائے گی۔ جرمنی اور فرانس کے کمزور دل جمہور نے کاشتکاری اور کاروبار چھوڑ دیا۔ تجارت برہم اور زراعت برباد ہوئی۔ اس سے قحط اور گرانی نازل ہوئی۔ فرماں رواؤں نے فرماں روائی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور خانقاہوں اور سنسان گوشوں میں جا کر یاد الٰہی اور توبہ و استغفار میں مصروف ہو گئے۔

ارباب تحقیق و تجسس کا یہ خیال ہے کہ کرۂ ہوا میں کاربانک ایسڈ

کاربانک ایسڈ گیس

کا ذخیرہ دن بدن بڑھتا ہے، اور آکسیجن کا جزو گھٹتا جاتا ہے۔ ایک ایسا وقت آئیگا کہ تمام کرۂ ہوا بھاری ہونے کے سبب سے ہم پر آ گرے گا اور ہم دبکر اور نیز دم گھٹنے سے مر جائینگے۔

مشہور پروفیسر سائمن نیوکم نے جو احتمال دنیا کی بربادی کی بابت ظاہر کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آفتاب مع سیارگان مجھستر ویگہ کی طرف جا رہا ہے۔ اثنائے راہ میں کسی نامعلوم ستارہ سے ٹکرانے کا امکان ہے۔

فلکی احتمال

ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی کالا تارا ہو جسکے وجود سے عالمان فلکیات بے خبر ہوں۔ اگر خدانخواستہ ایسا تصادم ہوا تو یہ بالکل بے نظیر اور نہایت خوفناک ہوگا۔ نظام شمسی کے کئی ارکین چشم زدن میں تحس نحس ہو جائیں گے۔ اسکا صرف احتمال ہے مگر لازم نہیں ممکن ہے کہ آفتاب کا محور ہو۔ یا کسی اور نامعلوم سبب سے ویگہ تک[۳] پہنچنے سے باز رہے۔

چہارم صدی پیشتر کے علما کا ایک گروہ یہ مانتا تھا کہ آفتاب

حرارت شمسی کا خاتمہ دنیا کی بربادی کا پیش خیمہ ہے

جلد جلد ٹھنڈا ہوتا جاتا ہے اور اسکا حجم سکڑتا جاتا ہے۔ ہیلم ہولٹس، ایک نہایت مشہور جرمن عالم طبیعیات، کا اندازہ یہ ہے کہ ستر اسی لاکھ سالوں میں حرارت ختم ہو جائے گی اور نظام شمسی کے باقی ارکین اس سے متاثر ہونگے۔ انکی حرارت بھی ختم ہو جائے گی اور وہ خودبخود سرد اور مردہ ہو جائیں گے۔ اسکا ذکر آگے آئیگا۔

پروفیسر کلفرڈ ایک بہت نامآور عالم تھے۔ آپنے بعض ضروری مسائل پر خاص مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک دنیا کی بربادی

۱؎ "رڈل آف دی یونیورس" صفحہ ۹۶   ۲؎ "ورلڈس ان میکنگ" صفحہ ۸۰

۳؎ ماخوذ از ہارمس ورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۱۔ ملاحظہ ہو "فتوحات علمیہ" از قلم مسٹر سی۔ ڈبلیو۔ سلیبی۔

کے لئے بھی وقف کیا گیا تھا، جس کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

اس کرۂ ارض کی نباتی اور حیوانی زندگی کا دار و مدار حرارت شمسی پر ہے۔ سورج کی جسامت فرسودہ ہو رہی ہے، اور اخراج حرارت سے سکڑتا جاتا ہے۔ اس عمل انقباض سے اس حرارت کا ایک حصہ پورا ہوتا رہتا ہے۔ مگر یہ حالت ہمیشہ تک نہیں رہیگی جب انرجی (شکتی یا قوت) کا خزانہ ختم ہو جائیگا تو حرارت یہاں تک نہیں پہنچ سکے گی، اور اگر اس اثنا میں کرۂ ارض آفتاب کے گرد گھومتی رہے تو کثرت برودت اور قلت حرارت سے ہم اکڑ کر مر جائیں گے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ سورج آگے کو بڑھ رہا ہے۔ اگر اس کی کشش[1] سے زمین اس کی سطح پر جا پڑے تو ہم کباب ہو جائیں گے۔ اگر آفتاب کی کشش زمین کو متاثر کرنا چھوڑ دے اور وہ خلا کے کسی دوسرے حصہ کو چلا جائے تو ہم گرمی نہ پہنچنے سے مر جائیں گے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا حشر ہوگا مگر ان دونوں باتوں میں سے ایک ہو کر رہیگی اگر عالم بالا کے تمام اجرام و اجسام کو لیا جائے اور ان کے آخری حشر پر غور کیا جائے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کشش سے ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور وہاں سے گرمی کی رَو نکلکر چاروں طرف خلا میں پھیلتی رہیگی۔ آخر کار وہ ذخیرہ ہولناک سرد و خشک ہو جائیگا اور جو روئیدگی یا جاندار کسی سیارہ میں ہیں وہ کثرت برودت سے اینٹھ کر ہلاک ہو جائیں گے۔

پروفیسر فلے مریان۔ پروفیسر کمل فلے مریان فرانس کے ایک نہایت مشہور عالم فلکیات ہیں۔ ان کی رائے آجکل کے اہل تحقیق اور طبعیات کا آئینہ ہے۔ اسواسطے اسے قدرے وضاحت کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

[1] منقول از "ہارمس ورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ" جلد ۸ صفحہ ۳۵-۶۲۳۶

کرۂ ارض فانی ہے۔ نہ ازل سے تھی اور نہ ابد تک رہیگی۔ ایک روز وجود میں آئی، کسی دوسرے روز اسے نابود بھی ہونا پڑیگا ایک طرف پانی کی مقدار اور ہوا کے آکسیجن کا جزو گھٹ رہا ہے، دوسری طرف براعظم اور پہاڑ فرسودہ ہو کر سمندر میں ملتے جاتے ہیں۔ کیا یہ دنیا پانی کے بے تھاہ گڑھے میں غرق ہوگی ؟ یا پانی کی قلت سے اسکی بربادی ہونے والی ہے ؟ کرۂ ارض کی حرارت اور جانداروں کی جان پانی سے قایم ہے۔ اگر یہ معدوم ہو جائے تو روئیدگی خشک، اور حیوانات بے جان، قدرت کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔ اگر سمندر خشکی پر حملہ کرے تو بھی نباتات اور جانداروں کی سلامتی نہیں ہے۔ بنی آدم نہنگ آبی کا لقمہ بنیں گے۔

پانی کی قلت سے بربادی کا خدشہ

مریخ (منگل) اس دنیا سے پرانا اور چھوٹا ہے۔ اور ارتقا کے تمام مرحلوں سے گذر گیا ہے۔ اس کا بڑھاپا شروع ہے بڑے بڑے سمندر غائب ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ دلدلی روئیدگی موجود ہے۔ اسکی ہوا لطیف اور ہلکی ہے۔ بارش نہیں ہوتی مطلع صاف رہتا ہے۔ پانی کی مقدار روز بروز کم[2] ہوتی جاتی ہے۔ بعینہ کسی زمانہ میں ہمارا بھی یہی حشر ہوگا۔ کائنات سے وہ عنصر اعظم مفقود ہو جائیگا جس سے اسکا کاروبار جاری اور اشیائے ذی روح قایم ہیں۔ جانداروں کے جسم میں پانی جزو لازمی ہے۔ انسان کے بدن میں ستر فیصدی ہے۔ اسی سے زندگی قایم رہتی ہے ہستیوں کے وجود اور نمو کے لئے جو حرارت درکار ہوتی ہے وہ اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ پس جب پانی نہ رہیگا تو ہماری زندگی محال ہو گی۔ پانی ہی سے موجودات برباد نہ ہوں گی بلکہ اسکی قلت سے جو اثر کرۂ ہوا پر ہوگا وہ بھی اس بربادی میں شریک ہوگا۔

[2] پروفیسر لوئل ماخوذ از "روسینس آف دی ماڈرن اسٹرانومی" مصنفہ ہکٹر میکفرسن صفحہ ۲۳۰

اسکی مقدار خواہ کتنی کم کیوں نہو مگر وہ ضروریات سے ہے - آکسیجن اور نائٹروجن کے دوسو ذرّوں میں ایک بھی آبی ذرہ نہیں ہے تاہم اسکی انرجی ان دوسو ذرّوں سے اسّی گنا زیادہ ہوتی ہے - یہ ننھے ننھے ذرّے کرۂ ہوا میں سورج کی کرنوں کو مرکوز کرلیتے ہیں اور اسے کرۂ ہوا کے نچلے حصوں میں روکے رکھتے ہیں - لیکن جب بخارات کا یہ ہلکا سا پردہ اٹھ جائیگا تو کیا ہوگا -

زمین کا درجہ حرارت صفر سے کہیں نیچے ہوگا - جاندار سردی **برودت کی کثرت سے ہلاکت کا خوف** سے اکڑ کر مر جائیں گے - پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف کے تودے لڑھک کر وادیوں میں پھیل جائینگے زندگی اور تمدنی سامان راحت برباد ہو جائیں گے - نیویارک، لندن، پیرس، برلن، وائنا، روم، قسطنطنیہ، کلکتہ، پیکن، ٹوکیو، دائمی برف کے نیچے مفقود الوجود ہو جائیں گے - پھول، پھل، نباتات، حیوانات اور تمام موجودات معدوم ہو جائیں گی - دریا اور سمندر ناپید ہو جائیں گے - انسان کا آخری قایم مقام کسی گرم ملک کے سمندر کے کنارہ پر اینٹھ کر جان دیتا نظر آئیگا اُس وقت سطح زمین کا ٹمپریچر[1] (۲۷۳) صفر سے نیچے ہوگا - ہوا میں آکسیجن اور نائٹروجن کا عنصر بھی دن بدن گھٹتا جاتا ہے - ہر صدی کے بعد کرۂ ہوا کے اُن اجزا میں معتدبہ تخفیف ہو جاتی ہے جس سے جانداروں کی زندگی قایم رہتی ہے - دس لاکھ برس کے بعد زمین کا ایک بڑا حصہ فرسودہ، بنجر اور سنسان ہوگا - اسکے نہایت شاندار ماضی کے کھنڈر اس کی سطح پر نظر آئیں گے -

(۶) دنیا کی بربادی کے خلاف احتمال

جیسا پہلے مذکور ہوا ہے علما کا بڑا حصہ دنیا کی بربادی کا بڑا سبب مخزن حرارت کا عدم قرار دیتا ہے - مگر اس کے برعکس آجکل کے علمائے فلسفہ کائنات اس احتمال کو محال ٹھہراتے ہیں - جب سے ریڈیم اور اسکی ماہیت کے باب میں نئی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں اور ہورہی ہیں اہل تحقیق نے یہ رائے قایم کی ہے کہ زمین پر ریڈیم مادہ بکثرت موجود ہے جس سے اسکا ذخیرۂ حرارت عرصہ دراز تک قایم رہے گا **مخزن حرارت غیر متناہی ہے** جتنی حرارت زمین سے نکلتی ہے اتنی ریڈیم کے ذخیرہ سے نکل کر کوتاہی پوری ہوجاتی ہے - ریڈیم کا وجود دیگر اجرام خلا میں بھی مانا گیا ہے - محققان طبعیات فلکی نے تازہ اکتشافات کی روشنی میں یہ نظریہ قایم کیا ہے کہ سورج کی حرارت موجودہ شرح خرچ سے تین کروڑ سال تک ختم ہوگی - اسواسطے کم از کم تین کروڑ برس تک کرۂ ارض ہلاکت و بربادی سے مامون ہے - اُس وقت تک ہمیں بربادی کا کوئی خوف نہیں ہوسکتا اور نہ ہونا چاہیے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم چالیس، پچاس، ساٹھ، حد سو سال تک یہاں زندہ رہکر اگلی دنیا کو چلدینگے جہاں دنیا اور ما فیہا کی بربادی کا خرخشہ ہرگز نہیں ستا سکتا - علاوہ ازیں ہم مانتے ہیں کہ روح کو بقائے دوام لاحق ہے - اگر ہم اس خاکی بدن کو چھوڑ دینگے اور اس سے رہائی پاتے ہی اس دنیائے فانی سے بھی منہ موڑ لینگے تو ہم پھر ایک ایسے خطہ میں داخل ہوں گے جہاں کی ہر شے اس سے بالکل نرالی ہے - وہاں ہم اس جہان کے تمام بکھیڑوں سے بالاتر ہوں گے - مرنے کا خوف بالکل نہ ستائیگا -

عالمان فلکیات کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ آفتاب اور زمین پُرانے اور کہن سال نہیں ہیں جیسا کچھ عرصہ سے تصور ہوتا رہا ہے یہ ہنوز لڑکپن کی حالت میں ہیں - ازلیت کے سال کا ابھی چوتھا حصہ بھی نہیں گذرا ہے - انسان بھی ایک قلیل عرصہ سے اس ستارہ پر نمودار ہوا ہے -

عالمان طبعیات کا یہ خیال ہے کہ عقل انسانی اُس ہولناک

---

[1] ماخوذ از "ہارمس ورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ" ضمیمہ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲ - ۴۳ - ۴۴ - ۴۴۶

عقل انسانی کی قدرت سانحہ کا انسداد نہیں کرسکتی جو دنیا کی بربادی کے متعلق ہے - کیونکہ یہ مغز کے اجزائے ترکیبی کا نتیجہ ہے - مظاہر فطری سے اسکا کوئی سروکار نہیں ہے - اس خیال کے بڑے حامی پروفیسر ہکسلے اور جرمن محقق ماؤڈسلے وغیرہ ہیں - لیکن کا ایک اور مشہور جرمن عالم وونٹ (Wundt) کا یہ خیال ہے - عقل و مادہ دماغ کے اجزائے طبعی اور ذہن کے عناصر روحی سے منتج ہیں - ان دونوں کا عمل و اثر متوازی خطوط میں نمایاں ہوتا ہے اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہتے ہیں - عالم موصوف کے اس انوکھے نظریہ کی تطبیق واقعات تجربیہ سے نہیں ہوسکتی - انسان کی روحانی تاریخ بھی اسکے خلاف ہے - انسان کو اپنے ارادوں اور خواہشوں کا پورا علم رہتا ہے - وہ ذی شعور ہستی ہے - مادہ پرست اور آئیڈیلسٹ (Idealists) چاہے اور باتوں سے انکار کریں مگر اسکا اقرار لازم ہے کہ ارادہ اور مقصد ہمارے اندر موجود ہے - ایک عجیب قوت ہماری ذات میں پنہاں ہے جس سے سب تمنائیں پیدا ہوتی ہیں اور جیسے ہماری تمام حرکتوں اور فعلوں کا علم ہے - ہم خدا پرست اس قوت کو اسکی بے حد غیبی طاقت کا ایک ریزہ سمجھتے ہیں جسکے وسیلہ سے انسان اور خدا کے درمیان رفاقت کا احساس قایم ہوسکتا ہے - اس قوت ارادی یعنی روحانی طاقت میں عجیب راز بند ہیں - جب انکے انکشاف اور عمل کا اسے موقع ملتا ہے تو وہ زور پکڑتی ہے اور اس سے عجیب وغریب افعال سرزد ہوتے ہیں بعض فقیروں اور یوگیوں میں یہ قوت پائی جاتی ہے جسکے اظہار کا ہمارے ناظرین کو کبھی نہ کبھی ضرور تجربہ ہوا ہوگا - انسان اس قوت کو درجۂ کمال پر پہنچا کر جناب باری کی عینی حضوری حاصل کرسکتا ہے اور حوادث کو روک سکتا ہے - راقم مضمون کا یہ محض گمان ہی نہیں ہے بلکہ سائنس داں بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں - پروفیسر ہکسلے نے ایک جگہ لکھا ہے :-

> انسان کے اندر انرجی کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جسکا عمل و ظہار معلوم و محسوس طریقہ سے ہوتا رہتا ہے اور جو انرجی عالم کے اندر موجود ہے وہ ہماری معنوی انرجی سے اس قدر مشابہ ہوکر اس سے عمل فطری (Cosmic Process) اور قانون طبعی موثر ہوسکتا ہے -

اب کیا فرق ہے؟ انسان کی اصل روحانی طاقت اور قوت یزدانی اپنے جوہر اصلیہ میں ایک دوسرے سے مطابق ہیں - سمندر میں سے ایک لوٹا پانی لو، اس کے اندر وہی خواص اور اجزا قایم رہتے ہیں جو سارے سمندر میں پائے جاتے ہیں -

پس اس عجیب وغریب طاقت سے انسان مظاہر فطری پر قابو حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے - اس خیال سے سب دلوں کی پوری تشفی ہونی چاہیئے اور خدا کی قربت وحضوری کا صدق دل سے خواہشمند اور طالب ہونا چاہیئے - تمام شد -

سچے آر رائے

سچائی میں آزادی

آدمی کے لئے انسان بننے کو یہ بات اشد ضروری ہے کہ اُس میں انسانیت کے اوصاف پائے جائیں۔ صرف گوشت اور ہڈیوں کے پتلے کا نام انسان نہیں ہے۔ بلکہ انسان وہ ہے جسمیں ایشوریہ (خدائی) صفات موجود ہوں۔ پرماتما نے انسان کے بنانے میں اپنی تمام صنعت ختم کردی ہے۔ انسان کو دانا لوگوں نے یہ پدوی اور درجہ دیا ہے کہ اُسکو ایشور کا نمونہ تک کہہ دیا ہے۔

لیکن کیا درحصل انسان میں ایشوریہ صفات موجود ہیں؟ کیا وہ ایشور پرماتما کی صنعت کا انتہائی مقصد ہونے کا مستحق ہے؟ کیا وہ ایشور کا نمونہ ہوسکتا ہے؟

حقیقت میں بات یہ ہے کہ انسان میں یہ ساری صفات موجود ہیں لیکن کمی صرف اسی بات کی ہے کہ اُس نے ان اعلیٰ درجہ کی صفات کو اپنی جہالت اور اخلاق سے گرے ہوئے کاموں کے پیچھے چھپا رکھا ہے۔ کون پرماتما کا سچا بندہ ہے؟ کس نے اُسکی مرضی کے پورا کرنے کی دل میں ٹھان رکھی ہے؟ آئے سامنے آئے۔ میدان میں آئے اُسکو بتایا جائیگا کہ پرماتما کی مرضی پوری اسی طرح ہوسکتی ہے کہ اُس کا ہر بندہ ہمیشہ سچ بولے۔ صداقت کو اپنی ہر بات کا معیار قرار دے وہ صداقت جو اصلی ہو۔ جھوٹ کے کھوٹ سے پاک ہو۔ ایسی بہادر صداقت جس سے متاثر ہوکر لوتھر بے دھڑک بول اُٹھا تھا کہ "اگر ورمز کی انجمن مجھے زندہ جلائے جانیکا فتویٰ دیتی ہے تو بیشک میں سچائی سے ہرگز گریز نہیں کرسکتا"۔ ہمیشہ سچ بولو اور بے کھٹکے سچ بولو سچائی ہماری زندگی اور جھوٹ ہماری موت ہے۔ ظاہرداری اور چاپلوسی کی باتوں سے پرہیز کرو بناوٹ اور جھوٹ سے کنارہ کش ہو۔ لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانا چھوڑ دو۔ بات وہ کہو جو درحصل درست ہو اور جسکی نسبت تمہارا ضمیر تم کو اجازت دے۔ اپنے ضمیر کی آواز کو مت دباؤ۔ اپنی جھوٹی باتوں سے خدا کی آواز کو چپکا مت کرو سنسکرت کا مقولہ ہے "सत्यमेव जयते नानृतम्" یعنی سچائی ہی کی فتح ہوتی ہے۔ جھوٹ کی نہیں"۔ بیشک سچائی عالمگیر قاعدہ ہے۔ اگر تمام عالم کے دل پر اپنا اثر پیدا کرنا چاہتے ہو تو ہمیشہ سچ بولو۔ تسخیر قلوب کے لئے اور کسی بات کی ضرورت نہیں صرف یہی درکار ہے کہ لوگوں کے ساتھ تمہارا سلوک سچائی پر مبنی ہو۔ تاکہ لوگ تمہارے قول وفعل پر بھروسہ کرسکیں۔ ہمیشہ لوگ سچائی کی وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں۔ نیکنامی دنیا میں اُن کو ہی ملتی ہے جنھوں نے سچائی کو اپنا اصل الاصول بنا رکھا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ بعض اوقات جھوٹ بولنے والا دنیاوی مقاصد میں بہت کامیاب دکھائی دیا کرتا ہے لیکن صبر سے اُسکے افعال کا مشاہدہ کرو۔ وہ دن قریب ہے جس روز اُسکے جھوٹ کا پول کھل جائیگا اور وہ انجام کار منہ کے بل گر پڑیگا۔ جھوٹ سے گرا ہوا انسان پاؤں سے چوٹی تک کا بھی زور لگائے تو پھر اُٹھ نہیں سکتا۔ اوپر اُٹھانے والی سچائی ہے جھوٹ نہیں۔ جھوٹ میں غلامی ہے۔ سچائی میں آزادی ہے۔ اپنے فائدے کی خاطر جھوٹ بول کر اپنے نفع کے غلام نہ بنو۔ بلکہ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے غرض ہر وقت اور ہر لحظہ سچ بولو۔ خوب آزادی سے اپنے نفع سے دست بردار ہو۔ اپنے ذلیل نفع کو روحانی آزادی پر قربان کردو۔ جھوٹا نفع "سچی آزادی" کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ سچائی میں طاقت، آزادی اور دلیری ہے۔ انسان سچائی آزادی اور دلیری کے بغیر انسان نہیں رہتا بلکہ وہ صرف پوست واستخوان کا ڈھانچا رہ جاتا ہے۔

بادشاہ اورنگ‌زیب : شکارگاہ میں

انڈین پریس الہ آباد

جھوٹ اپنی متعدد دلکش شکلیں تمہاری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے - تم اُن پر فریفتہ ہوکر اپنی اعلیٰ درجہ کی صفات اور بعض اوقات عزت و حرمت تک کو کھو بیٹھتے ہو - لیکن اگر تم ایک دفعہ بحسن الوجوہ یہہ ذہن نشین کر لو کہ تم آزاد ہو اور جھوٹ کے غلام نہیں ہو سکتے تو سچائی جو اوّل اوّل دیکھنے میں بہت بھونڈی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل نہایت ہی نیک سیرت ہے اُسکو حاصل کرکے بلا پس و پیش امن سے زندگی بسر کرسکتے ہو - سچائی میں ایسی روحانی طاقت ہے جس کی وجہ سے تم حقیقی حیات کی مہتم بالشان اور مسرت آمیز فتوحات حاصل کرسکتے ہو - انسان کی شرمناک کمزوری کا باعث یہہ ہے کہ وہ اکثر اپنے ادنیٰ درجہ کے جذبات کا اسیر بنا رہتا ہے حالانکہ انسانیت کا فرض یہہ ہے کہ وہ اپنے ادنیٰ درجہ کے جذبات خواہشات اور محسوسات کو اپنے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی اور روحانی اوصاف کے تابع کرے - اس طرح انسان روز بروز طاقتور اور آزاد ہوتا جائیگا - کمزوری غلامی میں ہے - آزادی میں غیر معتدبہ طاقت ہے - اپنے نفس کے غلام نہ بنو بلکہ نفس کو اپنا غلام بناؤ -

انسان قدرتی طور پر جھوٹا پیدا نہیں کیا گیا ہے - قدرت کسی شخص کو جھوٹا نہیں بناتی - قانونِ قدرت کی بنیاد سچائی پر ہے - قدرتی طور پر ہماری تمام طاقتیں اور قواء اچھی ہوتی ہیں - اُنکا درست استعمال خوشی دانائی اور پرہیزگاری کا موجب ہوتا ہے - اُنکا نامناسب استعمال بیوقوفی گناہ اور مصیبت کا باعث ہوتا ہے -

لوگ عموماً نفسانی زیادتیوں، غصے، نفرت، اور ناجائز عیش و عشرت میں پڑکر اپنی طاقتور آزادی کو کھو بیٹھتے ہیں اور دن رات مصیبت زدہ اور مفلوک الحال بنے رہتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں اپنے بخت سیاہ سے یا پرماتما سے - اُن کو پرماتما سے شکایت کرنی فضول ہے - اپنے نصیب کو بُرا بھلا کہنا جہالت ہے کیونکہ نصیبہ کا بنانے یا بگاڑنے والا آدمی خود آپ ہی ہے - بلکہ لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو مجرم قرار دیں اور آیندہ اپنے افعال و اقوال کا ہر سچائی اور راستی کو بنائیں کیونکہ ؎

راستی موجبِ رضائے خداست — کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

سچے آدمی میں مخالف اوصاف بھی اتفاق سے رہ سکتے ہیں اُسکا کسی کے سامنے مہربانی سے جھک جانا بھی یہہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ناقابلِ اطاعت طاقت کا مالک ہے - اُسکی ہر شخص کے ساتھ نبھ سکتی ہے اور کسی کے ساتھ اَن بَن نہیں ہوسکتی - وہ گنہگاروں کو بھی اپنے فیضانِ صحبت سے مستفیض کرسکتا ہے اور پرہیزگاروں کو بھی غرض وہ نہایت آزادی سے زندگی بسر کرسکتا ہے - جس طرح سورج کی روشنی ہر نیک و بد پر پڑتی ہے لیکن خود کسی کی نیکی یا بدی سے متاثر نہیں ہوتی بلکہ سب کو روشن اور چمکدار بنا دیتی ہے اسی طرح جو بُرے لوگ سچے نیک شخص کے پاس آکر بیٹھتے ہیں وہ اُسکی صحبت میں رفتہ رفتہ آدمی بنجاتے ہیں لیکن سچا اور نیک شخص اُن کی برائیوں سے آزاد رہتا ہے -

تم اپنے ضمیر کے کہنے میں چلو اور اُن لوگوں کی دل سے عزت کرو جو ہمیشہ اپنے ضمیر کے کہنے میں چلتے ہیں خواہ اُنکا راستہ تمہارے راستے کے خلاف ہو - اگر کسی شخص کے خیالات تمہارے خیالات سے جُدا ہیں یا اُسکا مذہب تمہارے مذہب سے نہیں ملتا جُلتا تو اس بات پر افسوس نہ کرو - اگر کوئی شخص ملحد ہے یا ناستک ہے یا بدھ مت کا پیرو ہے یا عیسائی ہے تو اُس پر تمھیں افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے - کیا اسلئے کہ وہ تمہارا ہمخیال اور ہم مذہب نہیں ؟ اس قسم کے افسوس کے اظہار سے یہ نتیجہ نکالا جائیگا کہ تمہارے دل میں اُس شخص کی طرف سے نفرت بسی ہوئی ہے - افسوس کا جایز استعمال یہہ ہے کہ تم فلاکت زدہ یتیموں، ستم رسیدہ بیوگان، اور دیگر مصیبت دیدہ لوگوں

کی حالتِ زار پر افسوس کرکے مدد کرو لیکن جو لوگ بات کے سچے خیال کے پکے اور مذہب میں راسخ الاعتقاد ہیں اُن پر افسوس کرنا عجیب بات ہے۔ اُن کو تمہارے افسوس کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک راستے کو سچا سمجھ رہے ہیں اور دل سے اُس پر چل رہے ہیں کیا مجھے یا تمھیں یہ حق حاصل ہے کہ اُن کو زبردستی اپنا ہمخیال یا ہم مذہب بنا لو؟ اپنے مذہب کے چوٹی کے اصولوں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرو۔ اپنے خیالات کی معقولیت پر تقریر کرو۔ اگر اُسکی رائے میں تمہارا مذہب یا تمہارے خیالات معقول معلوم ہونگے تو وہ ضرور تمہارا ہمخیال اور ہم مذہب ہو جائیگا اور تمہارے ساتھ ملکر کام کرے گا۔ لیکن اگر وہ اُس راستے کا رہنگر نہیں ہے جس کا میں ہوں تو مجھے یہ فرض کر لینا نہیں چاہیئے کہ وہ سچے راستے پر نہیں چل رہا ہے۔ ہر شخص کے فرایض جُدا جُدا ہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جو میرے فرایض ہیں وہی سب کے ہونگے۔ دوسرے کو زبردستی اپنے قول و خیال کے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ کرو۔ اس طرح تم اُسکی آزادی میں خلل انداز ہوگے۔ اگر کوئی شخص اپنے خیالات اور عقاید کا سچا ہے تو مجھے اُسکی قدر ضرور کرنی چاہیئے مجھے اس بات پر افسوس نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ میری بات کیوں نہیں مانتا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ راستی پر چلیں تو ہمکو چاہیئے کہ کسی کی آزاد رائے میں مداخلت نہ کریں۔ ہمکو اپنی آزادی اور دوسرے کی آزادی کا یکساں خیال رکھنا چاہیئے۔ ہمارے سینے میں وسعت ہونی چاہیئے اور ہمارا دل فیاضانہ خیالات سے معمور ہونا ضروری ہے۔

ریاکاری انسان کو ذلیل و خوار بنا دیتی ہے۔ دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش میں انسان خود دھوکا کھاتا ہے۔ انسان کو جعل، فریب، دھوکا اور مکر اور کمینہ پن سے ایسا پاک ہونا چاہیئے کہ وہ آزادی سے، بیخوفی سے، دلیری سے، ہر شخص کے چہرے کی طرف دیکھ سکے۔ کیونکہ گنہگار مجرم شخص اپنے نفسانی وسوسوں اور بداعمالی کی وجہ سے شرم و حجاب کے باعث اتنی مجال نہیں رکھتا کہ کسی شخص کیطرف نگاہ جما کر دیکھ سکے۔ اُسکا مجرم ضمیر اُس کی نگاہ کو فوراً نیچا کر دیگا۔ جھوٹے آدمی کے کام میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ جھوٹے آدمی کے وعدوں کو سُنکر خوش ہو جاؤ۔ لیکن یہ امید نہ رکھو کہ وہ اپنے قول کو نبھائیگا بھی۔ وہ خالی برتن کی مانند ہے جس میں سے بجانے پر خالی آواز ہی آتی ہے۔ دروغ گو اور دروغ کار روزمرہ اپنی پرستش گاہوں میں جاتے ہیں اور ہمیشہ دعا مانگتے ہیں کہ "اے پرماتما ہم کو گناہ سے بچا کر ہماری آتما کو پاک بنا" وہ دعا مانگ کر باہر نکلتے ہیں تو کوئی دشمن ملجاتا ہے اُسکو گالی دیتے ہیں اور اپنے ایسے دوست کی غیبت کرتے ہیں جس کے روبرو وہ ہمیشہ اُسکی تعریفیں ہی کیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی دروغ گوئی سے بالکل بیخبر ہوتے ہیں، اور جب اُن کے جھوٹ کی انتہا ہو جاتی ہے اور دوست اُن کی حقیقت کو پہچان کر اُن سے کنارہ کش ہوتے ہیں تو وہ دوستوں کی عیاری اور بے وفائی کا راگ الاپنے لگتے ہیں اور یہی الفاظ اُن کے وردِ زبان ہوتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی سچا دوست نہیں، لیکن عقل کے اندھے یہ نہیں سمجھتے کہ "از ماست کہ بر ماست"۔ تم دوسروں کے ساتھ سچائی اور وفاداری کا سلوک کرو تو دوسرے بھی تمہارے ساتھ سچائی اور وفاداری کا سلوک کرینگے۔ تم اپنے دشمن کے خیر خواہ بنے رہو۔ اور اگر تمہارے کسی دوست کی غیر موجودگی میں کوئی اُس پر الزام لگائے تو اپنے دوست کی عزت کا بچانا اپنا فرض سمجھو۔ اگر تمہارا شعار یہ ہوگا تو پھر تم کو کبھی عمر بھر یہ موقع ہاتھ نہ آئیگا کہ اپنے دوستوں کی بیوفائی کی شکایت کرو۔

کنفیوشس کے ضابطۂ اخلاق میں منجملہ پانچ خوبیوں کے ایک خوبی سچائی بھی ہے۔ وہ سچائی کی نسبت یہ تحریر کرتا ہے کہ

یہ ہماری زندگی کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسے راجہ کے لئے تاج وتخت۔ سچائی کے بغیر ہمارے اچھے سے اچھے کام بھی نکمے ہوجاتے ہیں۔ زمانہ ساز لوگوں کی نیکی نیکی نہیں ہے بلکہ ریاکاری ہے۔ اگر سچے متقی و پرہیزگار بننا چاہتے ہو تو ریاکاری سے احتراز کرو۔ بدی سے ایسی نفرت کرو جیسی تم بدبو سے نفرت کرتے ہو۔ اور نیکی سے خوشنما چیز کی طرح محبت کرو۔ سچی عزت پرہیزگاری اور پاکبازی میں ہے۔ اسی لئے انسان کو اپنے تنہائی کے وقت بہت محتاط ہونا چاہیئے۔

نکما آدمی اپنے فرصت کے اوقات چھپکر مکروہ کام کرنے میں گزارتا ہے۔ اُسکی بداعمالیوں کی کوئی حد نہیں رہتی۔ وہ خدا ترس باکمال لوگوں کے سامنے اپنے نیک اوصاف ظاہر کرکے ریاکاری اور فریب کرتا ہے لیکن انجام کار تجسس نگاہ کی روشنی ریاکاری اور فریب کے بادل کو پھاڑ ڈالتی ہے اور اُسکے اصلی چال چلن اور رویّے کا راز فاش ہوجاتا ہے۔

سچے آدمی کی زبان سے تمہارے پیٹھ پیچھے بھی وہی کلمات نکلیں گے جو وہ تمہارے منہ در منہ بھی نہایت ہی آزادی سے کہنے کے لئے تیار رہیگا۔ وہ اپنی سچائی اور راستبازی کی وجہ سے اپنے ہمجنسوں میں نیکنام اور باعثِ فخر شمار کیا جاتا ہے۔ وہ مظلوموں کے لئے پشت و پناہ ہے اُس کے الفاظ سنگین اتہاموں کی سدِ سکندری کو خس و خاشاک کی طرح اُکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اُسکی آزادانہ روش کے سامنے جھوٹ اور کذب کے غلاموں کی دال نہیں گل سکتی۔ وہ جس کام کو لیتا ہے اُس میں روزافزوں ترقی اور فروغ ہوتا ہے۔ وہ کوئلوں میں ہاتھ ڈالے تو سونا بنجاتے ہیں۔ گو اُسکے الفاظ سے لوگوں کے کانوں میں رس نہیں پڑتا لیکن اُن میں تسخیرِ قلوب کا جادو ضرور ہوتا ہے سچائی کی وجہ سے لوگ اُسکی عزت کرتے ہیں۔ اسکو معتبر سمجھتے ہیں اور اُسکو اپنا محرمِ راز بنالیتے ہیں

ڈپٹی لال نگم

فریبِ دولت

دولت دنیا کی سب سے بڑی نعمت خیال کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ کسی شاعر نے زر کو رب اور قاضی الحاجات کہا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اسکی یہ عظمت اور بڑائی انھیں لوگوں نے کی ہے جو اسکی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں۔ شعراء اور علماء اسکی برکات کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے۔ انھیں کبھی اسکا تجربہ نہیں ہوا۔ حق یہ ہے کہ دولت کی زیادتی انسان کے لئے وبالِ جان ہوجاتی ہے۔ تم میری ہی حالت کا اندازہ کرو۔ یکایک اس قدر دولت میرے ہاتھ آئی کہ راتھ چائلڈ، جیگولڈ، کارنیگی کی متفقہ دولت اُس کے سامنے ہیچ تھی۔ شداد کے خیالی بہشت کے جواہرات کے خزانہ کو بھی اس کے ساتھ کچھ نسبت نہ تھی۔ میری دولت پندرہ اور نو صفر تھی یعنی ۱۵.........

ذرا اس کثیر دولت کا خیال کرو۔ اگر تم اسکا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے تو جانے دو۔ صرف اتنا سمجھ لو کہ اگر اس دولت پر تین فیصدی سود لیا جاتا تو ۴۵ کروڑ روپیہ سالانہ، ۱۲ لاکھ ۳۰ ہزار روپیہ روزانہ، ۵۱ ہزار ۳۷۰ روپیہ فی گھنٹہ، یا ۸۵۵ روپیہ فی منٹ اسکی آمدنی ہوتی۔ اُفوہ! یہ کثیر دولت ایک اچھے حساب داں کو چکر میں لانے کے لئے کافی تھی۔

میں نے یہ دولت کس طرح حاصل کی؟ کیا مجھے ورثہ میں ملی؟ میں نے جمع کی؟ چوری کی؟ لاٹری میں جیتی؟ جوئے میں حاصل کی؟

یا کسی طلسماتی جزیرہ سے سنگِ پارس مل گیا جس سے مَیں نے تمام پتھر کا سونا بنا لیا؟ ان میں سے کوئی بات نہیں۔لیکن مَیں یہ صحیح طور پر نہیں بتا سکتا اور نہ مجھے اصل حال معلوم ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ یکایک اس قدر دولت میرے ہاتھ آگئی تھی۔اس دولت سے مَیں کیا کرتا۔ اگر مجھے دو سو برس کی بھی عمر ملتی، تو امید نہ تھی کہ مَیں اصل یا اسکا منافع صرف کرسکونگا۔ میرا کوئی رشتہ دار بھی نہ تھا۔ پھر مَیں اس دولت کو کہاں خرچ کرتا۔ رہ رہ کر یہہ خیال مجھے ستا رہا تھا۔یکایک ایک بات ذہن میں آئی اور مَیں نے اپنے دوست مسٹر روشن لال کے ساتھ مشورہ کرنے کا ارادہ کیا۔

گھر سے نکلکر مَیں انارکلی میں آیا اور گاڑی کرایہ کی، اور مسٹر روشن لال کے مکان کے قریب پہنچکر اُتر گیا۔گاڑی کا کرایہ صرف چند آنے تھے مگر مَیں نے گاڑیبان کو ایک اشرفی (ساوُرن) دیدی گاڑیبان نے خیال کیا کہ مَیں نے غلطی کی۔اُس نے مجھے مطلع کیا۔ مَیں نے کہا "میرے دوست! اسکو اپنے پاس رکھو۔ خدا کرے کہ اس سے تمھیں فائدہ پہنچے"۔مَیں چلا گیا مگر گاڑیبان کی تشفی نہوئی۔ اُس نے ایک پولیس مین کو اشرفی دکھائی اور اُنگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔ خدایا! کیا دنیا ایسی ہے کہ مجھے میری فیاضی کیلئے پاگل خیال کرتی ہے۔کیا دُنیا میں اتنی بھی نیکی نہیں کہ ایک دوسرے کی امداد کی جاسکے۔الٰہی! دنیا کا کیا حال ہوگیا ہے۔یہہ کیسی ذلّت میں مُبتلا ہے۔ . . . . مَیں یہی باتیں سوچتا ہوا مسٹر روشن لال کے دفتر میں پہنچا۔اس وقت وہ کام میں مشغول تھے۔اُن کی میز پر مختلف کمپنیوں کے حساب کتاب کے کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ان میں وہ اس قدر منہمک تھے کہ کچھ دیر تک اُنھیں علم نہوا کہ کوئی آدمی اندر آیا ہے۔تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے اوپر نظر کی تو مجھے دیکھا، اور فوراً اُٹھکر مصافحہ کیا۔ہم دونوں بیٹھ گئے۔مَیں نے تمام کیفیت اُن سے بیان کی، اور مشورہ کا طالب ہوا۔

مسٹر روشن لال کچھ دیر خاموش رہے، اور تھوڑے وقفہ تک غور کرنے کے بعد انھوں نے کہا "مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ تم اس دولت کو کس جگہ لگا سکتے ہو۔میری رائے میں تم اس روپیہ کو ساہوکارہ میں لگا دو۔عمدہ ضمانتوں پر روپیہ دینا شروع کرو، اس طرح تم سارے شہر کا سرمایہ خرید لوگے۔اگر یہہ نہیں چاہتے تو اعلیٰ پیمانہ پر ایک دو کارخانے جاری کردو۔ تمہاری بڑی شہرت ہوگی، اور ساری دنیا کی نگاہیں تمہاری طرف لگ جائیں گی، اور یقیناً تم بڑے آدمی بن جاؤگے . . . "

مَیں نے معلوم کرلیا کہ مسٹر روشن لال نے اپنے ہی مذاق کی صلاح مجھے دی ہے، اور اس میں مجھے ضرور فائدہ ہوگا۔مگر مَیں نے کہدیا کہ "میری مراد یہہ نہیں ہے کہ میری دولت اور زیادہ ہو بلکہ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ اس سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچے۔مَیں نے یہ سوچا ہے کہ مَیں گورنمنٹ کو لکھوں اور یہہ تمام روپیہ دیدوں تاکہ اس سے تمام ملک میں جبریہ اور مفت تعلیم جاری کی جائے۔اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے"؟

مسٹر روشن لال:- ایں! کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟ یہ خیال کیونکر تمہارے دل میں سما گیا؟ اس سے بنی آدم کو سخت نقصان پہنچے گا۔کیا تم نہیں جانتے کہ اگر ہندوستان میں جبریہ تعلیم کا نفاذ ہو جائے تو اس سے کارخانہ داروں کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔مزدوروں کی قلت ہر چہار طرف محسوس ہو رہی ہے۔ خدمتگار میسّر نہیں آتے صنعتیں اور کارخانے مزدوروں کے قحط کے باعث تباہ ہو رہے ہیں۔ملک کی بے انتہا معدنی دولت، فراوانی دولت کے صدہا ذرایع سب مزدوروں کی کمی کا رونا رو رہے ہیں۔ دیکھتے نہیں، کہ یورپین ممالک میں کیا اندھیر ہو رہا ہے۔آئے دن ہڑتال ہوتی رہتی ہیں۔شور و شر کا ایک طوفان منڈلا تا رہتا ہے۔سرمایہ

داروں کی قسمتیں مزدوروں کے ہاتھ میں ہو گئی ہیں۔ میں یہ ہرگز تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کہ اس شور و شر سے، اس آمدنی کی زیادتی سے مزدوروں کی مالی اور تمدنی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں اب وہ شراب زیادہ پیتے ہیں، تماشا گاہوں میں زیادہ جاتے ہیں، اور اپنی عورتوں کی مرمت زیادہ کرتے ہیں۔ کیا تم ہندوستان میں وہی حالتیں پیدا کرنی چاہتے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ انسانی اخوت ایک مہمل اور انہونی بات ہے۔ یہ دیوانگی ہے، جنون ہے، اور نظامِ قدرت کو درہم برہم کرنے والا خیال ہے۔ آپ لوگ خدا کی خدائی میں دخل دینا چاہتے ہیں۔ کیا خدا کے لئے یہ غیر ممکن تھا کہ وہ ہر ایک انسان کے دماغی اور جسمانی اوصاف یکساں خلق کرتا؟ پھر یہ ناہمواریاں، یہ نابرابریاں، کیوں نظر آتی ہیں؟ کیا آم کے جتنے درخت ہیں، وہ سب یکساں وسعت اور اونچائی کے ہیں؟ کیا قدرت کی کسی شے کے متعلق آپ ایسا کہہ سکتے ہیں؟ حق یہ ہے کہ یہی ناہمواریاں نظامِ قدرت کا شیرازہ ہیں۔ خدا کے لئے اس خیالِ خام سے درگذرو۔ تم دنیا میں ہلچل مچا دوگے۔ اور دنیا کا کاروبار زیر و زبر ہو جائے گا۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ تم جوئے میں دولت ہار دو۔ تماشہ گاہوں میں برباد کر دو۔ کسی نہر کے کھودنے میں صرف کر دو۔ اور اگر کچھ نہ بن سکے تو سمندر میں غرق کر دو۔۔۔"

میں اُٹھ کر چلا آیا۔ اس سے میری کچھ تسلی نہ ہوئی۔ میں نے فوراً ایک چٹھی گورنمنٹ کو اسی مضمون کی لکھی، مگر تعجب ہے کہ وہاں سے صرف یہ جواب آیا کہ تمہاری چٹھی پہنچ گئی ہے، اور فرصت کے وقت اس پر غور کیا جائیگا۔"

ایک روز میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ لوکل خبروں کے ضمن میں ایک ایسی خبر نظر آئی جس کو پڑھ کر میں چونک اُٹھا۔ اس میں لکھا تھا کہ

ایک گاڑیبان نے اپنی بیوی پر حملہ کیا۔ ملزم ماخوذ ہو کر عدالت میں پیش ہوا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ گاڑیبان کو کسی مسافر نے ایک اشرفی دی تھی۔ اُس دن اُس نے شراب پی، اور بدمستی کی حالت میں اپنی بیوی کو مارا۔ ہمسایہ کے لوگ شہادت دیتے ہیں کہ اس سے پیشتر اس نے اپنی بیوی کو کبھی نہیں مارا تھا۔ صرف بدمستی کی حالت میں اس پر حملہ کیا۔

اخبار میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ الٰہی! میں نے تو وہ اشرفی اس لئے دی تھی کہ غریب آدمی کے کام آئے گی، مگر اس سے اُلٹا نقصان پہنچا کہ اُس کی بیوی کی جان پر آبنی۔ اگر یہ دولت میرے کام کی نہیں تو کیا کسی اور کے کام بھی نہیں آسکتی۔ پھر لوگ کیوں دولت کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، جبکہ اس سے ایسے ایسے بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ میں سخت مضطرب ہوا، اور بے اختیار ہو کر گھر سے نکل جانے کو جی چاہا۔

اسی اثناء میں میرا خدمتگار اندر آیا اور خبر دی کہ کوئی اجنبی شخص میری ملاقات کے لئے آیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی غرض مند ہوگا۔ میں نے اُسے اندر بلا لیا۔ اُس کے چہرہ پر ذلت و ادبار کے آثار نمایاں تھے۔ اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ پیر کی جوتیاں بھی شکستہ تھیں غرض کہ اُسکی حالت بہت ابتر تھی۔ میں اُسے جانتا تھا۔ پہلے وہ ایک دفتر میں محرر تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

اُس نے کہا "معاف فرمائیے گا۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ کو کثیر دولت ہاتھ لگی ہے۔۔۔"

میں نے دل میں خیال کیا کہ دیکھو! بُری خبر کس قدر جلد پھیل جاتی ہے۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ کس نے تم سے کہا۔ اُس نے کہا کہ "خبر دینے والے کا نام تو مجھے یاد نہیں، مگر تمام شہر میں اسکا چرچا ہے۔"

کچھ دیر میں خاموش رہا۔ بعد ازاں میں نے دریافت کیا کہ "میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ بولا "مَیں مدّت سے بیکار ہوں - میری حالت بہت ابتر ہوگئی ہے - کپڑے تک پھٹ گئے ہیں - اب مجھے ملازمت کے لئے کسی کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے - مَیں صرف اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو پچاس ساٹھ روپے بطور قرض مجھے مرحمت فرمایئے' تاکہ مَیں اپنی حالت درست کرکے ملازمت کی تلاش کرسکوں"

میرے سامنے پچاس ساٹھ روپے کیا حقیقت رکھتے تھے - مجھ سے ایسی قلیل رقم کا سوال کرنا گویا میری ہتک کرنا تھا - مگر مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ دنیا بہت کم فیاض ہے' اور کسی کے ساتھ مروّت نہیں کرسکتی - اسلئے مانگنے والے بھی بچ بچ کر سوال کرتے ہیں - مگر دنیا بھی ایک پہلو سے سچّی ہے - بعض وقت مانگنے والے گدائی پیشہ ہوتے ہیں' جنکو درحصل امداد کی ضرورت نہیں ہوتی - ان کو کچھ دینا روپے کو ضایع کرنا ہے - مگر میری رائے میں انسان کو فیاض ضرور ہونا چاہیئے - کیونکہ اس سلسلہ میں اُن لوگوں کی بھی امداد ہوجاتی ہے' جو واقعی احتیاج مند ہوتے ہیں -

کچھ روز ہوئے کہ ایک گاڑی بان کو مَیں نے اشرفی دی تھی - اس سے اُس کی بیوی کو سخت نقصان پہنچا' اور وہ قریب المرگ تھی - شاید میری اُس اشرفی نے اسلئے نقصان پہنچایا کہ وہ ایک قلیل رقم تھی' اور شراب نوشی کے سوا کوئی اور بہتر کام اُس سے نہیں لیا جاسکتا تھا - اب مَیں دوسرا تجربہ کرتا ہوں - اس دفعہ اِس غریب محرّر کو اتنا روپیہ دیتا ہوں کہ آیندہ اُسے کسی قسم کی ضرورت نہ ہوگی' اور وہ دولت کا حقیقی فائدہ حاصل کرسکے گا - شاید اگر روپیہ کی تعداد زیادہ ہوگی تو اسے وہ بُرے کاموں میں صرف نہ کرسکیگا -

مَیں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر دیا اور کہا "محسن! یہ خفیف سی رقم بطور امداد تمہاری نذر کرتا ہوں - اس کو قرض مت سمجھو - اس سے تم اپنی حالت درست کرو"

پرشوتم نوٹ دیکھ کر ششدر سا رہ گیا' اور مجھ سے دریافت کیا کہ "جناب! آپ نے غلطی تو نہیں کی؟" مَیں نے جواب دیا "نہیں مَیں نے پانچ ہزار کا نوٹ تمھیں اسلئے دیا ہے کہ تم اِسے کسی عمدہ کام میں لگاؤ اور اس کے منافع سے اپنی حالت درست کرو"

اُس نے جواب دیا "آپ مطمئن رہیں - مَیں اِسکا درست استعمال کرونگا"

اس کے بعد اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا -

اب میرا دل کسی قدر ٹھنڈا ہوا کہ کم از کم ایک شخص کے ساتھ تو مَیں نے نیکی کی - اس سے ضرور اسکو فائدہ پہنچیگا - اس کے بعد مَیں گاڑیبان کے گھر پہنچا - مگر افسوس' اُسکی بیوی مرچکی تھی - مجھ سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ اُس کے کفن دفن کے اخراجات ادا کروں - وہ بیچاری میری اشرفی کا شکار ہوگئی - دل میں کڑھتا ہوا مَیں اپنے مکان پر واپس آیا -

---

اخبار پایونیر نے اس خبر کو شایع کردیا تھا کہ "فلاں شخص اس قدر روپیہ گورنمنٹ کو دینا چاہتا ہے تاکہ اس کے ملک میں ابتدائی تعلیم جبریہ اور لازمی قرار دی جائے - مگر گورنمنٹ نے بوجوہ چند درچند بالفعل اس روپیہ کو منظور نہیں کیا"

اس غیر ضروری خبر کی اشاعت نے میرے وقت کو بہت خراب کیا - عام طور پر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ مَیں اپنی کثیر دولت کو تعلیم عامہ کی مد میں صرف کرنا چاہتا ہوں - واقعی میرا مقصد یہی تھا' مگر سمجھنے والے میرے مفہوم کو نہ سمجھ سکے -

ایک روز مَیں ڈاک دیکھ رہا تھا' کہ ایک خط کو پڑھکر مَیں بہت حیران ہوا - معاً میرے دل میں یہ خیال آیا کہ دیکھو! دولت میں کس قدر کشش موجود ہے - مَیں وہی شخص ہوں جس کو ایک ماہ

پیشتر میرے محلے والے لوگ بھی نہیں جانتے تھے۔ اور یا اب یہ حالت ہے کہ دُور دُور میرا نام پہنچ گیا ہے' اور لوگ مجھ سے ملاقات کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ واقعی دولت میں یہی تاثیر ہے!

باقی ڈاک دیکھی' اُس میں ایک اور بھی خط ملا جسکا مضمون بھی اسی قسم کا تھا جو پہلے خط کا تھا۔ اب میری حیرانی کی کوئی حد نہ تھی۔ مَیں بے حس و حرکت ہو گیا' اور ٹھنڈے دل سے اِن دونوں خطوط پر غور کرنے لگا۔

شام کو مَیں ہوا خوری کے لئے باہر گیا تو میرے دوست' بابو جسونت رائے' راستے میں مل گئے۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی بات چیت ہوتی رہی۔ آخر مَیں نے اُن سے مشورہ طلب کیا۔ مَیں نے اُن سے صاف صاف کہدیا کہ بڑے بڑے نواب' راجہ' مہاراجہ' اور مولوی و پنڈت' مسلم و ہندو یونیورسٹی کی تحریک کے سلسلہ میں میرے پاس آنے والے ہیں۔ آج ہی مجھے خطوط ملے ہیں۔ اب آپ کیا صلاح دیتے ہیں؟

بابو جسونت رائے نے جواب دیا کہ "یہ دونوں تحریکیں بجائے خود مفید ملک ہیں' مگر اتنا ضرور کہونگا کہ اُن سے جس قدر فائدہ کی امید کی جاتی ہے' اُسکا چوتھائی حصہ بھی بمشکل حاصل ہوگا۔ فی الواقعی یہ تعلیم کو گراں اور محدود بنانے کا بہت سہل اور فریب دہ لٹکا ہے۔ کیا ایک بورڈنگ ہوس میں شب و روز کی بود و باش معجزے کر دکھائیگی۔ مانا کہ بہت سے طلباء ایک ساتھ رہیں گے تو ان میں اتفاق و اتحاد بڑھیگا' وہ اپنے گھروں کے مضر اور مخرب اخلاق اثرات سے محفوظ رہیں گے' اُن میں اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ مگر کیا یہ اغراض بورڈنگ ہوسوں سے حاصل نہیں ہو سکتے؟ اس کی تخصیص کیوں کی جاتی ہے کہ یہ سکونتی یونیورسٹی ہو۔ پر تکلف بورڈنگ ہوس بنوایئے' اُسے امیرانہ ساز و سامان سے آراستہ کیجئے' اور ہر ایک بورڈنگ ہوس کے لئے جُدا جُدا ڈاکٹر' سپرنٹنڈنٹ' معلم مقرر کیجئے۔ اس سے کون روکتا ہے۔ مگر خدا کے لئے یونیورسٹی کا دروازہ غربا پر بند نہ کرو۔ آکسفرڈ کی تقلید میں کیوں اپنے ہوش و حواس کھو رہے ہو؟ آکسفرڈ اور کیمبرج رؤسا' اور امراء کی تفریحگاہیں ہیں زیادہ سے زیادہ انھیں تعلیمی تکلف کہیئے۔ انگلستان مالدار ہے' اور اُس کے لئے یہ فضول خرچیاں زیبا و ضروری ہیں۔ مگر ہندوستان مفلسوں کا ملک ہے۔ یہاں اِن تکلفات کی ضرورت نہیں۔ میرے صدہا ایسے دوست ہیں جو اپنے نوجوان لڑکوں کو بورڈنگ ہوس میں کسی طرح رہنے نہ دینگے۔ سکونتی انتظام میں جہاں خوبیاں ہیں' وہاں نقائص بھی ہیں۔ اگر لڑکے گھر کے مضر اثرات سے بچے رہتے ہیں تو نیک اثرات سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اگر اتفاق و اتحاد بڑھتا ہے تو مزاج میں تکلف' نخوت پرستی' اور عیش پسندی کا دخل ہو جاتا ہے' اور اخلاق؟ خدا کی پناہ! مَیں اور تم دونوں بورڈنگ ہوس میں رہ چکے ہیں' اور اُس کے زہریلے اثر کا آجتک رونا روتے ہیں مَیں اپنے لڑکوں کو اس زہریلے' قاتل اسباب میں ہرگز نہ پھینکونگا اور غالبًا آپ بھی مجھ سے اتفاق کرینگے۔ رہ گئی تعلیم' تو بندہ نواز! جبتک یہی کرایہ کے ٹٹو پروفیسر رہیں گے اُس وقت تک تعلیم کی حالت ذرہ بھر بھی بہتر نہ ہو گی۔ سب سے بڑی ضرورت لائق پروفیسروں کی ہے اور انھیں کا آجکل قحط ہے۔ بنارس کے سنسکرت کالج ہی کو دیکھئے۔ وہ کوئی رہایشی کالج نہیں ہے' پر چونکہ بنارس کے لائق ترین سنسکرت علماء نے اُسے اپنا مرکز بنا لیا ہے اسلئے دور دراز سے طلباء کھنچے چلے آتے ہیں۔ مدراس' سندھ' اور آسام' غرض سب خطوں کے طلباء وہاں موجود ہیں۔ اگر تمہاری جگہ پر مَیں ہوتا تو سکونتی یونیورسٹی کے نام پر کانی کوڑی بھی نہ دیتا۔ یہ غضب ہے' زیادتی ہے' ظلم ہے' اُن لوگوں پر جو تعلیم کے نام سے بے بہرہ ہیں اور اگر

میرے دل کی بات پوچھئے تو وہ یہ ہے کہ ان دونوں یونیورسٹیوں کی بنیاد فرقہ بندی اور رقابت ہے - لیڈرانِ قوم زبان سے خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں، مگر واقعہ نفس الامری یہی ہے - ورنہ کیا سبب ہے کہ جب کوئی ہندو رئیس ہندو یونیورسٹی کے لئے کوئی شاہانہ رقم دے ڈالتا ہے تو اسلامی حلقوں میں کہرام سا پڑ جاتا ہے، اور چہرے زرد پڑ جاتے ہیں بعینہٖ یہی کیفیت ہندو صاحبان کی اسلامی چندوں پر ہوتی ہے - یہ حسد اور رقابت نہیں تو اور کیا ہے - وہ تعلیم گاہ جسکی بنیاد ایسی کمزور ہو کبھی عرصہ تک سرسبز نہیں رہ سکتی - نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دونوں یونیورسٹیاں تعلیمی اغراض و مقاصد کو نظر انداز کرکے پولیٹکل مناقشات میں اپنی کوششیں صرف کرینگی، اور وہاں سے جو گریجوایٹ نکلیں گے وہ فرقہ بندی اور منافرت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے میں اسے اس بدنصیب اور پامال ملک کی شومیِ قسمت سمجھتا ہوں - آپ یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ مجھے اِن یونیورسٹیوں کے بانیوں سے ذاتی خصومت ہے، مگر آپ انہیں ایسا صاف باطن اور فرشتہ اخلاق بھی نہ سمجھئے جتنا وہ بنتے ہیں - میں اِن میں سے ایک صاحب کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں - زندگی بھر وہ قومی خدمت میں مصروف رہے، یعنی گارڈن پارٹیوں اور سرکاری جلسوں میں مدعو ہوا کئے، مگر باوجود اس کے کہ گھر میں لاکھوں کی دولت تھی، ایک حبہ بھی کسی قومی کام کے لئے نہ دیا - مرے تو ۹ لاکھ چھوڑ گئے - مگر وصیت میں قومی کالجوں، مدرسوں، اور لیگوں کا مطلق ذکر نہ تھا سب کو حیرت ہوئی مگر مجھے مطلق تعجب نہ ہوا، کیونکہ میں اُن کی طینت سے واقف تھا خالی پیٹ کا ڈھول کیسے زور سے گرجتا ہے - لوگ انھیں قوم کا فدائی اور دیوانہ سمجھتے تھے، مگر حضرت رنگے ہوئے سیار نکلے - ذرا آپ ان حضرات کی وحشت کو دیکھئے - بنانے تو چلے دار العلوم، مگر چارٹر پہلی شرط ہے - اور یقین مانئے، یہ چارٹر اُن تمام اغراض کے لئے نوشتۂ مرگ ہے جو اس یونیورسٹی کے محرک ہوئے ہیں - میں دریافت کرتا ہوں کہ اس چارٹر کی ضرورت کیا ہے - یہی نہ کہ ان یونیورسٹیوں کے پاس شدہ طلباء سرکاری ملازمتیں حاصل کرسکیں - چند سرکاری ملازمتوں کے لئے آپ ایسے کثیر مصارف کو، ایسی سرتوڑ کوششوں کو، یونیورسٹی کے وجود کو، اُسکی آزادی کو، خاک میں ملا رہے ہیں - اسی کو قومی خودکشی کہتے ہیں - کیا موجودہ کالج خواہشمندان ملازمت کے لئے کافی نہیں ہیں ؟ کیا سرکاری ملازمت ہی سب سے اہم اور اعلیٰ قومی مقصد ہے ؟ ہمارے ہزاروں نوجوان امریکہ، یورپ اور جاپان کو حصولِ تعلیم کے لئے جارہے ہیں - وہ روانگی کیوقت گورنمنٹ سے یہ سوال نہیں کرتے کہ آپ انسائس، ہسٹیل، برلن، پیرس، اور ٹوکیو یونیورسٹی کے طلباء کو ملازمت دینگے یا نہیں؟ یہاں یہ سوال کیوں پیدا ہوتا ہے ؟ کیا ہمارے لیڈر ایسے سادہ لوح ہیں کہ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ لیاقت اور کارگزاری، جہاں کہیں دستیاب ہوگی اُسکی قدر کی جائیگی - اور اگر ارزاں ملے گی تو اور بھی کشادہ دلی سے - اس لئے پہلے ہی سے عہد و پیمان کی کیا ضرورت ہے - اس سے تو یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو خود اپنی کامیابی پر شک ہے - الغرض اور المختصر، میں ان تحریکوں کو فضول اور مُضر سمجھتا ہوں"۔

میں نے اس رائے پر صاد کیا، اور دل میں سوچنے لگا کہ یونیورسٹی کی تعلیم کن لوگوں کے لئے ہے - انھیں لوگوں کے لئے نہ، جو پیسے والے ہیں ؟ پھر کیا ضرورت ہے کہ پیسے والوں کی امداد کے لئے ہم اپنا پیسہ خرچ کریں - ہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ جن لوگوں کے پاس پیسہ نہیں ہے، اُن کی تعلیم کا سامان مہیا کیا جا-

بادشاہ اورنگ زیب : سواری جلوس

انڈین پریس الہ آباد

غریب لوگوں کے بچّے پرائمری تعلیم بھی حاصل نہیں کرسکتے مگر اُنکی حالت پر ہمارا دل نہیں پسیجتا۔ اگر کچھ کوشش کرتے ہیں تو انھیں لوگوں کے لئے جو اپنے لئے خود اچھا انتظام کرسکتے ہیں۔۔۔۔۔ جب تک ملک میں ابتدائی تعلیم عام نہو گی اُس وقت تک یسی یونیورسٹیاں بیکار رہیں !

بابو جسونت رائے سے وداع ہو کر مَیں اپنے گھر چلا آیا مَیں انھیں معاملات پر غور کرتا رہا، مگر کوئی ایسا پہلو نظر نہ آیا جکی بنا پر مَیں بھی ان تحریکوں میں حصّہ لے سکتا۔

دوسرے روز یونیورسیٹیوں کے فدائی علیٰحدہ علیٰحدہ وقت میں میرے درِ دولت (؟) پر حاضر ہوئے۔ مگر مَیں نے پیسہ دینے کے بجائے ٹکا سا جواب دیا۔ اگرچہ اس بات کا مجھے بھی افسوس رہا کہ کیوں مَیں نے ایسا سلوک کیا۔

شام کو ایک مسیحی صاحب تشریف لائے۔ مَیں انھیں عرصہ سے جانتا ہوں۔ آپ صوبجات متحدہ و راجپوتانہ کی انڈین کرسچن ایسوسی ایشن کے جنرل سکرٹری ہیں۔ اچھے خوش خلق اور ملنسار آدمی ہیں۔ انھوں نے کوشش کرکے گورنمنٹ سے کچھ زمین حاصل کی ہے، اور وہاں ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک اکیڈمی قایم کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہندوستانی مسیحی لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائیگی۔ گورنمنٹ نے بھی امداد کا وعدہ کیا ہے۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ مطلوبہ رقم کا قریباً نصف حصّہ جمع ہو چکا ہے، اگر باقی رقم مَیں دیدوں تو اکیڈمی جلد تیار ہو جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ شکریہ کے طور پر آپ کے نام پر ایک ہال تعمیر کردیا جائیگا۔ مگر میں ایسا نام ونمود کا خواہاں نہ تھا۔ مَیں نے کہا کہ آپ یونہی نظرِ عنایت فرمائے، مَیں ان باتوں کا قایل نہیں ہوں۔ مانا کہ آپ نے بذاتہٖ خود اکیڈمی کے لئے کوئی اچھا اصول قایم کیا ہو، مگر میری نظر میں اسکی وہ عزت نہیں ہے۔ مَیں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اکیڈمی قومیت شکن لوگوں کا ایک بڑا گروہ پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ ایسے لوگوں کی تعداد آجکل ہی کیا کم ہے جو ان کی تعداد بڑھانے کی فکر آپ کو دامنگیر ہوئی ہے۔ دیسی مسیحیوں کو اس سے خاک فائدہ نہو گا، ہاں البتہ وہ لوگ نفع میں رہینگے جنکے اعزا و اقارب اکیڈمی کی مینجنگ کمیٹی کے ممبر ہوں گے۔

میری صاف گوئی سے وہ کسی قدر رنجیدہ خاطر ہوگئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ مفت الزام لگاتے ہیں، ایسی کارروائی ہرگز نہو گی۔ جملہ امور اتفاق رائے سے طے ہوا کریں گے۔ اکیڈمی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ قوم کو اُبھارے تاکہ وہ منازلِ ترقی کو طے کرسکے۔

غصّہ میری طبیعت میں بھی بہت ہے۔ مَیں اُس بات کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتا جو میرے رد میں کہی جائے۔ مَیں نے صاف کہا کہ جناب! مجھے معاف کیجئے۔ ایسوسی ایشن کی طرف سے جو وظائف غریب مسیحی طلباء کے لئے مقرر ہیں، بتایئے کہ کتنے غریب مسیحیوں کو اُن سے فائدہ پہنچا ہے۔ جس قدر وظائف دیئے جاتے ہیں، وہ زیادہ تر ایسوسی ایشن کی جنرل کمیٹی کے ممبروں ہی کے لواحقین کو دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جنکو امداد کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ عام لوگوں کے پیسے سے لکھ پڑھکر ان میں اس قدر انانیت سما جاتی ہے کہ مصافحہ کرنا تو درکنار غریب مسیحیوں کا سلام بھی قبول نہیں کرتے۔ کیا اکیڈمی کا بھی یہی نتیجہ نہو گا کہ اس قسم کا ایک خود سر گروہ پیدا کرے جو اپنے آپکو ہندوستانی کہلانا پسند نہ کرے، اور جو ہندوستانی والدین کی اولاد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو انگلو انڈین کہے اور اس طرح ہندوستانی مسیحیوں کے

اپنی بزرگی ثابت کرے ؟....... بہرحال ایسے قومیت شکن
لوگوں کے لئے میں اپنا روپیہ ضایع کرنا نہیں چاہتا۔

آخر وہ رخصت ہوئے۔ اُن کے جانے کے بعد بہت دیر
تک میں اکیڈمی کے معاملات پر غور کرتا رہا، اور میں اپنے دل
میں بہت خوش تھا کہ میں نے ایسی فضول تحریک میں حصہ نہیں لیا۔

دنوں پر دن گزرتے جا رہے تھے، پر میں ابتک کچھ
فیصلہ نہیں کرسکا کہ آخر کیونکر اس دولت کو صرف کروں جب
اخبارات میں میری دولت کا تذکرہ ہو گیا تو میرے بہت
سے دوست نکل آئے تھے۔ دوست بھی ایسے کہ مجھ پر جان
قربان کرنے کو تیار رہتے۔ مگر میں ان کو بھولا نہیں تھا۔ یہہ
وہی تھے جنھوں نے میری مُصیبت کے وقت پیٹھ دکھائی
تھی۔ کوئی باپ کی وفات کی وجہ سے گوشہ نشین ہوگیا تھا
کسی نے شادی کرلی تھی اور گھر بار کے دھندوں میں پھنس
گیا تھا، کسی کے سر پر دفتر کا اس قدر کام آ پڑا تھا کہ ۲۴ گھنٹے میں
پندرہ منٹ کی بھی فرصت نصیب نہوتی تھی۔ غرض سبنے ایک
سے ایک نیا بہانہ بنا کر مجھ سے روپوشی اختیار کرلی تھی۔ یا اب
سب ایک دم گویا بیکار ہوگئے تھے کہ دن رات میرے دروازے
سے ٹلنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ پہلے بھی روپے کی
وجہ سے ملتے تھے اور اب ملتے ہیں تو وہ بھی روپے کی وجہ سے
جب روپیہ نہیں تھا تو تُو کون اور میں کون۔ گویا یہ میرے نہیں بلکہ
میری دولت کے یار تھے۔

اگر میں اپنے ان وفادار (؟) دوستوں کی رائے پر عمل
کرتا تو اس میں کچھ شک نہیں کہ میں جلد اس سے چھٹکارا پا جاتا۔
مگر میں کچھ ایسا کوتاہ فہم نکلا کہ ان کی ایک بات پر بھی عمل نہ کرسکا۔
یہہ لوگ کہتے تھے کہ تعلیم عامہ کے خیال کا جن میرے سر پر سوار
ہوگیا ہے۔ شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ میں اسکی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔

پرنس دلیپ سنگھ کی فضول خرچیوں نے اُسے بہت شہرت
دیدی تھی۔ جابجا اُس کی تکلیفوں کے چرچے تھے۔ ولایت میں جدھر
نکلتا تھا، اُدھر ہی انگشت نمائی ہوتی تھی۔ مجھے اُسکی حالت پر بہت
ترس آیا۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ ایک ہندوستانی شہزادہ
اپنی ناسمجھی کے باعث ادبار میں پھنس گیا ہے، اگر اسکو ایک موقعہ
دیا جائے تو شاید آیندہ وہ ہندوستان کی ناک رکھنے کی کوشش
کریگا۔ دو چار کروڑ روپیہ کوئی بات نہ تھی۔ میں نے مصمّم ارادہ
کرلیا کہ آیندہ ولایتی ڈاک سے اس قدر روپیہ ضرور اُسے ارسال
کردونگا کہ وہ اپنی عزّت کو قایم رکھنے کے قابل ہوسکے مگر جب
میرے دوست سردار کشمیرا سنگھ کو میرے ارادے کی اطلاع ہوئی
تو وہ فوراً تشریف لائے، اور آتے ہی مجھے سخت سُست کہنے لگے۔
اُن کی بھی یہہ رائے تھی کہ زیادہ روپے نے میرا سر پھرا دیا ہے۔
اُنھوں نے کہا کہ ہندوستانی رؤساء آگے ہی عیش وعشرت میں مست
رہتے ہیں۔ کوئی ملکی یا قومی کام اُن سے ہو ہی نہیں سکتا۔ جب سنئے گا
یہی سنئے گا کہ فلاں ریاست کورٹ آف وارڈس میں چلی گئی۔ تاہم
ان لوگوں کو تو پھر بھی ایک سہارا ہوتا ہے کہ اپنی ریاست ہے۔
مگر پرنس دلیپ سنگھ کی تو کوئی ریاست بھی نہیں، اور اس پر بھی اگر
وہ سوچ سمجھکر خرچ نہ کرے تو اس میں کسی کا کیا قصور؟ اگر آپ اُسے
کچھ امداد دیں گے تو اس کا نتیجہ یہہ ہوگا، کہ ہندوستانی رؤساء کو
عیش پسندی کی تحریک ہوگی۔ خدا کے واسطے آپ ایسی نادانی نکریں
ورنہ سُن لیجئے گا کہ ہندوستان ہی میں کتنی ریاستیں بگڑ گئی ہیں پھر
آپ کس کس کو سنبھالئے گا؟

یہہ صلاح اس قابل تھی کہ بلاچون وچرا اسکو مان لیا جاتا،

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، اور اُس ارادہ کو فسخ کر دیا۔

انڈریو کارنیگی نے ایک دفعہ اشتہار دیا تھا کہ کوئی بتائے کہ وہ کیونکر اپنی دولت کو صرف کرے۔ کارنیگی کی دولت، میری دولت کے آگے، بالکل بے حقیقت چیز تھی، اور اسپر بھی وہ خود اسکو صرف نہ کرسکتا تھا۔ میں نے بھی خیال کیا کہ چلو، میں بھی اخبار میں اشتہار دے دیکھوں۔ شاید کوئی مفید مطلب مشورہ مل جائے۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہہ تقلید کہلائیگی۔ کچھ جدّت ہونی چاہیئے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً اخبارات میں ایک اشتہار چھپوا دیا کہ

(۱) متوسط درجہ کے جو لوگ قرض میں مبتلا ہیں، اگر وہ اس بات کا اقرار کریں کہ آیندہ وہ قرض سے نفرت کریں گے تو فلاں تاریخ کو فلاں وقت میرے پاس آئیں، میں اُنکا قرض چکا دوں گا۔

(۲) جو لوگ کسی مُلکی یا قومی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، اور اُن کو اپنے مشن کے لئے امداد کی ضرورت ہو تو وہ بھی اُسی روز مجھ سے ملاقات کریں۔

اشتہار چھپ گیا۔ بہت دُور دُور تک اسکی شہرت ہوگئی۔ ریل والے بھی حیران ہوگئے۔ اُن بیچاروں پر بہت سا زائد کام آپڑا تھا۔ جو شخص سوار ہوتا تھا، خواہ وہ کسی اسٹیشن سے سوار ہوتا ہو ہی کا ٹکٹ لیتا تھا۔ اسٹیشنوں پر چھپے ہوئے ٹکٹوں کے علاوہ سادہ ٹکٹ بھی ختم ہوگئے تھے۔

ابھی چار پانچ دن باقی تھے۔ میں اپنے دل میں بہت خوش تھا کہ اب جلد اس دولت سے چھٹکارا پاؤں گا۔ دوپہر کے وقت میں ایک پُرانا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ایک نئی کمپنی کا اشتہار میری نظر سے گزرا جسکا سرمایہ ساڑھے سات لاکھ تھا اور تعجب یہہ کہ نصف حصے پرشوتم نے خرید کئے تھے۔ میں حیران ہوا۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہی سوال اُٹھتا تھا کہ کیا یہ وہی پرشوتم نہیں ہے ؟ پھر اس قدر دولت اس کے پاس کہاں سے آگئی ؟ مگر بعد ازاں سب راز کھُل گیا۔ یہ نئی کمپنی بہت جلد تباہ ہوگئی۔ جس روز میں نے اشتہار دیکھا تھا، اُس کے دوسرے ہی دن پرشوتم دغا کے جرم میں گرفتار ہوکر عدالت میں پیش ہوا۔ اُس نے میرے پانچ ہزار سے نہایت نکما کام شروع کیا تھا، اور پھر اُسے بیس ہزار میں ایک جعل سے فروخت کر دیا۔ صدہا غریبوں اور یتیموں کا روپیہ برباد کیا۔ میں بڑے غور کے ساتھ مقدمہ کی کارروائی کو دیکھتا رہا۔ مجھے ازحد ملال تھا کہ میری دولت سے اس قدر لوگوں کا نقصان ہوا۔ مگر میرے پاس کافی دولت تھی۔ میں نے سوچا کہ روپیہ کی تلافی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ میں نے فوراً ایک اور اشتہار دے دیا کہ "جن لوگوں نے پرشوتم کے ہاتھ سے نقصان اُٹھایا ہے، وہ بھی فلاں تاریخ کو آکر مجھ سے روپیہ لے جائیں"۔

سینچر کی صبح کو میں نہایت خوش خوش بستر سے اُٹھا۔ ملازم نے مجھے خبر دی کہ ہزارہا آدمی احاطہ میں جمع ہیں۔ میں نے جاکر دیکھا تو واقعی اس قدر بھیڑ نظر آئی کہ ماگھ میلہ کا گمان ہوتا تھا۔ سرسری نظر ڈالنے سے، ان میں بہت سے آدمیوں کو میں نے پہچانا۔ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی نظر آئے جو قومی و مذہبی خدمت کے بہانہ سے خوب روپیہ اینٹھتے ہیں۔ کوئی یتیم خانہ کے شاہ ہیں، کوئی ہندوستان میں الازہر کی نظیر قایم کیا چاہتے ہیں، کوئی بادشاہ کو مسلمان بنانے کی موہوم امیدوں کے سبز باغ دکھا کر گلچھرے اُڑاتے ہیں۔ کوئی کچھ اور کوئی کچھ۔ مگر مجھے ان باتوں سے کچھ سروکار نہ تھا۔ میں نے ہاتھ منہ بھی نہیں دھویا اور اپنا کیش بکس (نقدی کا صندوق) لیکر بیٹھ گیا۔

اور چاروں طرف چک لکھ لکھکر پھینکنے لگا۔ جس نے جس قدر اپنی ضرورت بیان کی، یا جتنا پرشوتم کی طرف بتایا، میں اُسے بلا تحقیقات چک لکھدیتا۔ میں نے بہت زیادہ روپیہ تقسیم کیا، مگر ابھی صدہا آدمی کھڑے تھے کہ اسی اثناء میں دو مضبوط آدمی آئے۔ انھوں نے مجھے پکڑکر میری مشکیں کس لیں۔ میں نے انھیں منہ مانگا روپیہ دینے کا وعدہ کیا، مگر انھوں نے روپیہ لینے سے انکار کیا، اور کہا کہ ہم تو صرف آپ کو چاہتے ہیں۔ اب آپ ہمارے ساتھ چلئے اور کچھ روز پاگل خانہ کی سیر کیجئے!

اتنے میں میری آنکھ کھُل گئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب خواب تھا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

میں بجائے ارب پتی ہونے کے وہی معمولی درجہ کا آدمی تھا جیسا کہ سونے کے وقت تھا۔ مگر میں دل میں بہت خوش تھا کیونکہ جو دولت اس قدر بُرے نتائج رکھتی ہے اُس سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ مگر ہاں، اس بات کا ابتک افسوس ہے کہ ایسے اعلیٰ اعلیٰ نفوس کا دیدار مجھے خواب میں نصیب ہوا مگر میں اُن کی کچھ بھی خدمت نہ کرسکا۔

ش۔ ح

برسات اور جنگلی پھول

قریباً چار سال کا عرصہ ہوا، کہ اُس پہاڑ کے دامن میں، جو مجھ بے برگ و نوا کے خسخانہ کے شمالی مغربی سمت واقع ہے، جنگلی جوئی پرسے میں مناظرِ قدرت کی سیر کیا کرتا تھا، اے برسات، تونے مجھے اس جنگلی پھول سے دوچار کردیا، جس میں گلاب کی شادابی، موگرے کی سادگی، اور گُل شبّو کی خوشبو یعنے حسنِ فطرت کی بہار نظرافروز تھی! میں کیا جانتا تھا اے برسات، کہ تو مجھ افسردہ دل کی شگفتہ خاطری کے لئے نیا گُل کھلائیگی، میرے دل میں بھی ہزاروں جاں نواز امیدوں کی کلیاں پھوٹیں گی، اور میں بھی سبز باغِ محبت کی ہوا میں، مثلِ طائرِ خوشنوا، جنگلی پھول کے ہوائے شوق میں، ترنم ریزِ عشق ہوکر، مصروف پرواز خیالی رہونگا!

اے برسات، تیرا کام تو اُٹھتے جوش پر پانی بہا دینا ہے لیکن آگ لگے تجھے، کہ تونے، مجھ میں وہ آتشپارہ ڈالدیا، جس کے آگے سمندر سرد ہے، جس سے میرا خرمنِ صبر و خرد جل بجھا۔ ہائے تونے میری کشت تمنا پر پانی پھیر دیا، کہ ایسے جنگلی پھول کی محبت کا بیج میرے سرزمینِ دل میں بو دیا، کہ شوربختی سے، میں اُس کے پھلنے پھولنے، برگ و بار لانے کی تمنا نہیں کرسکتا!

اے برسات، یاد ہے تجھکو، تاکستان والا اگلے برس کا وہ واقعہ؛ ہائے وہ دن بھی مجھ ناشاد کے حق میں، شب عید سے زیادہ مسرت بار تھا، جبکہ انگور کی بیل کے کُنج میں میں تھا، میرے دائیں مہر لقا، بائیں مہ پارہ، یعنے دونوں بہنیں، اور مقابل میں وہ سیہ پوش تھی، جو بدلی کی طرح بدلی ہوئی ہے، نیلگوں آسمان پر گھٹا چھاکر، میرے شوقِ تمنا کو بڑھا رہی تھی، ابر موتی رول رہا تھا، جو سایہ فگن پتّیوں کی دراز دستیوں سے بچکر، مہر لقا اور مہ پارہ پر نچھاور ہو رہے تھے، اور میں اپنی چابکدستی سے، انکو مہر لقا اور مہ پارہ کی آفتاب اور مہتاب کی سی چمکدار اور نورانی پیشانیوں سے، اپنی دستی میں چُن لیا کرتا تھا۔ ہائے وہ یادگار مجمع وہ

بادۂ محبت کی سرشاری کی یاد، قسم ہے نرگس کی چشم میگوں کی، میں عالم
خود فراموشی میں بھی فراموش نہیں کر سکتا! اے برسات! کیا
اِن گلعذاروں کے داغوں کی سوزش سے، میرے دل میں
آبلے نہیں پڑ گئے تھے، میرا دل خوشۂ انگور نہیں ہو گیا تھا، جو
تو نے جنگلی پھول کی نئی کھٹیں لگا دی!

اے جنگلی پھول! اے نازپروردۂ آغوشِ بہار!
مذہبِ عشق میں، جبکہ میں پیمبر ہوں، تجھے چھونا تک منع ہے، ورنہ
باوجود ناممکن الحصول ہونے کے، میں تجھے حاصل، اور اپنے
گلے کا ہار بنانے کی کوشش کرتا۔ خورشید جہاں آرا سے زیادہ،
جو صبح و شام، مہ جبینان و زہرہ جمالان زردشتیان کے نور
سے کسب ضیاء کرتا ہے، تیری جلوہ ریزی، میرے سیہ خانۂ
دل میں ہوتی، لیکن ہائے میں جانتا ہوں، تو میرے لئے نہیں
ہے، اور میں تیرے لئے نہیں ہوں، اسلئے زیادہ سے زیادہ،
میری یہ آرزو ہے، کہ کم از کم، تیرے دیدارِ مسرت بار سے روزانہ
دو ایک مرتبہ ہی بہرہ اندوز ہوں، لیکن افسوس! میرا مدعی محبت دل،
گواہی دیتا ہے، کہ بہت جلد، میں اس آرزو سے بھی محروم ہو جاؤنگا
اسلئے کہ وہ، جو میرے رنگ میں رنگے ہوئے نہ ہوں گے، قسمت
کی نیرنگی دکھائیں گے، تیری سرکار میں بار پائیں گے، باغبانوں
اور باغبانیوں کی اجازت سے، گو وہ تیرے خلافِ منشاء ہی
کیوں نہ ہوں، زود و دیر تجھے چن لینگے، اور پھر، ایک شب، صرف
ایک شب کے بعد، صبح کو، تیرا اچھوتا پن، غازۂ شب، یا سپیدۂ سحر
کی طرح، کافور ہو جائے گا! تو کہاں اور میں کہاں!

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

محمد سیف الدین شباب

تنقیدِ کتب

پنچ پرکاش یہ رسالہ جسے "قومی بزرگوں، مذہبی پیشواؤں، ملکی ریفارمروں، کی مستند آراء کا مجموعہ" کہنا چاہیئے لالہ گنیش داس صاحب میونسپل کمشنر ترنتارن نے "انسان کی پہچان اور حیوانات سے مشرف و ممتاز ہونے کے لئے" تصنیف و تالیف کیا ہے۔ اس قسم کا لٹریچر ہمارے ملک میں بہت کم ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اب اکثر اہل قلم اس نقص کے رفع کرنے میں ساعی ہیں لالہ گنیش داس صاحب اپنی کوشش میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے مقولے جن سے بکثرت اخلاقی فواید مترتب ہونے کی بجا امید کی جا سکتی ہے بہت دلچسپ ہیں اور جا بجا فارسی اور ہندی اشعار کا پیوند سلیقہ کے ساتھ لگایا گیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے "پنچ پرکاش" کی حالت قابل اصلاح ہے۔ اکثر مقامات میں ہندی اور سنسکرت الفاظ ایسے بے جوڑ واقع ہوئے ہیں کہ عبارت کی روانی اور اسلوب کلام خاک میں مل گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے۔

> حمام میں غسل کرنے سے جیسے جسمانی صفائی کے علاوہ صحت وتندرستی ترقی پکڑتی ہے ویسے حواس ظاہری و باطنی کو ضبط رکھنے سے انتہ کرن کی شدھی ہوتی ہے۔

اگر "انتہ کرن" اور "شدھی" ایسے نامانوس الفاظ کا لانا ضروری

ہی تھا تو بہتر ہوتا کہ ان کے اُردو مرادف الفاظ بھی مطالب کو عام فہم بنانے کے لئے قوسین میں لکھدیئے جاتے۔

میونسپل کمشنر صاحب کو اختیار ہے کہ اپنے مفہوم کو وہ ہندی اور سنسکرت الفاظ کی مدد سے ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں لیکن اُنھیں یہ حق نہیں کہ وہ کسی اُستاد کے شعر میں بھی من مانا تصرف کر ڈالیں۔ وہ خود انصاف کریں کہ داغ کے اس شعر میں

مار نا سن کا سمجھتا ہوں جہاد اکبر

وہی غازی ہے بڑا جس نے یہ کافر مارا

"دل" کو حذف کرکے "من" لکھدینا کہانتک قابل اعتراض نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ یہ فروگذاشتیں آیندہ ایڈیشن میں باقی نرہنگی (قیمت فی جلد ۸/)

مرقع دربار | مولوی محمد عبد الکریم خاں صاحب صبر دہلوی (موسیقی منزل حیدر آباد دکن) نے دربار تاجپوشی دہلی کے حالات ایک مطول قصیدہ کی شکل میں قلمبند کئے ہیں جنکا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ تمہید میں مختلف اسلامی حکومتوں۔ فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کے ہندوستان میں آنے اور نقش حکومت جمانے کا بیان خوبی سے کیا گیا ہے، ناموراشخاص کے مختصر حالات فٹ نوٹ میں دیئے ہیں اس سے یہ قصیدہ مستقل دلبستگی کی چیز بن گیا ہے۔ ناظرین ایک ایک کاپی ۸/ میں منگاکر ضرور دیکھیں۔

محاکمہ نادر | گذشتہ دہلی دربار کے موقع پر حضور قیصر ہند دام اقبالہٗ نے جن ملکی تغیرات انتظامی کا اعلان فرمایا تھا وہ آجتک معرض بحث میں ہیں۔ دہلی کے پایۂ تخت بنائے جانے پر کچھ لوگ اگر خوش ہیں تو اہل کلکتہ اپنے شہر کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت کے اس طرح چھن جانے سے کبیدہ خاطر ہیں۔ منشی نادر علی صاحب وکیل آگرہ نے اس رسالہ میں زیادہ تر اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور اُسکے دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد دہلی کے پایۂ تخت ہند بنائے جانے سے اتفاق رائے کیا ہے جسکی تائید ہم بھی کرینگے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ نے جس طریقے پر بنگالیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ہمارے خیال میں چنداں موثر نہیں ہوسکتا۔ آپ کہتے ہیں:۔

اہل بنگال کو جو امتیاز حاصل ہے وہ اُن کی عقل کی بڑائی اور دماغ کی روشنی کی وجہ سے ہے۔ جبتک یہ جوہر اُن میں جلوہ گر رہیگا اہل بنگالہ کی بڑائی کو کوئی انقلاب نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اس رائے پر جرح و قدح کرنے کے لئے ایک وسیع میدان موجود ہے لیکن "پالیٹکس" کے لئے صفحات ادیب میں گنجایش نہیں رکھی گئی اسلئے محاکمہ نادر کے ساتھ ہی

اتحاد نادر

پر بھی تفصیلی نگاہ ڈالنے کا موقع نہیں۔ آخری رسالہ بھی وکیل صاحب ممدوح کے نادر اور اکثر مفید خیالات کا مجموعہ ہے۔ اور اتفاق و اتحاد کے ذرایع اور اختلاف قومی کے اسباب پر تاریخی دلایل کے ساتھ بعض جگہہ نہایت متانت اور معقولیت سے رائے زنی کی گئی ہے۔ جو لوگ ہندو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہوں اُنھیں اس کا مطالعہ از بس کار آمد ہوگا (قیمت فی جلد ۸/)

العین | کامل بک ایجنسی لاہور کے طبی سلسلہ کی یہہ ساتویں کتاب ہے جسے "زبدۃ الاطبا" حکیم منشی محمد عبد العزیز صاحب کامل لاہوری نے مرتب کیا ہے۔ حکیم صاحب نے اس میں آنکھ کے متعلق علمی معلومات بہت خوبی سے جمع کی ہیں۔ یونانی اُصول کے ساتھ یورپین تحقیقات کا ذکر بہت مفید ہے اور عربی و انگریزی اصطلاحوں سے جن کا تعلق آنکھ سے ہوسکتا ہے کام لیا گیا ہے۔ سب کے آخر میں مختلف امراض چشم کے لئے مجربہ نسخہ جات ڈاکٹری و یونانی مندرج ہیں۔ اُمید ہے کہ حکیم صاحب کی یہہ کوشش مشکور ہوگی۔ قیمت عہ حجم اور چھپائی کے لحاظ سے کسی قدر زائد ہے۔

اوراق ماتم تسلیم | حضرت تسلیم لکھنوی کے انتقال پر ملک میں جس قدر

مائمی نظمیں اور تاریخیں لکھی گئی تھیں اُن میں سے بیشتر حصہ اس رسالہ میں حضرت صبر ارشد تلامذہ حضرت تسلیم مرحوم نے جمع کرکے چھپوا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتابیں اپنے مخصوص حلقوں میں مقبول ہو سکتی ہیں۔ البتہ صبر صاحب کی مثنوی

طلوع و غروب

جسے حضرتِ تسلیم کی منظوم سوانح عمری کہنا بالکل ٹھیک ہوگا قابل قدر چیز ہے۔ مصنف نے اپنے اُستاد کی زندگی کے تمام حالات شرح و بسط سے نظم میں قلمبند کئے ہیں۔ زبان صاف ہے۔ شروع میں تسلیم مرحوم کی ایک عکسی تصویر بھی شامل ہے۔ ہماری رائے میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب صبر نے "طلوع و غروب" لکھکر حق شاگردی ادا کر دیا ہے۔ یقیناً یہہ مشکل کام تھا اور واقعات کا نظم کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہوتا، لیکن صبر صاحب اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ گو اس بات کا تصفیہ کرنا پھر بھی باقی رہجاتا ہے کہ جبکہ ایک سوانح عمری نثر میں "حیات تسلیم" کے نام کی پیشتر سے موجود تھی تو اس مثنوی کیلئے درد سر مول لینا کیا ضرور تھا (قیمت علی الترتیب فی جلد ۲ ر و ۸ ر)

دفتر خیال | یہہ حضرت امیر اللہ تسلیم لکھنوی کا تیسرا دیوان ہے جسکے لئے ملک کو مطبع سعیدی رامپور کا ممنون ہونا چاہیئے جس کے حسن سعی سے دو ایک اور مفید کتابیں بھی اس سے پہلے شایع ہو چکی ہیں اور غالباً تسلیم مرحوم کا دوسرا دیوان بھی یہیں سے چھپا ہے۔

حضرت تسلیم دورِ آخری کے ایک قابل تعظیم شاعر گذرے ہیں جن کی وفات کا صدمہ حال میں ملک کو اُٹھانا پڑا تھا۔ انہیں نسیم دہلوی ایسے نغز گو اور نازک خیال شاعر سے تلمذ تھا جس نے اپنی زبان دانی کا ادعا ان الفاظ میں کیا ہے اور بجا کیا ہے ؎

نسیم دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں
کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

نسیم ایک عرصہ تک لکھنؤ میں مقیم تھے اور اپنی اُستادی کا سکہ وہاں کے علمی حلقوں میں بٹھا چکے تھے۔ تسلیم اُسی زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے اور اپنی زندگی بھر اپنے اُستاد کا نام روشن کرتے رہے۔

حضرت تسلیم کے کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تخیلات اور طرز بیان میں وہ ہمیشہ "دہلی اسکول" کے مقلد رہے ہیں۔ اسکا احساس اُنھیں خود بھی تھا۔ چنانچہ پہلے دیوان میں فرماتے ہیں ؎

ہم تو ہیں تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی
ہمکو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

تسلیم کے حالات زندگی بغایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں اور کارکنان مطبع نے شروع دیوان میں اُن کے سوانح کا حصہ شامل کر دینے سے اصل کتاب کی دلچسپی میں خاص اضافہ کر دیا ہے۔

اہل کمال کو قناعت پسندی اور زمانہ کی ناقدری کے ہاتھوں جن عبرت خیز پریشانیوں سے سابقہ عموماً پڑتا ہے اُن سے تسلیم بھی محفوظ نہیں رہے لیکن آخر میں نواب خلد آشیاں کی فیاضی سے فارغ البال ہو گئے تھے اور پھر تا حینِ حیات اُنھیں رامپور سے علمی وظیفہ ملتا رہا۔ گو یہہ امر قابل تاسف ہے کہ یہہ قدردانی اُن کے کمال و فضل کے اعتبار سے نہ تھی

مقدمۂ دیوان سے حضرت تسلیم کی تصانیف کی بھی ایک اجمالی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ایک دیوان آشوب غدر میں تلف ہو گیا۔ تین دیوان شایع ہو چکے ہیں۔ تاریخ رامپور بھی شایع ہو چکی ہے۔ کئی مثنویاں بھی چھپکر مقبول انام ہوئی ہیں۔ دو کتابیں کتب خانہ ریاست میں قلمی موجود ہیں (۱) سفرنامہ ہز ہائینس نواب رامپور (۲) تاریخ زمانہ یکجنبی۔ یہہ دونوں بلا مبالغہ تیس ہزار سے زاید اشعار کا مجموعہ ہیں۔ سفرنامہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب ہز ہائینس یورپ سے واپس آئے تو یہہ تیار تھا اور فوراً ملاحظہ میں پیش کیا گیا لیکن کسی کی شرارت سے اُسکا قلمی نسخہ میز پر سے جاتا رہا۔ لیکن شاعر کی ہمت کو دیکھئے کہ پھر خدا کا نام لیکر مستعد ہوئے

اور کچھ عرصہ کی محنت شاقہ سے اُسے پھر مرتب کیا۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دربار سے اسکا صلہ کیا ملا۔ تنخواہ بیس۲۰ سے چالیس۴۰ روپیہ کر دی گئی لیکن حج بیت اللہ کی تمنا نہ پوری کیجا سکی۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت تسلیم کا دم مغتنمات سے تھا اور اُن کی موت کا صدمہ جسے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا مدت مدید تک محسوس ہوتا رہیگا۔ اس دیوان سے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں ناظرین اندازہ کریں کہ آخر آخر میں اُن کا رنگ کس قدر پختہ ہو گیا تھا ۵

تعجب ہے کہ اُس بُت کے ہیں صدہا دیکھنے والے　　خدا کے ایک موسیٰ وہ بھی تنہا دیکھنے والے

اگر دیکھے نہ دیکھے چارہ گر داغِ محبت کو　　مرا تم کون ہوتے ہو کلیجہ دیکھنے والے

کوئی اتنا نہیں روکے جوان کو قتل کرنے سے　　ہزاروں ہیں سرِ بالیں تماشا دیکھنے والے

ابھی کمسن ہو شرماؤ چھپو نکلو نہ گھر سے تم　　شباب آنے دو پھر دیکھیں گے پردا دیکھنے والے

رُک رُک کے دمِ پیری دم آنے کو کیا کہئے　　جینے کا یہ عالم ہے مر جانے کو کیا کہئے

ہم نے تو یہیں دیکھا اللہ کے جلوے کو　　کعبہ نہ اگر کہئے بت خانے کو کیا کہئے

اس شعر میں کس قدر حسرت ہے ۵

بہار آئی گئی حالت وہی اب تک رہی دل کی
کھلائی اے صبا تو نے نہ اک دن بھی کلی دل کی

یہ مطلع کس قدر شاندار ہے ۵

آج دم بھر میں اجل کا سامنا ہونے کو تھا　　خیر گذری آ گئے تم کیا سے کیا ہونے کو تھا

غالب کی غزل ہے آئیں گے کیا، کھائیں گے کیا، اسی زمین میں حضرت تسلیم کے چند شعر یہ ہیں مطلع قابل دید ہے ۵

پرسشِ اعمالِ بد محشر میں فرمائیں گے کیا　　فرق اپنی شانِ غفاری میں وہ لائینگے کیا

کیا کہا پھر تو کہو زندہ دکھائے پھر خدا　　ایک دو دن تم نہ آؤ گے تو مر جائیں گے کیا

حضرتِ ناصح عنایت ہو چکی رکھئے معاف　　خوب ہم سمجھے ہوئے ہیں آپ سمجھائینگے کیا

دیگا رزاقِ ازل تسلیم جو قسمت میں ہے
مثلِ غالب کیوں کہیں گھر میں ہیں کھائینگے کیا

مقطع میں غالب کے اس شعر پر شاعرانہ تعریض ہے ۵

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد　　ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائینگے کیا

برآئے، خدا رآئے، مشہور طرح ہے۔ میر و سودا سے لیکر ذوق و داغ تک نے اسپر طبع آزمائی کی ہے۔ حضرت تسلیم فرماتے ہیں ۵

قاتل نہ کبھی کرہی امید بر آئے　　سر پر جو پڑے تیغ کمر تک اُتر آئے

دنیا سے غرض تھی طلبِ یار میں کس کو　　جاتے تھے کہاں بھول کے رستہ کدھر آئے

کہتی ہے لحدِ خاک میں کیا تم نہ ملوگے　　کیوں آج نہا دھو کے سنور کر ادھر آئے

کس کس سے کہیں وادیِ غربت میں پڑے تھے
سب کہتے ہیں تسلیم کدھر تھے کدھر آئے

ذیل کے مطلع میں حیدرآباد جانے کی تمنا کا اظہار ہے لیکن پھر حضرت امیر مرحوم کا واقعہ یاد آجاتا ہے یعنی جب تقدیر میں نہیں تو کہاں سے ملے ۵

مرے دل میں تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے
مگر مرگِ امیر بے وطن کچھ اور کہتی ہے

غزلوں سے پہلے قصاید اور بعد میں تاریخیں ہیں اور اپنی اپنی جگہ قابل تعریف ہیں۔ قدر دانان سخن کے لئے دفترِ خیال ایک گوہر گراں مایہ ہے اور مطبع سعیدی رامپور سے بقیمت عہ دستیاب ہو سکتا ہے جو اصل کتاب کے مفاد و دلچسپی کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔

شرح دیوان غالب اُردو شعرا میں یہ فخر صرف غالب کے حصہ میں آیا ہے کہ اُسکے کلام کی متعدد شرحیں آج تک شایع ہو چکی ہیں۔ منجملہ اُن کے یہ شرح بھی ہے جو مولانا فضل الحسن ایڈیٹر اُردوئے معلی نے مرتب کی ہے اور اپنی نکتہ شناسی اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے دو ایڈیشن اس سے پیشتر شایع ہو کر ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔ یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ مولانائے موصوف نے جو خدمت اُردو لٹریچر کی کی ہے اُس کے لئے وہ شکریہ کے مستحق ہیں اور اگر پبلک اُن کی خدمات کی قدر کرتی ہے تو کوئی جائے تعجب نہیں۔

راون کا دربار

انڈین پریس الہ آباد

اس کتاب میں ایک خوبی یہ ہے کہ دیوان غالب کے کل اشعار اس میں باترتیب درج ہیں اور جو قابل شرح سمجھے گئے ہیں اُن کی تشریح بھی ساتھ ہی ساتھ کردی گئی ہے۔ شروع میں غالب کے حالات اور شاعری پر تنقید کی گئی ہے اور اس گلدستہ میں دلفریبی پیدا کرنے کے لئے زیادہ تر "یادگار غالب" سے مدد لی گئی ہے۔ غالب مجدد الوقت شاعر گذرا ہے۔ بیشک زبان کی حیثیت سے اُنپر ایک حد تک خردہ گیری کا موقع مِل سکتا ہے لیکن مولانا فضل الحسن کا یہہ ارشاد کہ

ہمارے نزدیک صحت زبان و محاورہ کے جانب سے بے پروائی مرزا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ شعراء دہلی عموماً خوبی مضمون کے مقابلہ میں درستی الفاظ کا خیال نہیں رکھتے تھے۔

اساتذہ دہلی پر ایک ناروا اور غلط اتہام ہے۔ غالب کے تمام دیوان میں اس قسم کی فروگذاشتیں دس بیس سے زاید نہیں۔ انسے قطع نظر ذوق، ظفر، شاہ نصیر، داغ، یہہ وہ اہل فن ہیں جنھوں نے اُردو زبان کو صفائی و درستی الفاظ و محاورات کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اِن کے کلام میں جا بجا غلطیاں نکل آئیں لیکن اس سے کوئی خالی نہیں کہا جا سکتا۔ شعراء لکھنؤ میں آتش کا کلام صفائی زبان کے معیار پر سب سے اچھا سمجھا گیا ہے لیکن کیا اُن کا دیوان ایسی معمولی غلطیوں سے پاک ہے؟ آبِ حیات میں آتش کے علاوہ اور شعراء کی بعض لسانی فروگذاشتیں بہت خوبی سے دکھائی گئی ہیں لیکن عام حالت میں ان کو شہرت دینا اور اُچھالنا خفیف الحرکاتی ہیں داخل ہے۔

اصل شرح کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ مولانا فضل الحسن نے اختصار کو مدنظر رکھنے کے باوجود بعض اشعار کے معانی اس انداز سے بیان کردیئے ہیں کہ سامع کا ذہن فوراً اصل مطلب کو اخذ کر لیتا ہے مثلاً یہہ شعر ؎

دل گذرگاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

اس کی یہہ شرح

سرمنزل یعنی منزل:- مطلب یہہ ہے کہ اگر تقویٰ ممکن نہیں تو رندی ہی سہی۔

بہت درست ہے۔ چونکہ غیر مانوس الفاظ اس میں مطلق نہیں اس لئے ایک مبتدی بھی اسیقدر شرح سے مطالب کو ذہن نشین کرسکتا ہے۔ لیکن بعض شعروں میں الفاظ کے معانی بیان کرنے میں کوتاہی کی گئی ہے مثلاً یہہ اشعار

گرمِ فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے　　تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم　　لے لیا مجھسے مری ہمت عالی نے مجھے

پہلے شعر میں "شکل نہالی" اور "بردِ لیالی" کے معنی مبتدیوں کے افادے کے لئے لکھنے ضروری تھے۔ اسی طرح دوسرے میں نسیہ و نقد کی لفظی تشریح کرنا تھی۔

زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بست مژہ سیلیِ ندامت ہے

شرح:- چونکہ تماشائے حسن کی مشق جنون کی علامت ہے اسلئے بر وقت تماشا پلکوں کا کھلنا اور بند ہونا گویا سیلی ندامت کا پڑنا ہے۔

مطالب واضح ہیں لیکن یہ دکھانا چاہئے تھا کہ "جنون" اور "سیلی ندامت" کا درمیانی تعلق کیا ہے۔ مبتدیوں کا خیال ایسے مواقع پر اُلجھاؤ میں پڑ جاتا ہے۔ یہ شرحیں انھیں کے لئے لکھی جاتی ہیں لہذا ان کی محدود قابلیت اور تجربہ کو مدنظر رکھکر بہت سی معمولی باتوں کی تشریح بھی لامحالہ کرنا پڑتی ہے ورنہ کتاب کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

سادگی پر اُسکی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

شرح:- ہمارے دل میں اُسکی سادگی پر مرجانے کی حسرت ہے لیکن پھر بس نہیں چلتا کیونکہ اسکے ہاتھ میں خنجر ہے اس لئے مجبوری

کشتۂ خنجر ہونا پڑیگا۔ یا یہ کہ اسکی سادہ لوحی پر مرجانے کی حسرت ہے
جو ہم کو مارنا چاہتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ ہمیں بے خنجر ہی شہید
کر سکتا ہے۔

لیکن ایک تیسرے معنی اس کے اور بھی ہو سکتے ہیں جو کسی وجہ
سے نظر انداز ہو گئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اُسکی سادگی پر مرجانے کی
حسرت ہے لیکن بس نہیں چلتا کہ اُس کے ہاتھ میں خنجر ہے۔ کیونکہ جب
قاتل کے ہاتھ میں خنجر ہوا تو سادگی کہاں رہی؟

دیوان غالب کا پہلا شعر نقش فریادی ..... الخ ایک زمانہ
سے ادبی و علمی مجالس میں زیر بحث رہ چکا ہے۔ اسکی شرح میں خود غالب
کے الفاظ عود ہندی سے نقل کر کے لکھ دیے ہیں۔ حالانکہ تحقیق طلب امر
یہ تھا کہ وہ کونسی ولایت ہے جہاں "فریادی کاغذی پیرہن پہنکر
عدالت میں جاتے تھے" (قیمت مجلد عہ؍)

تاریخ جنگ ٹرکی و اٹلی (حصہ اول) اس جنگ نے جو اپنی نوعیت
کے لحاظ سے یورپین پالٹیکس کے تاریک پہلو کو دکھانے والی ہے تمام
عالم کو متحیر و متعجب بنا دیا ہے اور میدان جنگ کے حالات اور نتیجہ جنگ
کے معلوم کرنے کے لئے عام طور پر لوگ بیقرار پائے جاتے ہیں۔ جو حضرات
طرابلس کے ابتدائی اور موجودہ تاریخی اور جغرافیائی مستند حالات کے
ساتھ اوائل ۱۹۱۲ء تک کے کوایف جنگ سے واقفیت پیدا کرنا چاہتے
ہوں وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ مولوی محمد شفیع الدین خاں
صاحب مرادآبادی کا ہمیں مشکور ہونا چاہئیے کہ انھوں نے ایک
موجود الوقت ضرورت کو نہایت خوبی سے پورا کیا ہے۔ چھپائی میں
عجلت کی وجہ سے پورا پورا التزام نہیں ہو سکا لیکن گلابی سنہرا
ٹائیٹل پیج بہت دلفریب ہے۔ کیا خوب ہوتا اگر کاغذ اس سے بہتر لگایا
جاتا۔ قیمت ۸ر موجودہ حالت میں نہایت مناسب ہے۔ شایقین
مولوی صاحب سے بھٹی محلہ مرادآباد کے پتہ پر درخواست کریں۔

پنجاب ریلیجیس بُک سوسایٹی کی کتابیں پنجاب ریلیجیس بُک سوسایٹی
(انارکلی۔ لاہور) کی ادبی مساعی جمیلہ کا تذکرہ تاریخ ادب اُردو میں
نہایت روشن حرفوں میں لکھا جائیگا۔ اس سوسایٹی نے اسوقت تک
متعدد بیش قیمت اور مفید کتابیں تالیف اور ترجمہ کی شکل میں شایع
کی ہیں اور اُن کا سلسلہ ابھی تک بدستور جاری ہے۔ حال میں چند اور
تراجم شایع ہوئے ہیں جنمیں سے مندرجہ ذیل خاص ذکر کے مستحق ہیں

(۱) لڑکوں کا رہنما قیمت ۸ر
(۲) نوجوانوں کا رہنما قیمت عہ ر
(۳) شوہر کا رہنما قیمت عہ ر
(۴) رہنمائے تعلیم قیمت ۴ر
(۵) طالبان حق قیمت ۹ر
(۶) حل المشکلات قیمت ۶ر

آخری کتاب نفس مضمون کے اعتبار سے خالص مذہبی اسپرٹ
رکھتی ہے لیکن جو لوگ خدا اور دنیا کے مسیحی مفہوم سے واقفیت حاصل
کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہو گا
پروفیسر جیمس آر ڈی ڈی جو اسکاٹلینڈ کے ایک مشہور عالم الٰہیات ہیں
اُن کی انگریزی کتاب سے یہ ترجمہ ماخوذ ہے۔

طالبان حق میں سینیکا، اپکٹیٹس اور مرکس اورلیس ایسے
مشاہیر کے حالات زندگی درج ہیں اور اسکا مطالعہ بچوں اور نوجوانوں
کے لئے یکساں کارآمد ہے۔ حکیم سینیکا کے حالات غایت دلچسپ ہیں۔
اُس کی ماں ہل ویہ کے کیرکٹر کا ذکر جن الفاظ میں کیا گیا ہے اُس سے
ہندوستانی مستورات سبق لے سکتی ہیں۔ لکھا ہے کہ

اُس زمانہ کی عورتیں اپنے لڑکوں کو اس سبب سے عزیز
رکھتی تھیں کہ اُن کی اقبال مندیوں سے اُن کی دلی تمنائیں برآتی تھیں
اور اُن کی کمائی ہوئی دولت سے اپنے حوصلے پورے کرتی تھیں

مگر لِوِیہ اپنے بیٹوں کو اس وجہ سے پیار کرتی تھی کہ وہ اسکے
جگر پارے اور کلیجہ کے ٹکڑے تھے .... وہ اپنے زمانہ کی
بُرائیوں اور خرابیوں کے زہر مسموم سے بے لوث تھی۔ رومی
عورتوں میں پاکدامنی اور عصمت عنقا تھی.... مگر لِوِیہ کا دامن
عصمت و اخلاق بالکل بے داغ تھا۔ وہ زر و جواہر کو حقیر سمجھتی تھی

حکیم سینکا کی تعلیمات اور خیالات پر بھی کافی روشنی ڈالی
گئی ہے اور اُسکی بعض اخلاقی کمزوریوں کا پردہ بھی فاش کیا گیا ہے
لیکن اس قسم کی فروگذاشتیں انسانی سرشت میں داخل سمجھی جاتی ہیں
اُسکے بچپن اور تعلیم کے کوائف کسی قدر دلبستگی کا سامان رکھتے ہیں
لیکن رُوم کی مُلکی حالت کا جو فوٹو اس کتاب کے صفحوں میں کھینچا گیا
ہے وہ بیحد نفرت خیز ہے۔ جو بے ترتیبی اُمور مملکت میں اُسوقت پیدا
ہو گئی تھی اُسکے بھینٹ سینکا کو بھی چڑھنا پڑا اور بغاوت کے جُرم میں
جزیرہ کارسیکا میں جلاوطن ہو کر کئی سال رہنا پڑا۔ جو الزام اُس پر
لگایا گیا تھا وہ درحقیقت ایک افترا تھا لیکن اُس کی روز افزوں
شہرت نے حسد کی آگ حکمران وقت کے دل میں پھونک رکھی تھی وہ
آخرکار اس غیر منصفانہ و خود غرضانہ حرکت کے بعد سرد ہوئی۔

عموماً بڑے بڑے آدمیوں کے حالات سے جو سبق حاصل
ہو سکتے ہیں وہ اس کتاب کے پڑھنے والے ایکٹیٹس اور مرقس اوریلیس
کے سوانح سے بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ آخرالذکر روم کا ایک باعظمت شاہنشاہ
گذرا ہے ایک "ڈائری" اس دنیا میں اُسکی یادگار ہے۔ روم کی شاہنشاہی
اُسکے نام صفحۂ عالم پر قایم نہ رکھ سکتی تھی لیکن یہہ روزنامچہ حیات جاوید کا
بہترین ذریعہ ثابت ہوا ہے۔

رہنمائے تعلیم :- انگریزی کتاب سنچری سٹوڈنٹ گائیڈ کا ترجمہ
ہے جس میں "تعلیم کے اصناف اور بہترین طریقوں پر بڑی خوبی اور
جدت سے بحث کی گئی ہے"۔ تعلیم معراج انسانی کا زینہ ہے اور جس ملک
میں اسکی طرف سے لاپروائی کی جاتی ہے وہ کبھی سرسبز اور اقبالمند
نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان میں بھی تعلیمی مسئلہ گونگے کا گڑ بنا ہوا ہے۔
ہزار منہ ہیں اور ہزار باتیں۔ ایسی حالت میں کہ ہمارے یہاں اس قسم کے
ضروری مبحث پر انصاف اور اصابت رائے کے ساتھ غور نہیں کیا جاتا
رہنمائے تعلیم ایسی کتاب کا شایع ہونا بہت کچھ مفید ہو سکتا ہے۔

اس کتاب میں "تربیت کی قدر و قیمت" "تعلیم سائینس کے فواید"
"طبعی تعلیم" اور "اخلاقی تعلیم" کے متعلق مفید اور نتیجہ خیز رائے زنی کی گئی ہے
لیکن "ہندوستان کے نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت" کے عنوان سے
جو کچھ لکھا گیا ہے وہ عملی نتایج کے اعتبار سے ہندوستانی اہل الرائے کے
خاص توجہ کا محتاج ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم کی جو کچھ
بھی اشاعت ہوئی ہے اُس کے لئے ہمیں برٹش گورنمنٹ کا ممنون ہونا
چاہئے اور یہہ بھی درست ہے کہ مروجہ تعلیم میں سب سے بڑا یہ نقص ہے کہ
اسکے نظام میں مذہب و اخلاق کو جگہ کم دی گئی ہے لیکن اس نقص کے
رفع کرنے کے لئے گورنمنٹ سے زیادہ خود پبلک کو کوشش کرنا چاہئے
ایک نقص یہہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم کی غرض و غایت سے عام
طور پر ناواقفیت طاری ہے اور جبتک یہ حالت رہیگی یہی رونا رہیگا کہ

> آجکل یہہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اُنکی
> زندگی معیار بالا کے لحاظ سے کوئی دلخوش کن یا دلفریب منظر نہیں دکھاتی
> پہلو سے اگر دیکھا جائے تو آجکل کی تعلیم کا "مارکٹ بھاؤ" بہت ہی مندا ہے
> کلکتہ و مدراس جہاں تعلیم کا بڑا زور ہے وہاں کے بازاروں میں درجنوں
> ایسی دردناک صورتیں نظر آئیں گی کہ بی اے اور ایم اے کے معزز تمغے
> اُنکے کندھوں پر ہیں اور فکر معیشت میں ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں

اس دردناک منظر کے دلفریب بنانے کا بہترین ذریعہ یہی ہے
کہ سب سے پہلے اس بات کا تصفیہ کر لیا جائے کہ کس قسم کی تعلیم ضروریات
موجودہ کے لحاظ سے مفید ہوگی۔ ہمارے خیال میں صاحب رہنمائے تعلیم

کا یہ خیال نہایت صائب اور پُر معنی ہے کہ

ہمکو اپنی حالت اور موجودہ زمانہ کی سخت کشمکش کے لحاظ سے
سب سے پہلے ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو تدبیر معیشت میں ہماری معاون
ہو..... مثلاً زراعت صنعت - تجارت بار برداری کا علم وغیرہ -

بیشک پہلے پیٹ کا انتظام کرنا چاہیئے اور جب یہ ہو جائیگا تو لوازم دماغ اور تربیت ذہن کا سامان خود بخود پیدا ہو جائیگا اگر اس اُصول کو مدنظر رکھکر کم از کم ہمارے قومی مدارس میں تعلیم کے ذرایع بہم پہنچائے جائیں تو یہی دو چار کالج اور مدرسے بیش قرار فائدہ پہنچا سکتے ہیں ورنہ ہزاروں اسلامی اور لاکھوں ہندو یونیورسٹیاں کچھ نہیں کر سکتیں -

لڑکوں کا رہنما - اس مختصر رسالے میں "اُن خرابیوں کا ذکر ہے جن میں مبتلا ہو کر لڑکے اپنی صحت جسمانی اور قوائے عقلی کو بگاڑ لیتے ہیں اور اُن سے بچنے کی تدابیر اور ہدایات درج ہیں"

ان الفاظ سے ناظرین کو خیال ہوگا کہ شاید یہ کوئی دواؤں کا اشتہار یا کسی پنجابی حکیم کی جنتری ہو گی لیکن صورت حال یہ نہیں ہے فلاڈلفیا (امریکہ) کے مشہور و معروف پادری ڈاکٹر سلیونیوس اشٹال نے لڑکوں جوانوں اور معمر اشخاص کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے اسی قسم کے مضامین پر کتابوں کا ایک سلسلہ نکالا ہے جس کا نام "سلف اور سیکس سیریز" ہے - یہ کتابیں یورپ اور امریکہ میں خاص شہرت حاصل کر چکی ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ابتک فروخت ہو چکی ہیں - ڈاکٹر صاحب نے ایسے نازک مضمون پر جس کے بیان میں اگر ذرا بے اعتدالی ہو جائے تو فحش کی حد تک پہنچ جاتا ہے نہ دگانہ سنجیدگی کے ساتھ متانت آمیز پیرایہ میں بحث کی ہے - پنجاب ریلیجس بک سوسائیٹی نے اس سلسلے کی تین کتابیں ترجمہ کرا کے شایع کی ہیں جن میں سے یہ پہلی ہے - اس میں نباتات و حیوانات اور انسان کی خلقت - سلسلہ توالد و تناسل - اعضائے مخصوصہ کی ساخت اور اُن کا استعمال عورت مرد کی ضرورت یہ مدلل اور سائنٹیفک نظر ڈالی گئی ہے اور اُن خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو بُری صحبتوں میں رہکر لڑکے اپنے آپ میں پیدا کر لیتے ہیں اور پھر ان مذموم خصائل سے جو اخلاقی و روحانی و جسمانی نقایص ظہور پذیر ہوتے ہیں اُن کا تذکرہ نہایت موثر اور عام فہم طریقے پر ہوا ہے - جسمانی پاکیزگی پیدا کرنے اور طاقتور ہونے کے ذرایع اور فواید پر بسیط رائے زنی کی گئی ہے جسمانی تربیت میں غذا کو بڑا دخل ہے - ڈاکٹر صاحب نے اس کے متعلق جہاں اور بہت سی ہدایات درج کی ہیں وہاں نوعمروں کو چاء اور کافی کے استعمال سے منع کیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں خون کو جوش میں لاتی اور اُس میں حدت پیدا کرنے والی ہیں - تزکیۂ نفوس کے لئے ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے بہت صحیح ہے کہ

جس طرح تم غلیظ پانی اپنے منہ میں ڈالنا پسند نہیں کرتے ویسے ہی کتابوں یا اخباروں یا بیہودہ گفتگو کی غلاظت سے اپنے دل کو ناپاک نہونے دو -

آپ تواریخ - سوانح عمریوں - علوم و فنون کی کتابوں - سیر و سیاحت کے تذکروں اور اخلاقی و مذہبی مضامین کے دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن قصے کہانیوں اور واہیات و خرافات کتب کے مطالعہ کی سخت ممانعت کرتے ہیں - اسی طرح نیم برہنہ اور فحش تصاویر سے کمروں کی زینت بڑھانے کے آپ سخت مخالف ہیں - تفریحی مشاغل کی ضرورت کے قایل ہونے کے باوجود آپ کی یہ رائے ہے کہ کوئی شغل ایسا نہ اختیار کرو جو مذہباً - عقلاً اور اخلاقاً قابل اعتراض ہو یا جس سے فرایض کی بجا آوری میں ہرج واقع ہونے کا اندیشہ ہو - یقیناً کوئی ذی فہم اس سے اختلاف نہ کریگا -

لڑکپن کے بعد جوانی کا زمانہ آتا ہے اور یہ نہایت پر آشوب حصہ حیات انسانی کا سمجھا گیا ہے اس وقت ہر شخص کو اس قسم کی

ہدایات کی ضرورت یقینی ہوتی ہے جو نہایت تفصیل سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی دوسری کتاب

نوجوانوں کا رہنما

میں قلمبند کی ہیں۔ "لڑکوں اور نوجوانوں کے رہنما" میں نوعیت مضامین اور طرز استدلال کے اعتبار سے وہی فرق ہے جو لڑکپن اور شباب میں فی نفسہٖ ہو سکتا ہو۔ اس کتاب میں قابل مصنف نے ستیہٗ زندگی۔ ذاتی پاکیزگی۔ جسمانی کمزوری۔ عورت و مرد کے صحیح رشتے نکاح کی عظمت اہمیت انتخاب زوجہ اور اسی طرح کے کئی نازک مسئلوں پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ ناول خوانی۔ فحش تصاویر۔ شراب خواری۔ قمار بازی وغیرہ کی مذمت مثال کے ساتھ کی گئی ہے۔ سور کے گوشت کے استعمال سے ان الفاظ میں روکا گیا ہے۔

> تمھیں معلوم ہو جائیگا کہ جو آدمی سور کا گوشت کثرت سے کھاتا ہے وہ اپنے خون کو ضرور زہر آلود کریگا۔ بہتیرے امراض جو جسم کی جلد میں ہو جاتے ہیں وہ سور کے گوشت کھانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

اس سے بہت پہلے ایک یورپین عالم سائنس نے عملی تجربہ کے بعد معلوم کیا تھا کہ یہ کیڑے جو لحم خنزیر میں پائے جاتے ہیں بخلاف اور جانوروں کے گوشت کے اُبلنے اور پکنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ حال میں مصر کے نامور ماہوار رسالہ الہلال میں ایک مدلل نوٹ اس کے متعلق شایع ہوا ہے کہ یہ کیڑے گوشت کے ساتھ قوتِ ہاضمہ کے پردوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور نشو و نما حاصل کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ پیٹ سینہ اور دوسری جگہوں کے رگ اور پٹھوں میں سرایت کر جاتے ہیں ان سے ایک قسم کا خوفناک مرض "ترخینیا" پیدا ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں چاء۔ کافی۔ شراب یورپ کا تحفہ سمجھے جاتے ہیں اور جہالت سے ان کا استعمال فیشن میں داخل سمجھ لیا گیا ہے لیکن ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ جن چیزوں کو ہم بلا غور اختیار کر لیتے ہیں اُن کے متعلق خود اُن کے ملکوں کے اہل الرائے کیا رائے رکھتے ہیں جہاں یہ چیزیں رائج ہیں۔ مستورات کی پوزیشن پر اس کتاب میں جابجا روشنی ڈالی گئی ہو۔ اب تک عورتوں کے ساتھ بے انصافی جاری ہے۔ مرد اگر بدچلن ہو تو اسکو سوسائٹی اس قدر ذلیل نہیں سمجھتی لیکن عورت کی ایک معمولی سی معمولی لغزش اُسے ساری دنیا میں ذلت و طعن کا آماجگاہ بنا دیتی ہے۔ اس کو ڈاکٹر صاحب نے بھی محسوس کیا ہو اور کہتے ہیں کہ "وہ شخص بڑی سخت غلطی میں ہے جو عورتوں کی چال تو اعلیٰ درجہ کی نیک چاہتا ہے اور مردوں کی اپنی نہیں" آگے چلکر کہتے ہیں۔

> اب عورتیں باندیاں نہیں ہیں کہ بیویاں بننے کیلئے خریدی جائیں اور نہ اُن کی قدر اُن کے حُسن پر موقوف ہے۔ اُن میں قوائے عقلی ہیں اور اخلاقی زور اور اُنھیں برادری میں رسائی حاصل ہے اور اگر وہ چاہیں تو ایک ہی اخلاقی نمونہ جس سے اور بہتر خیال نہ کیا جاسکے مردوں اور عورتوں کے لئے پیدا کر سکتی ہیں۔

"انتخاب زوجہ" کے مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ جامع و مانع ہیں کہ

> بیوی چُننے وقت اس بات کی احتیاط کرو کہ تمہاری بیوی تمہاری ہم مزاج اور ہم شغل ہو۔ پہلی ضروری صفت بیوی کی یہ ہے کہ وہ خانگی کا انتظام خوش اسلوبی سے کرسکتی ہو۔

مستورات کے فرایض اور حقوق کا کچھ تذکرہ اس کتاب میں ہے اور اس سے زیادہ تفصیل اگر درکار ہو تو شوہر کا رہنما آپ کو مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس میں رشتۂ نکاح' معاشرتی ہدایات' مرد کے اعتدال پسندی کی ضرورت' عورت کے حقوق' ایام حمل' زمانۂ ولادت' وراثت' اور بچپن کے عنوان سے دلچسپ اور کارآمد نکتے مندرج ہیں۔ ان میں ہر ایک بجائے خود مشرح اور مفصل بیان کا محتاج ہے اور چند الفاظ سے اصل مطالب کا ذہن نشین ہونا ناممکن ہو۔ ہمارے خیال میں ان تینوں کتابوں کا مجموعہ ہر اہل آدمی کے پاس رہنا چاہیئے۔ اسکا مطالعہ مرد و عورت دونوں کیلئے یکساں ضروری اور مفید ہوگا۔

سید القلم

کوے یار

السلام اے ساکنانِ کوئے یار　ہو مبارک تم کو گلگشتِ جناں

کوچۂ جاناں ہے یا باغِ بہشت　یا پھلا پھولا ریاضِ بے خزاں

ہر در و دیوار رشکِ قصرِ خلد　بام پر ہے عرش و کرسی کا گماں

اللہ اللہ اوج و شانِ قصرِ یار　چھت سے جسکی پست سقفِ آسماں

چرخِ ہفتم سے بلند اس کی زمیں　صحن و دروازہ فضائے لامکاں

جھاڑ اور فانوس ہیں گر بحرِ نور　نور کی موجیں ہیں روشن بتیاں

قمقموں پر چاند سورج کا یقیں　بیل بوٹوں پر گمانِ کہکشاں

دن کو اُڑتے ہیں جو ذرے خاک کے　شب کو بنتے ہیں وہ نجمِ ضوفشاں

ہے دریچوں پر گمانِ بابِ خلد　چرخِ ہفتم ہے کہ اس کا سائباں

طاقِ محرابِ حرم ہیں پیش طاق　کعبۂ مقصود سنگِ آستاں

شاخِ گل پر گر عنادل نغمہ سنج　سرو پر نعرہ زناں ہیں قمریاں

چھوٹتے فوارے چشمے نور کے　کوثر و تسنیم ہیں جوے رواں

خار و خس پر سنبل و ریحاں فدا　لالہ و گل رشک روئے گل رخاں

ہے جو پھلواری لالہ و نسرین و گل　سبزے پر ہے سبز مخمل کا گماں

ہوتے ہیں مرغِ چمن جب نغمہ زن　ہیں بجاتی سبزہ بہتی تالیاں

ناز سے چلتی ہے جب بادِ سحر　جھومتی ہیں نخلِ گل کی ڈالیاں

خنجر و شمشیر کے چلتے ہیں وار　ہو رہے ہیں منچلوں کے امتحاں

کٹ رہے ہیں بے گناہوں کے گلے　خون میں ڈوبی ہے تیغِ خوں چکاں

لوٹتے ہیں خاک و خوں میں منچلے　کوئی بسمل ہے تو کوئی نیم جاں

خون میں ترتے ہیں سر مثلِ حباب　عاشقوں کے خون کا دریا رواں

ہے ہمہ تن کوئی محوِ انتظار　ہے کوئی مصروفِ فریاد و فغاں

سر بکف ہے کوئی شوقِ قتل میں　مرغِ بسمل کی طرح کوئی تپاں

ہیں پڑے اک سمت بیمارانِ ہجر　ہیں سسکتے ایک جانب خستہ جاں

شربتِ دیدار کا طالب کوئی　وصل کی لذت سے کوئی شادماں

صورتِ نقشِ قدم ہیں جاگزیں　ناتوانی سے ضعیف و ناتواں

محو و مستغرق خیالِ یار میں　غافل و بے خود ز فکرِ این و آں

کوئے جاناں سے یہ ٹلنے کے نہیں　خواہ ٹل جائیں زمین و آسماں

نفع و نقصاں کی ذرا پروا نہیں　ایک ہے ان کے لئے سود و زیاں

کیا لکھوں کوثر صفاتِ کوئے یار
ہے ثنا و مدح سے قاصر زباں

کوثر خیرآبادی

صبر

اے خوشا صبر ترا اوج خوشا تیری وفا　تو جسے ملتا ہے گویا اُسے ملتا ہے خدا

مرد وہ سر ہے تری اُلفت کا ہو سودا جس میں　آنکھ وہ آنکھ ہے جس میں کہ ہو تیرا جلوا

دل وہی دل ہے کہ جسمیں ہو محبت تیری　لب وہی لب ہے کہ جس لب پہ ہو تیرا مزا

تو وہ گل ہے کہ جسے خوف نہیں گلچیں سے　تو وہ گلزار ہے تا حشر رہے جس میں غنا

تو وہ ہے شمعِ ہدایت کہ نہیں گل ہوتی　نہ تو گلگیر کی پروا نہ صبا کا دھڑکا

تو وہ ہے نور کہ پر نور ہے تجھ سے ہر دل　کم ضیا سے ہے تری شمس و قمر نجم و سہا

رُخِ روشن سے ترے بدر کو نسبت کیا ہے　تو ہے مشہورِ جہاں اور وہ انگشت نما

تو وہ مے ہے کہ تصور سے ترے ہوتا ہے مست　کبھی میخانہ نہیں ڈھونڈھتا شیدا تیرا

تو وہ ہے گوہرِ نایاب نہیں جس کی نظیر　حد نہیں جسکی جہاں میں تو ہے ایسا دریا

تو وہ ہے درد کہ راحت کا مزا ملتا ہے　تو وہ ہے موت کہ تا حشر رہے مانندِ بقا

تجھکو اللہ نے بخشے ہیں مراتب ایسے　ملتی ہے تیرے ہی باعث رہِ تسلیم و رضا

زیب جس طرح زمانے میں ہے خاتم پہ نگیں　دلِ عارف میں اُسی طرح ہے تیرا نقشا

تھا بُرا حال زلیخا کا نہ ہونے سے ترے　چاک دامانِ قبا حضرتِ یوسف کا ہوا

آپ بدنام ہوا لیلیٰ بھی بدنام ہوئی　ساتھ تو دیتا جو مجنوں کا تو مارا پھرتا

تجھ میں ایسی ہے خداداد وہ برقی قوت　کہ بہت جلد دکھا دیتا ہے اپنا جذبا

تو نے یوں قلب میں صابر کے جگہ پائی ہو　　چشم میں جیسے نگہ دل میں خیالِ شعرا
تجھ سے مظلوموں کی امید لگی رہتی ہے　　دلِ غمگیں کا نہیں کوئی مگر تیرے سوا
منزلِ عشق تجھے لوگ کہا کرتے ہیں　　حق یہ ہے۔ معرفتِ حق کا ہے تو ہی زینا
تجھ میں ہیں رازِ خفی تجھ میں ہیں اسرارِ جلی　　کہیں پوشیدہ رہا تو تو کہیں جلوہ نما
صاف کہتا ہوں نہیں اس میں ہرگز کچھ فرق　　بال سے بھی تو ہیں کم سب تری راہیں خدا
تیری الفت نہیں لوہے کے چنے سے کچھ کم　　حق یہ ہے تیری محبت کا کڑا ہے سودا
تیرے باعث سے ہوا حضرتِ ایوب کا نام　　دوست اپنا تجھے سب رکھتے تھے خاصانِ خدا
یہ ہیں اوصاف ترے یہ ہے ستایش تیری　　زیرِ شمشیر بھی تجھکو نہیں کوئی بھولا

تجھ میں دو لطف ہیں واللہ بقولِ شاعر
صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

ماہ عظیم آبادی

قیل و قال

کہا بختی ہے مجھکو ہجر کی تم نے مصیبت کیا　　تو فرمایا کہ ناداں وصل کی بے ہجر لذت کیا
کہا یہ دل سی شے کیا مفت اڑا لیجاؤ گے صاحب　　تو فرمایا یہ جنسِ بے بہا ہے۔ اسکی قیمت کیا
کہا دل تو لیا ہے جان بھی لے دلربا لے لے　　تو فرمایا ملے پھر دلربائی میں حلاوت کیا
کہا یہ مجھ سے وعدہ کرکے جانا غیر کے گھر یہ　　تو بولے تو ہے جب میرا تو پھر غیروں سے صحبت کیا
کہا تم نے کبھی بخشا نہ ہمکو ایک بوسہ بھی　　تو بولے نامرادی پا نئی ترے لب نے نہ لذت کیا
یہ کی عرض آپ پر مرتے ہیں ہم اور آپ غیروں پر　　ہوا ارشاد لے ناداں محبت میں رقابت کیا
کہا اب ہجر میں جاں لب پہ آئی ہے تو فرمایا　　جو ہر دم دل میں ہو کیا اسکا وصل اور اسکی فرقت کیا
کہا بوسہ نہیں دیتے۔ نہ دو۔ دو گالیاں ہی دو　　کہا تیرے مزے کو ہم بگاڑیں اپنی عادت کیا
کہا عاشق پہ اپنے یہ ستم تو ہنس کے فرمایا　　ہے زیبا دعویٔ الفت پہ یہ شکوہ شکایت کیا
کہا تیغِ ادا نے قتل کر ڈالا تو وہ بولے　　کروگے فوجداری تم چڑھاؤگے عدالت کیا
کہا تم سا نہ دیکھا بیوفا کوئی زمانے میں　　تڑق کر بولے پھر تو کہئے؟ فرمایا یہ حضرت کیا

کہا مرتا ہے تیرے عشق میں کیفی تو فرمایا
مَیں کیا جانوں کسے کہتے ہیں عشق اور ہے محبت کیا

یہ کی فریاد اب روکے نہیں رکتی فغاں میری　　تو بولے کرچکا ہے کیا تو کم رسوائیاں میری
کہا شکووں کے دفتر کھولدوں گر میں تو پھر کیا ہو　　تو بولے مت خدا کیواسطے کھلوا زباں میری
کہا یہ گرمجوشی غیر سے جی کو جلاتی ہے　　تو بولے جانتے ہو تم تو ٹھنڈی گرمیاں میری
شکایت کی رقیبِ روسیہ سے وعدے ہوتے ہیں　　کہا تم جانتے ہو۔ ہے نہیں سے بڑھکے ہاں میری
کہا جب حشر میں پکڑونگا دامن تو مزا ہوگا　　کہا کوئی نہ ہوگا کیا حمایت پر وہاں میری
کہا اے بت خدا ہوتا تو کیا جانے تو کیا کرتا　　کہا چپ رہ نہ روکیں رہ کہیں کر دو بیاں میری
کہا جی اٹھیں گر تم اک نظر دیکھو تو فرمایا　　یہ ابرو تو ہے خنجر اور مژہ نوکِ سناں میری

کہا کیفی کے جان و دل پہ کچھ تو رحم فرماؤ
تو بولے وہ تو کہتا تھا نہ دل میرا نہ جاں میری

کیفی دہلوی

سوزِ محبت

اے محبت! ہے غضب داغِ ولا کی گرمی　　اُف ری گرمی کہ یہ گرمی ہے بلا کی گرمی
آہ ہر دم دلِ بیتاب پھکا جاتا ہے　　آگ پر صورتِ سیماب اُڑا جاتا ہے
کروٹیں لیتا ہے یا سیخ پہ بریاں ہے کباب　　خون جلتا ہے مرے دل کا کہ جلتی ہے شراب
استخوانوں سے ہے شعلوں کی لپک اف ری تپش　　اٹھتی ہے قلب میں رہ رہ کے چمک اف ری تپش
کسی کروٹ کسی پہلو کبھی آرام نہیں　　اب یہ ہے حال کہ ہم صبح نہیں شام نہیں
آہ کرتے ہیں نہ فریاد و بکا کرتے ہیں　　شمع ساں شام سے تا صبح جلا کرتے ہیں
میری تقدیر ہے یا قسمتِ پروانہ ہے　　تو ہے یا شمعِ جمالِ رخِ جانانہ ہے
دل جلانے کا ہر انداز تری بات میں ہے　　آتشِ حسن تری آگ مساوات میں ہے
آفتیں ڈھاتا ہے جلوہ ترا کیا کیا بنکر　　پھونکدیتا ہے جگر برقِ تجلی بنکر
بجلیاں خرمنِ دل کو ہیں نگاہیں تیری　　دامنِ جلوہ گہِ حسن ہیں راہیں تیری
ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے نظارا تیرا　　اور ہر سنگ میں پنہاں ہے شرارا تیرا

کششِ حسن اثر اپنا جو دکھلاتی ہے　　دل کے مانند رگِ سنگ پھڑک جاتی ہے
تیری ہی آگ کا اخگر ہے شرارِ ہستی　　تیرے ہی پھول سے عالم میں بہارِ ہستی
لذّتِ مائدۂ درد و الم ساز میں ہے　　سوز کا لطف ترے شعلۂ آواز میں ہے
رونقِ انجمنِ اہلِ صفا تجھ سے ہے　　اور بہارِ چمنِ اہلِ صفا تجھ سے ہے
چاند سورج میں ستاروں میں ہے جلوا تیرا　　ان چراغوں کو جلاتا ہے شرارا تیرا
حسن اسرار ہے پوشیدہ نمایش میں تری　　صورتِ شعلہ زباں لال ستایش میں تری
جو تری آگ میں جل جل کے بھسم ہوتے ہیں　　وہی اُس شاہدِ مقصد سے بہم ہوتے ہیں
درس یہ ہم نے لیا دہر میں پروانوں سے　　مے اُڑائی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں سے

خاک ہونے پہ بھی رتبے نہ کبھی کم ہوں گے
سرمۂ چشمِ تمنّائے جہاں ہم ہوں گے

سلام حیدرآبادی

سیتا جی کا باپ

(اشوک بن میں)

طرب انگیز ہے اشوک بن کی شام نورانی　　صبائے روح پرور کر رہی ہے عطر افشانی
مزیّن دامنِ صحرا ہے خود رو بیل بوٹوں سے　　تنِ کہسار کی زینت ہے سبزے کی قبا دھانی
برستا ہے فلک سے نور فرشِ خاک روشن ہے　　زمیں کو بخش دی ہے ماہ نے اپنی درخشانی
چراغِ صبح ہیں روشن ستارے اوجِ گردوں پر　　مہِ تاباں کے آگے بھر رہے ہیں شرم سے پانی
کہیں محوِ تماشائے قمر سرخاب صحرا میں　　کہیں رم خوردہ آہوئے بیاباں گرمِ جولانی
جو گل مرجھا چلے تھے حدّتِ خورشیدِ رخشاں سے　　وہ ٹھنڈی روشنی میں ہو گئے پھر خندہ پیشانی
بھری ہیں کو بکو رنگینیاں پھولوں کے دامن میں　　دیا ہے صانعِ قدرت نے سب کو حسن لاثانی
وہ ہر ہر برگ پر گلکاریاں ہیں کلکِ قدرت کی　　کہ ہے غوّاصِ بحرِ فکر جن سے فہمِ انسانی
پلٹتی ہیں نگاہیں دامنِ نظارہ بھر بھر کر　　گل و غنچہ سے ہے پیدا و پنہاں شانِ یزدانی
زبانِ حال سے شاہد ہے شادابی درختوں کی　　ہوا ہے فصلِ گل میں عام فیضِ ابرِ نیسانی
قیامت ہے سرِ صحرا بکھرنا زلفِ سنبل کا　　کہاں گیسوئے پیچاں میں یہ اندازِ پریشانی
گلِ خنداں ہیں محوِ خوابِ راحت شاخِ گلبن پر　　ملی بادِ صبا کو خدمتِ گہوارہ جنبانی
کسی کے چاند سے چہرے کا آئینہ میں پرتو ہے　　کہ ہے آبِ مصفّا میں یہ عکسِ ماہ نورانی
فضائے دشت ہے رنگیں مرقعِ حسنِ قدرت کا　　سرور افزا سماں ہے قاطعِ آلامِ روحانی
یہ دلکش سین ہے۔ اور یہ سہانا وقت ہے لیکن!　　سکوتِ شب میں سرگرمِ فغاں ہے ایک زندانی

سراپا یاس کی صورت مجسّم نقشِ حیرانی　　کھڑی ہیں سرنگوں۔ زیرِ شجر۔ سیتا مہارانی
پریشاں تا کمر ہیں موئے سر بیگانہ تزئیں　　لباسِ جوگیا ہے پردہ دارِ جسمِ نورانی
برستا ہے ملالِ دلنشیں مغموم چہرے سے　　نگاہِ مضطرب ہے ترجمانِ دردِ پنہانی
ہجومِ دود میں پنہاں ہو جیسے شعلۂ آتش　　نہاں الجھے ہوئے بالوں میں ہے یوں نورِ پیشانی
قدِ موزوں جو تھا بوٹا سا اعضا کے تناسب سے　　نظر آتا ہے اب کاہیدگی سے سروِ طولانی
ہوئی ہے نذرِ اشکِ غم چمک پُر نور آنکھوں کی　　نگاہوں سے عیاں ہے دیدۂ نرگس کی حیرانی
خلش افزا ہے نوکِ خارِ حسرت قلبِ نازک میں　　جگر پر نیشتر زن ہے خیالِ خانہ ویرانی
ہوئی ہے تیرہ روزی سے یہ حالت قیدِ ظلمت میں　　گہن میں جس طرح ہو چودھویں کا چاند نورانی
تھپیڑے کھا کے موجوں کے کنول بدروپ ہو جیسے　　ہوئی تاراجِ غم یوں روئے روشن کی درخشانی
ستم ہے گردشِ قسمت نے یوں ڈالا ہے چکر میں　　پڑے گرداب میں جیسے کوئی کشتیِ طوفانی
ہجومِ بیکسی ہے ہمنفس کنجِ اسیری میں　　شریکِ قید تنہائی ہے۔ انبوہِ پریشانی
پرندہ پر بھی مارے یہ کسی صورت نہیں ممکن　　درِ زنداں پہ صد ہا راکشش کرتے ہیں دربانی
خیالِ رام لیکن لطف فرما ہے اسیری میں　　یہی کرتا ہے زنداں میں نوازشہائے پنہانی
بسی رہتی ہے ہر دم رام کی تصویر آنکھوں میں　　اسی کے نور سے آنکھیں ہیں سیتا جی کی نورانی
زبس بیتاب ہیں قیدِ گراں میں دردِ فرقت سے　　لبِ فریاد سے یوں کر رہی ہیں گوہر افشانی

یہ کیا نیرنگ ہے۔ اے انقلابِ عالمِ فانی　　کہ آزادِ ازل ہیں گردشِ دوراں سے زندانی
جو پھولوں میں تلیں۔ اُف! یوں گھٹے جائیں کانٹوں میں　　شگفتہ دو شونکے حق میں بارِ خاطر ہو گرانجانی
یہ کن کرموں کا بدلا لے رہا ہے۔ او فلک مجھ سے　　یہ کن پاپوں کے کارن ہوں گرفتارِ پریشانی
پڑی اُفتاد کیا ایسی بُرے دن آئے ہیں جس سے　　ہوئی ہے نقشِ باطل کیوں مری تحریرِ پیشانی

برسات

انڈین پریس الہ‌آباد

خیال و خواب میں بھی تو نہیں چھوڑا ستی پن کو　　کبھی مَیں نے نہیں کی۔ بھولکر بھی کوئی نادانی
غضب ڈھایا اکیلا پاکے مجھکو دشٹ راون نے　　دیا دھوکا۔ خلافِ رسم آئینِ جہانبانی
پتی ورت دھرم سے لیکن گرا سکتا نہیں مجھکو　　میں ستونتی ہوں مَیں کر کے رہونگی اپنی من مانی
زمین و آسماں زیر و زبر ہو جائیں ممکن ہے　　مگر یہ غیر ممکن مَیں بنوں۔ لنکا کی پٹرانی
مرا قابو میں لانا اس نے کوئی کھیل سمجھا ہے　　مجھے مکّار نے جانا ہے کیا مندودری ثانی
میَں ہوں عصمت کی دیوی مجھسے کیا نسبت ہے اُسکو　　نہیں یکجا بہم ہو سکتے ہرگز آگ اور پانی
سری رگھنا تھ جی ہیں پرتش اور میں اُنکی چھایا ہوں　　ازل کے دن سے ہے میرا تعلق جسمی و جانی
لگا دو ناتھ بیڑا پار مجھ چرنوں کی داسی کا　　پڑی منجھدھار میں ہے اب مری کشتیٔ طوفانی
تمہاری ذات سے وابستہ اُمیدِ کشایش ہے　　تمھیں پر منحصر ہے عقدۂ مشکل کی آسانی
جھمایئے مرے اپرادھ درشن دیجیے مجھکو　　کہ تم مریادا پرشوتم ہو میں سیتا ستی رانی

وہ دن آئیگا جس دن مجھکو سونے کی گھڑی ہوگی
کہ پھر ہم دونوں دیکھیں گے اودھ کی شام نورانی

برق دہلوی

تصویر صحرا نشین

یہ اندازِ تفکر یہ لبوں پہ مُہرِ خاموشی　　یہ راہِ عشق میں لے دوست تیری خود فراموشی
ہے کس لیلیٰ کے غم میں اس قدر اندوہ گیں مجنوں　　یہ سجادہ نشینیٔ دشت کی اچھی نہیں مجنوں
ترس کھایا نہ اپنی جان پر فرقت زدہ تو نے　　بگاڑا گھر بنایا دشت کو غربت کدہ تو نے
نہ اسبابِ تعیش ہیں نہ سامانِ تن آسانی　　سراپا حسرت و اندوہ ہے صورت کی حیرانی
لبِ لبستہ ترے خود شاہدِ اندوہ پنہاں ہیں　　نمایاں کاغذی تصویر سے سو رنج و حرماں ہیں
ترے بیساختہ پن پر ہزاروں بانکپن صدقے　　مرے صحرا نشیں پر سو جوانانِ چمن صدقے
ہیں کانٹے جمع تیرے آس پاس اے میرے دیوانے　　کہ اک شمعِ لگن کے گرد ہیں دلسوز پروانے
گری ہے کس کی برقِ حسن تیری جان پر آخر　　ہوا کیوں شیشۂ دل چور کیوں خستہ جگر آخر
جلایا خرمنِ ہستی ترا کس آتشیں رُخ نے　　کیا وارفتہ کس بیدرد نے نور آفریں رُخ نے
بری حالت بنائی ہے یہ کیوں اے ہمنفس تو نے　　نہ کھایا کس لئے اپنی جوانی پر ترس تو نے
جنوں سے چاک تیرے جسم پر ہے پیرہن ہمدم　　ہوئی ہے تجھ سے تازہ قیس کی رسمِ کہن ہمدم
برہنہ سر ہے۔ کانٹے پاؤں میں ہیں چاک داماں ہے　　نہ کوئی لطف کی شے ہے نہ کچھ راحت کا ساماں ہے
اُٹھی ہے ٹیس دل میں یا چبھا ہے خار تلوے میں　　یہ اُنگلی کیوں دھری ہے کچھ تو ہے آزار تلوے میں
یہ کیا صدمہ ہے آخر کیوں شکن آئی ہے چہرے پر　　اُڑا کیوں رنگ زردی کس لئے چھائی ہے چہرے پر
یہ تنہائی کا عالم اور یہ وحشت بیاباں کی　　یہ دن بے نور شب دیجور یہ ہیبت بیاباں کی
درندوں کا نہ ڈر تجھکو نہ سائے کا خطر دل میں　　کسی کے حُسنِ عالمگیر کی دُھن ہے مگر دل میں
نہ مجمع ہے عزیزوں کا نہ جھرمٹ اہلِ اُلفت کا　　نہ کوئی ہے شریکِ حال اس غم اس مصیبت کا
نہ قالینِ مکلف ہے نہ بسترِ یا چٹائی ہے　　بساطِ خاک پر جوگی نے کیا دھونی رمائی ہے
جنونِ عشق کی خاطر امارت سب گئی ساری　　ہوئی اک نوجواں کی وحشتِ دل کے سبب خواری
لباسِ پُر تکلف سے تنِ پُر گرد عاری ہے　　کہ عاشق کیلئے پوشاک بہتر خاکساری ہے
مگر اللہ ری یہ بے نیازی حسن و اُلفت کی　　تمنا ہے نہ دولت کی نہ عزت کی نہ زینت کی
ہتیلی پر جو سر رکھا یہ محویت کا عالم ہے　　سکوتِ روز و شب یہ شاہدِ صدمات پیہم ہے
کرے کیا کوئی جا کر دشت میں اظہار ہمدردی　　سرِ شوریدہ اُس کا کب اُٹھائے بار ہمدردی
معین ہو کون تجھ آوارۂ راہِ محبت کا　　کہ او دلگیر تو مارا ہوا ہے اپنی شامت کا
جو گھٹنے پر ترے لے دوست کہنی کا سہارا ہے　　اسی سے کثرتِ افکار کا حال آشکارا ہے
معینِ دینِ قیس اب تو ہی باقی ہے زمانے میں　　مزا لیلیٰ وشوں کو ملتا ہے تیرے فسانے میں
خدا حافظ ترا محوی دعائے خیر کرتا ہے　　ملے وہ گل تجھے بلبل صفت تو جس پہ مرتا ہے

ادائے عاشقی طرزِ وفا کوشی مبارک ہو
تجھے دنیا کے جھگڑوں سے فراموشی مبارک ہو

محوی لکھنوی

سخن و سخنور

جس کو کہتے ہیں سخن الہام ہے　　گو سخن اسکا بظاہر نام ہے
ہے بہت عالی سخن کا مرتبہ　　اللہ اللہ اہل فن کا مرتبہ
فیض پاتے حق سے ہیں شاعر مدام　　ہیں یہ شاگردانِ ایزد لا کلام

طور پر اترا تھا یہ فیضِ کریم　　ہو گئے جو حضرتِ موسیٰ کلیم
ورنہ لکنت سے ہو پر جس کی زباں　　ہو سخن کی اُسمیں کیا تاب و تواں
سب صحابہ۔ کُل آئمہ لا کلام　　شعر گو سب تھے نہیں شک کا مقام
فیضِ حق کا معجزہ اشعار ہیں　　اکثر اسکے درک سے ناچار ہیں
سادہ کاغذ ہاتھ میں ہمنے لیا　　لیکن اس کو ایک دم میں بھر دیا
اب کہاں سے یہ مضامیں آ گئے　　صفحۂ قرطاس پر جو چھا گئے
ہے یہی پر تو بس اُس الہام کا　　نام جس کا شعر شاعر نے رکھا
شاعر و ہے شعر کا رتبہ بڑا　　اسکا جھنڈا ساری دنیا میں گڑا
اسکا ہر میداں میں ہی مرکب رواں　　اسکا شہرہ از زمیں تا آسماں
گر لکھیں توحید میں ہم۔ کیا عجب　　شعر خود بن جائے بخشش کا سبب
حضرتِ جامی جو تھے اہلِ کمال　　اُن سے راضی ہو خدائے ذو الجلال
نکتۂ نادر ہمیں بتلا گئے　　شعر کی تعریف یوں فرما گئے

شاعری جزو یست از پیغمبری
جاہلانش کفر خوانند از خری

حمید میرٹھی

گلاب کا پھول

سبز ٹہنی پہ اک گلاب کا پھول　　یوں شگفتہ ہے جیسے غنچہ دہن
ٹہنی، یا شاخ ہے زمرد کی　　پھول، یا ہے کوئی عقیقِ یمن
شاخ سرسبز نخلِ طور ہے گر　　پھول ہے شمعِ وادیٔ ایمن
قد ہے بوٹا عروس کا جو نہال　　پھول کو کہئے پھر رُخِ دُلہن
پھول اور اُسپہ قطرے شبنم کے　　عرق آلودہ عذارِ دمن
شاخ پر پھول، یا ہے مہرِ سحر　　نخل خضرا ہے، یا یہ چرخِ کہن
گُل بھبوکا سا ہے، مگر مُکھڑا　　پری اک سبز ہے نہالِ چمن
شاخ، فیروزے کی چھڑی ہے یا　　گل ہے، یا اُسپہ سام لعلِ ختن
شاخ کو کہئے بھی اگر مینا　　گُل کو کہئے شراب کا برتن
پھول ساغر ہے اک چھلکتا سا　　شاخ ہے، دستِ ساقیٔ پُر فن
پنجشاخے سے شاخ، کیا مانا　　گُل زیادہ چراغ سے روشن
گل ہے نافہ، کہ رشکِ نافہ ہے　　شاخ کو کہئے کیسے شاخ ہرن
گل کو کہئے دوات یاقوتی　　شاخ ہے، خامۂ زبرجد تن
نونہالِ چمن بُتِ ہندو　　صندلیں قشقہ، گُل گلشن
دہنِ سُرخ سُرخِ شیریں گل　　شاخ، لیلائے سبز پیراہن
گوش ہی گل، تو زیرہ کان کی کیل　　سبز آنچل ہے برگ، گُل جوبن
گر دہن گُل ہے، برگ گل لب ہیں　　شاخ قامت ہی، پتے ہیں دامن
ساعدِ سبزہ رنگ ہے، یا شاخ　　پھول، یا کوئی ہے یہ سیبِ ذقن
ہو نہ کیوں گرمیٔ بہارِ چمن　　زیرہ چنگاری ہے، تو گُل گلخن
باد و باراں سے اوس سی پڑ جائے　　یہ وہ آتش نہیں ہے، مشفقِ من
پنکھڑی پنکھڑی ستارہ ہے　　گُل ہے غیرتِ دہِ نجومِ پرن
شاخ میں کیسی ہے، دل آویزی　　گُل میں کیسی ہے دلفریب پھبن
شاخ ہے، یا کھڑا یہ کالا ہے　　گُل ہے، یا اُسکے منھ میں ہی یہ من
گل و گلبُن کے حُسن و خوبی پر　　شیفتہ حوریانِ باغِ عدن
لااُبالی مزاج، بلبل بھی　　عشقِ گل میں ہے وقفِ صد شیون

شوق میں آج شاہدِ گُل کے
لااُبالی بھی تو ہے گرمِ سخن

فضل ستار لااُبالی

لوری

او بہ پالے سوجا سوجا　　نازکے پالے سوجا سوجا
ہمت والے سوجا سوجا　　چیزی کھالے سوجا سوجا
بھولے بھالے سوجا سوجا

سوڈا لیمن جنجر دوں گی   کھیل کھلونے اکثر دوں گی
ہاتھی گھوڑے بندر دوں گی   چلتی پھرتی موٹر دوں گی

بھولے بھالے سوجا سوجا

صورت تیری بھولی بھالی   قدرت نے سانچے میں ڈھالی
رُخ پہ زلفیں گھونگروالی   نازانوکھے بات نرالی

بھولے بھالے سوجا سوجا

میری آنکھ کا تارا تو ہے   میرا راج دُلارا تو ہے
سارے گھر کا پیارا تو ہے   راحتِ جان ہمارا تو ہے

بھولے بھالے سوجا سوجا

جب تو جنٹلمین بنے گا   میرے دل کا چین بنے گا
سب کا نورالعین بنے گا   علم و فن کا زین بنے گا

بھولے بھالے سوجا سوجا

بی اے ایم اے پاس کریگا   ایل ایل ڈی کی آس کریگا
جج بنکر اجلاس کریگا   ظلم و ستم کا ناس کریگا

بھولے بھالے سوجا سوجا

ہمت میں شیر افگن ہونا   مثلِ جان نکلسن ہونا
سوبر بنکر روشن ہونا   سر اسحاق نیوٹن ہونا

بھولے بھالے سوجا سوجا

دُور دُور ہو شہرت تیری   گورنمنٹ میں عزت تیری
نیکی کی ہو عادت تیری   بڑھے رات دن دولت تیری

بھولے بھالے سوجا سوجا

قوم کا بیڑا پار لگائے   سرسید احمد بن جائے
ہموطنوں کے کام بنائے   ملک کی خاطر جان کھپائے

بھولے بھالے سوجا سوجا

یہ حسرت ہے ایسا دیکھوں   تیرے سر پہ سہرا دیکھوں
دولھا دُلہن کا جوڑا دیکھوں   گود میں ننھا بچہ دیکھوں

بھولے بھالے سوجا سوجا

گلشن میں شمشاد رہے تو   عالم میں آزاد رہے تو
شاد رہے آباد رہے تو   ہردم ہمکو یاد رہے تو

بھولے بھالے سوجا سوجا

عمر بھی تیری لاکھ برس ہو   پاک رہے بے حرص و ہوس ہو
دُکھیاروں پر رحم ترس ہو   اور خلیق و نیک نفس ہو

بھولے بھولے سوجا سوجا

خلیق دہلوی

قطعہ تاریخ

در تہنیت سرفرازی منصب جلیلہ مدار المہامی مملکت دکن بجناب مستطاب والا اتطاب صدر اعظم دستورِ معظم عالیجناب نواب میر یوسف علیخاں سالار جنگ بہادر دام اقبالہم و ضاعف اجلالہم

ہر گھر میں ہے آج کیوں مسرت   پائی اب وجد کی کس نے خدمت
یہ لطف خدا نہیں تو کیا ہے   ہاتھ آئی شباب میں وہ دولت
ہر وقت ہے جس میں ذمہ داری   ہر بات میں چاہیئے ہے حکمت
کل ملک پہ حکمراں ہوئے ہیں   وابستہ ہے ہر بشر کی قسمت
لازم ہے ہر اک کی پاسداری   زیبا نہیں فرقِ قوم و ملت
ہے عدل ثمر و زیرِ شاخیں   سلطان ہے شجر تو جڑ رعیت
جس طرح ہوئے بزرگ ان کے   ہر ملک میں آجتک ہے شہرت
یہ نام کریں اُسی طرح سے   حاصل ہو وہی جہاں میں عزت
دکھلائیں جہاں میں عقل و دانش   تسلیم کرے ہر ایک لیاقت
راضی رہیں بادشاہ دل سے   گرویدہ ہو ملک بھر کی خلقت
ہر سمت سے آئیں یہ صدائیں   بے مثل ہے انتخابِ حضرت

ہر پھر کے اسی کے گھر پہ پہنچی
دیوانی نے پائی جس سے عزت

یوسف کو علی سے ہاں ملا لو
گر نام کی تمکیہ ہے ضرورت

تاریخ کی فکر کر رہا تھا
احباب کو تا کہ ہو مسرت

کس لطف سے دو کا تجربہ ہے
دو دن رہی اور و نکی حکومت

آئی یہ ندائے غیب ماہر
حقدار کو شہ نے دی وزارت

ماہر کنتوری

بیر بہوٹی

لے مرے چھوٹے سے کیڑے کچھ کہے جا اپنا حال

کس کی دھن ہے کیوں نہیں میری طرح تجھکو قرار
ہٹ جا اکدم ابھی تجھے کر لوں لگا سینہ سے پیار

اپنے قلب خوں چکاں کی آہ تجھیں ہے مثال

دلربا ہے غنچۂ گل ساں ترا رنگِ جمال

خوشنما ہے کس قدر تیری شبیہ طرحدار
تیری نرمی پر گلابی شرم سے ہیں خدِ یار

خونِ شیدائی کا کرتی ہے یہ تیری سُرخ شال

لائی تجھکو بہر زیبائیش عروسِ برشکال

سُرخ بیندی سے فزوں کرنے کو چہرہ کی بہار
آہ یہ منظر ترا خوش کن یہ جوشِ سبزہ زار

ہیں خطِ گلزار کو موزوں یہ نقطے لال لال

آ۔ اٹھالوں آہ ساکت ہو گئی تو شکلِ خیال

یہ محبت سے مرا لینا ہے تجھکو ناگوار
چھوڑ دوں اچھا ستاؤں گا نہ تجھکو زینہار

جا زمیں پر کھیل خوش خوش ہاتھ پیر اپنے نکال!

دور ہی سے دیکھ لوں میں حسن کا تیرے کمال

محو ہو کر بس کروں دل ہی میں وصف کردگار
دیکھ لوں جی بھر کہ دورِ ہستیِ ناپائدار

آہ دکھلائے گا پھر تیری نہ صورت ایک سال

یوں اکڑ کر چل نہ اے رہروِ قدم رکھ دیکھ بھال!

خوں نہ ہو جائے کسی معصوم دل کا ہوشیار!
اس قدر ہو جن پہ ہر دم شفقتِ پروردگار

یوں حقارت سے انھیں دیکھے بشر کی یہ مجال!

اقبال ورما سحر

برسات

کوچ گرمی کا ہوا آئی ہوا برسات کی
بڑھ گیا مستوں کا دل اُٹھی گھٹا برسات کی

بادہ نوشوں کو مبارک ہو فضا برسات کی
سال بھر کے بعد پھر آئی گھٹا برسات کی

لے اُڑی برسات کو ٹھنڈی ہوا برسات کی
برق سے قیمت چمک اُٹھی سوا برسات کی

ہو گیا کافور اُسکے فیض سے سوزِ جگر
کارِ مرہم کر گئی ٹھنڈی ہوا برسات کی

سو گئے گرمی کے مارے پھول پھل پتے ہرے
ہے مسیحی معجزہ تم کا گھٹا برسات کی

سیپیوں کے بھر دیئے دامن دُرِ نایاب سے
ابرِ نیساں کی طرح برسی گھٹا برسات کی

شور کرتی جھومتی چنگھارتی للکارتی
مست ہاتھی کی طرح آئی گھٹا برسات کی

کھل گیا رحمت کا در جو سال بھر سے بند تھا
پھر گئی ہر سو دوہائی واہ وا برسات کی

کچے دھاگے کی طرح زاہد نے توبہ توڑ دی
جب اُسے آئی نظر اودی گھٹا برسات کی

چھپ گیا خورشید ڈر کر بادلوں کی آڑ میں
شکل کالی دیکھکر کالی گھٹا برسات کی

ابر کے رنگین ٹکڑے ہیں فلک پر یا کہ آج
پھول جنت سے اُڑا لائی ہوا برسات کی

باغ میں جھولے پڑے ہیں جھولتے ہیں مہ جبیں
جھوٹے دم لے لیکے دیتی ہے ہوا برسات کی

دیکھنا کس دھوم سے اُٹھی ہے آندھی کی طرح
کب سے بیٹھی تھی بھری جانی گھٹا برسات کی

آگ کی ہمیں ضرورت ہے تو اسمیں برف کی
جاڑے گرمی سے نرالی ہے فضا برسات کی

آج ابرِ فکر سے برسا کے نظمِ آبدار
مہر نے دل کھول کر باندھی ہوا برسات کی

سکھ دیو پرشاد مہر

تصحیح۔ جولائی ۱۹۱۲ء کے ادیب کے صفحہ ۹۴ کی نظم میں حضرات بجائے اس مصرعہ کے ع۔ رنگِ سخن سے فق ہوا چہرۂ رنگ ریزِ چرخ۔ ذیل کا مصرعہ پڑھیں اور تحریر فرمالیں ع۔ تیغِ قلم سے زیر ہے فطرتِ پُر ستیزِ چرخ۔

ایڈیٹوریل

مشرقی زبانوں کی ترقی کی تحریک گذشتہ چند سال سے ہندوستان کی کلاسیکل زبانوں کی ترقی کا سوال گورنمنٹ ہند کے سامنے ہے۔ شملہ پر جو مشترقین کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اُسکا مقصد بھی یہی تھا۔ حال میں گورنمنٹ ہند کے جائنٹ سکرٹری نے پنجاب گورنمنٹ کے تعلیمی سکرٹری کے نام ایک مراسلہ بھیجا ہے جس سے اس معاملہ پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ اس مراسلہ سے چونکہ ہندوستان کی آیندہ اُمیدیں وابستہ ہیں، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکا ضروری حصہ عوام کی آگاہی کے لئے یہاں نقل کردیا جائے :۔

.... میں یہ بھی ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ گورنمنٹ ہند اس ملک کی قدیم تعلیم اور کلاسیکل زبانوں کی حفاظت کو نہایت ضروری خیال کرتی ہے۔ مشترقین کی کانفرنس کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ جس طرح ہنوئی میں مشرقی زبانوں کی حفاظت کے لئے ایک اسکول قایم ہے اُسی کے نمونہ پر ہندوستان میں بھی ایک سنٹرل ری سرچ انسٹی ٹیوٹ کھولا جائے۔ چونکہ موجودہ یونیورسٹیاں مشرقی زبانوں کی ترقی کی ضرویات کو پورا نہیں کرسکتیں اسلئے یہ اشد ضروری ہے کہ مذکورہ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ایک اعلیٰ پیمانہ کی لائبریری بھی کھولی جائے جس سے تمام ہندوستان کے طلبہ مستفیض ہوسکیں۔ اس نئے بیت العلوم کا تعلق ہندوستان کی جملہ یونیورسٹیوں اور علمی مرکزوں کے ساتھ یکساں ہو۔ تبادلۂ خیالات کی غرض سے اس انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر وقتاً فوقتاً جملہ کالجوں میں جاکے لکچر دیا کریں۔ انسٹی ٹیوٹ میں اعلیٰ پایہ کے یوروپین اور دیسی پروفیسروں کے علاوہ چند خاص لکچرار بھی تعین کئے جائیں۔ طلبہ کو مناسب وظایف دیئے جائیں، تب اُمید ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ ایسے ہندوستانی بھی پیدا ہوجائیں گے جو ہر طرح پر اپنی ضروریات کو مکمل کرسکیں گے، اور تاریخ قدیم وصنا دید خاص کی تحقیقات کرنے والے مدارس (اسکول آف آرکیالوجی) کی بنیاد رکھیں گے، اور مختلف مقامات میں یونیورسیٹیوں اور کالجوں میں خاص ایوان تفحص (ری سرچ روم) قایم کریں گے۔ گورنمنٹ ہند نے اسی قسم کا ایک انسٹی ٹیوٹ کھولنے کے لئے صاحب وزیر ہند سے سفارش کی ہے۔

شملہ کانفرنس کی رائے میں اگر پُرانے پنڈت اور مولوی معدوم ہوگئے تو اس سے ہندوستان کی علمی دُنیا کو بڑا بھاری نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ لہذا مناسب ہو کہ ترقی زبان کے خیال سے ان لوگوں کی سرپرستی وحوصلہ افزائی کیجائے اور پُرانے طاق پر تعلیم دینے والے مدارس کے چند فارغ التحصیل بزرگوں کو طریق جدید کے مطابق تحقیق وتدقیق (ری سرچ) کی تعلیم دی جاے ..... کانفرنس کی رائے میں مندرجہ ذیل طریق مشرقی زبانوں کی ترقی کے لئے مستحسن ہوگا:۔

(۱) سنسکرت کالجوں، مدرسوں، پاٹھ شالاؤں، مکتبوں اور ایسی ہی دیگر انسٹی ٹیوشنوں کو سرکاری امداد دی جائے۔

(۲) یہ امدادی رقم اعلیٰ پایہ کے اسٹاف کی تنخواہ اور طلبہ کے وظایف میں خرچ کی جائے تاکہ طالب علم حتی الامکان اعلیٰ سے اعلیٰ پایہ کی تعلیم حاصل کرسکیں

(۳) قابل، لایق، اور تجربہ کار انسپکٹر ملازم رکھے جائیں۔

(۴) اعلیٰ تعلیم یافتوں اور ٹرینڈ طلبہ کی ملازمت کا خاص انتظام ہو

(۵) اچھا کام کرنے والوں کو انعامات دیئے جائیں۔

اسمیں شک نہیں کہ ملک کے مختلف صوبوں کے حالات میں اختلاف ہے، اور گذشتہ چند سال سے بعض صوبہ جات کی لوکل گورنمنٹوں نے مشرقی زبانوں کی ترقی کا کام شروع کیا ہے۔ اسلئے گورنمنٹ ہند ان کو حتی الوسع امداد دینے میں کمی نہ کرے گی۔

کانفرنس میں اس بات پر بھی زور دیا گیا تھا کہ آئے دن ہندوستان سے کثیر التعداد قلمی نسخے غیر ممالک کی لائبریریوں اور عجائب خانوں کو زینت دینے کی غرض سے بھیجے جاتے ہیں جسکی وجہ سے یہ ملک ان بیش بہا جواہر سے خالی ہورہا ہے، لہذا ضرورت ہے کہ ایسی کتابوں کو ہندوستان ہی میں رکھا جائے۔ اس کے لئے گورنمنٹ ہند لوکل گورنمنٹوں کو ہر طرح کی امداد دینے کو تیار ہے۔

کانفرنس کی رائے میں یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسیٹیوں کے آرٹ کے امتحان کے کورس کی نظر ثانی کی جائے اور نظر ثانی کے وقت یہ بھی ملحوظ رکھا جائے کہ جن مضامین کا باہمی تعلق ہو انہیں ملحق کر دیا جائے۔ مثلاً کلاسیکل ہسٹری اور فلاسفی۔ اس تجویز کے عملی پہلو پر اظہار رائے ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر اسٹائین نے اپنی چٹھی (مورخہ ۴ جولائی ۱۹۱۲ء) میں تحریر کیا تھا کہ اگر ہندوستان کے علما و فضلا کو بیت العلوم کا فیلو یا دیگر سینیٹ باڈی کا ممبر نامزد کر کے اُن کی عزّت افزائی کی جائے تو اس سے ہندوستان کے علوم قدیم کے دلدادگان کا حوصلہ بڑھیگا۔ نیز مدارس میں سنسکرت زبان کی تعلیم جدید معیار کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اُمید ہے کہ گورنمنٹ پنجاب ان دونوں اُمور پر خاص توجہ مبذول کرے گی۔

اُمور متذکرہ بالا کے اعادہ کے بعد ترقی السنۂ قدیمہ کی تحریک پر مجھ بھی طور عرض کرنے کیلئے ایما کیا گیا ہے۔ گورنمنٹ ہند کو یقین ہے کہ اس وقت ہندوستان کیلئے نہ صرف پولیٹیکل نقطۂ خیال سے بلکہ تعلیمی نقطۂ خیال سے بھی یہ ایک نہایت ضروری سوال ہے۔ اور جیسا کہ اس سے پیشتر بھی ظاہر کیا گیا ہے، اگر السنۂ قدیم کی ترویج عام کے متعلق کوئی خاص تجویز پیش کی جائے تو گورنمنٹ ہند حتی الامکان امداد دینے کو تیار رہے۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہند کا یہ مراسلہ ہمارے ہاں کے قدیم طرز کی تعلیم کے دلدادگان اور خیر خواہوں کے لئے پوری حوصلہ افزائی اور مسرّت قلبی کا باعث ہوگا۔ اور اگر شملہ کانفرنس کی تجویز کے مطابق جدید دہلی میں انسٹی ٹیوٹ قایم ہوگیا تو اس سے بڑی بھاری کمی پوری ہوگی۔

شہنشاہ جاپان کا انتقال | نہایت افسوس ہے کہ ۲۹ جولائی ۱۹۱۲ء کو ہز مجسٹی متسوہیٹو شہنشاہ جاپان، کا انتقال ہوگیا۔ آپ کچھ عرصہ سے علیل تھے اور ۱۹۰۱ء سے جو مرض لاحق تھا اُس نے چند مزید شکایات کے ساتھ اس وقت سختی کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ آپ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۸۶۷ء میں تخت نشین ہوئے ۱۸۶۹ء میں آپ کی شادی شہزادی ہاروکو سے ہوئی، جو ایک نہایت تعلیم یافتہ اور بیدار مغز خاتون ہیں اور اپنی ہم جنسوں کی بہبودی سے ہمیشہ دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ آپ کے ولیعہد کا نام یوشی ہیٹو ہے، جنکی پیدائش ۱۸۷۹ء کی ہے، اور جو تین بچوں کے باپ ہیں۔

جاپان کی تمام تر ترقی اور اسکا موجودہ عروج شہنشاہ آنجہانی کے عہد کی برکات کا ممنون ہے۔ آپ کے عہد میں انگلستان کے نمونہ پر پارلیمنٹ قایم ہوئی جاگیردار اور امراء جو بہت قابو یافتہ ہو رہے تھے، اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے، اصلاح و ترقی میں حارج اور حائل ہوتے تھے، اُن کا زور توڑا گیا۔ علوم و فنون کی اشاعت، صنعت و حرفت، اور تہذیب و شائستگی کے دوسرے شعبوں میں جاپان اس وقت کسی مہذب مُلک سے پیچھے نہیں ہے۔ آپ نے اپنے ملک کی ترقی کے لئے ابتدائی طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ جاپان سے بہت سے نوجوان ہر قسم کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کیلئے ممالک غیر کو بھیجے، اور ممالک غیر کے لوگوں کو بُلا کر اپنے ہاں رکھا پھر جوں جوں تعلیم میں ترقی ہوتی گئی ملکی عہدوں کو ممالک غیر کے لوگوں سے خالی کر کے اُن کو جاپانیوں سے پُر کیا جاتا رہا۔ رعایا کے دل میں ان کی محبت عشق کے درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ انھوں نے ایک اور بات سے بھی اپنی اعلیٰ دانشمندی اور غایت تدبر کا ثبوت دیا، اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنی سلطنت کے مختلف صیغوں کی اصلاح کے لئے صرف اعلیٰ ترین معیار کو پیش نظر رکھا۔ مثلاً بحری کے لئے انگلستان، بری کے لئے جرمنی، تعلیم کے لئے امریکہ اور عدالت کے لئے فرانس۔

جاپان کی موجودہ ترقی دنیا کے حیرت انگیز ترین واقعات میں سے ہے ہز مجسٹی متسوہیٹو کے ابتدائی عہد میں جاپان اس قدر کمزور تھا کہ جو سلطنت چاہتی تھی اس پر چڑھ دوڑتی تھی، اور اپنی من مانی شرائط اس سے منوا لیتی تھی۔ لیکن اسی عہد میں ایک وہ وقت بھی آیا کہ جاپان نے یورپ کی روس ایسی عظیم الشان سلطنت کو سخت ذلت کی شکست دی۔ ہماری دلی دعا ہے، اور تمام خواہشمندان تہذیب و شائستگی کی بھی آرزو ہونی چاہیئے، کہ جاپان کی جو ترقی صرف ایک عہد قبل شروع ہوئی تھی، وہ اس عہد میں بھی جاری رہے (انسٹی ٹیوٹ)

مرحوم و مبرور شہنشاہ جاپان

انقلاب وزارت دکن | امور سیاسی کا ایک اُصول یہ ہے کہ حالاتِ متغیرہ کے ساتھ وقتاً فوقتاً تغیرات وقوع میں لائے جائیں۔ چنانچہ اسی اُصول کے مطابق گذشتہ چند سال سے برٹش انڈیا کے اصولِ نظم و نسق میں تدریجی تغیرات کا آغاز ہوا ہے۔ حیدرآباد میں بھی کچھ عرصہ سے عام فیلنگ، انقلاب وزارت کے لئے، بے چین تھی، اور اسکی خبریں اُڑ رہی تھیں۔ آخر کار ۱۱۔ جولائی ۱۹۱۲ء کو ہز اکسلنسی یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ اب آپ صرف اپنے قدیم منصب پیشکاری پر فایز رہیں گے۔ حضور نظام نے وزارت کے منصب جلیلہ پر سر سالار جنگ اعظم کے پوتے کو سرفراز فرمایا ہے۔ نوجوان صدر اعظم نواب سالار جنگ ثالث کو ایک نہایت بیش بہا ورثہ عطا ہوا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ جس طرح سر سالار جنگ اوّل نے حیدرآباد میں تمدنی و اخلاقی اور انتظامی اصلاحیں شروع کی تھیں، نواب سالار جنگ ثالث اُن کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔

حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ نواب عماد الملک ایسا دیرینہ سال و زمانہ دیدہ اور مشاق مدبر و مشیر وہاں موجود ہے۔ آپ نوجوان وزیر اعظم کے مشیر بنائے گئے ہیں۔ آپ کے اعلیٰ کیرکٹر و حسنِ تدبیر، راستبازی و بے غرضی اور بے لوثی کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جس طرح آپ پر حضور نظام غفران مکان کو پورا اعتماد تھا اُسی طرح برٹش گورنمنٹ بھی آپکا پاس کرتی ہے۔ حیدرآباد میں سر سالار جنگ اوّل سے لیکر اب تک پانچ وزارتیں بدلیں بڑے بڑے انقلاب ہوئے۔ بڑی بڑی پارٹیاں پیدا ہوئیں اور مٹ گئیں، مگر تمام وزراء کو آپ پر اعتماد رہا، اور تمام پارٹیاں آپکا پاس ادب کرتی رہیں، اور کسی انقلاب کا کوئی اثر آپ پر نہ ہوا، بلکہ بمصداق دورِ تناسخ آپ آج بھی اُسی جگہ پر سرفراز ہیں جہاں چالیس سال قبل تھے!

ہمیں پورا یقین ہے کہ اہل دکن کیلئے جدید وزارت مبارک ثابت ہوگی۔ آیندہ نمبر میں ہم نواب سالار جنگ ثالث اور نواب عماد الملک کی تصاویر و حالات ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

مسٹر بی، ایم، مالاباری | مسٹر مالاباری کی وفات (شملہ ۱۱ جولائی) سے جو سنسنی تمام ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے، وہ مرحوم کی ہر دلعزیزی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ آپ کا وجود انسانی ہمدردی اور اصلاحی کاموں کے لئے نہایت بیش بہا تھا۔ سیوا سادھن اور دھرم پورسینی ٹوریم آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔ آپ سوشل ریفارم کے زبردست حامی تھے، چنانچہ صغر سنی کی شادی کے خلاف اور بیوگان کی حمایت میں آپ نے نہایت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

مسٹر مالاباری ۱۸۵۹ء میں بمقام بڑودہ پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار یہاں ایک معمولی کلرک تھے۔ آپ ابھی کمسن ہی تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ محترمہ کے قریبی رشتہ داروں میں ایک شخص میروان جی تھا۔ اُس نے انھیں متبنیٰ بنا لیا۔ ۱۵ سال کی عمر میں آپ بمبئی تشریف لائے اور مدرس کی حیثیت سے معاش پیدا کرنے لگے۔ انھیں ایام میں آپ نے چند کتب گجراتی اور انگریزی میں تصنیف کیں، اور پروفیسر میکسمولر کے لکچروں کو ہندوستان کی کئی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۸۴ء میں مختلف اصلاحوں کے متعلق نوٹ لکھے، اور ۱۸۸۵ء میں مجلسی اصلاح کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ مستورات کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے آپنے مختلف مقامات پر لکچر دیئے۔ قریب بیس سال تک آپ انڈین اسپکٹیٹر کے ایڈیٹر رہے۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی، انگریزی زبان میں، جاری کیا۔ غرض مسٹر مالاباری نے جو احسن خدمات انجام دی ہیں اُن کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خداوند اُن کے پسماندگان کو صبر و اطمینان بخشے۔

شعر العجم (جلد چہارم) | علامہ شبلی کی جادو رقمی کی تعریف جس قدر بھی کی جائے، کم ہے۔ آپ نے جس انداز سے تحقیق و تنقید کا اردو سلسلہ جاری کیا ہے وہ بلا مبالغہ مرحوم "پنجاب ریویو" کے اعجاز رقم ایڈیٹر، پادری رجب علی، کے

انداز پر ہے۔ اس سے پہلے شعر العجم کی تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں اب حال میں چوتھی جلد شایع ہوئی ہے۔ اس حصہ میں "تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ ایران کی آب و ہوا، اور تمدن، اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، اور کیا کیا تغیرات پیدا کیے۔ اس کے ساتھ ہر دور کی خصوصیات کی تشریح اور شاعری کے تمام انواع پر مفصل تقریظ او تنقید ہے"۔ یہ حصہ مثنوی کے ریویو پر ختم ہوتا ہے، اس کے دوسرے حصہ (پانچویں جلد) میں "تمام انواع شاعری پر تقریظ و تنقید ہوگی"

تصریح تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویر، جسکو غم و یاس کا مرقع کہنا چاہیے، انڈین پریس ہی کے ایک مصور کی صناعی کا نمونہ ہے۔ اس میں سیتا جی کی اس وقت کی حالت دکھائی گئی ہے جبکہ وہ "اشوک بن" میں مقید تھیں۔ اس کے ساتھ ہمارے مکرم منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی کی وہ دلکش نظم ملاحظہ فرمانی چاہیے جو حصہ "نظم" میں "سیتا جی کا بلاپ" کے عنوان سے درج ہے، او جسکو انھوں نے خاص ہماری فرمایش پر ادیب کیلیے نظم فرمایا ہے۔

ہز آنر نواب لفٹننٹ گورنر بہادر سر جان پریسکاٹ ہیوٹ بالقابہ اور آپ کی لیڈی صاحبہ کی تصویریں آپ کے مبارک پنجسالہ عہد حکومت کی یادگار میں شایع کی جاتی ہیں۔ آیندہ ماہ میں آپ اپنے عہدہ سے ریٹایر ہونے والے ہیں۔ ہز آنر نے اس پانچ سال کے قلیل عرصہ میں صوبجات متحدہ کو بہت ترقی دی ہے۔ کچھ شک نہیں آپ کے حسن اخلاق، وسیع ہمدردی، اور بلند خیالی کا چرچا اس صوبہ میں برسوں رہیگا، بالخصوص اس لحاظ سے اور بھی زیادہ کہ آپکا عہد حکومت تمام رعایا کی خوشحالی اور خاص ترقی کا زمانہ تھا۔

لیڈی ہیوٹ صاحبہ کی بھی وہ اعلی کوششیں نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں جو آپ نے لیڈی منٹو ز انڈین نرسنگ ایسوسی ایشن (صوبجات متحدہ) کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے ہندوستانی مستورات کی حالت کو بہتر بنانے میں فرمائی ہیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب کے متعلق جو دو تصویریں اس نمبر کے ساتھ شایع کیجاتی ہیں، امید ہے کہ وہ دلچسپی کے ساتھ دیکھی جائیں گی۔ یہ تصویریں اسی زمانہ کی ہیں اور ان کے پشت پر جو ہندی عبارت تحریر ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تصویروں کیلیے مصور کو اورنگ زیب کی طرف سے پانچ پانچ سو روپیہ انعام مرحمت ہوا تھا۔ اصل تصویریں رنگین اور مطلا ہیں۔ تصویروں کی پشت پر ہندی میں ایک نام (روپنارائن) بھی لکھا ہے ممکن ہے کہ یہ مصور کا نام ہو یا مصور کوئی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ جو منظر وہ دکھانا چاہتا تھا اس میں اسکو نہایت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

راون کا دربار بھی ایک پرانی تصویر کی نقل ہے۔ اس میں وہ سین نہایت خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے جبکہ سورپ نکھا روتی چلاتی ہوئی آتی ہے اور اپنے بھائی سے رام چندر جی اور لچھمن جی کی شکایت کرتی ہے کہ انھوں نے میری ناک کاٹ ڈالی ہے۔ یہ سنکر وہ اور اس کے درباری سخت برہم ہوتے ہیں، اور بدلہ لینے کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ اصل تصویر رنگین اور مطلا ہے۔ ہم مسٹر نسنت رام رکھی رام (کٹرہ اہلو والیہ امرتسر) کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کی عنایت سے یہ تصویر ادیب میں شایع ہوتی ہے۔ اصل تصویر کی خریداری کے لئے انھیں سے خط و کتابت کرنی چاہیئے۔

منشی امیر احمد صاحب بدایونی بحیثیت جنرل سکرٹری آل انڈیا اردو کانفرنس ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کانفرنس آپ ہی کی عالی دماغی کا نتیجہ ہے، اور کچھ شک نہیں کہ یہ ملک و قوم کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوتی اگر اسکو مسلم لیگ سے ملحق کرکے اہل ہنود پر اسکا دروازہ بند نہ کر دیا جاتا۔

آپ مولوی محمد حسین صاحب (وزیر ٹونک) رئیس اعظم بدایوں کے منجھلے صاحبزادے ہیں ۱۸۸۲ء آپکا سال ولادت ہے۔ آپکا علمی مذاق نہایت ستھرا ہے۔ شاعری کا بھی آپ کو شوق ہے، اور اس میں آپ غالب مرحوم اور حکیم مومن کا تتبع فرماتے ہیں۔ کسی آیندہ اشاعت میں ہم آپکا کلام بھی ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

برسات کی اشاعت موسم کے لحاظ سے نہایت با موقع ہے۔ اس میں مشہور بنگالی مصور، بابو ابنندر و ناتھ ٹیگور نے کالیداس کے "رت سنگھار" کا ایک سین پیش

منشی امیر احمد صاحب بدایونی
جنرل سکرٹری، آل اِنڈیا اُردو کانفرنس - صدر دفتر بدایوں

انڈین پریس الٰہ آباد

جنم اشٹمی

انڈین پریس الہ آباد

مرزا غالب دہلوی

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو ادیب جولائی ۱۹۱۲ء)

غالب کی شاعری کی عظمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ پورے طور پر کر سکتے ہیں جنھیں مبدءِ فیاض سے ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح کا معتدبہ حصہ ملا ہے۔ ایسے بابرکت نفوس میں فطرتی طریقے سے وہ تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں جنکی امداد سے وہ اپنی کوششوں کو کارآمد اور ضروریات کے عین مطابق بنا سکتے ہیں۔ غالب کے زمانہ تک اردو شاعری ایک ڈھرے پر چلی آ رہی تھی، اور اُس میں جدت کا پہلو تقریباً مفقود ہو چکا تھا۔ جو راگ صدیوں سے الاپے جا رہے تھے، انھیں سنتے سنتے سامعین کی بے لطفی بیزاری تک پہنچ چکی تھی۔ ایک ہی لقمہ تھا کہ ہزاروں منہ میں چبایا جا چکا تھا۔ اس میں وہ ذایقہ مطلق نہ باقی تھا جس سے دماغ اور روح کو کوئی مسرت پہنچ سکے۔ غالب کی دوربین نظروں نے اس نقص کو شاید پہلے ہی دریافت کر لیا تھا، اور انھیں عامیانہ طرزِ سخن کی تقلید کی زنجیر توڑ ڈالنے کی ضرورت ابتدا ہی میں محسوس ہو چکی تھی۔ اسلئے انھیں اپنے لئے ایک جداگانہ راستہ تلاش کرنا پڑا۔ پرانی لیک کا چھوڑنا کوئی آسان بات نہ تھی، اور اس کام میں انھیں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بایں ہمہ اُن کی معنی آفریں طبیعت اور ذہنِ رسا نے اُن کے لئے بالآخر ایک ایسی شاہراہ پیدا کر دی، جسے مولانا حالی تو پرانے راستہ کے متوازی سمجھتے ہیں، لیکن ہم، اپنی ناچیز رائے کے مطابق اُسے صراطِ مستقیم خیال کرتے ہیں۔

اصلاح کے معنی، ہماری سمجھ کے مطابق، یہ ہیں کہ کسی چیز کے نقائص و عیوب کو دور کر کے اُس کی ضرورت کے مطابق خوبیوں کو جمع کر دیا جائے؛ نہ یہ کہ چیز کی اصلی ہیئت ہی نہ باقی رہے۔ آخر الذکر صورت اصلاح نہیں بلکہ ایجاد کہی جا سکتی ہے۔ ہم غالب کو اردو شاعری کا موجد تسلیم نہیں کرتے، بلکہ مصلح یا ریفارمر، اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی قدیم خصوصیات قایم رکھنے کے ساتھ ہی اُس میں وہ تغیرات پیدا کر دئے ہیں جو کسی شے کی درستی اور اصلاح میں ظہور پذیر ہونا لابدی ہیں۔

غالب کو سب سے بڑی دقت جو اپنے مشن کی کامیابی میں
پیش آئی ہوگی، وہ عوام الناس کی مخالفت ہوگی۔ لوگوں کا مذاق شروع
سے بگڑا ہوا تھا، اور وہ حسن وعشق کے اُن سُوقیانہ جذبات سے لذت
پذیر ہونے کے عادی بنے ہوئے تھے، جنھوں نے اُردو شاعری کی بنا
میں آج تک بڑا حصہ لیا ہے۔ ہماری رائے میں عاشقانہ شاعری، بشرطیکہ
طرز ادائے مطالب میں اعتدال مدِ نظر رہے، کوئی بُری چیز نہیں، بلکہ سچ
وہ سچی اور قدرتی کیفیتیں مترشح ہوتی ہیں، جن سے متاثر ہونے سے
قلوبِ انسانی کو چارہ نہیں؛ لیکن شریفانہ طرزِ بیان کی جگہ جب بازاری
زبان میں عشق ومحبت کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو وہ نہایت ذلیل و
مکروہ چیز ہو جاتی ہے۔ مثنوی مولانا روم میں آپ عشق کی موثر تشبیہ
دیکھکر ذرا جان صاحب کے دیوان پر نظر ڈالئے تو پاک جذبات اور
ناپاک ترین خواہشات کا فرق بیّن دریافت ہو سکتا ہے۔ نیز موخرالذکر
سے ہمارے خیالات کی پستی اور ہماری معاشرتی خرابی کا صحیح اندازہ بھی
ہوسکتا ہے۔

غالب نے جب آنکھ کھول کر دیکھا ہوگا تو انھیں اپنا ہم خیال
شاید ہی کوئی نظر آیا ہو۔ اور پھر جب بے یار و مددگار اُنھوں نے اپنا
کام شروع کیا ہوگا تو نہ معلوم کس کس قسم کی مخالفت کے طوفان سے
مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ بعض تذکروں میں ابتک ایسے واقعات کا ذکر موجود
ہے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفوں نے کس کس طریقے سے غالب کی چلتی
گاڑی میں روڑے اٹکانے کی فکریں کی ہیں۔ لیکن مشاہیر کا خاصۂ طبیعت
ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ارادہ میں سدّ راہ نہیں
سمجھتے، اور جس بات کو وہ غور و فکر کے بعد اچھا سمجھ لیتے ہیں، اُس کی
دُھن سے پھر ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ غالب بھی دُھن کے پکے تھے، ورنہ
اُن کی کوششیں عام مذاق کی خرابی کا انسداد بدقت کرسکتیں۔ بہرکیف
غالب کامیاب رہے، اور عزم و استقلال کے ہاتھوں انھوں نے تاریخ اُردو
میں عظمت وشہرت کے وہ پائدار نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ اپنی
ضوفشانی سے اُن کا نام چمکاتے رہیں گے، اور آنے والی نسلوں کو
اُن کے زرّیں کارناموں سے باخبر کرتے رہیں گے۔ کامیابی کی یہ مثالیں
اور اولوالعزمی کی یہ نظیریں صرف اُنھیں لوگوں میں پائی جاتی ہیں
جن کو قدرت کی طرف سے اعلیٰ اوصافِ دماغی و ذہنی ودیعت کئے
جاتے ہیں، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب کے دماغ و ذہن
میں بھی فطرتاً وہ باتیں موجود تھیں جنکے بغیر انسان کے لئے مقصد وری
کی منزل پر پہنچنا مشکل اور امر محال ہوتا ہے۔

جب ہم غالب کی ابتدائی اور بے اصول تعلیم کا خیال کرتے
ہیں، اور پھر اُن کی طبعِ رسا کی جودت اور فکرِ عالی کی رفعت کا اندازہ
کرتے ہیں تو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ وہ ماں کے پیٹ سے
شاعر پیدا ہوئے تھے۔ گیارہ برس کی عمر ہی سے وہ شعر کہنے لگے تھے،
اور اس کا اعتراف، اس نامور شاعر نے، خود اپنے فارسی دیوان کے
خاتمہ پر کیا ہے۔ بلکہ اگر غالب کے ایک ہم عمر لالہ کنہیا لال صاحب کے
بیان پر اعتماد کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کا سلسلہ آٹھ نو برس
کی عمر ہی سے شروع ہو گیا تھا، جبکہ غالب نے ایک مثنوی "پتنگ بازی"
کے متعلق لکھی تھی، اور اُسے اس شعر پر ختم کیا تھا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

غالب کے بچپن میں تعلیم کا جو معیار مقرر تھا وہ آجکل رائج
نہیں۔ وہ خواہ مکمل رہا ہو یا نہیں، لیکن اُس کے کارآمد و مفید ہونے
میں شک نہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو قدیم طریقے کی پابندی
کے باوجود بھی عربی کی تعلیم نہیں دلائی گئی۔ صرف و نحو کی معمولی
ابتدائی کتابیں البتہ نظر سے گذر گئی تھیں۔ فارسی تعلیم خواہ کسی درجہ
تک ہوئی ہو، لیکن اس میں کلام نہیں کہ غالب کی فارسی زبان کی

لیاقت اجتہادی رُتبہ کی تھی، اور ہندوستان میں فارسی کا ماہر لسان امیر خسرو اور فیضی کے بعد غالب کے پایہ کا شاید ہی نظر آئے فارسی النسل ہونے کی وجہ سے اُنھیں اِسکا اکتساب یوں بھی آسان تھا لیکن حُسنِ اتفاق سے اُنھیں اُستاد بھی ایک پارسی نژاد ملا جس کی تاثیرِ تربیت نے غالب کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ انھیں فارسی زبان پر جو عبور اور قدرت حاصل تھی اُسکا ایک شمہ اُن کے فارسی کلام سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ الفاظ کا استعمال، محاورات کی صحت، زباندانی، وغیرہ امور کے لحاظ سے وہ فارسی کے بہترین ادیب اور مستند ماہر کہے جا سکتے ہیں، اور اسی دستگاہ کی جھلک اُن کے اُردو کلام میں بھی موجود ہے۔ خصوصاً اُنکا ابتدائی اُردو کلام جسے دیکھکر اکثر مخالفین نے مہمل کہدینے میں بھی تامل نہیں کیا۔

غالب کا مروّجہ دیوان ریختہ اصلاح شدہ حالت میں ہے۔ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی کی رائے سے اُس میں سے ادق اور بعید از فہم اشعار حذف کر دئے گئے ہیں۔ اس وجہ سے اُن کے وہ اشعار اس میں شاذ و نادر ملتے ہیں، جنھیں ظریف طبع اشخاص بے معنی خیال کرتے تھے۔ تاہم نمونتاً دو چار شعر موجود ہیں جو دقت پسندی کا بجائے خود، کامل ثبوت ہیں ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا　　جادہ اجزائے دو عالمِ دشت کا شیرازہ تھا

ہولئے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل　　کہ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے　　یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

پہلا شعر جو اُردو دیوان کا سرمطلع بھی ہے، معنی کے اعتبار سے علمی حلقوں میں آج تک ما بہ النزاع ہے۔ اسی قسم کے ادق کلام کو دیکھکر کسی نے یہ طعن آمیز شعر کہا ہے ؎

کلام میر سمجھے، اور بیانِ میرزا سمجھے
مگر اِنکا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مخالفوں کے طعن و تشنیع کا جواب اگرچہ غالب نے اس شعر میں نہایت خوبی سے دیا ہے، اور سچ یہ ہے کہ اہلِ کمال اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں ؎

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن اس استغنا کے باوجود بھی اُنھیں اپنی روش کی اصلاح کرنی پڑی، کسی مجبوری سے نہیں بلکہ بطیبِ خاطر۔ چنانچہ درمیانی عمر کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثقیل الفاظ کی کثرت، اور مطلب کی پیچیدگی تقریباً مفقود ہو گئی ہے۔ فارسی ترکیبیں اور محاورات چونکہ زبان پر چڑھے ہوئے تھے، اسلئے اُنکا ترک یکایک فی الجملہ دشوار تھا۔ لیکن اس باب میں جب وہ اعتدال سے کام لیکر کچھ کہتے ہیں تو نہایت لطیف معلوم ہوتا ہے، اور جب یہ ترکیبیں اضافاتِ مسلسل کے ساتھ آتی ہیں تو عجب مزیدار چیز ہو جاتی ہیں۔ اُردو میں یہ رنگ خاص غالب کا ہے، اور اگرچہ اس زمانہ میں اُس کے مقلد کئی پیدا ہو گئے ہیں لیکن اس کی نظیر ازمنۂ گذشتہ میں نہیں ملتی۔ کہتے ہیں ؎

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

سرشکِ سربصحرا دادہ نور العینِ دامن ہے　　دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق　　ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد　　کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

ہے نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

نازشِ ایامِ خاکسترنشینی کیا کہوں پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

نظربندی کے مضامین سے، جو زیادہ تر فارسی کے مشہور شاعر عبدالقادر بیدل کی تقلید کا نتیجہ ہیں، اگر قطع نظر کرکے دیکھئے تو اُن کے دیوان کے صفحے ایسے اشعار سے بھرے پڑے ہیں جو طرزِ بیان، اسلوبِ بندش، صفائی مضمون، اور پاکیزگی خیال کا بہترین مرقع ہیں۔ اس قسم کے اشعار سے اُن کی طبیعت کا اصلی رنگ معلوم ہوتا ہے، اور آمد کی شان ظاہر ہوتی ہے

ہم رشک کو بھی اپنے گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں، ولے، اُسکی تمنا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہئے ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہئے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
نیند اُسکی ہے، دماغ اُسکا ہے، راتیں اُسکی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

تصوف کا رنگ، جو مشرقی شاعری کا جزوِ اعظم ہے، غالب کے کلام میں بھی بہت چوکھا ہے۔ مذہبی حیثیت سے چونکہ وہ بہت وسیع نظر رکھتے تھے اور خود اپنے ہی بیان کے اعتبار سے موحد بھی تھے، اسلئے اس میدان میں بھی انکا سمندِ فکر کوسوں دور نکل جاتا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

صفائی زبان پر رجحان پیدا کرنے کے بعد سلاست پسندی کا مادہ بھی بڑھتا گیا۔ بعض بعض غزلیں ایسی صاف و شستہ زبان میں کہی گئی ہیں کہ باید و شاید۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ کمال ہر چیز کو اپنا بنا سکتے ہیں۔ اردو شعراء میں سادہ گوئی کی مثال میر کے کلام سے زیادہ کہیں اور نہیں مل سکتی، لیکن اُن کے بعد غالب کا نمبر ہے؛ اور سلاستِ زبان و روانیِ مطالب کے ساتھ اگر اُن کی نازک خیالی کو بھی شریک کر لیا جائے تو میر سے غالب کئی درجہ بڑھ جاتے ہیں۔ دیکھئے کس انداز سے فرماتے ہیں، اور کلام کے ربط و تسلسل میں سرِ مو فرق نہیں آتا ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

عالي جناب نواب مير يوسف علي خان بهادر سالار جنگ ثالث

انڈین پریس الہ آباد

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
ہوئے مرکے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دردِ منّت کشِ دوا نہوا میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہوا
جمع کرتے ہیں کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلہ نہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہوا

آہ کو چاہیئے اک عُمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے، لیکن خاک ہو جائینگے ہم تمکو خبر ہونے تک

کوئی دن گر زندگانی اَور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اَور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غمہائے نہانی اَور ہے
دیکے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغامِ زبانی اَور ہے

کوئی امّید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ دیکھ خونّابہ فشانی میری

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

بعض غزلوں میں قطعہ بند کی صورت پیدا ہو گئی ہے، اور وہ مجموعی حیثیت سے دلکشی و دلفریبی میں، بجائے خود، عدیم النظیر ہیں۔ پاکیزگیِ خیالات اور طرزِ بیان کی خوبی نے مِل کر عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس قبیل کی غزلیں اُردو میں رائج نہیں، اور غالب کے دیوان بھر میں دو تین سے زیادہ نہیں۔ ایک غزل مسلسل ہے ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا! کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

اسی طرح ایک دوسری غزل ہے ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغِ مَے سے گلستاں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

اسکو حسنِ عقیدت کہو یا امرِ واقعی! کلامِ غالب کے مطالعہ سے دماغ اور روح کو تقویت اور مسرت کا سامان بہم پہنچتا ہے، اور اسکا صحیح اندازہ کسی انتخاب سے نہیں ہو سکتا۔ سچ یہ ہے کہ غالب ایسا قادر الکلام اور رنگیں بیان شاعر، جو معجز نگاری میں بھی فرد ہو، ہندوستان میں آج تک پیدا نہیں ہوا، اور گو غالب کے پیشروؤں اور ہمعصروں میں بہت سے

مشاہیر بعض بعض خصوصیات میں اُن سے کسی طرح کم نہ تھے، لیکن بحیثیت مجموعی اُنکا کوئی مدِمقابل آج تک نہیں ہو سکا -

ذوقؔ مرحوم بھی اساتذہ اُردو میں بہت جلیل القدر سمجھے جاتے ہیں، اور وہ غالبؔ کے ہمعصر بھی تھے - بہادر شاہ ظفر کا اُستاد ہونے کی حیثیت سے، بظاہر، اُن کی عزت اور وقعت غالبؔ سے کچھ زیادہ ہی تھی ذوقؔ کے پختہ کار اور نازک خیال شاعر ہونے میں شبہ نہیں، لیکن غالبؔ کو وہ کسی طرح نہیں پہنچتے - اُنھوں نے جو سہرا غالبؔ کے سہرے کے جواب میں بایمائے بہادر شاہ، لکھا اپنی جگہ بہت اچھا ہے، لیکن انصاف پسند طبعیتیں اُسے غالبؔ کے سہرے پر کبھی ترجیح نہیں دے سکتیں - اسی طرح غالبؔ اور ذوقؔ کی اکثر غزلیں ہم طرح ہیں، اور اُن کے دیکھنے سے دونوں کا فرق دریافت ہو سکتا ہے - ذوقؔ کا مطلع ہے ؎

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کیلئے
ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے

شعر بہت اچھا ہے، لیکن اسی قافیہ اور قریب قریب اسی مضمون کا شعر غالبؔ نے نہایت نازک کہا ہے ؎

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کیلئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کیلئے

ذوقؔ ؎

نہ دل رہا نہ جگر، دونوں جل کے خاک ہوے رہا ہے سینہ میں کیا چشم خونفشاں کے لئے

غالبؔ ؎

بلاسے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

غالبؔ کے شعر میں ایک قسم کی جدت ہے، اور ذوقؔ نے بالکل معمولی طور پر ایک پامال مضمون کو نظم کر دیا ہے -

لکھنؤ کے اُستادوں میں آتشؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے، اور صفائیِ کلام کے اعتبار سے وہ اپنے لکھنوی ہمعصر ناسخؔ سے بہت آگے ہیں لیکن غالبؔ کی بات اُن میں بھی نہیں - اصل یہ ہے کہ غالبؔ چونکہ عامیانہ تقلید سے قطعی متنفر تھے، اسلئے اُنکا ہر شعر جدت کا پہلو لئے ہوتا ہے اور یہ صفت کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں - آتشؔ کہتے ہیں ؎

جب اشتیاق لکھا ہے خونخوار یار کو
قاصد کا کُشتہ آیا ہے خط کے جواب میں

اگرچہ اشتیاق کی تعریف خونخوار زیادہ موزوں نہیں، تاہم شعر صاف ہے، لیکن غالبؔ نے "جواب" کا قافیہ نرالا باندھا ہے - لکھتے ہیں ؎

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس شعر کا مضمون سادہ ہونے کے باوجود کس قدر بلیغ ہے - محبوب کی مزاج شناسی کی تمثیل اس سے زیادہ دلچسپ ہو نہیں سکتی - اس زمین میں غالبؔ نے دو غزل کہا ہے اور بعض قافئے تو نہایت نُدرت کے ساتھ نظم کئے ہیں - دیکھئے ؎

مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
مَیں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

غالبؔ کے دیوان میں ایسے اشعار معقول تعداد میں نکل سکتے ہیں جو بلاغت اور وسعتِ معنی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہیں - انصاف پسند صائبؔ نے غنیؔ کشمیری کا یہ شعر ؎

سبز خطے بخطِ سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدیم

سُنکر اپنا سارا کلام اس کے عوض میں دیدینا منظور کیا تھا - اسی طرح حقیقت بیں شعراء کے لئے اپنے دیوان کے دیوان غالبؔ کے ایک ایک شعر پر نثار کر دینا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا - دو چار شعر ہم یہاں اس قبیل کے لکھتے ہیں جن سے مصنف کے ذہن کی بلندی اور طبیعت کا معنوی عمق

معلوم ہو جائے گا ؎

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ یوں

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھسے

مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صُورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہوتا تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

دیکھیئے پاتے ہیں عشاق بُتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
مت پُوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

شاذ و نادر مثالیں غالب کے کلام میں ایسی مِل سکتی ہیں، جو مذاقِ سلیم کے خلاف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

لیکن شکر ہے کہ مجموعی حیثیت سے اُن کا کلام بداخلاقی کے الزام سے بری ہے۔

غالب کا اُردو کلام بہت مختصر ہے، اور جو کچھ انھوں نے کہا تھا اور نظری اشعار خارج کر دینے کے بعد جو قایم رہا، اُس میں بھی عجیب تفرقہ پڑا ہے۔ اب بھی اکثر اُن کا غیر مطبوعہ کلام کہیں کہیں مِل جاتا ہے۔ ہندوستان کے بعض مقامات کے قدیمی کتب خانوں میں دیوان غالب کے ایسے نسخے موجود ہیں، جن میں سے اکثر خود مصنّف کی نظر سے گزر چکے ہیں مروّجہ دیوان سے جب اُن کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اول الذکر میں کلام کا ایک حصّہ بالکل موجود نہیں۔ عرصہ ہوا رسالۂ مخزن میں ایک نظم "طائرِ دل" کے عنوان سے نکلی تھی، جو حسب ذیل ہے ؎

اُٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا دل بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او نا کام! آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھِل کھِلا کر پہلے، پھر مجھکو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ہوں اُسکا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائرِ روز آ کر باغِ رضواں سے
اُسی کے زلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھکو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جب دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہو گیا یوں خاک اپنی آہِ سوزاں سے

میجر سیّد حسن بلگرامی کو یہ قطعہ اُن کے والد بزرگوار سے پہنچا ہے اور مؤخر الذکر

کے بیان کے مطابق اس کے مصنف غالب دہلوی ہیں۔ میجر صاحب
اور اُن کے والد ماجد کے بیان کی تردید ہمیں منظور نہیں، لیکن غالب
کا قدرتی رنگ اس میں مطلق نظر نہیں آتا، اور اس لحاظ سے ہمیں
اس کے غالب کی تصنیف ہونے میں ضرور کلام ہے۔

شیخ عبدالقادر صاحب بی اے کو غالب کی اور بھی کچھ غیر
مطبوعہ غزلیں دستیاب ہو چکی ہیں۔ اسی طرح اگر کوشش کی جائے تو شاید
کچھ اور کلام بھی فراہم ہو سکے اور اس کے بعد غالب کا دیوان مکمل
صورت میں شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ سکتا ہے۔

غزلوں کے علاوہ قصاید اُردو بھی غالب کی یادگار ہیں، لیکن
اُن پر بسیط بحث کی ضرورت نہیں۔ اُن کے فارسی کے قصاید بیشک
قاآنی کے قصیدوں سے کسی طرح کم نہیں سمجھے جا سکتے، لیکن اُردو میں
اُن کے قصیدے ایسے نہیں جو سودا اور ذوق کے مقابلہ میں لائے
جا سکیں۔ تاہم اِس کا انصافاً اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس صنف
میں بھی انھوں نے جو کچھ کہا، اپنے رنگ میں بے مثل کہا ہے، اور بعض
مقامات پر تو اپنی سحر گوئی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ اُن کا ایک
قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے ؎

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام | جسکو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام

اس قصیدے نے مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی ایسے
نقادِ سخن سے بھی، جنھوں نے "شرح دیوان غالب" میں نہایت بیباکی
سے اُن کے عیوب شاعری کو ظاہر کرنے میں تامل نہیں کیا، اِسکا اقرار
کرا دیا ہے کہ تخیل کی جدت اور مضامین کی تازگی کے اعتبار سے یہ
بے مثل چیز ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ غالب جو کچھ کہتے تھے، سب سے جدا کہتے تھے،
اور اس التزام کو انھوں نے اپنے مدحیہ قصاید میں بھی بہت خوبی سے
ملحوظ رکھا ہے۔ دیکھئے ممدوح کی توصیف کا پہلو کتنا پیارا اور خیالات
کس قدر نادر ہیں ؎

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ | مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف | نوبہارِ حدیقۂ اسلام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ | لوحش اللہ عارفانہ کلام
وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے | ایرج و تور و خسرو و بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے | گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا! موشگافیِ ناوک | آفریں! آبداریِ صمصام

ایک دوسرے قصیدے میں بھی مدحیہ مضامین کے نظم کرنے
میں قوتِ متخیلہ کی حدیں کھینچ دی ہیں ؎

مہر کانپا چرخ چکّر کھا گیا | بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب | اب علوئے پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس | اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ | اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے | اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

غزلیات و قصاید کے علاوہ بہت سے قطعات و رباعیات
دیوانِ ریختہ کا ایک جزو ہیں، اور اُن کے دیکھنے سے بھی غالب کی طباعی
اور بذلہ سنجی کا تہ دل سے مقر ہونا پڑتا ہے۔

غزل گوئی کی ایک جدید روش نکالنے کا سہرا غالب کے سر ہے،
اور اُسی کے ساتھ نثر اُردو بھی اُن کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔
انگریزی طرز کے صاف و سادہ خطوط کی ابتدا، اُردو میں، غالب سے
ہوئی ہے اور اُنھیں کی تقلید کے تصدق میں آج اُردو نثر اس قدر صاف
اور سُلجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ قلم برداشتہ اور رواں انشا پردازی کا لطف
اگر اُٹھانا ہے تو اُن کے رقعات کے دو مجموعوں، عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ
کا مطالعہ کرو۔ اس سے نہ صرف تمھیں اُن کے قلم کا زور معلوم ہوگا بلکہ
اُن کی زندگی کی تصویر بھی ہو بہو نظر آئے گی۔ ہم اس جگہ ایک خط کا انتخاب

سانچي کے ثوپ کے مشرقي پھاٹک کا ستون

انڈین پریس الہ آباد

ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اُس سے مجموعی حالت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔
مرزا قربان علی بیگ سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

...... یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی مَیں نے اپنے آپ کو غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالب! ایک اور جُوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے، اب تُو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا......... ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، دوسرا بھوگ سُنا رہا ہے۔ مَیں اُن سے پُوچھ رہا ہوں، اجی حضرت! نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حُرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو! بولے کیا، بے حیا، بے عزت؟ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے؛ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دونگا...... الخ

اسی طرح اور خطوط میں بھی اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں سے مزہ لے لیکر باتیں کرتے ہیں کہ سننے والوں کو بھی مزا آجاتا ہے۔

غالب نے اردو نظم و نثر پر جو احسانات کئے ہیں، اُن سے اہلِ یُورپ کو روشناس کرانے کی اشد ضرورت تھی، خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ وہاں مشرقی علوم کے ساتھ خصوصیت سے اعتناء ظاہر کیا جا رہا ہے۔ ہمیں مسٹر صلاح الدین خدا بخش ایم اے، بی سی ایل، کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اُنھوں نے انگریزی میں ایک کتاب غالب کے متعلق شایع کر کے ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب ولایت میں چھپی ہے اور اس میں غالب کی اردو و فارسی شاعری پر مبسوط بحث کے علاوہ اُن کے سوانح کا بھی ذکر نہایت دلچسپی کی چیز ہے۔

غالب کی شاعری کی کیفیت اُسوقت تک مکمل نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ اُن کے فارسی کلام کی عظمت و شان کے چہرے سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ اِس کے علاوہ اُن کے سفر کلکتہ کی دلچسپ کیفیت، برہان و قاطع برہان کے قضیہ کی طوالت، اور اُن تمام علمی مذاکروں اور مباحثوں کے افسوسناک نتائج پر بھی بحث کرنا ضروری تھا، لیکن یہ تمام باتیں ہمارے دائرۂ تنقید سے باہر ہیں، اور اس لئے ہمیں اُن امور پر قلم اُٹھانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

سانچی کے آثارِ قدیمہ

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ + آثار پدید است صنادید عجم را

نزہت گاہِ ہستی کی دلفریبیاں انسان کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیتیں؛ لطفِ مشاہدہ کا ذوق خود بخود اُس کا ہاتھ پکڑ اُس مقام کی جبیں سائی کرا دیتا ہے جہاں فطرت کی گلکاریوں کے بیش بہا نمونے اپنی داد طلب خوش منظری سے اُسکا انتظار کرتے ہیں۔

جبکہ موسم بہار رخصت ہونے والا تھا اُس کی ایک پُر فضا صبح کو اسی جوشِ فطرت پرستی نے ہمیں اُس پر فضا سبزہ زار میں پہنچا دیا جو ریاست بھوپال کے شمال و مشرقی گوشہ میں بیتوا ندی کے بائیں جانب کسی قدر فصل سے واقع ہے دُور تک خود رو شریفوں اور کھرنیوں کا جنگل، اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ، ایک جانب وسیع میدان، اُس میں ایک چھوٹے تالاب کی ہلکی موجیں، ایک عجیب پر لطف سینری تھی۔ کوسوں تک

انوارِ سحر کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک عجیب نورانی بادل آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ آفتاب کچھ اُبھر چلا تھا۔ نورانی شعاعیں ایک قرمزی رنگ کی بدلی میں سے چھن چھن کر آتیں اور جنگلی بیلیوں کے خوشنما پھولوں پر گر پڑتی تھیں جس کے حیرت زا نظارے نے آنکھوں میں سکتہ کا عالم پیدا کر دیا۔ جس طرف نظر گئی وہیں کی ہو گئی۔

شاید اسی مسرت آبی کی وجہ سے اس فرح بخش جگہ کا نام سانچی رکھا گیا ہے کیونکہ ہندی لغت میں سانچی کے معنی آرام و راحت ہیں اور اِن ہی دلفریبیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس روایت کے مان لینے میں تامل نہیں ہوتا کہ رام اور سیتا نے اپنے بن باس کا بیشتر حصہ اِن ہی جنگلوں میں گذارا تھا جس کا ثبوت راوی یہ بیان کرتے ہیں کہ سیتا جی یہاں کے شریفوں کو بہت پسند کرتی تھیں۔ اُسی زمانہ سے ان کا نام اِس نواح میں سیتا پھل مشہور ہو گیا۔

یہ جگہ علاوہ ایک دلکشا مقام ہونے کے عجیب وغریب تاریخی مضامین کا دفتر ہے۔ سلسلۂ بندھیاچل کی ایک سطح اور سایہ دار پہاڑی پر جو اور پہاڑوں سے کسی قدر علیٰحدہ ہے بودھ مذہب کے زمانۂ نمو کا طرزِ معاشرت، طریقِ تمدن، مذہبی خیالات، اصولِ زندگی، پتھروں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ پہاڑی کا ذرہ ذرہ ہزاروں برس کے واقعات ہماری نگاہوں تک پہنچانے کے لئے صفحاتِ تاریخ بنا ہوا ہے۔ تعمق بیں نظریں اس پر نہایت بے صبری سے پڑتی ہیں۔ سیکڑوں یورپین سیاح اور دیگر ممالک کے لوگ اِن صناعیوں کو دیکھنے کے لئے یہاں آتے ہیں اور اِن آثارِ قدیمہ کی بدولت ڈھائی ہزار برس قبل کے ہندوستان کی سیر کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ اسی کثرتِ آمد و رفت کے باعث گریٹ انڈین پنینسولا ریلوے نے اپنا سٹیشن قایم کر دیا ہے جو دہلی سے بمبئی جانے والی لائن کے وسط میں واقع ہے اور شہر بھوپال سے ایک گھنٹہ کا راستہ ہے۔ دامنِ کوہ میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال نے ایک خوبصورت ڈاک بنگلہ بنوا دیا ہے جو یہاں آنے والوں کو آرام پہنچاتا ہے۔ شہر بھوپال یہاں سے ۹ کوس کے فاصلہ پر ہے اور وبائی موسم میں اکثر عمائدین وحکام ریاست اور بعض اوقات ہر ہائینس بیگم صاحبہ کا کیمپ بوجہ عمدگی آب و ہوا یہیں ہوتا ہے۔

اگرچہ ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں آثار قدیمہ کے بہترین نمونے نہ پائے جاتے ہوں لیکن صوبۂ مالوہ کو ایک خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ یہاں کثرت سے قدیم سے قدیم عمارات کی نشانیاں موجود ہیں۔ جو اگرچہ دستبردِ زمانہ کی بدولت بہت ہی شکستہ اور ابتر حالت میں ہیں لیکن پھر بھی اپنے بانیوں کی عظمت اور جبروت یاد دلانے کے لئے کافی سے زیادہ سامان رکھتی ہیں۔ شہر اوجین، دھار، بھیلسہ (جسکو زمانہ سابق میں بدشا کہتے تھے) ایسے مقامات ہیں جو تاریخ ہند میں باعتبار قدامت کے مقدمۂ کتاب کہے جانے کے مستحق ہیں اور ہزارہا تغیرات دیکھنے کے بعد ابتک صوبۂ مالوہ میں آباد ہیں، جنکے چاروں طرف کوسوں تک ایسے کھنڈر پڑے ہیں جنمیں لاتعداد تاریخی معلومات کے ذخیرے مدفون ہیں۔

صرف بودھ کے متعلق جس قدر عمارتیں اس علاقہ میں ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:- (۱) سانچی میں، ۱۰۔ (۲) بھوجپور میں، ۳۷۔ (۳) سوناری میں، ۸۔ (۴) ست دھارا میں، ۷۔ (۵) اودھر میں، ۴۔ (۶) اندھیر میں، تعداد کا تعین نہیں ہو سکا۔ اسکے علاوہ اور ہزاروں مقامات ایسے ہیں جو چشمِ عبرت کے منتظر ہیں۔ اگر اُن کی تحقیقات کی جائے تو حیرت انگیز معلومات کے علاوہ قدیم تمدنِ ہند پر بھی کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔ مثلاً

(۱) قصبہ کوروائی کے پاس موضع پٹھاری میں ایک ڈال پتھر کا ۴۸ گز بلند مینار ہے اور اُس پر بہت سے چھوٹے چھوٹے بُت ترشے ہوئے ہیں اور ایک کتابہ بخط ہندی قدیم لکھا ہے جو اب پڑھا نہیں جاتا۔

(۲) پٹھاری سے ایک کوس کے فاصلہ پر ایک تالاب ہے اُسکے گرد چند قدیم تبخانے ہیں۔ اُن میں ایک عالیشان مندر ہے جسکی تصاویر دیکھکر سمجھ میں نہیں آتا کہ اِن سے کیا مراد ہے۔ کہیں جوگہ ایک حسین عورت پہلو میں ایک طفل شیر خوار کو لئے لیٹی ہے اور ارد گرد کنیزیں کھڑی ہیں۔ اُن کے جسموں پر زیور مثبت کندہ ہے۔

(۳) موضع ایرن میں ایک منار ڈال پتھر کا مثل منار موضع پٹھاری استادہ ہے اور منار کے برابر ایک قوی ہیکل بت ہے جسکے سر، پیٹ، اور کاندھوں پر بہت چھوٹے چھوٹے بت بنے ہوئے ہیں۔

(۴) موضع گیارسپور کے قریب ایک سنگین تبخانہ ہے۔ اُس پر اگر کوئی پتھر کھینچ مارے تو ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے تانبے اور پیتل کے ظرف پر کسی چیز کے گرنے سے جھنجھناہٹ ہوتی ہے۔ اہلِ دیہات اُسے بجے مندر کہتے ہیں۔

(۵) موضع اودیپور میں راجہ اودیات کا عالیشان مندر ہے جس کی نقاشی اور سنگتراشی خاص طور پر قابل دید ہے۔

(۶) شہر بھوپال سے بارہ کوس کے فاصلہ پر ساکھا نامی میدان میں ایک منقش عالیشان مندر پاربتی ندی کے متصل بنا ہوا ہے۔

(۷) علاقہ نہر سنگڈھ میں سرحد بھوپال کے قریب ایک چھوٹا سا موضع بہار ہے جس میں دور تک عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور سیکڑوں سنگین قبور اب تک موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہاں کوئی بڑا شہر آباد ہو گا۔

(۸) موضع بھوجپور میں علاوہ یادگار بودھ کے تقریباً دو ہزار برس کا ایک مندر شکستہ حالت میں ہے جسکو سمبت ۱۰۵۹ میں راجہ سمپ بلج نے بنایا تھا۔ اس میں چار ستون ۲۵-۲۵ ہاتھ بلند ایک پتھر کے اسوقت تک کھڑے ہیں اور دروازہ پر بخط ہندی ایک کتبہ موجود ہے۔

ایسے ہی اور بہت سی عمارتیں و آثار ہیں جنکی تفصیل سے بخیال طوالت قطع نظر کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ عمارتیں کس قدر پُرانی ہیں اور کتنی صدیاں ان پر تاریکی کے پردے متواتر ڈالتی جاتی ہیں جو بالآخر ایکدن اہل عالم کی نظر سے بالکل پوشیدہ کر دینگی۔

افسوس یہ ہے کہ اہلِ ہند نے ہمیشہ تاریخ کی طرف سے غفلت اور لاپروائی کی ہے اور اس بارے میں یہ لوگ دنیا کی تمام قوموں سے بہت پیچھے ہیں۔ آج کسی ملکی تاریخ سے سانچی کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا اور نہ صحیح طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ چین کا مشہور مؤرخ فاہیان سنیاسی جس نے تقریباً ۴۱۲ سال قبل مسیح اُن چاروں مقامات کی زیارت کی جنکی نسبت گوتم نے اپنی وفات کے وقت آنند سے کہا تھا کہ اُن کے درشن سے بودھ مت والوں کو بڑا پُن ہو گا عقیدتمندانہ طور پر یہاں بھی آیا تھا۔ اُسکے نزدیک یہ وہ متبرک مقام ہے جہاں گوتم نے پریت پرتا نامی درخت لگایا تھا جو ہمیشہ سات فیٹ بلند رہتا تھا اور بصورت قطع و برید پھر اُتنا ہی ہو جاتا تھا۔ لیکن گوتم کے حالات زندگی بھی اس قدر تاریکی میں ہیں جن سے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ محترم شخص سانچی میں کب آیا تھا۔ یا یہ کہ فی الواقع اس سرزمین کو اُسکی قدمبوسی کا شرف بھی حاصل ہے یا نہیں۔ ورنہ اُسی سے کچھ پتہ چلتا کہ عہد ماضیہ میں یہ کونسا شہر تھا قیاس ہوتا ہے کہ گوتم نے اپنی وفات سے ۱۲ سال قبل جو ایک طویل سفر دکن کا کیا تھا اور پھر بنارس و دیسالی ہوکر واپس آیا اُسی سفر میں سانچی میں بھی اپنا ویاکھیان یعنی وعظ کہنے آیا ہو گا کیونکہ اس سفر میں جہاں وہ جاتا تھا ہر مقام پر اپنا وعظ ضرور کرتا تھا علاوہ ازیں فاہیان نے جو کچھ لکھا ہے وہ شاچی کے متعلق ہے۔ پس اگر لفظ سانچی اُسی شاچی سے بن گیا ہے جیسا کہ قرینہ بھی اسکا مقتضی ہے تو سانچی کی عظمت میں شک نہیں۔ والّا وہ کوئی دوسرا مقام ہو گا کیونکہ حال کی تحقیقات سے لفظ سانچی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی بلکہ اختلاف بڑھتا جاتا ہے۔

فاہیان نے لکھا ہے جب وہ یہاں آیا تھا تو یہ ایک بہت بڑی ریاست تھی۔ اب اُس ریاست کا اس خاص جگہ کوئی پتہ نہیں چلتا۔ صرف سانچی کا ناکھیڑہ کے نام سے ایک بہت چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ البتہ میجر الگزنڈر صاحب نے معلوم کیا ہے کہ یہاں سے کچھ دور پر ایک بڑا شہر آباد تھا جسکا نشان بھیلسہ سے دو میل کے فاصلہ پر پایا جاتا ہے اور ویسانگر اُس کا نام معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے اسی ویسانگر کو تلفظ کی یکسانیت سے بیش نگر اور بشنو نگر بھی لکھا ہے جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُسکا دوسرا نام چیتیہ گر تھا کیونکہ چیتیہ بدھوں کی عبادتوں کو کہتے ہیں۔ اور وہ عبادت خانہ یہاں بہت تھے۔ انکی کثرت سے یہ نام پڑ گیا تھا۔ لیکن ایک دوسرے محقق نے یہ لکھا ہے کہ زمانۂ سالف میں جسکو تقریباً ۳ ہزار برس کا عرصہ ہوا زیر کوہ سانچی جو شہر آباد تھا اُس کا نام سنکانگر تھا۔ اسکے سوا سانچی کی وجہ تسمیہ ایک اور بتلائی جاتی ہے جس سے فاہیان والی شاچی سے سانچی کو کوئی تعلق نہیں رہتا۔ وہ یہ ہو کہ یہاں کے ایک مینار پر قدیم پالی حرفوں میں شانت سنگھم کندہ ہے جو سنت سنگھم اور سنتو سنگھم بھی پڑھنے میں آتا ہے۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ سانچی اسی شانت یا سنت کے لفظ سے بگڑ کر بنا ہے۔ بہر کیف جو کچھ بھی ہو یہ اختلافات بھی بجائے خود سانچی کی قدامت پر شاہد ہیں۔ میجر الگزنڈر صاحب کی رائے ہے کہ یہ عمارتیں ۶ سو یا ۹ سو برس قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام تعمیر ہوئیں ہیں اور نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے تاریخ بھوپال میں لکھا ہے کہ سانچی کی عمارت راجہ اسوکا والیِ اوجین کے زمانہ میں بنی ہے۔ لیکن وہ راجہ اسوکا جس نے اپنے دسویں سنہ جلوس میں بودھ مذہب اختیار کیا اور اُسکے ۸ برس بعد ایک بہت بڑا مذہبی جلسہ بعض بے عنوانیوں کی اصلاح کی غرض سے ایکہزار سادھوؤں کا منعقد کیا تھا وہ والی اوجین نہ تھا بلکہ اُس کا پایۂ تخت پاٹلی پتر تھا جو اب پٹنہ عظیم آباد کہلاتا ہے۔ اسی راجہ کے فرمان اکثر مقامات میں سنگی ستونوں پر کندہ دستیاب ہوئے ہیں اور بعض پہاڑیوں کے پتھروں پر بھی اُسکے کتابے موجود ہیں اور خاص سانچی میں اُسکی یادگار پائی گئی ہے۔ یہ راجہ حضرت عیسیٰ سے ۳ سو برس قبل گذرا ہے۔ اسکی سلطنت ہندوستان میں دور تک پھیلی ہوئی تھی خیال کیا جاتا ہے کہ سانچی کی بعض عمارتیں اس کے زمانہ سے کئی سو برس قبل کی ہیں اور بعض عمارتیں اسکے عہد میں تیار ہوئیں اور پہلی عمارتوں کی مرمت بھی اسکے زمانہ میں کی گئی۔ اُس وقت سے پھر ان آثار کی طرف کوئی توجہ نہیں کیگئی۔ اب ۱۸۸۱ء میں جب گورنمنٹ برطانیہ نے بودھ گیا کے منڈل پر جو ۷۰ فیٹ بلند اور قدامت میں سانچی کا ہمعصر ہے اپنا قبضہ کرکے اُس کی مرمت کرائی، اسی کے دو تین سال بعد سانچی کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ وہ جنگل جو سالہا سال سے اس عمارت کو اپنے بڑے بڑے درختوں کے کنج میں چھپائے ہوئے تھا صاف کر دیا گیا۔ شمالی اور مشرقی پھاٹک منہدم ہو گئے تھے اور بعض بعض جگہ سے حصار بھی شکستہ تھا اُس کی درستی کرا دیگئی۔ بہت سے بُت جو اِدھر اُدھر لڑھک گئے تھے یکجا کر دیئے گئے اور اکثر تصاویر و مجسمے قدیم چیزوں کے شایق اُٹھا کر لیگئے۔ آیندہ کے لئے اُنکی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا اور ریاست کی طرف سے اسکی کافی نگرانی کی جانے لگی۔

جو آثار زیادہ تر بودھ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اُن کو زمانۂ حال کے محققین نے یادگاروں کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر فرگسن صاحب (جنھوں نے بودھوں کی یادگاروں کی بہت کچھ تحقیقات کی ہے) کی رائے میں یہ عمارتیں پانچ حصوں میں حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کی جا سکتی ہیں:۔

(۱) سنگی ستون اور لاٹیں جنپر کتابے کندہ ہوتے تھے۔

(۲) یادگار، جو گوتم کی کسی متبرک شے کی حفاظت یا کسی پاک مقام کی یادگار کے طور پر بناتے تھے۔

سانچی کے ستوپ کا مشرقی منظر

انڈین پریس الہ آباد

سانچی کے توپ کا شمالی منظر

انڈین پریس الہ آباد

(۳) حصار، جو عمارات نمبر ۲ کے گرد بنا کر اُن پر صناعی او نقاشی
کا کمال دکھایا جاتا تھا۔

(۴) عبادت گاہیں، معابد

(۵) خانقاہیں۔

اس تفصیل کو ملحوظ رکھ کر جب سانچی کی عمارتوں کو دیکھا
جاتا ہے تو یہ تقسیم صحیح معلوم ہوتی ہے۔سانچی کی بڑی یادگار جو اسوقت
بمقابلہ دیگر عمارتوں کے زیادہ صحیح حالت میں ہے اُسکی صورت یہ ہے
کہ پہاڑی کی سطح پر جانب مغرب ایک مدور گنبد بشکل نیم کرہ شل
نرد جو سرا ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے جو ٹوپ کہلاتا ہے۔اسکے بنانے
میں ایک بہت بڑی صنعت یہ کیگئی ہے کہ پتھروں کو بغیر کسی مصالحہ او چونہ
کے باہم وصل کیا ہے۔اور مہندس نے کچھ ایسے حساب سے گنبد بنایا
ہے کہ گرد وغبار اُس پر نہیں ٹھہرتا اور نہ گھاس جمتا ہے نہ کوئی خود رو
درخت پیدا ہوتا ہے۔باوجودیکہ اُس پر کوئی استرکاری اور پلاستر
نہیں ہے مگر تمام جوڑ ایسے لگے ہوئے ہیں کہ کوئی ابتک نہیں کھلا۔
لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس پر ۴ انچہ چونہ کا پلاستر تھا اور
اُس پر غالباً رنگین تصاویر تھیں لیکن عمارت کی دیگر حالتیں دیکھتے
ہوئے یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ تمام تر تصاویر تو پتھروں پر
کندہ کیجائیں اور کمال صنعتگری دکھلانے میں استحکام کا خیال رکھا جا
لیکن وسط میں جو تصاویر بنائی جائیں وہ ایسی نقش بر آب تیار ہوں
جنکے فوری مٹ جانے کا خیال بنانے کے ساتھ ساتھ آرہا ہو۔قطر گنبد
کا ۱۰۶ فٹ بلندی ۴۲ فٹ ارتفاع دیوار جس پر گنبد قایم ہے ۱۴
فٹ کرسی ۵ ۱/۲ فٹ اور چبوترہ ڈھائی فٹ ہے۔ ۵۰ گز لانبے اور
۱۰۰ گز چوڑے صحن کے بیچ میں یہ گنبد بنا ہوا ہے اور چاروں طرف
کٹہرہ کی صورت سنگین حصار ہے۔اس چار دیواری میں بھی چونہ لوہا
شیشہ وغیرہ بجائے وصل سنگ کچھ نہیں ہے کاریگروں نے مثل کارنجاری
سل نکال کر ایک پتھر کو دوسرے سے ایسا صحیح وصل کیا ہے کہ اُن کے
جوڑ ہنوز بدستور پیوستہ ہیں۔اسکی بلندی تقریباً دس فٹ ہے اور ہر
چہار سمت چار دروازے ۳۴-۳۴ فٹ اونچے بنے ہوئے ہیں۔
ہر ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک پتھروں کے خوبصورت
جنگلہ میں ۲-۲ فٹ کے فصل سے ڈھائی ڈھائی گز اونچے مثمن ستون
ہیں۔دروازوں کے بالائی حصہ پر اور نیچے تک تمام بازوں پر
نقاشی کا کام ہے جسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے
سامنے پتھر موم ہوجاتا تھا کہ جو چاہا بنالیا۔جانور اور انسانوں کی
تصویریں کچھ اس انداز سے بنائی ہیں جنکو غور سے دیکھنے کے بعد
اُن کے کمال نقاشی اور اُن کی خداداد ذہانت اور طباعی پر حیرانی
ہوتی ہے اور بیساختہ زبان سے نکل جاتا ہے ع

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

مثلاً ایک عورت ہے، سر پر بوجھ پڑنے سے اُس کی کمر دوہری ہوگئی
ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسی حالت میں انسان کے چہرے اور اعضا
پر کس کس طرح اثر پڑتا ہے۔بس وہی تصویر میں دیکھ لیجئے۔ایک
دوسری عورت کی کمر میں لچک آگئی ہے تو اُس کے چہرہ پر جو کیفیت
پیدا ہونا چاہیئے وہی اس تصویر میں موجود ہے۔شیروں کی تصاویر
جو دروازہ کا بالائی حصہ اپنے سروں پر تھامے ہوئے ہیں اس
خوبصورتی سے بنائی گئی ہیں کہ دیکھنے والے عش عش کر جاتے ہیں
مہیب شکل ہو بہو اصلی شیر کی مانند ہے۔دروازہ کے بارسے جسم
اور پنجوں پر پٹھوں کے ذریعہ سے تحریک پہنچی ہے۔چار بڑے ناخن
پنجے کے سامنے ہیں۔اور ایک چھوٹا ناخن پنجے کے نیچے اُٹھا ہوا ہے
چاروں دروازوں پر چار بڑے بڑے مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔یہ
غالباً گوتم کے بت ہیں۔ان میں باعتبار تفاوت عمر جسمانیت کا فرق
دکھلایا گیا ہے جو بت تراشی اور تصویر سازی کا انتہائی کمال ہے۔

خُردبین سے تمام جسم کے مسامات، نشانات عروق، ہڈیوں کے جوڑ بجنسہٖ
ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے زندہ انسان کے جسم پر محسوس کئے جاتے ہیں
اس گنبد سے تھوڑی دور پتھر کے دو ایسے ترشے ہوئے
حجرے ہیں جنمیں قوی ہیکل قوی جثہ انسان کی ایک ایک مورت
بنی ہوئی ہے۔ ایک ہاتھ میں تلوار ایک میں ڈھال آسن مارے
بیٹھی ہیں جنکو دیکھکر رُعب غالب ہوتا ہے۔ ایک مجسمہ صحیح حالت میں
ہے۔ دوسرے کا سر کسی نے توڑ ڈالا ہے اور وہ اُسی جگہ پڑا ہے۔
اِن حجروں کے قریب دُور تک ایک دالان بنا کر اُس میں چھوٹی چھوٹی
کوٹھریاں بنائی گئی ہیں جنکی چوکھٹوں پر ننگی تصویریں بنی ہیں اور
یہ سلسلہ حجروں تک پھیلا ہوا ہے۔

ایک جگہ لاٹیں کھڑی ہیں جن پر کچھ کندہ بھی ہے۔ مگر صحیح
طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آیا وہ کسی منہدم ہو جانے والی عمارت
کا جزو ہیں یا بجائے خود ایک مستقل چیز ہیں۔

اسکے بعد تھوڑے فاصلہ پر کسی قدر نشیب میں ایک اور گنبد
ہے جو پہلے سے قد میں چھوٹا مگر اور خصوصیات کے اعتبار سے بالکل
برابر ہے۔ وہی چار دروازے اور وہی ہیئت ہے البتہ نقاشی اسقدر
نہیں ہے۔ کہیں کہیں ستونوں پر بیل بوٹے اور طیور وغیرہ کے نقشے
بنا دیئے ہیں۔ ہر دروازہ پر ایک نازنین خاص انداز سے شاخ گل
ہاتھ میں لئے کھڑی ہے۔ عام طور پر یہ دونوں گنبد ساس بہو کے بھٹے
کے نام سے مشہور ہیں۔ اسکے علاوہ اور بہت سے کھنڈر کچھ در و دیوار
اکثر منہدم شدہ عمارتوں وغیرہ کے نشانات کا سلسلہ دور تک پھیلا
ہوا ہے جس کا مفصل تذکرہ کننگھم صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے
اور بعض بعض مقامات کی تصویریں اُس میں شامل کی ہیں جو ۱۸۵۴ء
میں بھیلسہ ٹوپس کے نام سے شایع ہوئی ہے۔

بہرکیف سانچی کے موجودہ نقشہ سے فرگسن صاحب کی رائے
کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ مگر جب ایلورا اور اجنتا کے غاروں کی
صنعت اور نمونوں پر غور کیا جاتا ہے جہانتک اُن کو بودھ سے تعلق
ہے تو صاحب موصوف کی رائے کا کلیۃً ٹوٹ جاتا ہے۔ نیز دیگر ایسی
عمارات بھی اُسکی تصدیق نہیں کرتیں۔

سنہ ۱۲۶۶ھ میں میجر الگزنڈر صاحب نے جو مسٹر جوزف ڈلوی
کننگھم صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال کے حقیقی بھائی تھے چند ہفتہ سانچی
میں قیام فرما کر اِن بھٹوں کی پوری تحقیقات کی اور سُرنگ لگا کر گنبد
کے اندر داخل ہوئے۔ وہاں اُن کو ایک سنگین صندوق ملا۔ جب
وہ باہر لا کر کھولا گیا تو اُس میں سے ایک سنگ مرمر کا پیالہ نکلا جسمیں
اُستخوانہائے سوختہ مروارید ناسفتہ آمیز بر آمد ہوئیں۔ موتی تمادیِ
ایام سے زرد بے آب ہو گئے تھے۔ دیگر برجوں سے بھی پتھر کے صندوق
اور مُردوں کی ہڈیاں اور خاکستر ملیں اور اُن کے نام پیالوں اور
ڈبیوں پر جو صندوقوں ہی کے اندر سے نکلیں تھیں کندہ پائے۔ چنانچہ
صاحب موصوف نے اپنی تحقیقات کے نتائج ایک ضخیم کتاب میں
شایع کر دیئے۔

ڈاکٹر فرگسن صاحب نے بھی ایک کتاب "درخت اور سانپ کی
پرستش" میں اِن آثار پر تفصیل سے بحث کی ہے اور جگہ جگہ مناسب و
ضروری تصویرات سے اُسے مزین کیا ہے۔ لیکن سانچی کی عمارت کے
متعلق وہ کوئی صحیح رائے قایم نہیں کر سکے۔ اُن کے نزدیک یہ گنبد کسی
متبرک چیز کی یادگار کے طور پر بنائے گئے ہیں۔

اسی طرح کننگھم صاحب نے بھی غدر سے کئی سال پہلے اِن آثار کی
طرف توجہ کی تھی۔ لیکن واقعی طور پر وہ بھی نہیں بتلا سکے کہ اصل میں
یہ ٹوپ کیا چیز ہیں۔ دراصل انھوں نے براہِ راست صرف سانچی ہی کی
تحقیقات نہیں کی تھی بلکہ انھیں یہ علم ہوا تھا کہ بودھ کی یادگاروں کا
ایک بہت بڑا مجموعہ بھیلسہ کے پاس ہے جو مشرق و مغرب میں ۱۷ میل

اور شمال جنوب میں ۱۶ میل کی وسعت کو گھیرے ہوئے ہے۔ اُسی سلسلہ میں سانچی بھی شامل ہے۔ اسی لحاظ سے اُنھوں نے خاص سانچی کی زیادہ چھان بین بھی نہیں کی البتہ میجر الگزنڈر صاحب کی تحقیقات کا مقصد یہی تھا کہ وہ اس بات کا کھوج لگائیں اور معلوم کریں کہ یہہ عمارت اس قسم کی کیوں بنائی گئی ہے اور اس میں کیا خاص بات ہے۔ مزید برآں اُنھیں اپنی تحقیقات کو جاری رکھنے کے وسائل بھی حاصل تھے۔ انھیں آسانیوں کی بدولت بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ یہہ گنبد مسمی آریہ پرش کی چھتری ہے جو ملت بودھ کا ایک زبردست پیشوا تھا اور دوسرے برآمد شدہ صندوقوں میں بھی بزرگان دین بودھ کی خاکستر و استخوان رکھکر اُن سے تابوت کا کام لیا گیا ہے اور یہہ عمارت نشان مدفن یا مقبرہ ہے۔ نیز موضع سُناری میں جو گنبد اس نمونہ کا ہے وہ دھرم گپت کی چھتری ہے اور موضع ست دھرا والا گنبد مسمی گوپی گپت کی چھتری ہے۔ یہہ دونوں شخص آریہ پرش کے مریدین خاص اور خلیفہ تھے۔

بودھ مذہب کے ابتدائے یہہ رواج تھا کہ جب کوئی مقدس شخص مرجاتا تو اُسکی خاک کو دفن کرکے بطور مقبرہ کے اُسپر عمارت بنادی جاتی تھی چنانچہ حال میں بنارس کے قریب مقام سارناتھ سے ایسی خاک برآمد ہو چکی ہے۔ اور پشاور کے قریب سے خود بودھ اعظم کی خاک ملی ہے جسکو گورنمنٹ عالیہ نے نہایت احترام کے ساتھ زمانہ موجودہ کے پیشوائے ملت بودھ کو دیدیا۔

تھوڑا عرصہ ہوا کلکتہ میں ایک سوسایٹی بصدارت بابو زیندر رناتھ سین (اڈیٹر اخبار انڈین مرر) اس غرض سے قایم ہوئی تھی کہ بودھ کے متعلق علمی ذخیرہ اور تاریخی معلومات جس قدر ممکن ہو بہم پہنچا کر دیسی زبانوں میں اُسکی اشاعت کیجائے۔ مگر افسوس ہے کہ ان آثار کی بابتہ ابھی تک کوئی واقفیت حاصل نہیں کی گئی اور نہ آیندہ کوئی اُمید ہے۔ لیکن اہل ہند کی اس عدم توجہی سے باکمالان سلف کے کارنامے دنیا کی نظروں سے چھپے نہیں رہ سکتے۔ قدردان اور کمال پسند لوگ دُور دراز ممالک سے آکر اُن کے حسن کمال کی داد دیتے ہیں۔

میجر الگزنڈر صاحب کا قول ہے کہ جو مطابقت اصلی و رعایتی، وضع وہیئت، اور تناسب اعضا، کی سانچی کی مورتوں میں موجود ہے وہ صناعت یونان سے مقابلہ کرتی ہے۔ سب سے بڑا کمال ان صنعتگران ذی ہنر نے یہ کیا ہے کہ اپنے زمانہ کے طرز معاشرت کا پورا فوٹو کھینچ کر اب سے ڈھائی ہزار سال کا طریق تمدن آئینہ کر دیا ہے۔ ہنگامہ زیست کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسکی تصویر انتہائی خوبی کے ساتھ نہ دکھلائی گئی ہو۔

کہیں شہر آباد ہے، بازار کھلے ہوئے ہیں، سوداگر خرید فروخت میں مصروف ہیں، دوکانوں پر خریداروں کا ہجوم ہے، ہر قسم کی اجناس اور اشیاء باقاعدہ رکھی ہوئی ہیں، دوکانداری کا طریقہ، خریداری کی شان، طرز فروخت، دوکان کی آرایش، اجناس کی ترتیب قابل لحاظ ہے کسی جگہ سڑک پر گاڑیاں چلی جارہی ہیں۔ رتھیں ہیں، بہلیاں ہیں، اندر آدمی بیٹھے ہیں، گاڑیبان ہانکتا جاتا ہے، لگام اور راسیں ہاتھ میں ہیں۔ ایک جگہ بگھی دو اسپہ کی تصویر ہے کسی جگہ جابک سواری کا انداز دکھلایا ہے۔ کہیں بادشاہ کے جلوس کا منظر قابل دید ہے۔ تمام حشم خدم سے راجہ کی سواری جارہی ہے۔ نوکر، چاکر، اردلی، سوار وغیرہ ساتھ ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم، آدمیوں کی چہل پہل عجب دلچسپ منظر ہے۔ آبادی کے سادہ رُخ پر چند عورتیں کنویں سے پانی بھرتی نظر آتی ہیں۔ بعض گگرے بھر کر لیچلی ہیں، کچھ گھڑے لئے آرہی ہیں، ایک پانی کھینچ رہی ہے۔ دوسری جانب گھریلو زندگی کا نقشہ کھچا ہوا ہے۔ مستورات گھر کے کام کاج میں مصروف ہیں۔ کوئی اناج درست کر رہی ہے، کوئی چکی پیس رہی ہے، کوئی روٹی پکاتی ہے، کسی نے بچہ کو گود میں لیکر کھلانا شروع کیا ہے۔ کسی مقام پر مندر بنے ہوئے ہیں۔ لوگ پوجا پاٹ میں

معروف ہیں، طرزِ پرستش کی بعینہٖ شبیہ کھینچ دی ہے۔ تمام لوازماتِ عبادت موجود ہیں۔ کسی سمت ندی بہتی ہے، گھاٹ پر لوگ نہا رہے ہیں، بیچ دریا میں کشتیاں چلی جاتی ہیں، ملاح کھے رہے ہیں، سیرِ دریا کے شائق لطف اُٹھا رہے ہیں، کوئی کشتی کنارے سے جا لگی مسافر اُتر کر خشکی پر آئے ہیں، بعض کھڑے ہیں، بعض روانہ ہوگئے۔ کہیں باغ ہے کہیں صحرا۔ چراگاہ میں گائے بھینس چرتی نظر آتی ہیں کسی طرف بکریوں کا گلہ ہے۔ کسی سمت سے ہرن بھاگے آرہے ہیں۔ کہیں کاشتکاری کا سماں دکھایا ہے۔ ایک جگہ میدانِ کارزار گرم ہے۔ نبرد آزما مصروفِ جنگ ہیں۔ فوجیں لڑ رہی ہیں، سپاہیوں اور کمانڈروں کی شان عجب آن بان رکھتی ہے، بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دے رہے ہیں، تبر، تلوار، نیزے، بھالے اپنا کام کر رہے ہیں، شہر کا محاصرہ کر دیا گیا ہے، فتح و شکست دونوں کی سینریاں نظر آتی ہیں۔ ہاتھی گھوڑے سازوسامان مالِ غنیمت سبھی کچھ ہے، جو بمقابلہ لکھنے کے زیادہ تر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور اہلِ ہند کی قدیم صناعی اور فن صورتگری پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ یقین کرنے میں بھی تامل ہے کہ آیا یہ گلکاریاں صناعانِ ہند کی ہیں بھی یا نہیں بہت سے اشخاص نے اس نقاشی کو اہلِ چین سے منسوب کیا ہے۔ کیونکہ فن مصوری کی ایجاد کا سہرا چین والوں ہی کے سر رہے اور یہ لوگ ۳۰۰۰ قبل مسیح سے اس میں ترقی کر رہے تھے۔ چنانچہ ابوالفضل عباس شروانی نے لکھا ہے کہ مسمی آریہ پرش شاہ چین کا گرو یعنی مرشد تھا۔ اُسکے مرنے کے بعد فغفور چین نے چار سو سنگ تراش بھیجکر اُسکی چھتری (مقبرہ) بسبیل یادگار بنوا دیا۔ جسکی تصدیق مؤرخ مذکور کی ایک دوسری تصنیف سے یوں ہوئی ہے کہ یہاں سے بفاصلہ چند فرسخ قصبہ کوروائی کے پاس ایک ندی کے کنارے کہنہ آثار عمارت کے پائے جاتے ہیں اور موسم بارش میں چار رتی سے ۳ ماشہ تک کا مسمی پیسہ اور شاذ و نادر نقرئی سکہ (بھی) اُس ویرانہ کی زمین سے ملتا ہے اُس پر چینی حروف مسکوک معلوم ہوتے ہیں۔ مولانائے موصوف نے اپنی تالیف "نقدِ رواں" تاریخ سکہائے شاہان میں اُن کا نقشہ بھی دیا ہے لیکن جبکہ متعدد ذرایع سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سانچی کی عمارت ۶ سو ۷ سو برس قبل مسیح تیار ہوئی ہے یا کم از کم راجہ اسوکا کے وقت میں اس عمارت کی بنیاد پڑی ہے تو اس بیان کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے کہ حجارانِ چین نے یہ گلکاریاں کی ہیں۔ کیونکہ سنہ عیسوی کی چوتھی صدی میں بودھ مذہب چین میں شاہی مذہب ہوا ہے اور ۶۲ء سے قبل تو چین میں کوئی شخص بودھ دھرم کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔

بعض محققین نے کچھ تو اُن کتبوں کی مدد سے جو سانچی کے آثار قدیمہ پر جگہ جگہ کندہ ہیں اور کچھ علم آثار و اُسکے متعلقات سے موجودہ عمارت سانچی کی قدامت پر یہ رائے قایم کی ہے:- گنبد ۴۰۰ برس سے ۹۰۰ برس تک قبل مسیح حصار ڈھائی سو برس قبل مسیح اور دروازے ۴۰ برس قبل مسیح تیار ہوئے ہیں۔ مگر یہ اندازہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ عمارت بودھوں سے تعلق رکھتی ہے۔ پس اگر یہ بات بھی غلط ثابت ہو جائے کہ گنبد مذکور آریہ پرش کا مدفن نہیں تاہم ۹۰۰ برس قبل تک اسکی قدامت کا خیال اسوجہ سے باطل ہے کہ گوتم کی پیدایش ۶۲۳ برس قبل حضرت عیسیٰ لمبنی باغ میں ہوئی ہے۔ اس حساب سے ۳ سو برس قبل اس مکان کا بنایا جانا ناممکن ہے۔ دوسرے عام قاعدہ کے مطابق جب کوئی عمارت بنائی جاتی ہے تو معمولاً اُسکو مکمل حالت میں پہنچا دیا جاتا ہے اور اگر بتدریج اُسکی تکمیل ہوتی ہے تب بھی اُس میں صدیوں کا فرق اور بُعد نہیں پڑتا۔ اسلئے درست یہی ہے کہ کل عمارت تقریباً ساتھ ہی تیار ہوئی ہے۔

ایک بات اور بھی کہی جاتی ہے کہ پھاٹکوں اور تورنوں پر

سانچی کے ثوپ کا مغربی پھاٹک

انڈین پریس الہ آباد

جو تصاویر کندہ ہیں اُن میں گوتم کی زندگی کے خاص خاص واقعات دکھلائے گئے ہیں۔ مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ گوتم کے صحیح حالات بہت ہی کم معلوم ہوئے ہیں اور جو کچھ اُسکی زندگی کے متعلق معلوم ہوا ہے اُسمیں بھی سخت اختلاف ہے۔ گوتم اور اُسکے مذہب کے حالات دریافت کرنیکا بہت بڑا ذریعہ بودھ مذہب کی کتاب مقدس ہے جسکا نام "پتکا" ہے۔ اسکے ۳ حصے ہیں اور ۳ مختلف زمانوں میں لکھے گئے ہیں۔ مگر گوتم کے عہد میں کوئی جزو قلمبند نہیں ہوا۔ بلکہ گوتم کی پیدایش سے ۳۷۴ برس بعد تک اُنکے لکھے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اسلئے اُن کی صحت بھی یقینی نہیں ہے۔ بالعموم جو لوگ خاص دل و دماغ رکھتے ہیں اور کسی خاص ریفارم کے بانی ہوتے ہیں اُن کی پیدایش اور زندگی کے حالات تعجب آمیز فسانوں کے ساتھ مشہور ہو جاتے ہیں اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مبالغہ کی ہتیں اُن پر لپٹی جاتی ہیں عقیدتمند لوگ آمنّا وصدقنا کہکر سچے دل سے اُن پر یقین کرتے ہیں۔ اس لئے پتکا کے لکھنے والے بھی اِن مغالطوں سے نہ بچ سکے یا مصداق پیراں نمی پرند مریداں می پرانند خود اِن جامع اوراق صاحبان نے اِن اضافوں کو قابل قدر سمجھکر مصلحت کوشی سے کام لیا جس کی تصدیق ہر سہ کتب کے باہمی اختلافات سے ہوتی ہے جنمیں تاویل کی ذرا بھی گنجایش نہیں۔ سب سے بڑا واقعہ جس سے گوتم کی زندگی میں تبدیلی واقع ہوئی اور جسکی وجہ سے آج تمام دنیا اُسے بودھ اعظم کے لقب سے پکارتی ہے مردہ، بیمار، ضعیف، فقیر کا دیکھنا اور ایکدم سے متاثر ہو جانا مشہور عام ہے۔ لیکن اِن کتب مقدسہ میں یہی واقعہ ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف شان رکھتا ہے۔ اُس پر طرّہ یہ ہے کہ بعض قصص اور واقعات اس قدر بعید از قیاس ہیں، جنکو عقل سلیم ایک منٹ کے لئے باور نہیں کرسکتی جسکی وجہ سے راستی اور دروغ میں امتیاز ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً جب گوتم حمل میں تھا تو ۳۲ علامتیں نظر آئیں۔ نابینا بینا ہو گئے، بہرے سننے لگے، گونگے بولنے لگے، لنگڑے چلنے لگے، قیدی جیل سے آزاد ہو گئے۔ یا بودھ پیدا ہوتے ہی سات قدم چلا اور بلند آواز سے کہا کہ مَیں دنیا کا مالک ہوں وغیرہ اسلئے بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ بودھ درحقیقت کوئی شخص ہی نہ تھا بلکہ مذہب بودھ فلسفہ سانکھیہ سے نکلا ہے۔ نظر بحالات اِن تصاویر کی وہ تشریح قابل اعتبار نہیں جو اکثر دیکھنے والے گوتم کے مشہور حالات سے مطابق بنا کر بیان کرتے ہیں۔ چونکہ اس مرقع میں عہد ماضیہ کا پورا پورا طرز معاشرت دکھلا دیا گیا ہے اسلئے اُس زمانہ کے ہر مشہور شخص کی زندگی سے اُن کو تعلق کیا جا سکتا ہے اور زمانۂ حال کی ناول نویسی کے ہزاروں عجیب سے عجیب واقعات کے خاکے اس نقشہ پر تیار ہو سکتے ہیں ورنہ بنانیوالوں کی تو اس نقاشی سے صرف اتنی غرض تھی سہ

غرض نقشیست کز ما یاد ماند — کہ ہستی را نمی بینم بقائے

او! دلفریب منظر او سبزہ زار "سانچی" — او! جلوہ گاہ فطرت او کوہسار "سانچی"

او! خوشنمائیوں سے دل کو لبھانیوالے — او! جانفزائیوں کا نقشہ جمانے والے

اس تیری دلکشی سے ممنون ہے نظارا — اک عالم لطافت ہر سو ہے آشکارا

سر سبز جھاڑیوں کا یہ سلسلا ادھر کو — بے اختیار کھینچے لیتا ہے جو نظر کو

چڑیوں کا اُس طرف سے وہ چہچہاتے آنا — خوش خوش سُروں کے نغمے سُناتے آنا

وہ پیڑ اونچے اونچے ہر سمت سایہ افگن — یہ کھرنیوں کا جنگل! سیتا پھلوں کا وہ بن

دامانِ دشت میں یہ لطفِ شکار دیکھو — وہ چرتی پھر رہی ہے ہرنوں کی ڈار دیکھو

صحرا کا چپا چپا کیسا ہرا بھرا ہے — دلچسپ فرش مخمل خوش رنگ سبزے کا ہے

پھولوں سے لد رہی ہیں وہ پتلی پتلی بیلیں — اُلجھیں تو مثل کاکل دل عاشقوں کا لے لیں

میداں جو یہ پڑا ہے رونق کا گھر یہی تھا — دیسا نگر یہی تھا۔ سنکا نگر یہی تھا

یہ پر فضا پہاڑی اعدا اسپہ یہ عمارت — عہد عتیق کی جو دکھلا رہی ہے صنعت

دورِ زماں جہاں سے جسکو شمار رہا ہے — اور بے ثباتیوں کا عالم دکھا رہا ہے

جسپر بنے ہوئے ہیں نقش و نگار ابتک　　جو اپنے بانیوں کے ہیں یادگار ابتک
تبلا رہے ہیں دورِ رفتہ کی شان و عظمت　　سمجھا رہے ہیں اگلے وقتوں کی ساری حالت
کیا رفتگان ہستی کی باکمالیاں ہیں　　اِن پتھروں میں پنہاں نازک خیالیاں ہیں
پتھر کی مورتیں ہیں انداز ہیں پری کے　　اعلیٰ یہ ہیں نمونے فنِ مصوری کے
ہر ایک نقش اس کا تاریخ کا ورق ہے　　ہر ایک اس کا کتبہ بھولا ہوا سبق ہے
اگلی زراعتوں کا اگلی تجارتوں کا　　اگلی ترقیوں کا اگلی عمارتوں کا
پوری معاشرت کا فوٹو کھچا ہوا ہے　　گویا ہر ایک پتھر جامِ جہاں نما ہے
طرزِ تمدن اگلا رسم و رواج پیشیں　　رنگ حکومت اگلا اورتخت و تاج پیشیں
نظارے کو لبھایا صنعتگری دکھا کر　　ایامِ ماضیہ کو رکھا ہے آگے لا کر
ہنگامہ زارِ ہستی کا عکس لے لیا ہے　　اچھا برا نمونہ ہر رنگ کا دیا ہے

ہے اس کا ہر مرقع اخبارِ زندگانی　　دکھلا دئے ہیں سارے اطوارِ زندگانی
ہر شکل سے دکھایا نیرنگ کو انھوں نے　　آئینہ کر دیا ہے ہر سنگ کو انھوں نے
یہ ٹھوس اس کا گنبد کہتے ہیں ٹوپ جسکو　　اک پیشوائے دیں کی چھتری سمجھئے اسکو
ہندوستان میں تھا انسان اک مکرم　　دنیا میں آج جو ہے مشہور بودھ اعظم
وہ اک جدید مذہب کا تھا جہاں میں موجد　　یہ اُسکے پیروانِ ملت کے ہیں معابد
جاپان - چین - تبت - نیپال - اور لنکا　　ابتک ہیں اُسکے پیرو بھرتے ہیں دم اُسی کا
"سانچی" تجھے یہ حاصل اک اور بھی شرف ہے　　بودھا کے پیرواں کا تو مدفنِ سلف ہے
کچھ اور بھی کھنڈر ہیں کچھ اور بھی مکاں ہیں　　دورِ مسیح سے بھی پہلے کے یہ نشاں ہیں

دکھلائے ہیں جو ہر اپنے کمال والے
ارشد! تجھے وہ دکھی کیسے جاہ و جلال والے

ارشد تھانوی

آنریبل مولوی سید حسین بلگرامی

الملقب بہ نواب عماد الملک بہادر سی آئی ای

دکن کی دلفریب مگر پُر انقلاب سرزمین ہمیشہ سے اپنی بےنظیر زرخیزی و فیاضی، سیر چشمی و مہمان نوازی کی بدولت بلاد ایشیا کے سیاحوں، فاتحوں، اور اہل کمال کے لئے قسمت آزمائی اور دلکشی کا باعث رہی ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں بڑی بڑی جلیل القدر پُر شان و شکوہ ہندو و مسلمان راجدھانیاں و سلطنتیں پیدا ہوئیں، بڑھیں اور آخرکار قانون زوال کے تحت میں آکر زمیں دوز ہو گئیں۔ اگر آج کوئی بیجانگر و بیجاپور، بیدر و ورنگل اور گولکنڈہ کے خاموش کھنڈروں کا، جو کسی وقت مشہور دارالسلطنت تھے، مطالعہ کرے تو یہ خاموش کھنڈر عجیب و غریب فصاحت سے اپنی گذشتہ عظمت کی داستان سُناتے ہیں۔ اب ان کُل عظیم الشان حکومتوں کا باقیات الصالحات صرف وہ ٹکڑا رہ گیا ہے جو ممالک محروسہ سرکار نظام کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا پایہ تخت حیدرآباد فرخندہ بنیاد ہے مگر اسکا قدیم اصلی اور موزوں نام بھاگ نگر یعنی بخت نگر تھا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں اب بھی کچھ تھوڑا سا اندازہ مشرقی دارالحکومتوں (مثلاً بغداد و دہلی) کا ہو سکتا ہے۔ دہلی و لکھنؤ کے مٹنے کے بعد اب صرف یہی ایک شہر باقی رہ گیا ہے جس نے ہندوستان کے فلک زدہ اہل ہنر و باکمال صاحب لیاقت لوگوں کے لئے اپنا دست کرم وسیع کیا اور انکی قدردانی کی ہے۔ شاہان دکن کی قدردانی و فیاضی ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے۔ ان کی قدردانی و فیاضی کی بدولت دکن میں بڑے بڑے اہل سیف و قلم و باکمال افراد کو اپنے جوہر دکھانے و فروغ حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ شاہان بہمنیہ کے زمانہ میں محمود گاواں ایک

ایرانی تاجر کو اپنی خداداد لیاقتوں کی ترقی و اظہار کے لئے ایسا عمدہ موقع ہاتھ لگ گیا کہ آخر کار وہ دربار بہمنی میں باوجود مختلف پارٹیوں کی کشمکش کے سلطنت بہمنیہ کا ایک نہایت ہی لایق و مشہور وزیر بن گیا۔ اُسکے عہد کی علمی مادی و اخلاقی ترقیوں کا کچھ سُراغ اُس مشہور یونیورسٹی سے لگتا ہے جسکے کھنڈر صوبہ بیدر میں اب تک موجود ہیں اور راقم نے ان کا معائنہ کیا ہے اور آجکل اس کھنڈر میں بیدر کا ہائی اسکول ہے۔

تاریخ اپنے صفحات کو ہمیشہ دُہراتی رہتی ہے۔ جس طرح سلطنت بہمنیہ میں محمود گاوان نے محض اپنی ذاتی لیاقت، دیانت داری و حسن تدبیر سے تمام ملکی و غیر ملکی نئی و پرانی پارٹیوں، سے اپنا ادب و اعتماد کرا لیا اور وزارت تک ترقی کی، زمانہ حال میں اُس کی عمدہ مثال عالیجناب آنریبل مولوی سید حسین بلگرامی الملقب بہ نواب عماد الملک بہادر ہیں۔ آپ کی زندگی اولوالعزم نوجوانان ہند کے لئے نہایت سبق آموز ہے۔

آج جس شخص کو عماد الملک یا "ستون سلطنت" کا اعلیٰ لقب و مرتبہ سلطنت نظام میں حاصل ہے اُسکی ابتدا اودھ کے ایک چھوٹے مگر مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام سے ہے۔ یہ قصبہ عرصہ دراز سے اسم بامسمیٰ رہا ہے کیونکہ یہاں سے بڑے بڑے گرامی افراد و صاحب کمال انسان پیدا ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان پر مرز بوم، وراثت، روایات و تربیت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہ باتیں اُسکی اولوالعزمی کی محرک ہوتی ہیں اور کوئی شک نہیں کہ بلگرامی ممدوح کو بھی اپنے قصبہ پر فخر ہے کیونکہ اُنھوں نے باوجود اتنی اعلیٰ ترقیوں کے اپنے نام کے ساتھ اپنے قصبہ کی شہرت کو بھی قایم رکھا ہے۔ آپ بلگرام کے ایک قدیم اولوالعزم و عالم خاندان سادات سے ہیں جو چند صدی قبل قصبہ واسطہ صوبہ عراق عرب سے ہجرت کرکے بلگرام میں آبسا تھا۔ اور شاہان مغلیہ کے عہد میں نہایت ممتاز تھا۔ علم و کمال کا شوق، اولوالعزمی و حوصلہ مندی ہمیشہ سے آپ کی خاندانی خصوصیت رہی ہے اور انھیں اوصاف عالیہ کی بدولت آپ کے خاندان نے اپنے مرتبہ و ہستی کو بخوبی قایم رکھا ہے۔ ہندوستان میں عہد انگلشیہ کے اوائل ہی میں آپ کے بزرگوار اپنی شرافت خاندانی و لیاقت ذاتی کی بدولت اچھے اچھے مناصب پر فائز رہے۔ خاندانی روشن خیالی و زمانہ شناسی کی بدولت آپکا خاندان شروع ہی سے اُن تعصبات و اوہام سے بہت کچھ بری رہا ہے جنکی بدولت آج مسلمانوں کا کثیر طبقہ جہالت، ذلت، اور خواری میں مبتلا ہو رہا ہے۔ مثلاً یوروپی علوم و فنون اور انگریزی زبان سیکھنے کی ضرورت کو آپ کے خاندان نے اب سے سو سال قبل ہی محسوس کر دیا تھا۔ اسی طرح بعض نہایت مضرت رساں تمدنی خرابیوں کی اصلاح کے متعلق آپ کا خاندان ہمیشہ مستعد رہا ہے اور اس بارہ میں قدامت پسندی کے مقابلہ میں سود مندی کو ترجیح دی ہے۔

یہ خاندانی خصوصیتیں تھیں جنہیں مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے جنم لیا۔ غیر معمولی ذکاوت و ذہانت آپ کو بطور خاندانی ورثہ کے حاصل ہوئی اور بچپن ہی سے آپ میں خداداد ذہنی قابلیتیں نظر آنے لگیں۔ اس موقع پر جس خاص اور اہم بات کی طرف میں اپنے ناظرین کی توجہ کو مائل کرانا چاہتا ہوں اور جس کو جناب بلگرامی صاحب ممدوح کی کل ترقیوں کی بنیاد سمجھنا چاہیئے وہ اُن کی ابتدائی تعلیم ہے۔ خوش قسمتی سے آپ کو شروع ہی سے ایسے اعلیٰ و تجربہ کار استاد ملے کہ جو کچھ اور جس قدر آپ نے سیکھا وہ ضروری اور مفید تھا اور اُسکو آپنے اچھی طرح سے سیکھا۔ دنیا میں جتنے نامور لوگ گذرے ہیں اگر اُن کی ترقی کے راز کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کو اپنی فطرتی ذہنی قابلیتوں کے ساتھ خوش قسمتی سے اعلیٰ درجہ کے استاد حاصل ہوئے تھے۔ تاریخ اسلام میں الغزالی، طوسی، سعدی، وغیرہ سب کے حالات سے اس صداقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ فی زمانہ ایک عام رواج یہ دیکھا جاتا ہے کہ نوعمر

ہونہار طلبا خام و ناتجربہ کار اُستادوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ استاد طلبا کی مختلف ذہنی قابلیتوں کی بہت کم جستجو یا لحاظ کرتے ہیں اور کتابوں کے انبار کے انبار شاگردوں پر لادتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

"Jack of all trades and master of none."

بن جاتے ہیں میں نے اسی موقع پر خود جناب بلگرامی صاحب ممدوح کی زبان سے یہ سنا ہے کہ مطالعہ میں سب سے اہم بات یہ ہو کہ کتابوں کے انبار میں سے صرف چند عمدہ تصنیفات منتخب کرنا اور ان کو اچھی طور سے مطالعہ کرنا بہ نسبت بہت سی غیر مفید کتابوں کے سرسری طور پر مطالعہ کرنے سے نہایت مفید و مناسب ہے۔ آج بلگرامی صاحب ممدوح کی عربیت و انگریزیت کا جو سکہ ہندوستان و یورپ میں بیٹھا ہے وہ بہت کچھ اُن ابتدائی تعلیم کا نتیجہ ہے جو خوش قسمتی سے آپ کو ایام طفولیت میں حاصل ہوئی۔ ملک میں اسوقت درجنوں نہیں بلکہ ہزاروں ماسٹر آف آرٹس (ایم اے) ایل ایل ڈی وغیرہ موجود ہیں مگر ۱۹۰۶ء کے اُس مشہور محمڈن میموریل کے مسودہ کے لئے جو شملہ گیا تھا بجز آپ کے کوئی موزوں شخص نہ ملا! یہ وہ پُرزور میموریل تھا جسکے معقول دلائل و اعلیٰ فصاحت سے شملہ و انگلستان کے بڑے بڑے مدبر و اہل قلم مسلمانوں کے قلم کا لوہا مان گئے۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بجز مسلمانوں کے دعاوی قبول کرنے کے کوئی اور چارہ نہ رہا۔ اور کوئی شک نہیں کہ اس میموریل کے بعد مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ایک نئی زندگی و دَور کا آغاز ہوتا ہے۔

بلگرامی صاحب ممدوح کی ابتدائی زندگی جہاں تک کہ اُن کے حالات سے پتہ چلتا ہے تحصیل علم و مذاکرہ علمیہ سے خصوصیت رکھتی ہے۔ لکھنؤ ایسے معدن علم و فضل میں جو ایام غدر کے قریب قریب بڑے بڑے مشرقی علما و فضلا کا مامن تھا آپ نے عربی و فارسی علم ادب میں اعلیٰ درجہ کی مہارت پیدا کی، اور اُسی پُر آشوب زمانہ میں جبکہ انگریزی زبان بمنزلہ کفر و الحاد کے سمجھی جاتی تھی آپ نے انگریزی شروع کی اور آخر کار کیننگ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کی اعلیٰ لیاقت اور زبردست کیرکٹر کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جس کالج میں آپ طالب علم تھے وہیں کے انگریزی زبان کی پروفیسری کی کرسی آپ کو عطا ہوئی۔ اُنھیں ایام میں آپ ہر طرح کے مشاغل و مذاکرہ علمیہ میں منہمک رہتے تھے چنانچہ آپ نے لکھنؤ سے ایک انگریزی اخبار جاری کیا۔ اب سے چالیس پچاس سال قبل اودھ سے انگریزی زبان کا اخبار کسی مسلمان کے اہتمام سے نکلنا کوئی معمولی و آسان کام نہ تھا۔

اودھ و بنگال میں آپ بلحاظ اپنی خاندانی شرافت، ذاتی لیاقت، پُرزور قلم، اور بے ریا و بے لوث کیرکٹر کے خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اسی اثنا میں ہندوستان کے مدبر اعظم و دکن کے بسمارک سر سالار جنگ اول اپنی زمانہ شناسی و دوراندیشی سے سلطنت نظام کی اصلاح و تجدید کی ضرورت محسوس کر رہے تھے اور اُن کو یہ فکر تھی کہ ملک کے بہترین و قابل افراد کے ذریعہ سے یہ عظیم الشان کام انجام دیا جائے اس کام کے لئے لایق و منتظم انگریزوں کا ملنا تو بہت آسان تھا لیکن اُن سے حیدرآبادی و اسلامی خصوصیات کے قایم رکھنے کی توقع مشکل کی جا سکتی تھی اور پھر ایک باجگذار ریاست میں غالب قوم کے افراد کے عنصر سے جو مشکلات و پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اُن سے سر سالار جنگ اول غافل نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے اپنی توجہ ملک ہی کے لایق و ہونہار افراد کی تلاش میں صرف کی۔ ۱۸۷۳ء میں جب وہ بہ تقریب سیر و سیاحت شمالی ہند میں تشریف لائے تو اُس مردم شناس مدبر اعظم نے فوراً سید حسین صاحب بلگرامی کی قدر شناسی کی اور اُن کو اپنے ہمراہ حیدرآباد لے جا کر اپنا پرائیوٹ سکرٹری مقرر کیا۔ اب اس بات کو قریباً بیالیس سال کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اس طول طویل زمانہ میں حیدرآباد کی جو کایا پلٹ ہوگئی ہے، انقلابات ہوئے ہیں، نصف درجن وزارتیں بدلی ہیں، یہ سب تماشے اس گرینڈ اولڈ مین آف حیدرآباد کی آنکھوں

آنریبل مولوي سید حسین بلگرامي الملقب به نواب عماد الملك بهادر سي آئي اي

انڈین پریس الہ آباد

دیکھے ہیں، اور ان سب تماشوں میں عطارد فلکی کا ایکٹ آپ نے انجام دیا ہے جس کے بیان کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ ہم یہاں صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ بلگرامی صاحب ممدوح نے اس طول طویل زمانہ میں سر سالار جنگ اول کے انتخاب کی خوبی اور اپنے بلگرام و اودھ کی عظمت کو کس خوبی لیاقت و دیانت داری سے قایم رکھا ہے۔ جب سر سالار جنگ اول نے ۱۸۷۳ء میں آپ کو اپنا پرائیوٹ سکرٹری مقرر کیا تو آپنے اپنی ذمہ داریوں کو ایسی خوبی، لیاقت، جفاکشی، بے لوثی و دیانت داری کے ساتھ انجام دیا کہ آقا اور گرد و پیش کے سب لوگ آپ کی بے حد عزت کرنے لگے۔ آپ سر سالار جنگ اول کے خاص معتمد و محرم راز ہوگئے اور معاملات ریاست کی راز داری کی اعلیٰ صفت میں آج آپ کا نام ضرب المثل ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سر سالار جنگ اول کے دو بڑے محرم راز تھے۔ خانگی معاملات میں تو سدّی عنبر جنگی وفاداری سر سالار جنگ اول کے ساتھ قریب قریب ویسی ہی تھی جیسی کہ حضرت بلال حبشی کی آنحضرت کے ساتھ، اور معاملات ریاست میں مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کو نہایت اعتماد و تقرب حاصل تھا۔ چنانچہ آپ کو جو خطابات عطا ہوئے وہ نہایت موزوں تھے یعنی مؤتمن جنگ، عماد الدولہ عماد الملک۔ سر سالار جنگ اول کا سب سے اعلیٰ لقب عماد السلطنت تھا اور بلگرامی صاحب عماد الملک کے اعلیٰ لقب سے سرفراز کئے گئے۔

بلگرامی صاحب ممدوح کے بعد حیدرآباد میں اور بھی ہندوستانی لایق افراد سر سالار جنگ مرحوم نے بلائے جنھوں نے اپنی حسن لیاقت و تدبیر سے بہت فروغ حاصل کیا اور نامور مشاہیر بن گئے مثلاً نواب محسن الملک جنھوں نے ریاست کے نظم و نسق میں نہایت کار نمایاں کئے، نواب وقار الملک جنھوں نے حیدرآباد میں معدلت عمر کی مثال قایم کرنا چاہی، مولوی چراغ علی مرحوم جنھوں نے اپنی علمی تصانیف سے اسلام کی شہرت و وقعت کو چمکایا، مولوی سید علی صاحب بلگرامی مرحوم جنھوں نے اپنے علمی تبحّر و وقار کی بدولت ہندوستان و یورپ میں شہرت حاصل کی اور اہل یورپ سے اپنا احترام کرالیا۔ اُن کی دو تصانیف تمدن عرب و تمدن ہند قیامت تک انکی زندہ یادگار رہینگی۔ یہ سب اور بہت سے اور سالار جنگی آورد ے تھے جنھوں نے اقطاعِ عالم میں اپنے ذاتی جوہر اور ریاست کی مالی فیاضی و آب یاری کی بدولت حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے نام کو روشن کیا۔ لیکن باغِ عدن کی آزمایش کی تاب نہ لاسکے۔ سالار جنگ اول کی وفات سے حیدرآباد میں عہد زریں ختم ہو جاتا ہے اور اسکے بعد حیدرآباد کی تاریخ میں ایک نہایت پیچیدہ او شخصی کشمکش کا زمانہ شروع ہوتا ہے جسکو موزوں لفظ نہ ملنے کے سبب سے عہد کمزوری کہا جا سکتا ہے۔ نیپال و حیدرآباد میں کل دارمدار ریاست کا وزیر پر ہوتا ہے اور وزارت کی قوت اور ضعف پر بہت کچھ ریاست کی نیکنامی یا بدنامی کا انحصار ہوتا ہے۔ وزیر کی قوت اور اُسکے دست و بازو اُسکے لایق مشیر ہوتے ہیں۔ یہ مشیر جس قدر لایق و تجربہ کار و اعلیٰ کیریکٹر ہوتے ہیں اُسی قدر وزارت و سلطنت کا نام ہوتا ہے۔ خوشحالی و فارغ البالی ترقی کرتی ہے۔ ملک میں اولوالعزمی و حوصلہ مندی اور اخلاق کی پاکیزگی بڑھتی ہے۔ بمشکل کہا جا سکتا ہے کہ سالار جنگ اول کے بعد حیدرآباد کی وزارت کو وہ قوت و شہرت حاصل ہوئی جو اُس کے شایان شان تھی۔ شخصیات (پارٹی اسپرٹ) کا زور بڑھنے لگا، سازشوں کی ہانڈیاں پکنے لگیں، انگریزی اثر کو دست اندازی کا موقع ہاتھ لگ گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ حیدرآباد اُن افراد عالیہ سے خالی ہوگیا جن سے سر سالار جنگ اول نے حیدرآباد کو زینت دی تھی۔ صرف مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی ذات واحد تھی جو ان تمام شخصی کشمکشوں، پارٹیوں، اور سازشوں سے الگ تھلگ رہی اور اس طول طویل زمانہ میں باوجود عمدہ سے عمدہ موقعوں اور سخت سے سخت آزمایشوں کے بھی جادۂ دیانت داری و وفاداری سے انحراف نہیں کیا۔ ۱۸۸۲ء میں جب بعہد لارڈ رپن نظام مرحوم

مسند آرائے سلطنت حیدرآباد ہوئے اور انتظام ریاست کے لئے ایک کونسل مقرر ہوئی تو اُس کی سکرٹری شپ کا جلیل القدر اور معتمد عہدہ مولوی صاحب ممدوح کو عطا ہوا اور آپنے اُس کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ جب یہ کونسل شکست ہوگئی تو نظام مرحوم نے آپ کو اپنا پرائیوٹ سکرٹری یعنی معتمد خانگی مقرر فرمایا۔ حیدرآباد میں یہ عہدہ نہایت اعتماد کا سمجھا جاتا ہے۔ اس عہدہ کے لئے ماسوائے اعلیٰ لیاقت و تجربہ کاری کے چند خاص اوصاف نہایت ضرور ہیں یعنی اعلیٰ درجہ کا راز دار و دیانت دار ہونا، ہر قسم کی پارٹی اسپرٹ کے اثر سے بری رہنا، تقرب شاہی کا ہر لحظ اور ہر ہر قدم پر خیال رکھنا۔ اسی کے ساتھ دائمی مستعدی و حاضر باشی اور دل و دماغ کی صحت و توازن کو قایم رکھنا۔ بلگرامی صاحب ممدوح نے کئی سال تک اس اہم اور نازک خدمت کو بھی ایسی خوبی و لیاقت اور دیانت داری سے انجام دیا کہ نہ صرف نظام مرحوم ہی آپ کو نہایت عزت و سرفرازی کی نظر سے دیکھنے لگے بلکہ رزیڈنسی کے انگریز صاحبان پر بھی آپ کی اعلیٰ لیاقت متانت و دیانت داری کا عمدہ اثر پڑا۔

ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ بلگرامی صاحب ممدوح کا رجحان و ذوق طبعی ہمیشہ سے عالمانہ رہا ہے۔ بہ نسبت ریاست و سیاست کے جھگڑوں و درباز داریوں کے آپ کو علمی زندگی میں زیادہ لطف و آرام ملتا ہے۔ چنانچہ باوجود ان ریاستی فرایض کے آپ علمی مشاغل سے کبھی غافل نہ رہے۔ دکن کی ضخیم انگریزی تاریخ جسکو سلطنت نظام کا بہترین گیزیٹر سمجھنا چاہیئے آپ کا بہترین و دائمی لٹریری کارنامہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو حیدرآباد کے سول سروس کے نصاب میں داخل ہونے کے لایق ہے۔ دکن کی جلد ضعیف کرنے والی آب و ہوا نے جب آپ میں اضمحلال جسمانی کے آثار پیدا کرنا شروع کئے تو آپ معتمد خانگی حضور پرنور مرحوم کے عہدہ سے کنارہ کش ہوگئے اور سررشتہ تعلیمات حیدرآباد دکن کے ڈائرکٹر بنائے گئے اور آپ کے زمانہ میں ابتدائی و درمیانی مدارس و تعلیم کی خاص طور پر توسیع ہوئی۔ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ بلگرامی صاحب ممدوح تعلیم کے متعلق بہ نسبت مقدار (Quantity) کے حسن لطافت و سودمندی (Quality) کو زیادہ پسند کرتے ہیں آپ نے انگریزی تعلیم کے لئے لایق لایق انگریز ہیڈ ماسٹر و مہتمم تعلیمات و پروفیسرز مقرر کئے جنکی بدولت آج حیدرآباد کے نوجوانوں کا انگریزی شین قاف و لب و لہجہ بمقابلہ برٹش انڈیا اور بالخصوص مدراس کے ہزاروں دیسی گریجویٹوں کے بہتر ہے، اور اُن میں سیلف رسپکٹ یعنی خودداری کا احساس بھی زیادہ ہے۔ یہ بات کہ بلگرامی صاحب ممدوح کے ڈائرکٹری کے زمانہ میں حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کیوں کم ہوئی کسی قدر بحث طلب اور سیاسی مسئلہ ہے، اور ہم بلگرامی ممدوح کو اس امر میں کسی قدر مجبور سمجھتے ہیں۔ وہ بحیثیت ریاست کے ایک اعلیٰ رُکن ہونے کے اُس وقت کی سیاسی پالسی کے پابند تھے۔ برٹش انڈیا میں اعلیٰ تعلیم سے جو گل کھل رہے تھے وہ اُن کی نظر سے پوشیدہ نہ تھے۔ اگر وہی پودے حیدرآباد میں جمائے جاتے تو خدا ہی جانے کیا طوفان بے تمیزی اور کیسی بے چینی ریاست میں برپا ہوتی قطع نظر اسکے خود اکثر ماہرین فن تعلیم اہل یورپ و نیز اہل ہند موجودہ طرز تعلیم ہند کو بہ نسبت اصلی مفید و سودمند ہونے کے زیادہ تر نمایشی و غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ موسیو گستاوے لی بان اپنی کتاب موسومہ تمدن ہند* کے باب "موجودہ ہند" میں لکھتے ہیں کہ

> زمانہ حال کا ہندوستانی تعلیم یافتہ ایک عجیب برزخ ہے موجودہ یوروپی اجنبی طرز تعلیم سے اُسکے دماغ و اخلاق کا توازن ڈانواں ڈول ہوگیا ہے جسکے ذمہ دار خود وہ ناتجربہ کار انگریز

* یہ کتاب حال ہی میں عالیجناب شمس العلما سید علی صاحب بلگرامی مرحوم نے اُردو میں ترجمہ کی ہے اور قریب الاشاعت ہے۔

ماہرانِ فن تعلیم ہیں جنھوں نے ہندوستانی دماغ کا اندازہ ٹھیک طور پر نہ کرنے کے باعث ایک ایسی تعلیم ہندیوں کو دی ہے جو اُن کے دماغ سے مناسبت نہیں رکھتی۔

ہم اس بحث سے اس وقت درگذر کرتے ہیں۔ مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ بلگرامی صاحب ممدوح خود اعلیٰ درجہ کے تعلیم و تربیت یافتہ ہیں اور تعلیم مگر صحیح و مفید تعلیم کے زبردست حامی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ علی گڑھ کالج پر آپ کے کتنے احسان ہیں۔ خود سر سید مرحوم کے آپ زبردست موئد تھے اور سر سید اہم امورات میں آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آپ دو دفعہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پریزیڈنٹ بنائے جا چکے ہیں اور ایک دفعہ بورڈ ٹرسٹیان علی گڑھ کالج کے بھی آپ پریزیڈنٹ رہ چکے ہیں۔ تعلیم نسواں کے متعلق آپ کا خاندان ہمیشہ سے نہایت روشن خیال اور ہر قسم کے تعصبات و اوہام سے بری رہا ہے۔ آپ کی صاحبزادی جو اب نواب ڈاکٹر خدیو جنگ بہادر کی بیگم صاحبہ ہیں ہندوستان میں پہلی مسلمان خاتون ہیں جنھوں نے بی اے کی ڈگری مدراس یونیورسٹی سے حاصل کی ہے۔ آپ کے خاندان کی اکثر صاحبزادیاں اعلیٰ درجہ کی عربی فارسی و انگریزی کی تعلیم یافتہ ہیں۔ چنانچہ مس لولو رقیہ بلگرامی بنت شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم فارسی و انگریزی خوب جانتی ہیں اور نہایت ہونہار صاحبزادی ہیں۔ خوشا وہ گھر جس کی یہ لایق و معزز خاتونیں زیب و زینت ہوں! عورتوں کی سخت جہالت نے ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی نہایت مجہول کر دی ہے، اور مسلمان قوم باوجود ایک اعلیٰ نسل ہونے اور اعلیٰ مذہب رکھنے کے بھی ہندوستان میں پست و مجہول سی ہو گئی ہے۔ قوم میں انحطاط و اضمحلال جسمانی و دماغی و اخلاقی پیدا ہو گیا ہے۔ اسکا علاج تعلیم نسواں میں ہے بشرطیکہ وہ تعلیم اصلی ہو اور نمایشی نہو۔

بلگرامی ممدوح عربی تعلیم کے خاص شیدائی ہیں چنانچہ چند سال قبل آپ نے علی گڑھ میں عربی تعلیم رائج ہونے کے متعلق ایک خاص مضمون لکھا تھا اور اسی کے ساتھ ایک معقول رقم بھی عطا فرمائی تھی۔

حضور نظام جنت آشیاں کو آپ کی لیاقت و دیانت داری و پختہ کاری پر اس قدر اعتماد تھا کہ حضور پرنور نے آپ کو اپنے ولیعہد میر عثمان علیخاں بہادر کا جو اب مسند آرائے حکومت دکن ہیں اتالیق مقرر فرمایا اور آپ نے اس خدمت کو بھی نہایت قابل اطمینان طور پر انجام دیا۔

۳۶ سال کی متواتر خدمات کے بعد آپ نے باصرار شدید وظیفہ کی خواہش ظاہر کی گو بار بار استعفا دینے پر بھی بارگاہ سلطانی سے استعفا نامنظور ہوتا رہا۔ لارڈ کرزن کی باز نما آنکھیں ہندوستان کے مطلع پر دور دور تک لایق ہندوستانیوں کی تلاش میں رہتی تھیں چنانچہ اُنھوں نے بلگرامی صاحب ممدوح کو اپنی امپیریل کونسل و نیز کمیشن تعلیم کی ممبری کے لئے منتخب کیا، اور جس طرح آپ نے سلطنت نظام میں اعتماد کلی حاصل کیا تھا اُسی طرح شملہ کی شاہی کونسل سے بھی آپ نے اپنا ادب و احترام و اعتماد کرا لیا چنانچہ سب سے بڑا اور انتہائی اعزاز جو کسی ہندوستانی کو مل سکتا تھا وہ آپ کو عطا ہوا یعنی آپ انگلستان میں وزیر ہند کے پہلے ہندوستانی مشیر مقرر کئے گئے۔

بعض حلقوں میں ابتک یہ سرگوشیاں ہوتی ہیں کہ بحیثیت وائسرائے و وزیر ہند کی کونسل کے ممبر ہونے کے نواب عماد الملک بہادر نے جیسا چاہیئے ویسا شور و غوغا کیوں نہیں کیا؟ اعتراض کیوں نہیں کئے۔ بہت سے سوالات کیوں نہ پوچھے؟ ہماری رائے اس بارہ میں یہ ہے کہ نواب عماد الملک بلحاظ اپنی تعلیم و دماغ و ملکی رایوں کے ایک خاص ٹائپ ہیں۔ آپ رموز سلطنت سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ انگریزی نقطۂ خیال اور دماغ کی سائیکالوجی (طرز رفتار دماغی) و اصول سیاست کو خوب سمجھتے ہیں۔ اپنے ملک و اہل ملک کی طبیعتوں

وخامیوں و قوت عملی کی کمی کا گہرا علم رکھتے ہیں - بلگرامی صاحب ممدوح کی شان متانت اور سخت عمل پسند طبیعت موجودہ نمائشی خالی خولی اسپیچوں اور محض سوالوں کی بوچھاڑ مارنے کی عادی نہیں - شملہ یا لندن کے مدبروں کی کونسل کے سامنے محض ان طفلانہ حرکات یا فونوگرافی سے کوئی موثر نتیجہ پیدا نہیں ہوسکتا - ہاں عوام کے خوش کر دینے کا یہ اچھا طریقہ ہے - پس اگر بلگرامی ممدوح نے اس پہلو سے کوئی نام شملہ یا لندن کی کونسل میں پیدا نہیں کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں - وہ انگریزی نقطۂ خیال کو خوب سمجھ کر کلام کرنے کے عادی ہیں - اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز مدبروں کی نظروں میں انھوں نے اپنا وقار خوب قایم رکھا - یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک اپنی قوم اور اپنے ملک میں اپنے دعاوی کے سپورٹ یا عملی تائید و معاونت کی قوت نہ ہو قوم کے وکلا یا نائبین کا شملہ کی کونسل میں شور مچانا اپنے کو مورد مضحکہ بنا لینا ہے -

نواب عماد الملک "یقولون ما لا تفعلون" میں سے نہیں ہیں آپ عالم بے لوث اور صاف آدمی ہیں - بادشاہوں و مدبروں کی صحبت اٹھائے ہوئے ہیں - زمانہ کے نشیب و فراز کا ایک طول طویل تجربہ رکھتے ہیں - عمر رسیدہ ہیں جو مقتضیٔ حزم و احتیاط ہے - کوئی شک نہیں کہ اقوام کی تاریخ میں بعض اوقات نوجوان اپنی حدت و شدت میں بڑے کام کر جاتے ہیں جس طرح جنگ میں کبھی کبھی کوئی خاص مورچہ فتح کرنے کے لئے بلا دھنواں دھار دھاوے کے کام نہیں چلتا لیکن ہر بات کا ایک موقع و محل ہوتا ہے اور اسکے لئے اسی قسم کے لوگ درکار ہوتے ہیں - لارڈ کرزن کی جلد بازی اور لارڈ منٹو کا صبر و متانت ہمارے لئے عجیب و غریب سبق ہیں - بشرطیکہ ہم سیاست کی بلند چوٹیوں پر سے ان کے کارناموں پر نظر ڈالیں - اینگلو انڈین لارڈ منٹو کے صبر و متانت دیکھے پن کی برابر ملامت کرتے رہے - ایک مغلوب و مفتوح و محکوم اور پراگندہ و کمزور ملک و قوم کے لئے لارڈ منٹو کے صبر و متانت سے بدرجہا زیادہ صبر و متانت و برداشت و احتیاط کی ضرورت ہے -

ہم اس پیچیدہ و بحث طلب مسئلہ کو چھوڑ کر اپنے نوجوان اہل وطن سے یہ ضرور کہیں گے کہ وہ نواب عماد الملک کی زندگی کے اس سرسری ریویو سے چند خاص سبق اخذ کریں :-

اول - یہ کہ اپنی و اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق کتابوں کے جنگلستان و خارستان سے چیدہ چیدہ کتابیں اپنے اپنے مذاق کے موافق چن لیں اور جو کچھ سیکھیں اچھی طرح سے سیکھیں - تھوڑا کھائیں اور ہضم خوب کریں - چھوٹی سی منتخب و مفید لائبریری بہ مقابلہ بڑی کتابستان کے بہتر ہے - بچوں کی ابتدائی تعلیم نہایت اعلیٰ و تجربہ کار ماہر استادوں سے کرائیں نواب عماد الملک کی عجیب و غریب عربی و انگریزی قابلیت کا راز اُن کی ابتدائی تعلیم میں مخفی ہے -

دوم - دیانت داری و بے تعصبی کو اپنا دستور العمل بنائیں لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ایمانداری و دیانت داری کا اس زمانہ میں کچھ اجر نہیں - مگر ہم اُن کے جواب میں نواب عماد الملک کی مثال پیش کرتے ہیں - گذشتہ ۴۰ سال میں حیدرآباد میں بڑے بڑے انقلاب ہوئے، بڑی بڑی پارٹیاں بنیں اور بگڑیں، بڑے بڑے ملکی و غیر ملکی انگریز و دیسی کے جھگڑے پیدا ہوئے، شورشیں ہوئیں، طوفان آئے، سیکڑوں بنے اور بگڑے، مگر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی "مثل قطب از جا نجنبد" کے مصداق بنے رہے - موافق اور مخالف ملکی و غیر ملکی انگریز و دیسی حضور اور فقیر سب آپ کا ادب کرتے رہے - اسلئے کہ آپ کا مسلک صلح کل اور باہمہ و بے ہمہ رہا - آپ نے اپنے فرایض ذاتی و مشاغل علمی کے انہماک کے سوا اور کسی جھگڑے سے سروکار نہ رکھا سلامت روی کی چال چلے اپنے آقا کی فیاضانہ دی ہوئی تنخواہ پر قناعت کی اور آپنے اپنے دامن کو

ہر طرح کے لالچ کے داغ سے پاک و صاف رکھا۔ حیدرآباد کے باغِ عدن میں سب سے بڑی آزمایش کا شجر ممنوعہ شجر الذہب والفضہ رہا ہے۔ آپ نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ آج اس کا ثمرہ اسی زندگی میں آپ کو یہ ملا کہ آپ اُسی حیدرآباد میں جہاں بیالیس سال قبل سر سالار جنگ اول کے خانگی معتمد تھے بمصداق دو ر تناسخ اُنھیں سالار جنگ کے پوتے یا سر سالار جنگ ثالث کے مشیر اعظم و رکن سلطنت ہیں! امیر و غریب ملکی و غیر ملکی انگریز و دیسی سب آپ کا ادب کرتے ہیں۔ خدا نے آپ کو کوئی صالح و لایق اولاد عطا کی ہیں۔ "الولد سرّ لابیہ" کی مصداق ہیں۔ بے تعصبی و بے غرضی دیانت داری و روشن خیالی، اور سلامت روی آپ کے خاندان کا خاصہ ہے۔ خدا نے اولاد کی اولاد آپ کو دکھائی۔ سب لڑکے آپ کے سامنے پھلے اور پھولے آپ نے کوئی ورثہ اپنے لئے باقی نہیں رکھا۔ ایک بچا بچایا گھر تھا وہ بھی صاحبزادی کو دیدیا اور اب آپ کو پورا اطمینان قلبی حاصل ہے۔ صرف ایک آرزو ہے کہ خدا قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کو جس کا مشکل حصہ یعنی قریباً ۹ پارہ ترجمہ ہو چکے ہیں مکمل کرا دے۔ خدا سے قوی اُمید ہے کہ یہ مراد دلی بھی ضرور بر آئے گی اور آپ کا قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ویسا ہی انگریزی دنیا میں مقبول ہو گا جیسا کہ مقدس بائبل کا آتھرآئیز ڈ ورشن ترجمہ ہے جو ہر ایک انگریزی خاندان کا محبوب ورثہ ہو گیا ہے۔

نواب عماد الملک کی ایک ذاتی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے بخلاف دوسرے ہندوستانیوں کے حیدرآباد ہی کو اپنا پیارا بلکہ رام بنا لیا ہے۔ جس طرح قدیم سے حیدرآباد کے اُمرا شمال ہند سے ہجرت کرکے حیدرآباد میں آ بسے آپ نے بھی اسی سنت پر عمل کیا ہے۔ حیدرآباد کی پہاڑیوں، کُنٹوں، اور تالابوں، اور جنگلوں، پھلوں اور پھولوں سے آپ کو خاص اُنس ہے۔ مشاغل علمی و ایام خلوت کے لئے وقار آباد کا الگ تھلگ مقام آپ نے پسند کر رکھا ہے۔ جہاں آپ کبھی کبھی حیدرآباد کے مجالس و مشاغل ملکی سے فارغ ہو کر چلے جاتے ہیں۔ آپ کے مذہبی خیالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں مگر راقم نے ایک مرتبہ صرف ایک جملہ سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ آپ بہت گہرے اور پکے مسلمان ہیں۔ قرآن مجید کی محبت کوٹ کوٹ کر آپ کے رگ و ریشہ میں بھری ہوئی ہے۔ مگر ہند کے رواجی و نام نہاد اسلام کو آپ تحت اصلاح طلب مانتے ہیں اور درحقیقت ہند کے اسلام میں ۱۲ بھر ہندی مضر رسم و رواج کا میل مل گیا ہے اور خالص اسلام صرف ۴ بھر باقی رہ گیا ہے۔

کسی آیندہ موقع پر ہم یہ کوشش کریں گے کہ بلگرامی صاحب ممدوح کے علمی کارناموں کو یکجائی صورت میں پبلک کے سامنے روز روشن میں لائیں۔ اسوقت ہماری یہ دعا ہے کہ خدا اس بزرگوار قوم و فخر حیدرآباد کو عمر صد سالہ عطا فرمائے۔ اور حیدرآباد میں سالار جنگی عہد زریں ایک مرتبہ پھر عود کرے۔ جہاں تک علم قیافہ سے معلوم ہوتا ہے موجودہ سالار جنگ ثالث کا قیافہ لارڈ کرزن سے بہت ملتا جلتا ہے اور عجیب و غریب زیرکی و دانائی کے جوہر آپ کے بشرہ سے ہویدا ہیں۔ موجودہ نوجوان حضور نظام کی ابتداہیت کچھ مرحوم مکاڈو شہنشاہ جاپان کی تخت نشینی سے مشابہ ہے جو ۴۴ سال قبل تخت جاپان پر متمکن ہوئے تھے اور اُن کا سب سے پہلا زبردست ایکٹ وزارت کا بدلنا تھا جسکے بدلنے کی اُس وقت اشد ضرورت تھی۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ موجودہ نظام کا عہد حیدرآباد کے لئے مثل جاپان کے ہو۔ بادشاہ و وزیر دونوں اپنی جوان قوت سے گذشتہ عہد کمزوری، کی تلافی کر دیں حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چند سال سے حیدرآباد میں ضعف و اضمحلال کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ اور بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ حکمران قوی دل ہو اور وزیر

زبردست۔ موجودہ حیدرآباد ایک نئی و نوجوان پود کا حیدرآباد ہے۔ ترقی کی نئی نئی اُمنگیں ہیں اور بادشاہ و وزیر بھی حسب حال ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ جاپان کی پارلیمنٹ کثرت سے نوجوانوں کی پارلیمنٹ ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی اب جو کچھ اُمیدیں ہیں وہ نئی پود اور اُن کی نوجوان قوت سے وابستہ ہیں۔ سوچنے کا زمانہ گذر گیا اب عمل کا زمانہ آگیا ہے اور کچھ کر گذرنے کی قوت تاریخ عالم میں صرف جوانوں ہی میں پائی گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آیندہ دس برس میں حیدرآباد میں عجیب و غریب مادی و اخلاقی ترقی کے امکانات ہیں۔ خدا مدد کرے!

جان ملکم

جزر و مد

یوں تو ہوا کے تیز چلنے سے جب سمندر میں تلاطم آتا ہے اور خوفناک لہریں اونچی ہو کر پانی کی سطح پر رواں ہوتی ہیں تو عام لوگ اس کو جزر و مد کہتے ہیں۔ لیکن اگر سچ پوچھو تو یہ جزر و مد نہیں ہے اسکو تلاطم اور امواج جو چاہو کہہ سکتے ہو جزر و مد اور جوار بھاٹا پانی کے اُس باقاعدہ اُتار اور چڑھاؤ کا نام ہے جو برابر سال بھر روزانہ دو مرتبہ ساحل پر نظر آتا ہے اور ہوا کے جھونکوں سے اُس کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ جو لوگ ساحل پر آباد ہیں اُن کو آئے دن اور آئے سال یہ تماشا دکھائی دیتا ہے کہ کسی وقت تو سمندر کا پانی اونچا ہوتے ہوتے ساحل کے برابر آگیا اور پھر کوئی چھ گھنٹے کے بعد اُتر گیا اور اس طرح ہر بارہ گھنٹہ ۵۰ منٹ کے بعد پانی بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ مدت چاند کی تاریخ کے ساتھ زیادہ ہوتی جاتی ہے اور پھر چودھویں کے بعد کم ہونی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ چاند کی ہر ۲۹ تاریخ کو اوسط مدت قریب قریب بارہ گھنٹہ کی ہوتی ہے جسکے بعد پھر پانی چڑھتا ہے۔ اماوس کے دن جس روز نیا چاند ہوتا ہے اور پُرنما کو جس روز چاند پورا ہوتا ہے جزر و مد کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے اور تلاطم عظیم پیدا ہوتا ہے۔ پہاڑ کی سی اونچی اونچی لہریں خروش کرتی ہوئی ساحل کو آتی ہیں اور پھر اُتر جاتی ہیں اور پانی نیچا ہو کر تہ میں چلا جاتا ہے۔ اسکے خلاف چاند کی ۸ اور ۲۲ تاریخ کو نہایت چھوٹا جوار آتا ہے اس کے علاوہ اور تاریخوں میں جوار کی حد بڑھتی اور گھٹتی جاتی ہے۔ غرض جزر و مد کو چاند کی رفتار کے ساتھ کچھ اس طرح کا لگاؤ ہے کہ تم خود بتا سکتے ہو کہ ہو نہو اس کا باعث چاند ہے۔

دو ہزار برس قبل بنی نوع انسان نے اس واقعہ کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا تھا اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کی وجہ کو دریافت کیا تھا جو زیادہ تر اُن کی جی کی اوپچ اور خیالی باتیں ہیں۔ حکمائے یونان کو تو اس مسئلہ پر فکر کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا اسلئے کہ وہاں کے ساحل پر جوار کا اثر مشکل سے محسوس ہوتا ہے لیکن عرب اور چین کی پُرانی تحریروں میں اس کا ذکر موجود ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پُرانے لوگوں نے اس حیرت خیز واقعہ کی طرف غور کیا تھا۔ بعد اسکے جوں جوں ہمارا علم ترقی کرتا گیا یہ بات معلوم ہوتی گئی کہ پانی کے اس اُتار اور چڑھاؤ کو کسی نہ کسی طرح چاند کے ساتھ لگاؤ ہے اور محض چاند نہیں بلکہ سورج بھی اس میں شریک ہے۔ لیکن اتنی بات سمجھ میں نہ آئی کہ آخر چاند کی وجہ سے پانی کیوں اونچا ہوتا ہے اور کیوں پھر گر جاتا ہے۔ آخر کار حکیم نیوٹن کا زمانہ آیا جس نے اپنی خدا داد عقل و دانا

سے جذب مرکزی کے قانون قدرت کو دریافت کرکے ساری دنیا کو حیرت میں ڈالدیا اور ۱۶۸۶ء میں اس بات کو ثابت کردیا کہ جزرومد کو پیدا کرنے والی چاند اور سورج کی قوت جاذبہ ہے۔ بعد اس کے اور ریاضی دانوں نے اس کی تائید کی اور جزرومد کی وجہ کو بیان کیا۔

زمین چاند سورج ستارے ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچ رہے ہیں اور یہ قوت جاذبہ تمام عالم میں اپنا کام کر رہی ہے جسکو حکیم نیوٹن نے دریافت کیا تھا تو اب سمجھ لو کہ جس وقت چاند سیدھا ہمارے سر پر ہوتا ہے یا یوں کہو کہ وہ ہمارے خط نصف النہار سے گذرتا ہے تو اُس کا مرکز زمین کے مرکز کے مقابل میں آتا ہے اور چاند کی قوت جاذبہ زمین پر اپنا پورا اثر ڈالتی ہے۔ سخت چیزوں پر تو اُس کا نمایاں اثر محسوس نہیں ہوتا لیکن پانی جو سیال چیز ہے چاند کی قوت جاذبہ سے اثر پذیر ہوکر چاہتا ہے کہ بڑھکر اُس کے مرکز سے مل جائے۔ اسلئے پانی اوپر کو چڑھتا ہے اور اُسکے ارد گرد تمام کا پانی جس پر چاند کی قوت جاذبہ اثر ڈالتی ہے سمٹ کر چلا آتا ہے اور چاند کے مرکز کی سیدھ میں انبار ہو جاتا ہے پانی کے اس طرح بڑھنے اور چڑھاؤ کا نام اصطلاح میں مد یا جوار ہے۔ یہاں تک تو زمین کے آدھے کرہ کا حال ہے جو چاند کے مقابل میں ہوتا ہو۔ باقی آدھا کرہ جو چاند سے پھرا ہوا اُدھر کو ہوتا ہے وہاں بھی اسی طرح کی رُوداد نظر آتی ہے اور تمام کا پانی سمٹ کر زمین کے اُس طرف کو انبار ہو جاتا ہے اور اس طرح زمین کے اِدھر اور اُدھر دونوں جانب کو جوار پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب زمین کے دائیں بائیں دونوں پہلو کا پانی کھینچ کر چلا جاتا ہے تو وہ جگہ خالی پڑ جاتی ہے اور ان مقامات پر پانی اپنی سطح سے نیچا ہوکر اُتر جاتا ہو اصطلاح میں اس کا نام جزر ہے۔

جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں اس کو یہاں پر شکل کھینچکر بتاتا ہوں تم نے شاید اگر نہیں سمجھا ہو تو اب ضرور سمجھ جاؤ گے۔ اپنی پرکار سے ایک محض چھوٹا اور اسکے مقابل میں ایک بڑا دائرہ بناؤ چھوٹے کو چاند اور بڑے دائرے کو زمین مان لو اور حرف (د) اور (ز) کو ان کا مرکز قرار دو اور آسانی سے سمجھنے کے لئے فرض کرلو کہ تمام روئے زمین پر پانی ہے

اب شکل کو خیال کرو تو تم دیکھوگے کہ زمین کا آدھا کرہ تو چاند کی طرف اِدھر اور آدھا کرہ اُدھر کو ہے جس وقت چاند سیدھا سر پر خط (ز د) کی سیدھ میں آتا ہے تو زمین کے آدھے کرہ کا پانی جو چاند کے مقابل میں ہے تمام سے سمٹ کر چاند کی سیدھ میں کھنچ آتا ہے اور مد پیدا ہوتا ہے۔ اب زمین کے دوسرے ٹکڑے کو جو چاند سے اُدھر کو ہے خیال کرو تو یہاں بھی اسی طرح کی روداد ظہور میں آتی ہے اور ارد گرد کا پانی کھنچکر ایک جگہ انبار ہو جاتا ہے اور اس طرح زمین کے دونوں جانب کو پانی زوروں میں بڑھتا ہے اور جوار آتا ہے تم پوچھ سکتے ہو کہ زمین کے اِدھر کا پانی تو چاند کی قوت جاذبہ سے کھنچکر بڑھتا ہے لیکن اُدھر کو جہاں چاند کی قوت جاذبہ کام نہیں کرتی ہے، پانی کے بڑھنے یا جوار آنے کی کیا وجہ ہے؟ اس کو یوں سمجھو کہ جب اِدھر کا پانی قوت جاذبہ سے کھنچکر انبار ہو جاتا ہے تو اُدھر کا پانی سمٹ کر بھاگتا ہے اور اس طرح وزن کو برابر کرلیتا ہے۔ ترازو کے ایک پلے کو اونچا کردو تو دوسرا پلہ خود بخود نیچا ہو کر وزن کو برابر کردیتا ہے زمین کے اُدھر کو پانی کا سمٹ کر چلا جانا اور جوار کا آنا کچھ اسی طرح کی بات ہے جس کا اچھی طرح سمجھنا تمہارے لئے دشوار ہے خیر اب شکل کو پھر دیکھو۔ جس وقت پانی زمین کے دونوں جانب کو کھنچکر چلا جاتا ہے تو زمین کا کرہ جو گول ہے بیضاوی شکل کا ہو جاتا

ہے جس طرح یہاں دکھایا گیا اور اس کی وجہ سے زمین کے دائیں بائیں
دونوں جانب کو جگہ پانی سے خالی پڑ جاتی ہے اور مقام (ج ج)
پر جزر ہوتا ہے یعنی پانی اپنی سطح سے نیچا ہو کر اُتر جاتا ہے۔ تم جانتے
ہو کہ چاند زمین کے گرد چرخ کھاتا ہے بس سمجھ لو کہ جس طرح مور اپنی
چونچ میں سانپ کو اُٹھائے پھرتا ہے اسی طرح چاند قوت جاذبہ سے
زمین کے پانی کو اوپر اُٹھائے ہوئے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔
بڑھا ہوا پانی یا جوار برابر چاند کے ساتھ ساتھ جاتا ہے اوپر چاند
سیر کرتا ہے اور زمین پر پانی کا اونچا دھارا اسکے ساتھ دوڑتا ہے
جس کی وجہ سے جہاں پانی اُترا ہوتا ہے اُس جگہ چڑھ جاتا ہے
اور جہاں چڑھا ہوتا ہے پھر اُتر جاتا ہے اور اس طرح زمین پر جزر و مد
دورہ کرتا ہے۔

خط اُستوا پر تو جس وقت چاند سیدھا سر پر ہو کر گزرتا ہے
اس کے ساتھ ہی اسی وقت اونچا پانی یا جوار کا دھارا شور مچاتا ہوا
نکل جاتا ہے۔ لیکن چاند جس وقت شمال یا جنوب کی جانب جھکا ہوا
رہتا ہے تو جس وقت وہ سر سے ہو کر گزرتا ہے اسکے دیر کے بعد جوار
آتا ہے اور یہ تاخیر جس کے باعث اور دوسرے دوسرے اسباب
ہیں ہر مقام کے لئے جداگانہ ہے۔ کسی مقام پر چاند کے خط نصف النہار
سے گزرنے کے کامل ڈیڑھ دن کے بعد جوار کا دھارا پہنچتا ہے۔
اب جزر و مد کی اونچائی اور اس کی گہرائی کی حد کو خیال کرو تو وہ بھی
ہر جگہ کے لئے الگ الگ ہے کسی مقام پر تو جوار کا پانی ۵۰ فیٹ
اونچا جاتا ہے اور کسی جگہ ۴ فیٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا اور اسطرح
پانی کے اُترجانے یعنی جزر کی گہرائی اسکے مطابق ہوا کرتی ہے۔ چھوٹے
اور تنگ سمندروں میں جوار کا پانی بہت اونچا جاتا ہے۔ ہمارا بحر بنگالہ
جوار کے تلاطم اور اسکے پانی کی اونچائی کے لئے معروف ہے۔ اس میں
جوار کا پانی ۲۰ فیٹ سے زیادہ اونچا جاتا ہے اور جب اس کا دھارا
دریا میں آتا ہے تو جگہ کی تنگی کی وجہ سے دونوں جانب سے دبکر
اور زیادہ اونچا ہو جاتا ہے لیکن بڑے بڑے بحر ذخار میں جوار زیادہ
اونچا نہیں آتا ہے اور یہ محض اس وجہ سے ہے کہ وہ بہت کشادہ اور
لق و دق ہیں۔ جو بندرگاہ بڑے سمندروں کے کنارے واقع ہیں
وہاں جوار کے پانی کی اونچائی تین چار ہاتھ کے قریب ہوتی ہے۔
بحرالکاہل میں ۳ فیٹ سے زیادہ اونچا جزر و مد نہیں آتا ہے۔ غرض
ہر مقام کے لئے پانی کے بڑھنے اور گھٹنے کی ایک حد مقرر ہے اور ہر جگہ
کے لئے اس کا وقت جداگانہ ہے جس کا کوئی اُصول مقرر نہیں ہے۔

چاند کی قوت جاذبہ اور اُس کی وجہ سے جزر و مد کے پیدا
ہونے کی حالت کو تم نے سُن لیا۔ اب سورج کی قوت جاذبہ کو خیال
کرو تو اُس کی وجہ سے جزر و مد اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح چاند کے
باعث جس کا ذکر اوپر ہوا۔ فرق اتنا ہے کہ چاند کی وجہ سے بڑا جزر و مد
پیدا ہوتا ہے اور سورج کی وجہ سے چھوٹا جوار آتا ہے جس کے پانی کی
اونچائی قریب قریب آدھی ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ
سورج کی قوت جاذبہ کی وجہ سے جو چاند کی قوت سے کروڑوں گُنا
بڑی ہے چھوٹا جوار کیوں آتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند زمین سے
قریب ہے اور سورج بہت دور ہے۔ سورج کی قوت جاذبہ جو عظیم
ترین ہے زیادہ دوری کی وجہ سے زمین پر زیادہ اثر نہیں ڈال
سکتی ہے۔ غرض چاند اور سورج کی وجہ سے دو طرح کا جزر و مد پیدا ہوتا
ہے جن میں ایک بڑا اور ایک چھوٹا ہوتا ہے اور ان دونوں کے
واقع ہونے کا وقت جدا جدا ہے۔ سورج کا جوار دن کو دوپہر کے
قریب اور شب کو آدھی رات کو آتا ہے۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ جزر و مد
جو تم کو ساحل یا بندرگاہوں میں نظر آتا ہے وہ ان دونوں طرح کے
جزر و مد کا نتیجہ ہے۔ کہیں تو سورج اور چاند کے جوار میں مار کٹائی ہو جاتی
ہے، چاند جہاں پانی کو اُٹھاتا ہے سورج کی وجہ سے وہاں پانی میں

اُتار پیدا ہوتا ہے اور جہاں سورج پانی کو بڑھاتا ہے وہاں چاند کی وجہ سے پانی گرجاتا ہے اور ان دونوں کا محض ہم کو نتیجہ نظر آتا ہے یہ مخالفانہ اثر پردازیاں چاند کی ۸ اور ۲۲ تاریخ کو زیادہ نمایاں ہوتی ہیں لیکن ہر ماہ میں دو تاریخ ایسی آتی ہیں جس میں چاند اور سورج کی قوت جاذبہ اتفاق کرجاتی ہیں اور دونوں باہم کام کرتی ہیں۔ اِنمیں ایک تو پرنما یعنی جس روز چاند پورا ہوتا ہے اور دوسرا اماوس کا دن ہے جس روز نیا چاند ہوتا ہے۔ گوکہ جوار کے پیدا ہونے کے لئے چاند کی رویت کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہے۔ ہر ماہ کی چودھویں تاریخ اور ۲۹ تاریخ کو بڑا جزر و مد آتا ہے اور پانی کی اونچائی قریب قریب تین گُنا زیادہ بڑھ جاتی ہے یعنی چاند کی ۸ اور ۲۲ تاریخ کو جہاں ۸ فیٹ اونچا پانی آتا ہے ۱۴ اور ۲۹ تاریخ کو وہاں کے جوار کی اونچائی ۲۴ فیٹ ہوتی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ ۱۴ اور ۲۹ تاریخ کو چاند اور سورج اس طرح ایک دوسرے کے مقابل میں آجاتے ہیں کہ ان کی قوت جاذبہ باہم کام کرتی ہیں اور ان دونوں قوتوں کے اتفاق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مَد مَد کے ساتھ اور جزر جزر کے ساتھ مِل جاتا ہے جس سے پانی بہت زیادہ اونچا چڑھتا ہے اور نیچا ہوکر اسی قدر گہرا اُترتا ہے کہ پانی کے اس طرح پینگ مارنے سے بلا کا تلاطم پیدا ہوتا ہے جس کے لئے پرنما اور اماوس کا دن مقرر ہے۔

تمکو سُنکر حیرت ہوگی کہ جزر و مد جس کا بیان اوپر ہوا زمین کی حرکت محوری کا توڑ کرتا جاتا ہے۔ جوار کے دھاروں کی رگڑ جسکے اتفاق میں اور دوسری قوتیں کام کررہی ہیں زمین کی چال کو رکتی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ ایک نہ ایک دن زمین چرخ کھاتے کھاتے بالکل ٹھہر جائے گی جس طرح لٹو ناچتے ناچتے کھڑا ہوجاتا ہے اسی طرح زمین جو گھوم رہی ہے وہ بالکل کھڑی ہوجائیگی۔ سورج جس جگہ ہوگا وہاں کا وہیں رہجائے گا۔ پھر نہ دن ہوگا نہ رات ہوگی۔ نہ آفتاب طلوع کرے گا اور نہ غروب ہوگا۔ جہاں رات ہوگی وہاں پھر صبح نہ ہوگی اور جہاں دن ہوگا وہاں شام نہ ہوگی۔ نہ کوئی ہفتہ ہوگا اور نہ پھر کوئی نیا سال آئے گا۔ غرض وقت کے اندازہ کرنے کے لئے کوئی پیمانہ باقی نہیں رہیگا۔ زمین کا آدھا کرہ جو آفتاب کے مقابل میں ہوگا وہ برابر روشنی میں رہیگا اور سورج کی آنچ سے تاؤ کھاتے کھاتے اس شدت سے گرم ہوجائے گا کہ پانی انجرہ بنکر اُڑجائے گا۔ باقی آدھا کرہ جو دوسری جانب کو ہوگا وہاں ہولناک تاریکی ہوگی۔ آسمان کے ستارے جہاں ہوں گے وہیں برابر دکھائی دیں گے۔ زمین کا یہ حصہ جو سورج کو پھر کبھی نہیں دیکھے گا برباد ہوجائے گا۔ کل چیزیں یخ ہوجائیں گی اور حیوانات اور نباتات مرجائیں گے۔ لیکن کرہ ارض کے گرد زمین کا ایک دائرہ اس طرح کا ہوگا کہ وہاں نہ زیادہ گرمی ہوگی اور نہ زیادہ سردی آفتاب افق سے نیچا دکھائی دے گا اور یہ جگہ قابل رہنے کے ہوگی جہاں ہر اقلیم و دیار سے لوگ جوق جوق ہجوم کر آویں گے اور زمین کا یہ خطہ میدان حشر بن جائے گا۔ لیکن حق پوچھو تو اس کو خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہوگا۔

سید راحت حسین

قطعہ تاریخ وفات شاہ جاپان از پنڈت سکھدیو پرشاد مہرؔ

شاہ جاپان چل بسے افسوس — یا الٰہی نصیب جنّت ہو
کیوں نہ جاپان میں مچے کہرام — قبل از وقت جب قیامت ہو
جو رعیت پہ جان دیتا تھا — اُس پہ قربان نہ کیوں رعیت ہو
اس فرشتہ منش میکاڈو پر — سایہ افگن خدا کی رحمت ہو
سال رحلت بھی ہے دعا بھی ہے — مہر لکھ دو غریق رحمت ہو

سنہ ۱۹۶۹

مرزا حاتم علی مہر

مرزا حاتم علی بیگ مرحوم مہرؔ تخلص تاریخی نام خورشید علی ١٢٣٠ھ چوتھی جمادی الاول ہفتے کے روز قریب شام جھٹ پٹے وقت گلزار عدم سے دنیا کی بہار دیکھنے آئے۔ اس زمانہ میں انکے پدر بزرگوار مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے علی گڑھ کے تحصیلدار تھے کہ مرزا مہرؔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

جب ان کی عمر ڈھائی برس کی ہوئی تو ان کے چھوٹے بھائی مرزا عنایت علی بیگ ماہؔ پیدا ہوئے۔ مرزا مہرؔ چار برس کے اور مرزا ماہؔ ڈیڑھ برس کے تھے کہ باپ نے اس جہانِ فانی سے انتقال فرمایا۔ بیوہ ماں نے اپنے حسنِ انتظام سے دونوں بچوں کی تعلیم اور پرورش میں نہایت عقلمندی کا ثبوت دیا اور ابھی تعلیم سے فراغت ہی ہوئی تھی کہ اٹھارہ برس کے سن میں اپنے بیٹے کی دھوم سے شادی بھی کر دی۔ مرزا صاحب نے اپنے عقد کی تاریخ نئے طرز پر لکھی ہے۔

چوں مرا قیدیِ زندانِ علایق کردند	سال تاریخ عروسیِ خودم بنوشتم
یعنی آزاد وشے بودم و اکنوں اے مہرؔ	از سرِ جبر گرفتار شدم بنوشتم

١٢٤٨ھ

قیدیِ زندان علایق بن کر سرِ جبر کا تعمیہ بہت مناسب کیا ہے۔

شادی کے دو برس بعد خدا نے فرزند عطا کیا جسکا نام مرزا سخاوت علی رکھا اور تاریخی نام آغا بہرام نکالا۔ آغا بہرام دسویں شوال کو دوشنبہ کے روز صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔ مرزا صاحب نے اس خوشی کی بھی تاریخ لکھی:۔

شوال کی دسویں تھی دوشنبہ کا وہ دن	تو عین نماز جمعہ کا تھا وہ ہنگام
خالق نے عطا کیا مجھے جو فرزند	ہم صولت اسکندر و ہم جرات سام
دل نے کہا مجھسے مہرؔ اس بیٹے کا	تاریخ بھی ہوئے جس میں رکھنا وہ نام
ناگاہ یہ دی سروشِ غیبی نے ندا	لو ہم نے تو رکھا نام آغا بہرام

[illegible]

آغا بہرام کے تین برس کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جسکا دو برس کے بعد انتقال ہوگیا۔ اسکے بعد پھر کوئی اولاد نہ ہوئی۔

بزرگ ان کے مغل قزلباش اصفہان کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں ان کے دادا مرزا مراد علیخاں قزلباش لکھنؤ میں آئے اور شاہی دربار میں رکن الدولہ کا خطاب حاصل کرکے ممتاز عہدوں پر رہے۔ کچھ دنوں ڈلمئو رائے بریلی کے ناظم بھی رہے۔ مرزا مراد علی خاں کے والد یعنی مہرؔ کے پردادا نادر شاہ کے عہد میں کمانڈر توپ خانہ ہوکر ہندوستان آئے تھے۔

مہرؔ کو شاعری کا چسکا ابتدائے سن سے تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ برس کے سن سے اچھی طرح شعر کہنے لگے اسلئے کہ اپنے عقد کی تاریخ آپ فارسی میں لکھی اور بہت اچھی لکھی۔ طبیعت کے اقتضا سے مہرؔ ناسخؔ کے شاگرد ہوئے، اور ماہؔ نے آتشؔ سے اصلاح لی۔ شاید دس برس اصلاح لی ہو کہ ناسخؔ کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کی تاریخ مہرؔ نے جو لکھی اس میں بیشک اپنی اُستادی کا کمال دکھایا ہے۔ ناسخؔ کے ایک مقطع کے مصرعہ آخر سے تاریخ انتقال بے کم و کاست نکالی ہے

ناسخؔ ازل سے بندۂ شاہِ حجاز ہے　　　١٢٥٤ھ

١٨٤٠ء میں سند عہدہ منصفی کی حاصل کرکے چنار گڑھ کے منصف مقرر ہوئے۔ وکالت ہائی کورٹ کی سند حاصل کی۔ ابھی عہدہ منصفی کے امیدوار تھے کہ حاسدین نے رخنہ اندازی شروع کی۔ اس واقعہ کو مہرؔ نے ایک تاریخ میں لکھا ہے۔

امیدوار کیا جج نے منصفی کا مجھے	تو مجھسے ہوگئی ناحق کو حاسدوں کو کد
دیا سوال مری ضد پہ صدر میں اے مہرؔ	ہوا وہاں سے بھی آخر سوال ان کا رد
ملا ذریعۂ کامل خدا کا فضل مجھے	اثر نہ بد یہ عدو کا نہ ہوگا بغض و حسد

فروغ شوکت و شان منوچہر * شبیہ میرزا حاتم علي مہر

انڈین پریس الہ آباد

نکالوں سائل موذی کو اب کہوں تاریخ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

۱۲۷۳ھ

۱۸۵۷ء کے غدر میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپایا۔اس خدمت میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر کے ماموں شریک تھے۔پھر لکھنؤ سے ان کو لیکر آگرے گئے گورنمنٹ سے اس خدمت کے صلے میں بائیس پارچہ کا خلعت مع مالائے مروارید اور گھوڑا اور اسلحہ عطا ہوئے اور جاگیر میں دو موضع قریب فتح پور مرحمت ہوئے۔اب اپنا قیام آگرے میں کر لیا اور وہیں ہائیکورٹ میں وکالت کرنے لگے۔لیکن موجودہ زمانے کے وکیلوں کی طرح نہ تھے۔موکل سے کبھی فیس طے نہیں کی۔مقدمے کی کامیابی کے بعد اگر کچھ موکل نے خدمت کی تو قبول کر لی اور نہیں تو کچھ طالب نہوئے۔باہر سے جو لوگ اپیل کرنے آتے تھے اور مہر کو اپنا وکیل کرتے تھے تو کھانا اور مکان ان کے سر۔بلکہ اگر واپسی میں کرائے کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی مرزا صاحب سے وصول کر کے گھر جاتے تھے۔کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔اس حکومت پر آپ کے اخلاق عالم رہے۔میرزا صاحب کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا لیکن کبھی مذہب کا ذکر نہ آنے دیتے تھے۔نماز جنازہ شیعہ سنی دونوں نے پڑھی۔غدر میں بہت سا کلام برباد ہوگیا لیکن شاعری کا ذوق شوق بدستور رہا۔آپ کے خاص احباب میں مرزا غالبؔ مولوی غلام امام شہیدؔ، خواجہ غلام غوث خاں بے خبرؔ، میر وزیر علی صاحب صباؔ تھے۔غالبؔ مرحوم نے ان کے نام بہت سے خط لکھے ہیں جو ان کی تالیف میں شایع ہو چکے ہیں۔منشی محمد اسمعیل صاحب منیرؔ اور مرزا دبیرؔ میر انیسؔ صاحب بھی خاص ملنے والوں میں تھے۔

آگرہ میں جب ان کی شاعری کی شہرت ہوئی تو مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر والی کاشی مقیم آگرہ ان کے شاگرد ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ بھی قدر دانی کے لحاظ سے مقرر کر دی۔ان کا تخلص راجہ رکھا گیا۔ اُس زمانے میں اُردو زبان کے قدر داں ہر جگہ موجود تھے۔اسی سے لوگوں کو تالیف اور تصنیف کا بہت شوق تھا۔غدر میں جو کلام کھو گیا

اسکے علاوہ بھی مہر کی تصنیف و تالیف کا بہت ذخیرہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہے:۔

الماس درخشاں۔دیوان کا نام ہے۔اسکا تاریخی نام خیالات مہر ہے جو مصنف کے انتقال کے بعد ان کے پوتے مرزا قاسم حسین صاحب قزلباش نے چھپوایا ہے۔اس میں کچھ غزلیں فارسی کی بھی شامل ہیں اور اکثر غزلیں سنگلاخ زمین میں لکھی ہیں جو مصنف کی کہنہ مشقی اور اُستادی کا اظہار کر رہی ہیں۔

بارۂ عروض اُردو میں فن عروض کا ایک مختصر رسالہ ہے جسمیں انھیں بحروں کا بیان ہے جس میں اُردو کے شاعر اکثر طبع آزمائی کیا کرتے ہیں جو مصنف کے ایک شاگرد نے چھپوا کر شایع کیا۔

ایاغ فرنگستان تاریخ کی ایک کتاب ہے جو ۱۸۶۳ء میں چھپی تھی۔اس میں مختصر حال شروع عملداری انگریزی سے گورنر اور لفٹنٹ گورنر کا اور بڑے بڑے واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں۔

داغ نگار ایک مثنوی ہے جس میں عاشق و معشوق کا ایک سچا واقعہ نظم کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ پوری مثنوی ایک روز میں نظم کر کے چھپوائی۔

داغ دل مہر ایک واسوخت ہے۔

شبیہ عشرت میں اپنے فرزند آغا سخاوت علی بیگ کی شادی کے سہرے اور تاریخیں جو احباب نے لکھی ہیں جمع کر کے چھپوائی ہیں۔

ذاب انتقام ایک مذہبی کتاب ہے جس میں مختار کا حال نظم کیا ہے۔

شعلۂ مہر مثنوی ہے جو ۱۲۷۵ھ میں مطبع حیدری آگرہ میں طبع ہوئی ہے۔یہ وہی مثنوی ہے جس کی تعریف غالبؔ نے اپنے خطوط میں لکھی ہے۔اس میں نگارین بیگم زوجہ مسعود سوداگر پر سلطان محمود کا عاشق ہونا نظم کیا ہے۔

انکے علاوہ رسالہ زبردبنیات، ہمدم آخرت، بیان بخشائش، عید قیصریہ، پنجہ مہر، توقیر شرف وغیرہ مختلف مقاصد پر نظم کی گئی ہیں۔ اس سے مہر کی پرگوئی کا پتہ ملتا ہے۔ اسکے علاوہ اور مراثی وغیرہ غیر مطبوعہ آپ کے یادگار ہیں۔ ہر صنف سخن پر تھوڑا بہت کلام مرزا صاحب کا ملتا ہے۔ غزل، مستزاد، مسدس، مثلث، مسبع، تضمین، رباعی، مخمس، قطعہ، مثنوی، تاریخ، وغیرہ دیوان میں بھی موجود ہیں۔

مادۂ تاریخ ہمیشہ صاف اور پاکیزہ نکالتے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں ان کے فرزند مرزا سخاوت علی مسل خوان صدر کلکٹری ایٹہ کے سررشتہ دار مقرر ہوئے اس خوشی میں آپ نے تاریخ لکھی۔

مستقل شد بہ افسریِ مال نور چشم دلم چو گل بشگفت
مہر تاریخ سال استقلال نیک سررشتہ دار ایٹہ گفت
۱۸۶۶ء

میر وزیر علی صبا نے انتقال کیا آپ نے مادہ تاریخ نکالا۔

دورِ صبا گلشن جنت میں ہے ۱۲۷۱ھ

غالب مرحوم کے انتقال کی تاریخ لکھی۔

بجنان غالب نامی آمد ۱۲۸۵ھ

مہر کی خوش نصیب ماں نے شوہر کے انتقال کے صدمے اٹھانے کے بعد فرزند کے عروج سے دل کو خورسند کیا۔ مہر نے تعلیم پائی شادی ہوئی بہو گھر میں آئی، غدر ہوا، بیٹے نے سرکار کی خوشنودی کے لحاظ سے انگریزوں کی جان بچائی، خلعت اور جاگیر سے سرفراز ہوا، وکالت سے منصف ہوا، پوتا جوان ہوا، کلکٹری ایٹہ کا سپرنٹنڈنٹ مال مقرر ہوا، شادی ہوئی، پوت بہو آئی، اپنے باغ کی بہار اچھی طرح دیکھنے کے بعد ۱۲۸۶ھ میں اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ مہر نے تاریخ لکھی۔

شد جنتی مادرِ پاک مہر ۱۲۸۶ھ

ڈاڑھی ہمیشہ منڈوایا کئے۔ کلا صاف رہتا تھا۔ جب خدا نے ۱۲۸۲ھ میں پوتا دیا تو اس خوشی میں آپ نے ڈاڑھی رکھ لی۔ لوگوں نے سبب پوچھا کہنے لگے یہ منت مانی تھی کہ پوتا ہوگا تو ڈاڑھی رکھیں گے۔ کشیدہ قامت، رنگ گندم گوں، کترواں ڈاڑھی مخضب۔

روزگار کے لحاظ سے ہمیشہ آگرہ میں رہتے تھے۔ جج مجسٹریٹ تھے۔ تین مہینے بنچ میں برابر نشست رہتی تھی۔ تین مہینے فرصت ہوتی تھی۔ فرصت کے زمانے میں ایٹہ میں اپنے بیٹے آغا سخاوت علی تحصیلدار ایٹہ کے پاس چلے آتے تھے۔

ایک دفعہ ایٹے میں تھے کہ ہچکی کا مرض شروع ہو گیا آخر ۲۸ شعبان ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۰۔ اگست ۱۸۷۹ء روز دوشنبہ غروب آفتاب کے بعد مہر آسمان سخن بھی گوشۂ قبر میں چھپ گیا۔ دوست احباب کو اس سانحہ کا بہت صدمہ ہوا اسد علی کے تکئے میں دفن ہوئے۔ چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مرزا صاحب کے کلام میں روزمرہ اور محاورے کے لطف کے ساتھ کلام میں پختگی اور ترکیب میں متانت اور مضامین بلند ہیں۔ بعض بعض مقام پر استعارات اور تشبیہیں فارسی کی بھی موجود ہیں۔ کلام کو رنگین اور بلند کرکے دکھانے میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ کہیں سادہ شعر میں ایسا مزا پیدا کر دیا ہے جسے سنکر آدمی پھڑک اٹھے ؎

تجھ سے تو ہے امید ہمیں لطف و کرم کی ہوگا کسی کا فرہی کو ڈر روزِ جزا کا

کتنا صاف شعر ہے اور کافر کے لفظ نے کتنا مزہ دیا۔

محراب کے عوض خم گیسو ہے یار کا عالم ہے دل میں عابدِ شب زندہ دار کا

اس سادگی کے بعد اس بلند پروازی کو دیکھئے۔ خم گیسو کو محراب بنایا۔ دل کو عابد شب زندہ دار سمجھنا پھر گیسو کی رعایت سے شب کا استعمال کتنا دشوار گزار راستہ تھا۔

ظلم سے بھی ظالموں کو آسرا ہو جائیگا پیر گردوں کو مرا نالہ عصا ہو جائیگا

محال امر کو ممکنات کر دکھایا۔

آبروِ اشکِ ندامت سے مجھے ہوگی نصیب پنجۂ مژگانِ تر دستِ دعا ہو جائیگا

شعر کی بلندی قابلِ دید ہے۔

مرے دستِ جنوں کا شغل اچھا نکل آیا　　گریباں پھٹ گیا تو دامنِ صحرا نکل آیا

کیا طوفاں سا طوفاں ہمارے دیدۂ تر نے　　جو اِک آنسو نکل آیا تو اِک دریا نکل آیا

غبارِ خاطرِ یارانِ رفتگاں نہ رہا　　میں خاک ہوکے بھی دنبالِ کاروان رہا

وہ بے حجاب سوئے عالمِ شباب آیا　　بہار آئی تو گلشن میں باغباں نہ رہا

شکلِ آئینہ دلِ صاف جو پیدا کرتا　　وہ مجھے دیکھتا اور میں اسے دیکھا کرتا

اشعارِ بالا میں حسنِ بندش شکوہ الفاظ حسنِ تخیل روزمرہ سب موجود ہے۔ ذیل میں آپ کے کلام کا مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے:-

مَیں تو اس چال پہ مرتا ہوں کہ چلتے چلتے　　ٹھوکریں ماریں سرِ گورِ غریباں کیا کیا

تجھی سے جس نے پایا مطلبِ دل اپنا پایا　　بتوں کو برہمن نے عمر بھر پوجا تو کیا پایا

یہ شانِ بے نیازی ہے کہ وارستہ کیا مجھکو　　طبیعت بے غرض پائی دلِ بے مدعا پایا

چراغِ دیر میں شمعِ حرم میں تیرا جلوہ ہے　　تجھی کو ہر جگہ دیکھا تجھی کو جابجا پایا

میرے اور یار کے ہے بیچ میں دریا حائل　　جوش آنسا نہ ترا دیدۂ گریاں ہوتا

قفل کنجی کی اگر گوندھتے پہ چوٹی صاحب　　کوچۂ زلف مجھے گوشۂ زنداں ہوتا

عاقلوں کا ہے تکدر بھی فروغ سادہ لوح　　خاک سے آئینہ چرخ کا خاک اسکندر ہوا

آسماں پر آپکے جھمکے کا یہ پڑتا ہے عکس　　بندہ پرور عقدۂ عقدِ ثریا کھل گیا

روزی ہوا ہے دانۂ زنجیر و آبِ تیغ　　قسمت کا عاشقوں کی یہی آب و دانہ تھا

ذرا تمھیں مرے رونے پر التفات نہیں　　بتو خدا سے ڈرو یہ ہنسی کی بات نہیں

خدا کریم ہے اس سے تو ہے اُمیدِ نجات　　زبانِ واعظِ مغرور سے نجات نہیں

پیار سے مَیں نے جو دیکھا تو وہ فرماتے ہیں　　دیکھتے دیکھتے ہوتی ہیں گنہگار آنکھیں

رنگِ صحبت بدلتے جاتے ہیں　　ساتھ کے یار چلتے جاتے ہیں

صبر ہم بےقرار کرتے ہیں　　جبر یہ اختیار کرتے ہیں

چڑھا کشتی پہ جب وہ غیرتِ مہتاب دریا میں　　تو ہالے بن گئے اے مہرؔ سب گرداب دریا میں

ہوا جاتا ہوں پانی پانی احسانِ احبا سے　　عبث مجھکو ڈبوتے ہیں مرے احباب دریا میں

رات دن سینہ زنی خاک بسر کرتے ہیں　　عیش و آرام سے ہم خاک بسر کرتے ہیں

روزہ کیا رکھیں وہ میخوار جو میخانے میں　　پانی پی پی کے شب و روز گزر کرتے ہیں

صورتِ گردِ رہِ قافلہ مَیں بیکس ہوں　　ہمسفر بھی مرے سب مجھسے حذر کرتے ہیں

پوچھتا کون ہے اب علم و ہنر کو اے مہرؔ　　سخت نادان ہیں جو کسبِ ہنر کرتے ہیں

دل مجھکو دے کے حکم دیا بے نیاز نے　　اس دل میں دو وہ درد جو درماں پسند ہو

غافل نہو سرا یہ محلِ خطر بھی ہے　　شب کاٹنی ہے صبح کو عزمِ سفر بھی ہے

میں وہ ہوں جس نے تیغِ قاتل کو　　معرکے میں گلے لگایا ہے

شانہ نکر و گیسوؤں کا تار نہ ٹوٹے　　دیوانوں کی زنجیر ہے ہشیار نہ ٹوٹے

قرباں مَیں کس ناز سے کہتے ہیں وہ مجھسے　　سر پھوڑ بیٹے لیکن مری دیوار نہ ٹوٹے

کوئی دلسوز سوا اسکے نہ دیکھا اپنا　　شمع رونے کو مری قبر پہ آجاتی ہے

کوچ وقتِ سحر ہمارا ہے　　کوسِ رحلت گجر ہمارا ہے

سخی بھی خدا کے ہے فضل و کرم سے　　بتو مہرؔ کا نام حاتم علی ہے

عبث کرتے ہیں کیوں ہر کام میں تدبیر پہلے سے　　وہ ہوگا لکھ چکا جو کاتبِ تقدیر پہلے سے

کدھر کا چاند ہوا مہرؔ کے جو گھر آئے　　تم آج بھول پڑے کس طرف کدھر آئے

دلسوز ہے کوئی نہ کوئی غمگسار ہے　　مرنے کو ہم ہیں رونے کو شمعِ مزار ہے

سند ہمیں وہی ہوگی تری کریمی کی　　جو فرد ہاتھ میں اپنے گناہ کی ہوگی

معین اپنے بندوں کا ہر آن تو ہے　　خداوندِ عالم نگہبان تو ہے

شمع کی تقریر پروانوں سے یہ محفل میں ہے　　وہ زباں پر ہے ہمارے جو تمہارے دل میں ہے

زلف اندھیر کرنے والی ہے　　تمنے ناگن بلا کی پالی ہے

اسکے مذہب کا اعتبار ہے کیا　　مہرؔ اک رند لاابالی ہے

کس منہ سے خداوندا ترا شکر ادا ہو　　جب دانت نہوں بندوں کے تب دودھ عطا ہو

رومال کے لباس میں ابر آکے بارہا　　پانی پیا گیا مری چشمِ پُر آب سے

عشرت لکھنوی

شرائع ہنود واسلام کی مماثلت

ضرورت کے وقت مصلح ظاہر ہونے کا ثبوت تواریخ اور مذہبی کتب میں موجود ہے۔ قرآن شریف میں صاف طور پر ارشاد ہے کہ ہر ملک وملت کے واسطے خدا ایک ہادی مقرر کرتا ہے۔ بعض رسولوں کے نام وحالات کی تصریح فرما دی گئی ہے۔ بعض کی نسبت اشارے کنائے کر دیئے ہیں۔ اور پھر ایک کلیہ قاعدہ قایم کرکے حکم دیدیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے تمام رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانا ضروری اور لازم ہے۔ مسلمان بھی زبان سے نہیں بلکہ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ جن رسولوں کی اطلاع اُن کو پہنچی اور جن کی نہیں پہنچی سب برحق ہیں

اتنا معلوم کرنے کے بعد سوچنا چاہیئے کہ ملک ہندوستان جو دنیا میں ایک بڑا ملک کہلاتا ہے اس بات کا مستحق ہے یا نہیں کہ یہاں بھی خدا نے اپنے دستور کے موافق پیغامبر بھیجے اور اُن کو ہدایت کرنے کے واسطے کتابیں دیں۔ اگرچہ قرآن شریف میں اس ملک کے رسومات کی بابت کوئی تصریح نہیں پائی جاتی مگر خدا کے اس کلیہ کے موافق کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان بھی اُن متبرک آدمیوں سے محروم نہیں ہے جنکو خدائی اصطلاح میں نبی و رسول کہتے ہیں۔

ہندوستان کے نامور بزرگوں سری رامچندر جی مہاراج اور شری کرشن جی مہاراج، اور مہاتما بدھ کے حالات پڑھنے، اُن کی طرز زندگی پر غور کرنے، اور اُن کی تعلیمات پر منصفانہ نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وہی حالات تھے جو سیدنا حضرت ابراہیم وعیسیٰ و موسیٰ وغیرہ علیہم السلام کے پائے جاتے ہیں اور وہی تعلیم تھی جسکا ذکر بار بار قرآن شریف میں آیا ہے۔ مگر افسوس ہے اس ملک کے بعض لوگوں نے اصلی بات معلوم کرنے میں توجہ نہیں کی اور ظاہری الفاظ پر عمل کرکے اپنے پاکیزہ اصول کو خراب کر دیا۔

ایک مثال دنیا کی پیدایش کی نسبت یوں دی ہے۔ قرآن شریف میں خداوند عالم فرماتا ہے کہ ہم نے حکم دیا کُن فیکون۔ ہندو مذہب میں ہے کہ اول برھما پیدا ہوا، اُس نے تمام عالم کو ظاہر کیا۔ غور کیجئے کہ ان دونوں بیانات میں کیا فرق ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ متحد بیان ہے۔ قرآن شریف میں خدا نے صفت خالقیت کو کُن کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور وید میں برھما کے لفظ سے۔ برھما صفت ایجاد کا نام ہے۔ جس طرح کُن کے ظہور کے بعد یکون کا ظہور ہوا اسی طرح برھما کے ظہور کے بعد سب کچھ ظاہر ہوا یہی کیفیت تمام اصول مذہب کی ہے۔ مورتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک جسم میں سیکڑوں ہاتھ اور متعدد سر ہیں اور ہر ہاتھ میں مختلف چیزیں ہیں کسی میں تلوار ہے، کسی میں پھول ہے، کسی میں اناج کا خوشہ ہے، اور ہندو اُن مورتوں کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اُس وقت آپ کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا مضحکہ ہے کہ ان کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ مگر حضرات ہندوستانی رہبروں نے یہاں کے باشندوں کو سمجھانے کے لئے صفات الٰہی کی حقیقت صاف طور پر ذہن نشین کرنے کے واسطے یہ مورتیں بنائیں تھیں تاکہ کم سمجھ لوگ آسانی سے سمجھ جائیں کہ خدا میں قہر کی شان بھی ہے جسکا نمونہ تلوار ہے، اور رحم بھی جسکا نشان پھول دلفریب ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق ہے اسلئے اناج کا خوشہ دکھلایا ہے۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ انسان بہت ہی بے عقل ہے اور مثالوں کو ذریعہ کے بجائے نتیجہ سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ ان مثالی مورتوں کے سبب بت پرستی شروع ہوگئی اور ہزاروں غلط فہمیاں واقع ہوگئیں یہ بات ہندوستان پر مخصوص نہیں۔ روم، یونان، اور مصر میں اسکی کافی شہادتیں موجود ہیں۔

مجمل طور پر ہندوستان کے دو نامور بزرگوں سری رامچندر جی

مہاراج اور سری کشن جی مہاراج کے حالات بیان ہوئے ہیں تاکہ معلوم
ہو کہ ان لوگوں کی زندگی اور تعلیم ہمارے مسلّمہ رسولوں کے کس قدر
مشابہ تھی۔ مَیں رام و کرشن جی کے بعض اقوال کو اپنے حضور صلعم کے
ارشاد نیز قرآن شریف کے بیان سے مطابق کرکے دکھانا چاہتا ہوں
کہ یہ لوگ واقعی ہندوستان کے رسول تھے۔ اور ہمارے حضور نے
جو سب کے بعد بھیجے گئے وہی بیان فرمایا جو پہلے بیان ہو چکا تھا۔ کوئی
نیا دین لیکر نہیں آئے تھے۔ لہٰذا تمام دنیا خاصکر ہندوستان کو لازم
ہے کہ پُرانی تعلیم کو نئے طریقہ سے سیکھے جو سب سے زیادہ آسان ہے
جس میں اکثر وہی باتیں ہیں جو ہندوستانی رسول فرما گئے تھے۔

ایک عجیب بات ہے جسکی بابت حدیثوں میں بھی اشارہ ہے کہ
ہر بڑے رسول کو ایک بڑے دشمن سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ دشمن
اُسی رسول کے ہاتھ سے ہلاک ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم کو نمرود اور
حضرت موسیٰ کو فرعون، اور ہمارے حضور صلعم کو ابوجہل سے سابقہ پڑا تھا۔
اسی طرح رامچندر جی کو راون، اور سری کرشن جی کو کنس جیسے خونخوار
دشمن دئے گئے تھے۔ جو مذکورہ بالا دشمنوں کی طرح ذلت و خواری
سے ہلاک ہوئے۔

اب یہاں سے عرض ہے کہ گوتم بدھ نے اس درجہ بندی کو
توڑ دیا ہے اور اسلئے چین وجاپان میں جو منوسمرتی جاری ہے اُسمیں
وہ درجہ بندی والے احکام نہیں پائے جاتے۔ ممکن ہے کہ کچھ اور باتہو
مگر جس نسبت کے ساتھ شرائع ہنود و اسلام میں منوجی کے اخلاقی و فقہی
مسائل کا استخالہ ہوا ہے اُسکا امتیاز صرف اُس مماثلت سے ہو سکتا ہے
جو منوسمرتی اور شریعت اسلام میں پائی جاتی ہے۔ یہ مماثلت اور مشابہت
نہ صرف کلیات ہی میں موجود ہے بلکہ بعض مسائل جزویات میں باہم اس قدر
مماثل اور مشابہ ہیں کہ مثال پر توارد کا دھوکا ہوتا ہے۔ پھر ہندوستانی
رہبر کن کے ہوئے اور ہم کن کے ہوئے، اور پھر یہ اگیان کا بھرم نہیں
تو اور کیا ہے۔ ہندو کون اور مسلمان کون ایک ہی مایا ہے۔ دوہا

بھنجے بھنجے[1] ایک ست بن پہنچے مت اور
کشن داس گھڑی ارٹھ کی ڈھریں ایک ہی ٹھور

یعنی کبیر صاحب نے خلاصہ کر دیا۔

اللہ الکھ جون ایک ہے بیچ پڑا ہے دھوکا
کہت کبیر سنو بھائی سادھو۔ چاول کہو کہ چوکھا[2]

شرائع ہنود و اسلام میں کس قدر مماثلت ہے۔ سو ملاحظہ ہو ع

دوئی را چوں بدر کردم یکے دیدم دو عالم را

(۱) منو کا پنج یگ شارع اسلام کی پنجگانہ نماز (۲) اہل ہنود کا
آچمن اسپرش مسلمانوں کا وضو و مسح (۳) ہندوؤں کا اشنان اہل اسلام
کا غسل (۴) اہل ہنود کا شوچ مسلمانوں کا تیمم (۵) ہندوؤں کا لسنکا
مسلمانوں کا استنجا (۶) ہندوؤں کا جپ مسلمانوں کی تسبیح و تہلیل (۷)
اہل ہنود کا پاٹ مسلمانوں کی تلاوت (۸) ہنود کا برت مسلمانوں کا روزہ
(۹) ہندوؤں کا دان پن مسلمانوں کی خیرات زکوٰت (۱۰) ہندوؤں کا
بلدان مسلمانوں کا صدقہ (۱۱) ہندوؤں کی تیرتھ جاترا مسلمانوں کا حج۔
(۱۲) ہندوؤں کی پردکشنا مسلمانوں کا طواف (۱۳) ہندوؤں کی پرایشچت
مسلمانوں کا کفارہ (۱۴) اہل ہنود کا شرادھ مسلمانوں کی فاتحہ (۱۵) ہندوؤں
کا بیکنٹھ و نرک مسلمانوں کی بہشت دوزخ (۱۶) ہندوؤں کا اچھے بٹ
مسلمانوں کا طوبیٰ (۱۷) ہندوؤں کی اپسرا۔ دھرم راج۔ وگن مسلمانوں
کی حوریں رضوان، و ملائکہ (۱۸) ہندوؤں کی اکاش بانی مسلمانوں کا
الہام و القا (۱۹) ہندوؤں کے چترگپت مسلمانوں کے کراماً کاتبین (۲۰)
ہندوؤں کے جم راج مسلمانوں کے عزرائیل (۲۱) ہندوؤں کی بیترنی
مسلمانوں کی پل صراط (۲۲) ہندوؤں کا مدھکر کنڈ مسلمانوں کا حوض کوثر
(۲۳) ہندوؤں کا کلپ برچھ مسلمانوں کا سدرہ (۲۴) ہندوؤں کی
بارنی مسلمانوں کی شراب طہورا (۲۵) ہندوؤں کا کیلاش مسلمانوں کا

---

[1] نشانہ سب کا ایک ہے [2] چوکھا گجرات میں چاول کو کہتے ہیں۔

عرش عظیم (۲۶) ہندوؤں کا بوان مسلمانوں کی معراج (۲۷) ان کا گیان اُن کا عرفان (۲۸) ان کا دھیان اُن کا مراقبہ (۲۹) ان کے گرو۔ مہاتما ان کے پیر فقیر (۳۰) ان کے۔ کلکی اوتار۔ ہمارے حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جن کے والد کا نام۔ وشنو دیس۔ ہوا۔ وشنو کے معنی اللہ۔ اور دیس کے معنی عبد یعنی عبداللہ نام ہوا۔ ماں کا نام سومتی یعنی امانت دار ہوا۔ سو حضور کی والدہ محترمہ کا نام آمنہ تھا۔ حضرت نے غار حرا میں عبادت کی۔ پرشرام یعنی پرش کہتے ہیں روح کو رام اللہ کو جبرئیل سے تعلیم پائی۔ حضرت جبرئیل سب سے پہلے وحی لیکر آئے شنبل دیس میں پیدا ہوئے۔ شنبل دیس ملک عرب کو کہتے ہیں۔ یہ سب کلکی پرانوں میں درج ہے۔ جس سے کوئی تعلیم یافتہ فرد بشر انکار نہیں کرسکتا۔ اور ہٹ دھرمی چیزے دیگر ست۔ اس بیان سے جب ثابت ہوچکا کہ جس طرح سب پیغمبر ہمارے حضور کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہندوستانی رسولوں نے بھی تصدیق کی ہے۔ اور طریقے بھی ایک سے ہیں تو ہندوستانی رسولوں کی اُمت کو بھی اگر واقعی وہ منصف مزاج ہیں ہمارے حضور کلکی اوتار کی تصدیق صدق دل سے کرنی چاہیئے۔ اور ہمکو بھی ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہیئے۔ اس سے ہندو مسلمانوں میں دلی اتحاد پیدا ہوسکتا ہے جسکی ہندوستان کو نہایت ضرورت ہے اور حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تائید ہوسکتی ہے۔

حافظا۔ گر وصل خواہی صلح کن باخاص و عام با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

سید محمد اسد علی

اُردو میں انگریزی الفاظ

تمام اردو اخبارات میں کم و بیش انگریزی الفاظ کا استعمال رائج ہوگیا ہے اور اس صورت میں اُردو زبان پر جو اثر پڑتا ہے وہ ترقی خواہانِ زبان اُردو سے مخفی نہیں۔

ہمارے صوبہ برہما میں چونکہ آج کل اُردو زبان سُرعت سے ترقی کررہی ہے اور اسکو طلبا و علما کے نہایت محنت سے یہاں حاصل کیا جا رہا ہے اسلئے یہاں کے ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی اُردو اخبار آہی جاتا ہے۔ یہاں کے مسلمان باشندے اُردو پرچوں کو نہایت شوق سے خریدتے اور پڑھتے ہیں مگر ان لوگوں میں عموماً یہ شکایت پائی جاتی ہے کہ انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال گویا اُن کے لئے اُردو عبارت کے سمجھنے میں سخت رُکاوٹ پیدا کردیتا ہے۔

مجھے مدت سے اسکا خیال تھا اور کسی مناسب موقع کا انتظار تھا کہ اپنے خیالات کو ظاہر کروں کہ "روزانہ پیسہ اخبار" مطبوعہ ۵ر دسمبر ۱۹۱۱ء پر نظر پڑی جس میں ایک مضمون بعنوان انگریزی الفاظ کا استعمال شایع ہوا ہے۔ اس کے دیکھنے سے مجھے نہایت خوشی ہوئی اور میں صاحبِ مضمون سے اس بارے میں بالکل متفق ہوں۔ لیکن مجھے مدیر "پیسہ اخبار" معاف فرمائیں کہ میں ان کے جواب سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ وہ حسب ذیل رقم طراز ہیں:۔

> مجبوراً اُردو اخبارات میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات درج کرنی پڑجاتی ہیں۔ مگر جو صاحب انگریزی داں نہ ہوں وہ کارخانہ پیسہ اخبار سے کتاب ضروری انگریزی الفاظ منگوا کر اُس میں سے تمام الفاظ کے معنی دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ تمام انگریزی لفظ جو اُردو میں استعمال ہوتے ہیں اس کتاب میں بطور لغات ابجد کے قاعدے سے درج ہیں۔

مثلاً آپ نے آفینسو (Offensive) اور ڈیفنسو (Defensive) دو لفظ پیش کئے ہیں۔ اب کتاب کے صفحہ ۶ پر ردیف الف میں "آفینسو"

درج ہے جس کے سامنے لکھا ہے وہ جنگ یا امر جس میں پیش دستی کیجائے اور "ڈی فنسو" کے سامنے صفحہ ۲ ایر ردیف دال میں درج ہے "وہ لڑائی یا فعل جو اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لئے کیا جائے" ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی ایسی مجبوری تھی کہ بجنسہ انگریزی لفظ لکھ دیا گیا حالانکہ اسکا ترجمہ اُردو میں بہ آسانی ادا ہو گیا۔

چند روز ہوئے کہ ہمیں ایک نہایت بارسوخ اور ذی علم صاحب سے (جو خاص شہر مانڈلے کے باشندے ہیں) ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا۔ دورانِ گفتگو میں اُردو اخبارات کی خریداری کی بابت سفارش کی گئی تو جواب ملا کہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ اُردو اخبارات کا برابر مطالعہ کیا کریں لیکن عبارت میں انگریزی الفاظ کا حائل ہونا اخبار بینی کے لطف کو زائل کر دیتا ہے۔

یہ امر قابل قدر و باعث مسرت ہے کہ بہت سے انگریزی داں اُردو کے مصنف بے ضرورت انگریزی الفاظ کو اُردو عبارت میں داخل کرنا ناپسند کرتے ہیں مثال کے طور پر ایک معزز خاتون کے خیالات پیش کرتا ہوں :۔

ہماری بیدار مغز علم دوست بہی خواہ قوم اور نہایت قابل بہن جناب مجستہ اختر بانو صاحبہ نے ہنری وُڈ کے ایک اخلاقی ناول کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا ہے جس کا نام "آئینہ عبرت" ہے ... ترجمہ سلیس زبان میں ہے اور اس بات کا حتی الوسع خیال رکھا گیا ہے کہ انگریزی الفاظ شامل نہ کئے جائیں۔ یہ واقعی خوبی کی بات ہے کیونکہ آج کل مرد بھی بہ مشکل اس بات کا خیال رکھتے ہیں رسالے اور ناول غیر ضروری انگریزی الفاظ سے خلط ملط ہو کر عجیب صورت پیدا کر دیتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہو اور اُردو فارسی عربی الفاظ نہ ملتے ہوں تو اور بات ہے۔ لیکن مشیخت جتانے کے لئے تو بہت ہی غیر موزوں معلوم ہوتا ہے بلکہ زبان کا لطف جاتا رہتا ہے

بعض مشرقی علوم کے جاننے والے جنکو انگریزی زبان میں دخل نہیں ہے جب انگریزی لفظوں سے اپنی عبارت کو رنگتے ہیں تب تو سبحان اللہ ایسی وضع پیدا ہوتی ہے کہ بے اختیار یہی خیال آتا ہے، اور افسوس ہوتا ہے کہ کاش تیتر بٹیر نہ بنے ہوتے۔ بطور مثال ایک جملہ ہدیۂ ناظرین کرتی ہوں۔ ایک صاحب اثنائے گفتگو میں فرماتے ہیں جلڈ رن ونڈو میں سے پیپ کرتے ہیں اُردو کا خدا حافظ ہے لیکن انگریزی کا حشر بھی تو ملاحظہ ہو، یعنی اُن کا مطلب ہے کہ "بچے کھڑکی (یا دریچہ) سے جھانکتے ہیں"۔ ایسی زبان سے کس کو نفع ہو سکتا ہے۔ بے شک گفتگو میں حد درجہ کو یہ بات پہنچی ہے لیکن تحریر میں بھی بعض حضرات غضب ڈھاتے ہیں ویسی عبارت بہت کر یہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ حاکم کا اثر پڑنا بدیہی بات ہے مگر کچھ تو پرہیز ہو۔

رسالہ زنانہ (دسمبر ۱۹۰۴ء) میں باستانی روایات کے عنوان سے ایک مضمون چھپا تھا۔ اُس میں مضمون نگار صاحب نے تحریر کیا تھا کہ

بیچاری اُردو زبان تو ابتدا ہی سے مرکب و مخلوط ہے اب مزید آمیزش سے اُس میں بہت تصرف روا رکھا گیا ہے غدر سے پہلے دہلی کے مستند اساتذہ اس ترکیب مجنس کو مزاحاً گدا امیر کہتے تھے۔ اور شاید صرف یہی ایک معنوی لفظ انگریزی کا اُس وقت کے نامی عالم عربی و فارسی کے جانتے تھے۔ التباس زبان کے اندیشہ کے علاوہ اکثر مقدس اہل اسلام اُس زمانہ کے متنفر سے بھی بہت پرہیز کرتے تھے یہاں تک کہ بعض مسائل علمی میں بھی اختلاف تھا جواب بھی ہے اور رہیگا...... اُردو زبان میں انگریزی الفاظ کا امتزاج ناپسند تھا۔ غالب نے مرشد زادہ آفاق مرزا جواں بخت کی شادی کے منظوم سہرے میں ایک لفظ انگریزی نمبر کا اتفاقیہ استعمال کیا تھا اُس پر اُردوئے معلیٰ میں سخت ہنگامہ برپا ہوا۔

اس جگہ ہم مسٹر سی ڈبلیو وہش کے اُس قابل قدر مضمون کا بھی

جو اُنھوں نے زبان اُردو پر لکھکر رسالہ مخزن (فروری ۱۹۱۰ء) میں شایع کرایا تھا کچھ اقتباس کرتے ہیں:۔

ایک مدت سے اُردو کے بولنے والوں کو انگریزوں سے معاملہ پڑا ہے۔ علوم جدیدہ اور مشاغل جدیدہ کا چرچا شروع ہے۔ ان کی بابت لکھنے یا بولنے کے لئے اُردو کے بولنے والے انگریزی الفاظ بجنسہ لیکر اُردو میں ملا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اصطلاحی الفاظ لینے پر ہم مجبور رہیں تاہم ان کے لینے میں بھی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ان کو مناسب وضع اور لباس میں لیا جائے تاکہ ان کی اجنبیت جاتی رہے، اور بے ضرورت انگریزی الفاظ داخل کرنے سے تو بہ صورت پرہیز چاہیئے۔ میرے خیال میں اہل زبان کو سب سے پہلے یہ اچھی طرح دیکھنا چاہیئے کہ آیا ان کی زبان میں کوئی ایسا لفظ موجود ہے یا نہیں جس سے وہ خیال ظاہر ہوسکے جس کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اکثر لوگ محض غفلت یا سہل انکاری سے دوسری زبان کے الفاظ ملا دیتے ہیں۔ اسکے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ان زبانوں میں جو قدرتی جز اسی زبان کا بنی ہوئی ہیں ایسا لفظ موجود ہے یا نہیں جس سے مطلوبہ خیال کا اظہار ہو۔ اگر ان میں ہے تو وہ مقدم ہے۔ مثلاً اُردو کے لئے سنسکرت عربی اور فارسی کے خزانوں میں ڈھونڈھنا چاہیئے کہ مناسب الفاظ میسر ہیں یا نہیں؟ اگر ان میں تلاش کرنے پر بھی مطلب نہ نکلے تو کسی دوسری زبان سے لینے میں مضائقہ نہیں۔ مگر حتی الامکان یہ استثنا صرف اصطلاحی الفاظ کے لئے رکھنی چاہیئے اور عام نہیں کرنی چاہیئے۔

آگے چلکر صاحب ممدوح فرماتے ہیں:۔

اگر کسی کو اس ضرورت کا پوری طرح احساس نہ ہو تو اکثر اُردو اخبارات اور رسالوں پر نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ وہ آسانی سے دیکھ سکے گا کہ کس کثرت سے انگریزی الفاظ کی بھرمار ان میں ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو یہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے کہ جس زبان میں اخبار لکھا ہوا ہے وہ اُردو ہے یا انگریزی۔ اس خرابی کا علاج ایک حدتک ایڈیٹر صاحبان کے ہاتھ میں ہے اگر وہ اس طرح کھچڑی زبان میں لکھے ہوئے مضامین کے لینے سے انکار کردیا کریں یا لکھنے والے کے پاس یہ ہی الفاظ درخواست بھیجدیا کریں کہ وہ صفائی زبان کا زیادہ تر خیال رکھکر درست کردیں اور پھر بھیجدیں تو بہت سا فائدہ ہوسکتا ہے۔ تھوڑی سی توجہ سے عموماً دیسی الفاظ مل سکتے ہیں اور قیاس میں نہیں آتا کہ اپنی تین زبانوں کی موجودگی میں ہندوستان والوں کو انگریزی سے اس کثرت کے ساتھ مدد لینے کی ضرورت ہو۔ اگر واقع میں اپنی تینوں زبانوں سے لفظ مناسب نہ ملے تو انجمن کا کام ہوگا کہ کوئی نیا لفظ گڑھے جو زبان میں بخوبی کھپ جائے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ سب ضروری اصطلاحات اور باریکی ہائے معنی کے لئے اُردو میں الفاظ اور محاورات موجود ہوجائیں۔ یہ کام خاص حصہ تو محقق علما کا ہی ہے مگر دوسرے لوگ بھی جو زبان کے بولنے والے ہیں، خواہ بڑے عالم نہ بھی ہوں، اس کام میں معقول مدد دے سکتے ہیں، اور خود اپنی بولی میں صفائی اور پاکیزگی کی کوشش کرکے بیجا ملاوٹ کے دن بدن بڑھتے ہوئے شوق کو روکنے میں شریک ہوسکتے ہیں۔ اگر لوگ اس کام کی اہمیت کو سمجھ جائیں اور جان لیں کہ عمدہ اور مکمل زبان کا مالک ہونا ملک کی عزت اور بہبودی کا باعث ہوگا، اور اس میں نقص پیدا کرنے یا اس کی خرابی کا علاج نہ کرنے سے ملک کے اغراض کو نقصان پہنچ جائیگا، تو پھر انھیں احتیاط سے کام لینا اور خود اپنی زبان کے وسائل کو بڑھانا کچھ دشوار نظر نہ آئیگا۔ زبان کے اتحاد اور اس کی پاکیزگی کے لئے اہل ہند کی متفقہ کوشش کی ضرورت محض خیالی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس میں اتحاد ملک کا راز چھپا ہوا ہے اور اسی سے امید کی جاسکتی ہے کہ ملک میں ملکی ہمدردی اور قومیت کا خیال اپنا ظہور دکھائے۔

کرنل زنگنگ صاحب جو اردو زبان کے ایک اعلیٰ مصنف اور اردو کے ممتحن ہیں اپنی انگریزی اردو لغات کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

...... کوئی متنفس آج کل کے کسی ہندوستانی اخبار کو جو مادری زبان کے ایک موزوں اور بامحاورہ لفظ کے بجائے انگریزی الفاظ کے استعمال کرنے کے میلان میں تیزی سے بڑھ رہا ہے بغیر متاثر ہوئے ہاتھ میں نہیں لے سکتا - یہ امر ہر پہلو سے نہایت ناقابل قدر ہونا چاہیئے، کیونکہ یہ ہندوستانی زبان کی خرابی کا باعث ہوتا ہے اور اس پر اصرار کیا جائے تو لامحالہ کچھ عرصہ کے بعد اکثر قیمتی الفاظ جو پھر بازیافت نہ ہوسکیں معرض گمنامی میں پڑ جائیں گے - اس افسوس ناک زوال کو کسی قدر روکنے کی اُمید سے میں نے تحریری پیرایہ میں انگریزی اور ہندوستانی کے درمیان تناسب کی حفاظت کرنے کے لئے کوشش کی - میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ باشندوں سے جو مذاق سلیم رکھتے ہیں استدعا کرتا ہوں کہ وہ اُس سیلاب کو جو ہندوستانی زبان کے ساحل پر فضول اور غیر کارآمد انگریزی الفاظ کے تموج کی تہدید کر رہا ہے، تھامیں -

ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ اردو زبان کی یہاں تک نگہداشت کرتے تھے کہ غیر فصیح الفاظ کو سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے، اور اب اخباری عبارت کی عموماً یہ حالت ہے کہ غیر ضروری انگریزی الفاظ کی بھرمار سے اس کو اس قدر بگاڑ رہے ہیں کہ وہ دن دور نہیں ہے کہ غالب اور ذوق کی اردو سے علیحدہ ایک نئی زبان پیدا ہو کر رہے گی -

اگرچہ ہمارے صوبہ کی برمی زبان ایک محدود اور علم ادب میں بے مایہ زبان ہے تاہم برمی لوگوں نے باوجودیکہ اجنبی قوموں کے ساتھ مدت دراز سے میل جول ہے، ابھی تک اس کو غیر ضروری اجنبی الفاظ سے خلط ملط نہیں ہونے دیا اور اپنی اصلی حالت میں ان کو قایم رکھا ہے -

مثلاً یہ انگریزی الفاظ اسٹیشن ماسٹر، ریل گاڑی، انجن، ٹکٹ، پوسٹ ماسٹر، اپیل، بائیسکل، ٹرام، پریس، پنسل، سلیٹ، وایسرائے، علیٰ ہذا القیاس اور بہت سے اس قسم کے انگریزی الفاظ جو پوری طرح سے اردو زبان میں مل گئے ہیں، برمی لوگوں نے انھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے - چنانچہ آپ کسی برمی کی زبان سے لفظ اسٹیشن ماسٹر خواہ وہ انگریزی داں ہی کیوں نہ ہو، جب وہ اپنی زبان میں گفتگو کرے گا تو ہرگز نہ سنیں گے - برمی روزانہ اخبارات Burma Herald اور Friend of Burma جو ٹائپ میں چھپتے ہیں اور جن کی تقطیع اور ضخامت کے برابر کوئی اردو اخبار ابھی تک موجود نہیں ہے، اگر آپ ملاحظہ فرمائیں تو شاذ و نادر ہی کوئی انگریزی لفظ ملے گا ورنہ صاف اور شستہ برمی عبارت ہی نظر آئے گی جیسا کہ عربی خواں اصحاب مصر کے روزانہ عربی جرائد میں پاتے ہیں - لہٰذا ہم ہندوستان کے ان فصحا و بلغا اور اراکین انجمن ترقی اردو سے جو زبان اردو کی ترقی و توسیع اور اُس کی صفائی و شستگی میں تابمقدور کوشش کر رہے ہیں درخواست کرتے ہیں کہ اس امر پر بخوبی غور کر کے کوئی مناسب عملی صورت اس ناگوار سیلاب کو روکنے کے لئے اختیار کر کے ہماری موجودہ اور آیندہ نسل پر ایک علمی اور مستقل زبان کی میراث چھوڑ کر ہمیشہ احسانمندی کا موقع بخشیں اور وہ ان کے ادائے شکر سے ہمیشہ قاصر رہیگی -

تونگو (برما) م - ی - چھانیا

ہندو کا کرشن نمبر - اخبار ہند (لاہور) کا کرشن نمبر خوب آب و تاب سے نکلا - کئی مضامین خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں - حضرات کیفی، محروم، برق کی دلکش نظمیں بھی اس میں موجود ہیں - جن اصحاب کو اس کے مطالعہ کا شوق ہو ایک آنہ کا ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں -

برسات کا ایک منظر

موسمِ گُل ہو چمن ہے اور بھری برسات ہو   تختۂ سنبل کے نیچے اک اندھیری رات ہے
جلوہ گر ہر ایک ذرّے سے خدا کی ذات ہو   چشمِ دل محوِ جمالِ حُسنِ مصنوعات ہے

پھول کا ہر صفحہ کیا ہے ؟ وادیِ تجرید ہے
غنچۂ سربستہ میں اک عالمِ توحید ہے

سبزہ لہریں لے رہا ہے نکہتِ گل بیقرار   ہر طرف ہو جلوہ گر حدِ نظر تک لالہ زار
کوہساروں میں بھرے ہیں نغمہائے آبشار   تازہ پھولوں سے ہے مملو دامنِ فصلِ بہار

گل کھلا ہے جو وہ بلبل کا دلِ صد پارہ ہو
الغرض دنیا تمام اک جنتِ نظارہ ہے

یہ سماں فرحت فزا اور تیرا جھولا جھولنا   یہ پپیہوں کی صدا اور تیرا جھولا جھولنا
یہ بہارِ دلربا اور تیرا جھولا جھولنا   اُف یہ جنگل کی ہوا اور تیرا جھولا جھولنا

پینگ جب تو نے لیا دل ہاتھ سے جانے لگا
حُسن کے دریا میں جذر و مد نظر آنے لگا

سر سے پا تک اک ادائے دلربا چھائی ہوئی   آنکھ شرمائی ہوئی اور زلف لہرائی ہوئی
پینگ لینے میں ہزاروں رُخ سے بل کھائی ہوئی   شانۂ بادِ صبا سے خوب سُلجھائی ہوئی

کیوں نہ ہو دلے کاکُلِ مرغولہ اوجِ ہوا
منصبِ مشاطہ پائے جبکہ ہر موجِ ہوا

عشق کا کھولے ہوئے دفتر نگاہِ سُرمگیں   دوش پر بکھری ہوئی مرغولۂ زلفِ عنبریں
رستخیز اندازہ ہے ہر اک ادائے دلنشیں   کون ہے اے حسن کی دیوی ترا نقش آفریں؟

گود میں ناز و ادا کی کس نے پالا ہے تجھے
حُسن کے سانچے میں ہیتلا کس نے ڈھالا ہو تجھے

ناگنیں لہرا رہی ہیں اے نگارِ مہ جبیں   باندھ لے جوڑا غضب ڈھاتی ہو زلفِ عنبریں
ہو چلی ہے تیرگی پیدا ہوا میں یا نہیں؟   خوف ہے مجکو سیہ آندھی نہ آ جائے کہیں

تار جو گیسو کا ہے گو یارہ ظلمات ہے
خیر ہو دل کی الٰہی یہ اندھیری رات ہے

وہ ترا جوشِ طرب زیرِ درختِ سایہ دار   وہ جوانی کی اُمنگیں رنگِ رُخ کا وہ نکھار
ہے سیہ پُتلی میں جادو انکھڑیوں میں ہو خمار   ابروئے پیوستہ سے شکلِ ہلالی آشکار

ہے لبوں پر مسکراہٹ بھی وفورِ ذوق میں
خاص ادا سے ڈوریاں جھولے کی دستِ شوق میں

چپ ہو تو کرتی ہیں لیکن تیری آنکھیں گفتگو   ہے تری چتون سے پیدا میری شمعِ آرزو
دیدنی ہی پینگ لینے میں ترا جوشِ نمو   دوڑتا پھرتا ہے رگ رگ میں جوانی کا لہو

حُسن پر خود اپنے دلدادہ ہیں دھانی چوڑیاں
زہر کھلوانے پہ آمادہ ہیں دھانی چوڑیاں

سر سے پا تک دلکش اک تصویرِ جذباتِ شباب   جلوہ ہو یا رخ میں گردش کر رہا ہے آفتاب
صندلی ماتھے کا ٹیکا ہے وہ نقطۂ انتخاب   حُسن کے دفتر میں مل سکتا نہیں جسکا جواب

سامنے یہ منظرِ عشرت فزا دن رات ہو
تُو ہو اور گلشن ہو اور معجز نما برسات ہو

عزیز لکھنوی

ہلالِ عید

(۱)

اے مہِ عید بے مثال ہے تو   سایۂ مہ ذوالجلال ہے تو
کششِ کافِ کُن کا نقشہ ہو   حُسنِ آغاز کا مآل ہے تو
نیم گردش ہے چشمِ ساقی کی   خطِ جامِ مئے وصال ہے تو
مستِ رفتار کا ہے نقشِ قدم   حلقۂ دیدۂ غزال ہے تو
ہے تخیل کی صورتِ باریک   ذہنِ شاعر کا انتقال ہے تو
لبِ اظہارِ مدعا کیئے   دہنِ تنگِ مہجال ہے تو
ہے گریبانِ حور کا کنٹھا   شکنِ دامنِ خیال ہے تو
خمِ محرابِ مسجدِ نبوی   کششِ ابروئے بلال ہے تو

شکلِ نقارِ عندلیباں ہے — پرِ طاؤس کی مثال ہے تو
ہے تراشیدہ ناخنِ معشوق — سرِ انگشتِ نونہال ہے تو
پیچ دستارِ چرخ اخضر کا — شرحِ دیباچۂ کمال ہے تو
حلقۂ گیسوئے شبِ معراج — کھل گیا عقدۂ محال ہے تو
بحرِ امواجِ حسن کی اک موج — یا کسی کج ادا کی چال ہے تو
مصرعۂ تر ہے طبعِ نازک کا — نقشِ رنگینیِ خیال ہے تو
کیوں مہینہ کٹے نہ عیش کے ساتھ — خنجرِ قاطعِ ملال ہے تو
بڑھکے گھٹتا ہے گھٹکے بڑھتا ہے — عینِ عبرت کی اک مثال ہے تو
اُسکی قدرت کا اک نمونہ ہے — پرتوِ حسنِ لازوال ہے تو
کیوں نہ کھینچے دلوں کو اپنی طرف — کششِ لامِ اتصال ہے تو
دورِ پرکارِ گردشِ دوراں — مرکزِ محوِ کمال ہے تو
کیوں نہو آسماں پہ تیرا دماغ — ماہِ شوال کا ہلال ہے تو

کیوں نہ دائم خوشی ہو **واصف** کو
عیش جس پہ عین دال ہے تو

واصف اکبرآبادی

(۲)

اے ہلالِ عید! منظورِ نظرِ عالمیاں! — آ ترے دیدار کی مشتاق ہے چشمِ جہاں
منتظر تیرے کھڑے ہیں مرد و زن پیر و جواں — سب کی آنکھیں لگ رہی ہیں آج سوئے آسماں

تو کلیدِ مسجدِ عید الفطر ہے ماہِ نو
تو پیامِ عید کا پیغامبر ہے ماہِ نو

اس خوشی کے وقت میں بیٹھا ہے تو چھپکر کہاں — جلد پردے سے نکل مشتاق ہیں خورد و کلاں
تیری آمد کی خبر سنکے اے بانکے جواں — چھپ گیا سورج دکھا کر اپنی ٹھنڈی گرمیاں

ڈھونڈھتی ہیں تجھکو آنکھیں زیرِ دامانِ سحاب
سامنے آجا اُلٹ دے روئے روشن سے نقاب

اے ہلالِ عید آخر تا بکے یہ انتظار — ساحتِ گردوں پہ آجا دیکھ لیں تیری بہار
آنکھ کا تارا بنائیں گے تجھے سب روزہ دار — تجھکو بے دیکھے نہیں آتا ہے اب دل کو قرار

طالبِ دیدار ہیں کب سے تماشائی ترے
ٹکٹکی باندھے شفق پر ہیں تمنائی ترے

آڑ میں چلمن کی ہے تو یا کوئی پردہ نشیں — چھاؤں میں تاروں کے غلطاں کوئی زہرہ جبیں
یا کوئی بانکا حسیں ہے یا نکیلا نازنیں — یا کماں ابرو ہے کوئی چرخ پر گوشہ گزیں

گرم بازاری سے کیا دلکش ہے نظارہ ترا
ایک سوداگری سے اونچے چڑھ گیا پارہ ترا

اے ہلالِ عید کیا دلکش تری تنویر ہے — تو کماں ہے یا نیمچہ ہے مغربی شمشیر ہے
تو کسی کے ابروئے خمدار کی تصویر ہے — غرۂ شوال تیرا حسن عالمگیر ہے

منتظر ہیں توپچی تیری سلامی کے لئے
مضطرب ہیں آلۂ برقی پیامی کے لئے

تجھکو ہم پہچانتے ہیں تو مہِ شوال ہے — تو ہی تو پچھلے برس تھا تو ہی اب کے سال ہے
یاد ہے ہاں یاد ہم پر تیرا ماضی حال ہے — تیرے تیور ہیں وہی گو قوم اب پامال ہے

آہ! ہم اب وہ نہیں، ہاں تیرا عالم ہے وہی
بانکپن تیرا وہی ہے تیرا دم خم ہے وہی

لیجئے وہ آگیا وہ آگیا وہ آگیا! — اوجِ گردوں پر جھلک اپنی ہمیں دکھلا گیا
جب نگاہیں شوق کی پڑنے لگیں شرما گیا — تھوڑا تھوڑا ہو گیا کھلا گیا مرجھا گیا

فیر توپوں کے ہوئے جانے لگے ٹیلیگرام
غرۂ شوال ہمکو عید کا لایا پیام

سبز جامہ دیکھتے ہیں دیکھنے والے ترے — سورۂ تبت یدا پڑھتے ہیں متوالے ترے
گائے جاتے ہیں جہاں میں آج ہرمالے ترے — کچھ نہیں تیرے نہیں گورے ترے کالے ترے

صبحِ عشرت لائیگی ہمکو مہِ نو تیری شام
پھر ملیں گے پھر ملیں گے پھر ملیں گے والسلام

اے ہلالِ عید تجھکو کس سے میں تشبیہ دوں — معجزہ ہے تو کسی کا شعبدہ ہے یا فسوں
کچھ اشارے سے بتا تجھکو تجھے میں کیا لکھوں — جی میں آتا ہے تجھے قاضی کہوں مفتی کہوں

آتے ہی فتوی دیا تونے ہمیں یہ اے ہلال
نعمتیں جائز نہ تھیں جو دن کو سب کر دیں حلال
چلدیا جب برج عقرب کی طرف وہ خوشخرام — چھٹ گئی سب بھیڑ رخصت ہوگئے ہر خاص و عام
اب نہ وہ انبوہ باقی ہے نہ وہ اب اژدہام — آج ہی سے عید کا ہونے لگا ہے اہتمام

آتے ہی تونے بڑھادی لے مہِ نوشانِ عیش
شام ہی سے ہر جگہ ہونے لگا سامانِ عیش
کیا خوشی چھائی ہوئی ہو ہر طرف ہو دھوم دھام — پھر بھی کچھ ہے گو نہیں اگلا سا اب وہ اہتمام
چاند دیکھا جب سے بچوں نے ہر اک ہے شاد کام — کس خوشی سے سارے گھر کو کرتے پھرتے ہیں سلام

سال بھر کے بعد پھر دنیا میں آئی چاند رات
شیرِ خورمہ اور سوئیاں ساتھ لائی چاند رات

اختر جلال آبادی

بزمِ فانی

درحقیقت بزمِ فانی خواب ہے — ڈھلتی پھرتی صورتِ مہتاب ہے
عیش و راحت کی گھڑی کمیاب ہے — چند روزہ صحبتِ احباب ہے
ہیں کوئی دن شامِ عشرت کے مزے — میکدے میں جامِ عشرت کے مزے
تھی ابھی فصلِ بہاری زور پر — خود بخود اُگتا تھا سبزہ گور پر
باغ میں پھیلا رہے تھے مور پر — خندہ زن گُل بلبلوں کے شور پر
دم زدن میں چہچہے جاتے رہے — قمریوں کے قہقہے جاتے رہے
کرگئی پامالیاں بادِ خزاں — ہوگیا برباد سارا بوستاں
ہے پراگندہ نسیمِ گلفشاں — سوکھکر کانٹا ہوئی گُل کی زباں
خاک اُڑتی ہے درِ گلزار پر — باغباں روتا ہو ڈاڑھیں مار کر
لگ گیا سوکھا سرِ شمشاد کو — کھا گئی کس کی نظر آزاد کو
ہائے وہ دن گلشنِ ایجاد کو — خلد کہتے تھے جہانِ آباد کو
ہوگئی رخصت بہارِ دلنشیں — چار تنکوں کے سوا کچھ بھی نہیں

الغرض نیرنگیاں ہیں دہر میں — دشت میں دریا میں گھر میں شہر میں
قہر کا جلوہ ہے چشمِ مہر میں — رنج دیکھے ہیں خوشی کی لہر میں
صورتِ پرکار گردش ہے مدام — بے ثباتی کے نظارے ہیں تمام
یار کی اُٹھتی جوانی تھی ابھی — عاشقوں سے لن ترانی تھی ابھی
جسم پر پوشاک دھانی تھی ابھی — سبزہ بختی کی نشانی تھی ابھی
شوخیاں تھیں ناز تھا انداز تھا — سبزہ خط کا یونہی کچھ آغاز تھا
تھا مئے گلگوں کا آنکھوں میں اثر — مستِ نخوت عاشقوں سے بے خبر
حشر کی رفتار شرمیلی نظر — نازنیں نازک بدن پتلی کمر
فرق بالکل بھی نہ تھا تلوار میں — اور اُسکے ابروئے خمدار میں
حور کا ٹکڑا سراپا نور تھا — ماہِ کامل کی طرح مشہور تھا
عارضِ انور چراغِ طور تھا — بانکپن پر کس قدر مغرور تھا
آفتابِ حسن جب ڈھلنے لگا — آپ اپنی شکل سے جلنے لگا
نازکیا ہو ناز رہتا ہی نہیں — سرکشی سے باز رہتا ہی نہیں
حُسن کا انداز رہتا ہی نہیں — یہ زمانہ سازِ رہتا ہی نہیں
چار دن کی چاندنی تھی یار کی — روشنی جاتی رہی رُخسار کی
ہو چکے ہیں سیکڑوں بانکے جواں — دیو ہیکل رستمِ ہندوستاں
رہ نہ سکتے تھے جو زیرِ آسماں — گور میں اُن کی نہیں ہیں ہڈیاں
مٹ گئے ایسے، نشاں جاتا رہا — زور بل جانے کہاں جاتا رہا
ہائے وہ نوخیز دولھا گلبدن — ہائے وہ رشکِ چمن بانکی دُلھن
تاک میں تھی گردشِ چرخِ کہن — موت نے پہنا دیا رنگیں کفن
غنچۂ اُمید کھِل کے رہ گیا — حیف لطفِ دید مِل کے رہ گیا
شادمانی نوجوانی میں نہیں — کامرانی زندگانی میں نہیں
لطفِ عمرِ جاودانی میں نہیں — عیش دورِ آسمانی میں نہیں
ہے یونہی چکر زمانے کے لئے — کوئی آنے کوئی جانے کے لئے
تھے نصیبے کے سکندر سیکڑوں — شان میں دارا سے بڑھکر سیکڑوں

عدل پرور داد گستر سیکڑوں ۔۔۔ عہد کے اپنے گورنر سیکڑوں
سو رہے ہیں چین سے زیرِ زمیں ۔۔۔ نام بھی اُن کا کوئی لیتا نہیں
دارِ فانی میں نہیں کچھ بھی اٹل ۔۔۔ ہر کمالے را زوالے ہے مثل
بادشاہی قلعے قصرِ بے بدل ۔۔۔ مٹ گئے جمشید کے زینت محل
صرف ذکرِ جام باقی رہ گیا ۔۔۔ ہے غنیمت نام باقی رہ گیا
کوئی پرسش مال و دولت کی نہیں ۔۔۔ شانداری جاہ و حشمت کی نہیں
آبرو اعزاز و حُرمت کی نہیں ۔۔۔ قدر دانی علم و حکمت کی نہیں
ہے برابر سب قضا کے سامنے ۔۔۔ دم نکلتا ہے بلا کے سامنے
شادمانی ہے بہت مشکل یہاں ۔۔۔ چاہیئے انساں ہو بیدل یہاں
کچھ محبت میں نہیں حاصل یہاں ۔۔۔ فعل بن جاتا ہے خود فاعل یہاں
بیخودی میں کچھ خبر رہتی نہیں ۔۔۔ رنج و راحت پر نظر رہتی نہیں
ہائے ہم بھی تھے کبھی دیدار باز ۔۔۔ جانتے تھے حُسن کے راز و نیاز
عشق بازوں کا خدا ہے کارساز ۔۔۔ مل گیا معشوق ہمکو دلنواز
وصل کی شب مُسکرایا ناز سے ۔۔۔ جھوم کر پہلو میں آیا ناز سے
یوں محبت کا مزا آنے لگا ۔۔۔ وہ مرے سر کی قسم کھانے لگا
دل لگی میں جھوٹ بہکانے لگا ۔۔۔ جانِ عاشق کی طرح جانے لگا
وہ کنکھیوں کے اشارے یاد ہیں ۔۔۔ وصل کے اقرار سارے یاد ہیں
دلبرِ شیریں زباں جاتا رہا ۔۔۔ صورتِ روحِ رواں جاتا رہا
نوبہارِ بوستاں جاتا رہا ۔۔۔ عیش و عشرت کا سماں جاتا رہا
چاند سی صورت نظر میں رہگئی ۔۔۔ آرزو دل میں جگر میں رہگئی
عیش کے دن ہو چکے ہم کیا کریں ۔۔۔ جُانے والی چیز کا غم کیا کریں
ہے یونہی نیرنگِ عالم کیا کریں ۔۔۔ گاہ ہے شادی گاہ ہے ماتم کیا کریں
کون لوٹے روزِ عشرت کی بہار ۔۔۔ ہے سرورِ جام کے پیچھے خمار
رنگ پر تھی بزمِ رندانہ ابھی ۔۔۔ خوب تھا آبادِ میخانہ ابھی
چل رہے تھے چال مستانہ ابھی ۔۔۔ کر رہا تھا دورِ پیمانہ ابھی
رنگ جب بدلا کوئی منظر نہ تھا ۔۔۔ مے نہ تھی ساقی نہ تھا ساغر نہ تھا
ہے سرورِ مے پرستی کوئی دن ۔۔۔ بادۂ احمر کی مستی کوئی دن
اے خلیق زار ہستی کوئی دن ۔۔۔ عالمِ امکاں میں بستی کوئی دن
ہے زمیں گردش میں گولے کیطرح ۔۔۔ چرخ پھرتا ہے ہنڈولے کی طرح

خلیق دہلوی

پی کہاں

شاخ پر ظالم پپیہا گا رہا ہے "پی کہاں" ۔۔۔ ایسی بھیگی رات میں چلا رہا ہے "پی کہاں"
سُننے والوں کو بہت تڑپا رہا ہے "پی کہاں" ۔۔۔ اے پپیہے قہر دل پر ڈھا رہا ہے "پی کہاں"

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

پی کہاں پھر پی کہاں پھر پی کہاں پھر پی کہاں ۔۔۔ گر یہی رٹ ہے یہی دُھن ہے تو تیرا پی کہاں
چین تجھکو ایک پل لے غمزدہ پڑتی کہاں ۔۔۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں آواز تو نے دی کہاں

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

بادۂ الفت سے بیحد چور ہے مستانہ وار ۔۔۔ جھومتا ہے تو فضائے چرخ میں رندانہ وار
جل رہا ہے آتشِ فرقت میں تو پروانہ وار ۔۔۔ یہ صدا ہے "پی کہاں" لب پر ترے دیوانہ وار

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

دیکھتا ہوں اپنے بستر سے تری بیتابیاں ۔۔۔ ہے کبھی مشرق سے مغرب کو تو جلدی سے رواں
پھر پلٹتا ہے تو جاتا ہر طرف ہے بیگیاں ۔۔۔ ہر گھڑی ہر وقت یہ دو لفظ ہیں وردِ زباں

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

کس قیامت کا اثر ان میں بھرا ہے کوٹ کر ۔۔۔ دل نہ تیرا ہوگا خوش رنج و الم سے چھوٹ کر
درد وہ ہے "پی کہاں" میں رہگیا دل ٹوٹ کر ۔۔۔ پھر سُنی آواز تیری رو دیئے ہم پھوٹ کر

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

کس نے سکھلایا تجھے یہ دل دکھانے کا شعور ۔۔۔ کس نے تیرے شیشۂ دل کو کیا ہے چور چور
مجرمِ الفت ہے شاید، ہے یہی تیرا قصور ۔۔۔ بولتا پھرتا ہے یوں جو رات بھر نزدیک و دور

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

توابھی دل کی طرح مضطر تھا فرشِ خاک پر　　پھر اُڑا جا کر کہاں پہنچا سرِ افلاک پر
بجلیاں تو نے گرائیں ہیں دلِ غمناک پر　　"پی" سوا مطلب نہیں صدقے خیالِ پاک پر

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

"پی کہاں" سنکر بہت سے عابدِ خلوت نشیں　　جنکا جُز یادِ الٰہی اور کچھ مطلب نہیں
ایسی گذری اُن کے دل پر ہو گئے اندوہگیں　　رو دیے تیری صدا سنکر اسے تو کر یقیں

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

"پی کہاں" کو تیرے کس نے زیرِ لب دُہرا دیا　　ہاں اکیلی رو رہی ہے بام پر اک مہ لقا
اُسکا "پی" پردیس میں ہے، ہے گرفتارِ بلا　　یہ اندھیری رات یہ برسات یہ کالی گھٹا

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

"پی کہاں" کی یہ صدا رہ رہ کے تڑپاتی رہی　　کوک تیری لے پپیہے دل کو برماتی رہی
"پی کہاں" کو غمزدہ چپکے سے دوہراتی رہی　　زیرِ لب کہتی رہی اُس پر بھی شرماتی رہی

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

"پی کہاں" کے سحر نے دل پر کیا ایسا اثر　　سو گئے ہم پر وہی عالم رہا پیشِ نظر
سچی اُلفت نے بچھے رکھا سراپا باخبر　　"پی کہاں" کہتے ہوئے پایا تجھے وقتِ سحر

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

محو ہو اتنا تو کم سے کم خیالِ یار میں　　درد ہو اتنا تو باسطؔ اس دلِ بیمار میں
آہ سنکر لوگ رو دیں کوچہ و بازار میں　　مُنہ سے نالہ بھی نکل جائے تیری گفتار میں

روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

باسطؔ بسوانی

اُمید

تو بھی اُمید ہے کچھ عجب شے　　تجھ سے وابستہ سچی خوشی ہے
کیوں نہو تجھ سے ہر اک کو اُلفت　　تو ہی ہے مایۂ عیش و عشرت
جب ہے دنیا بامید قایم　　ساتھ انسان کے تو ہے دایم
باوفا تجھ کو کہنا بجا ہے　　کون ورنہ کسی کا ہوا ہے

تو جگاتی ہے سوتے ہوؤں کو　　تو ہنساتی ہے روتے ہوؤں کو
بخت خوابیدہ بھی تو جگائے　　مردہ دل کو تو زندہ بنائے

ساتھ انساں کا دے مفلسی میں
ایسی کب ہے مروت کسی میں

شان و شوکت ہیں تیرے ہی مظہر　　مال و دولت کی ہے تو ہی مصدر
ہے خوشی خُرمی کی تو مخزن　　ہے ہر اک دل میں تیرا ہی مسکن
مبتلا رنج و غم میں کوئی ہو　　تو جو بر آئے اُس کو خوشی ہو
تو ہے اُسکے لئے وجہ فرحت　　ہو خوشی سے مُبدل مُصیبت
راہِ مقصد میں جو ہو ترا ساتھ　　کسی خطرے میں ہو جو ترا ساتھ
تجھ سے بڑھتا ہے عزم اور ہمت　　تجھ سے گھٹتا ہے خوف اور وحشت
کیوں ذہیںؔ اسکو چاہیں نہ دل سے　　زندگی ہے اسی کے سہارے
دل اسی کا ہے گھر آئے اُمید　　کیا خوشی ہو جو بر آئے اُمید

غلام مصطفیٰ ذہینؔ

ترانۂ وحدت

یہ چرخِ چنبری اور اُسکی وسعتِ موزوں　　یہ رنگ نیلوفری اور رفعتِ گردوں
یہ بامِ چرخ کہ جس میں کوئی ستون نہیں　　رُکا ہے جو کہ ہوا پر یہ گنبدِ زریں
یہ آفتاب کہ جسکو کبھی قیام نہیں　　صبح کہیں جو یہ آیا نظر تو شام کہیں
ثبوتِ قدرتِ پروردگار دیتے ہیں　　خدا کے ہونے کا سب اشتہار دیتے ہیں

جہاں میں پھیلتے ہی شام کو سوادِ شام　　زبانِ حال سے کہتا ہی ماہِ گردوں مقام
کہ "ہم بھی قدرتِ حق کے عجائبات سے ہیں　　فلک پہ پیدا ہویدا اُسی کی ذات سے ہیں"
جو گردِ چاند کے روشن ہیں تارے سیارے　　اُسی کے قول کی تائید کرتے ہیں سارے
قطب سے لے کے قطب تک یہ روز جاتے ہیں　　خدا کی ذات کو برحق ہمیں بتاتے ہیں

یہ جبکہ چلتے ہیں ہر شب کو گرمجوشی سے — زمیں کے گرد یہ جب پھرتے ہیں خوشی سے
نہ کہنے دو انھیں اپنی زباں سے اپنا راز — نہ ہونے دو جو نہیں کوئی ظاہری آواز
زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں ترانوں میں — سب اپنا حال حقیقت نیوش کانوں میں

کہ جس نے ہمکو چمک دی وہ ذات باری ہے
اُسی کے ہاتھ کی اک یہ بھی دستکاری ہے

(ترجمہ از انگریزی) — حفظ الکریم حفیظ

موتیوں کی لڑی

مول لے عقل سیم و زر نہ خرید — سُن لے اے سر۔ تو دردِ سر نہ خرید
بھر لے کاسہ میں علم کے موتی — سیم و زر لعل اور گہر نہ خرید

اے مرے نین۔ نین کھونا سیکھ — دردمندوں کو دیکھ رونا سیکھ
کھول کر دل بہا وطن پر اشک — جاگنا سیکھ لے۔ نہ سونا سیکھ

نکہتِ باغِ معرفت بھی سُنگھا — بوئے عطرِ نگا نگت بھی سنگھا
پھولیں ہم کیوں ریا کے پھولوں پر — اب شمیمِ صفا و قت بھی سنگھا

میرے کانوں کو گوشِ ہوش بنا — نغمۂ حق کی جن میں آئے صدا
حرفِ بد بک نہ۔ گُل کی تجھکو قسم — بلبلا! مژدۂ بہار سُنا

بول میٹھا ہو۔ خوش بیاں ہو جا — مدحتِ حق میں گل فشاں ہو جا
راستی کو شعار اپنا بنا — اے زباں۔ ورنہ بے زباں ہو جا

اے مرے دست و پا ذرا سنبھلو — کام کر لو جو کرنا ہے تم کو
نیکو کاری میں خوب ہو ساعی — ہو مچلنا تو کارِ بد میں ہو

آہیں بھرنا ہی کام ہو تیرا — غم پہ مرنا ہی کام ہو تیرا
دل پر درد! سوزِ عشق میں جل — اُف نہ کرنا ہی کام ہو تیرا

نرائن داس پوری

داستانِ شوق

واکر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
(غالب)

نالوں میں کچھ نہیں ہے مگر ہاں بیانِ شوق — ہوش و خرد بھی کیا ہیں؟ فقط پاسبانِ شوق
رنگیں مزاج و شوق کا مشتاقِ دید ہوں — ہے اس وجہ سے دوستو! رنگیں بیانِ شوق
عاشق ازل سے میں، دہنِ یار کا رہا — کوئے عدم میں مجھکو ہوا اغفوانِ شوق
خاکی لباس اب ہوا، پر تھا کسی کا شوق — روزِ الست میرے لئے تھا کن فکانِ شوق
سودائی جہان کی پروا نہیں مجھے — جبتک کہ تو مکیں ہے اور دل مکانِ شوق
چاکِ جگر ہے مطلعِ خورشید داغِ دل — تیغِ جفائے یار ہے اپنی تو جانِ شوق
جاں در ہوائے شوق و سراپائے اشتیاق — شیدائے یار کے ہیں یہی دو نشانِ شوق
میری زبان میں کہاں طاقت بیان کی — لیکن وفورِ شوق سے دل ہے زبانِ شوق
بیتابیِ فراق دلِ زار کو نہ چھو — حُسنِ ازل کے واسطے ہے ارمغانِ شوق
میں سر بکف ہوں۔ جان پہ گر کھیل جاؤنگا — پچھتائے گا تو کر کے مرا امتحانِ شوق
تھا اضطرابِ شوق میں اصرار۔ اے کلیم — بیہوش کیوں ہو؟ طور ہوا شمعدانِ شوق
نظارۂ وصال کے پردے میں ہجر ہے — روتا ہوں یاد کر کے سدا این و آنِ شوق
آتی کبھی جو یاد ہے نیرنگیِ شباب — کن حسرتوں سے کہتا ہوں اُف ہے زمانِ شوق
چشمِ جہاں نگر بھی ہے مشتاقِ دیدِ یار — اور مردمانِ دیدہ ہیں نظارگیانِ شوق
محرابِ ابروئے صنمِ مہ لقا و شوخ — مشتاقِ دید کے لئے ہیں معبدانِ شوق
گر چشمِ قیس دیکھے سوئے قافلہ کبھی — بارِ شتر بھی آئیں نظر محملانِ شوق
پیغامِ اشتیاق کا حامل نہ تھا کوئی — طبعِ رواں چلا ہے پسِ کاروانِ شوق
بعدِ مقام کیوں ہو بھلا پردۂ حجاب — خلوت کدے میں دل کے ہو تم میہمانِ شوق

یہ ظرف تنگنائے غزل اور بیانِ شوق
رہنے دے اب حسن ہے بڑی داستانِ شوق

حسن وارثی

فسانۂ دشینت و شکنتلا

دوسرے باب کا بقیہ حصہ

بیتاب تھا یوں اِدھر یہ ناکام — گلگشت میں تھی اُدھر وہ گلفام
دونوں میں غضب کا بانکپن تھا — دونوں میں تناسُبِ بدن تھا
دونوں تھے فردِ دہرِ خوبی — دونوں تھے مہ سپہرِ خوبی
دونوں میں غضب ادا کا تھا ڈھنگ — دونوں میں شباب و حسن کا رنگ
تصویرِ خیالِ حُسن دونوں — تنویرِ جمالِ حُسن دونوں
تھا عشق سے اب مگر یہ عالم — ذرہ سے بھی نورِ مہر تھا کم
شوخی سے نہ واں تھی کچھ اُسے کل — تھا دل کی تڑپ سے یاں یہ بیکل
جو بات تھی واں وہ فرحت انگیز — یاں لب پہ تھا کلمۂ جنوں خیز
واں سایۂ خور سے پُر ضیا چاند — یاں پرتوِ مہ سے مہر تھا ماند
خنداں تھی وہ واں بصورتِ گل — نالاں تھا یہ یاں بسانِ بلبل
یاں حال تھا یہ، اُدھر یہ تدبیر — تھا وصل سے عشق گرمِ تاثیر
اُڑ کر ناگاہ ایک بھونرا — چہرہ پہ شکنتلا کے پہنچا
بھاگی وہ کنارے ہٹ گئی پھر — شکڑی، دبکی، سمٹ گئی پھر
ہاتھوں کو پٹک پٹک اُڑایا — آنچل کو جھٹک جھٹک اُڑایا
آخر چلائی ڈر کے مجبور — سکھیو! دوڑو۔ اِسے کرو دور
پھر، ہائے! وہ دیکھو آ رہا ہے — ناحق یہ سب مجھے ستا رہا ہے
واں پاسِ وفا تھی کمسنی تھی — ہر لحظہ لگاوٹ تھا، ہنسی تھی
بولیں وہ کہ "جا جہاں ہے دشینت — فریادرسِ زماں ہے دشینت"
"یہ بار اُٹھانے والی ہم کون — ہیں تجھ کو بچانے والی ہم کون"
یاں چھیڑ نا لطف متصل میں — واں شہ نے کیا خیال دِل میں
"جو کچھ ہو، چلو ابھی بہانے — موقع دیا طالعِ رسا نے"
پہنچا وہیں جو تھی جائے اُمید — وارد ہوا سُنبلہ میں خورشید
پوچھا "اے مہوشانِ خوشرو! — کیا شور ہے؟ کون ہے جفا جو؟
قاطع ہوا کون آشتی کا؟ — دعویٰ ہوا کِس کو سرکشی کا؟
شرمائیں یہ دیکھکر وہ تا چند — لب غنچہ کی طرح ہو گئے بند
وہ حُسن و جلال کی تھی مورت — ششدر تھی ہر ایک بُت کی صورت
آخر انسوئیا باندازِ — بولی: نہیں کوئی فتنہ پرداز
اُس گُل کی وہ دلبری سُنائی — زنبور کی خودسری سُنائی
پھر شہ کو بٹھا کے بامدارات — رُک رُک کے، حیا سے پوچھے حالات
"کیا نام؟" کہا۔ کہا کہ "گمنام" — "کیا کام؟" کہا۔ کہا کہ "ناکام"
پوچھا کہ "حصولِ دستگیری"؟ — بولا کہ "حفاظتِ فقیری"
یاں بہرِ شکنتلا وہ صورت — تھی عقدہ کشائے رازِ الفت
خود اُٹھ گئی سر جھکا کے بیٹھی — تینوں سے علیحدہ جا کے بیٹھی
وہ محوِ جمالِ دلربا تھی — یوں عشق کی دل میں ابتدا تھی
تھا عشق سے شرم کا بھی یہ حال — کن انکھیوں سے دیکھے وہ خط و خال
سوچی وہ یہ دیکھ بھال رسمیں — شعلہ ہے نہاں ضرور خس میں
ہے کوئی بشر حجاب میں قید — ہے کوئی گہر حباب میں قید
سمجھی نہ وہ سادہ لوح زنہار — ہیں حضرتِ عشق کے سب آثار
مضطر تھا یہ یاں گماں سے عاشق — واں وہ ہوئی لاکھ جاں سے عاشق
تھا دل میں بسا خیالِ محبوب — پوچھا راجہ نے حالِ محبوب
انسوئیا تب بہ خوش زبانی — کہنے لگی عشق کی کہانی
وہ بسوامتر کی عبادت — وہ رشک کی ہر مَلَک کی عادت
وہ عرش سے مینکا کا آنا — وہ نفس کا قہر زہد پانا

دشینت و شکنتلا

غنچہ میں وہ دخلِ موجِ صرصر | وہ نکہتِ گل۔ وجودِ دختر
عابد کا وہ خوف اپنے شر کا | شعلہ کا وہ چھوٹنا شرر کا
وہ کنو٘ئیں کا اُس کو بن سے لانا | وہ نام شکستہ تلا رکھانا
یوں ختم کیا ترانۂ عشق | سارا وہ کہا فسانۂ عشق
باتیں تھیں یہ آشنائیوں کی | گھاتیں تھیں یہ دلربائیوں کی
اُٹھا اتنے میں شور ناگاہ | دیکھا تو تھا سر یہ لشکرِ شاہ
واقف تھے نہ رازِ عشق سے وہ | غافل تھے نیازِ عشق سے وہ
آتے ہی دکھائے طرزِ غمّاز | وہ پردۂ اسم ہو گیا باز
جب شہ نے یہ دیکھا کارخانہ | مانگی رخصت۔ ہوا روانہ
دل چھین کے لے گیا جو طرّار | بس دل ہیں شکستہ تلا ہوئی زار
ہرچند سہیلیوں کا تھا پاس | شیشہ میں مگر چھپا نہ الماس
کہتی تھی نہ جس کو شرم و ڈر سے | وہ بات عیاں تھی چشمِ تر سے
بادل میں چھپا وہ شعلۂ برق | یاں زورقِ صبر ہو گئی غرق
تھا سیلِ الم جو جاں پر اُس کی | آئی یہ غزل زباں پر اُس کی

غزل

کس دشمنِ جاں سے لڑ گئی آنکھ | قابو سے جو اپنے ہے بری آنکھ
کیا اس میں نہاں ہے کوئی تصویر | ہے کیوں پئے غیر آرسی آنکھ
پڑتی ہیں زمین پر نگاہیں + | ہے عشق کی کرتی بندگی آنکھ
آنکھوں میں سیاہ ہے زمانہ | پھیری جو کسی نے اک ذری آنکھ
مانا یہ کہ دل نہیں ہے۔ لیکن | کیوں اب نہ رہی وہ آنکھ سی آنکھ
کھایا ہے کسی نگاہ کا تیر | بیوجہ نہیں ہے خوں بھری آنکھ
کیوں خندۂ گل ہے طعنہ زن آج | ہر گل کی تو کرتی تھی ہنسی آنکھ

در پئے جو سحر ہے چرخ
کیوں پھر گئی ماہ و شتر کی آنکھ

اقبال ورما سحر

ایڈیٹوریل

نواب سالار جنگ ثالث

جس طرح ہندوستان کا پایہ تخت دہلی میں منتقل ہونے سے تمام ملک سے یہ صدا بلند ہوئی کہ "حق بحقدار رسید" اسی طرح نواب سالار جنگ ثالث کے وزارت حیدرآباد پر سرفراز ہونے سے تمام ملک سے یہ صدائیں آ رہی ہیں ع حقدار کو شہ نے دی وزارت تمام ملک سے اس خیر مقدم کا ہونا نہایت مبارک فال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد میں سالار جنگ اوّل کا عہد "عہدِ زرّیں" کے نام سے مشہور رہے اور آپ کے کارنامے تاریخ ہند کا ایک زرّیں باب ہیں۔ وزارت اس خاندان کا خاصہ اور حق ہے۔ چنانچہ میر عالم اور میر جملہ ایسے مُدبّر اسی خاندان میں گذرے ہیں جنکا تاریخِ ہند میں خاص درجہ ہے۔ موجودہ سالار جنگ ثالث سر سالار جنگ اوّل کے پوتے اور نواب لایق علیخاں عماد السلطنت سالار جنگ ثانی کے اکلوتے فرزند رشید ہیں۔ آپکا نام میر یوسف علیخاں ہے۔ آپکا سلسلۂ نسب یمنتیں و اسلوں سے مشہور بزرگ حضرت اویس قرنی کے ساتھ ملتا ہے۔ آپ کے آبا و اجداد کا ترکِ وطن کرکے ہندوستان پہنچنے کے بعد ابتداءً بیجاپور کی حکومتِ عادل شاہیہ اور پھر دہلی کی سلطنت مغلیہ سے تعلق رہا۔ شہنشاہانِ مغلیہ کے دربار ہی سے نظام الملک آصفجاہ اوّل کے ہمراہ رکاب آپ کے جد اعلیٰ حیدرآباد پہنچے اور مختلف خدمات انجام دیں۔

نواب سالار جنگ ثالث ۱۴۔ شوال المکرم ۱۳۰۶ھ کو بمقام پونہ (جہاں اُس زمانہ میں نواب میر لایق علیخاں سالار جنگ ثانی تفریحاً مقیم تھے) پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر ۲۴ ہی دن کی تھی کہ آپ کے والد ماجد کا سایہ آپ کے سر سے اُٹھ گیا اسکے کچھ ہی دنوں بعد آپ کے چچا نواب میر سعادت علیخاں نیر الملک بہادر کا بھی آپ کے والد کی طرح عین عالمِ شباب میں انتقال ہو گیا، اور آپ کی وسیع جاگیرات کا انتظام اور آپ کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرنے والا کوئی باقی نہ رہا مگر حضور نظام غفران مکان نے مراحم خسروانہ سے آپ کی جاگیرات اور آپ کی تعلیم و تربیت کا بابت اعلیٰ پیمانہ پر معقول انتظام فرما دیا۔ حضور خلد مکان بہ نفس نفیس آپ کی تعلیم و تربیت میں بہت کچھ دلچسپی لیتے تھے۔ کچھ دنوں خانگی تعلیم پانے کے بعد آپ نظام کالج میں شریک کئے گئے ۱۹۰۸ء میں مڈل کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ قریباً سولہ سال تک آپ نے نظام کالج میں باقاعدہ تعلیم پائی۔ ۱۷۔ جمادی الاوّل ۱۳۱۶ھ کو دربار سالگرہ میں حضور نظام مرحوم نے آپ کو خطابات خان بہادر و سالار جنگ سے ممتاز فرمایا۔ سات آٹھ ماہ ہوئے کہ آپ کی جاگیرات پر سے سرکاری نگرانی اُٹھائی گئی۔ اب آپ خود اپنے علاقہ کا انتظام فرماتے ہیں۔

آپ کی جاگیرات چھ تعلقات میں منقسم ہیں جنکا مجموعی رقبہ ایک ہزار چار سو ستی

مربع میل ہے - جاگیرات کی آمدنی قریباً دس لاکھ ہے اور مردم شماری ۲ لاکھ -

نواب سالار جنگ ثالث کے اخلاق و اطوار کے متعلق ہر طبقہ میں بہت اطمینان بخش خیالات پائے جاتے ہیں - جس روز آپ منصبِ وزارت پر فایز ہوئے اُسی روز شب کو حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی سالگرہ مبارک کی تقریب میں ایوانِ شاہی میں ڈنر تھا - اس موقع پر کرنل پنچھے (ریزیڈنٹ) نے حضور نظام کا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے تبدیلی وزارت کے ذکر میں نواب سالار جنگ ثالث کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے تھے اُن میں "بلے داغ چال چلن" کے خاص الفاظ ثابت کرتے تھے کہ آپ کی اخلاقی خوبیوں اور ذاتی قابلیتوں کا کتنا اچھا اثر ہے - نظام کالج کے پرنسپل مسٹر اسٹرج کا بیان ہے کہ مدرسہ کے لڑکوں کے لئے جو خوبیاں ضروری ہیں شلاً باقاعدہ حاضری، اپنے کام پر توجہ، اُستادوں اور اپنے ہم سبق طلباء کے ساتھ متواضعانہ برتاؤ، ان سب باتوں میں وہ دوسرے طلباء کے لئے ایک بیش بہا نمونہ تھے - اسکی تقلید دوسرے لڑکوں نے کی مگر وہ اس میں عمدہ برآ نہ ہوسکے -

ابتدا ہی سے آپ کی روشن خیالی اور علمی قابلیتوں کے قابل قدر ثبوت ملتے رہے ہیں - آپ کو اپنے ملک اور اپنی قوم کی بہبودی کی تحریکوں سے بھی کچھ کم دلچسپی نہیں ہے - حال ہی میں مسلم یونیورسٹی کو جو ایک لاکھ روپیہ کی گراں قدر رقم آپ نے عطا فرمائی ہے، وہ اس کی ایک روشن مثال ہے - غرض آپکے عادات وخصائل قابل تعریف ہیں اور اس بات کی قوی اُمید ہے کہ اپنی خاندانی اور موروثی خصوصیات، دماغی قابلیتوں، اعلیٰ تعلیم، اور اخلاقی اوصاف کی بدولت آپ اپنے نامور باپ اور فخرِ روزگار دادا کے مایۂ ناز جانشین ثابت ہوں گے، اور اس بڑے نام کی وقعت وعظمت کو نہایت عمدگی کے ساتھ برقرار رکھیں گے جس سے آپ منسوب ہیں - آپ کی ذات سے حیدرآباد کی بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں، اور سب کی یہ دلی دعا ہے کہ آپ کو اپنے اس عظیم الشان عہدہ کے فرایض کی انجام دہی میں ہر طرح کی کامیابی اور نیکنامی حاصل ہو -

آپ کے منصبِ وزارت پر سرافراز ہونے کی بہت سی تاریخیں کہی گئی ہیں، جنمیں سے حضرت جلیل کا قطعہ ہدیۂ ناظرین ہے :-

خدا نے آصفِ ہفتم کو دی ہے وہ توقیر ۔۔۔ کہ نام لینے سے ہوں ہفت آسماں تسخیر
جہاں پناہ سلیماں شکوہ ظل اللہ ۔۔۔ نگاہ میں وہ اثر ہے کہ خاک ہو اکسیر
وہی نظر پئے احباب موج رحمت ہے ۔۔۔ وہی نظر پئے دشمن ہے خنجر و شمشیر
ہر ایک حکم ہے ناطق شہ فلک فر کا ۔۔۔ ابھی کریں جو اشارہ تو بول اُٹھے تصویر
کیا حضور نے سالار جنگ کو دیوان ۔۔۔ وہ سرفراز ہوئے، ملک کی کھلی تقدیر
اس انتخاب سے خوش ہو کے سب یہ کہتے ہیں ۔۔۔ شہ دکن پہ ہمیشہ ہو فضلِ ربِ قدیر
مری زبان پہ آیا یہ مصرعۂ تاریخ ۔۔۔ جلیل! شہ نے کیا مستحق کو آج وزیر
۱۹۱۲ء

رائے بالاجی سہائے صاحب عاقل نے خوب تاریخ کہی ہے :-

مرے آقا کو شہ نے کی عطا خدمت جو آبائی ۔۔۔ اسی لایق تھا یہ، کی خوب اسکی قدر افزائی
کہو تاریخ یہ فرطِ خوشی سے تم بھی اب عاقل ۔۔۔ زلیخا بنکے دیوانی مرے یوسف کے گھر آئی
۲۱ ف ۱۳

گذشتہ نمبر میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ نواب سالار جنگ ثالث و نواب عماد الملک بہادر کی تصاویر و حالات ہدیۂ ناظرین کرینگے چنانچہ اس نمبر میں یہ تصاویر شایع کیجاتی ہیں

نواب عماد الملک بہادر کی زندگی ہمارے ملکی نوجوانوں کے لئے نہایت سبق آموز اور قابل مطالعہ ہے - ہم جناب ریورنڈ ملکم جان صاحب کے نہایت ممنون ہیں کہ انھوں نے بلگرامی صاحب ممدوح کی بعض ان مابہ الامتیاز خصوصیات کو نمایاں کیا ہے جو فی الحقیقت بلگرامی صاحب ممدوح کے لئے باعث شرف و امتیاز ہے - ریورنڈ ملکم جان صاحب ہندوستان کے مشہور انشاء پردازوں میں سے ہیں - تبحر علمی کے علاوہ آپ بلادِ اسلامیہ و یورپ کے بہت بڑے سیاح ہیں - معاملات ملکی پر گہری نظر رکھتے ہیں - آپ کو موجودہ عہد کے دیسی مشاہیر ہند کے حالات سے خاص دلچسپی و ہمدردی ہے - آپ کا خیال ہے کہ زمانہ حال میں ہندوستان میں کسی قسم کی ترقی کرنا، خواہ وہ مادی ہو یا روحانی، آسان کام نہیں ہے، اور ایسے مخمص اور مشکل حالات میں جو افراد ترقی کریں وہ نہایت ہی عزت و قدر کے لایق ہیں - ایسے اشخاص کے حالات، کیرکٹر، اور رازِ ترقی کا مطالعہ کرنا، اور ان سے سبق حاصل کرنا از حد مفید ہے - ہم اُمید کرتے ہیں جناب ریورنڈ ملکم جان صاحب دیگر مشاہیر ہند کے حالات سے بھی اوراقِ ادیب کو زینت دیتے رہیں گے -

---

اس ماہ کی رنگین تصویر "جنم اسٹمی" بابو جامنی پرکاش گنگولی کی صناعی کا نمونہ ہے - "جنم اسٹمی" کے واقعات اس قدر مشہور ہیں کہ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں - حضرت برق دہلوی نے اس واقعہ کی تصویر اخبار ہند، ولاہور کے کرشن نمبر میں خوب کھینچی ہے - ایک بند حسب ذیل ہے :-

ہوئیں ماں باپ کی آنکھیں منور کنجِ زنداں میں ۔۔۔ جگہ تسکینِ خاطر کو ملی قلبِ پُر ارماں میں
ہوئی آکاش بانی کنس کو خوابِ پریشاں میں ۔۔۔ اِدھر حیرت سمائی خواب بنکر چشمِ درباں میں
بچانا تھا زلبس مدِ نظر موذی کے چنگل سے
شباشب لے اُڑے بسدیو جی متھرا کو گوکل سے

بھیشم کا عہد

انڈین پریس الہ آباد

استمرارِ مادّہ اور ڈاکٹر لی بان

علوم انسانی کی سب سے زیادہ حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ گو
انکے کلیات، ان کے قوانین، اور ان کے نتائج نہایت معقول و مستحکم نظر آتے
ہیں، لیکن ان کے مبادی اولین اور اصل الاصول ہمیشہ غیر مُدلل مفروضات
ہوتے ہیں۔ ریاضی سے بڑھکر اور کس علم کے مسائل کو یقینیات کے درجہ پر
رکھا جا سکتا ہے؟ لیکن کیا اسکے مبادی اصلی یعنی عدد و کمیّت کی تعریف کوئی بڑے
سے بڑا ریاضی داں کر سکتا ہے؟ علم ہندسہ کے اصول آج انجینئرنگ صنعت
کے تمام کاروبار کے لئے سنگ بنیاد ہو رہے ہیں، لیکن کیا خود اقلیدس کے
امکان میں بھی نقطہ کا تصور ہے؟ ان مختص الموضوع علوم سے قطع نظر
کر کے، فن منطق کو دیکھو، جو اپنے دائرہ بحث کے لحاظ سے سب سے زیادہ
وسیع اور عام علم ہے، اور جس کے قوانین ایک معیار ہیں جس سے اور کل
انسانی معلومات کی صحت جانچی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص انکار و بحث
پر آمادہ ہو، اور اس امر کے منطقی ثبوت کا مطالبہ کرے کہ برہان یا استدلال
ہی معیار واقفیت ہے، تو کیا خود ارسطو اور مِل تک اس کی زبان کسی دلیل
سے بند کر سکتے ہیں؟

پھر آخر کیا ہمارے سارے علوم کی بنیاد تمامتر نقش بر آب ہے؟
کیا ہمیں ہزارہا سال کی علمی جانفشانیوں اور دماغ سوزیوں کے ثمرات کو
مجموعۂ مزخرفات سمجھ لینا چاہیے؟ پیرہو[1] کے مقلدین اسکا جواب اثبات
میں دیں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم کو سوسائٹی کا جزو بن کر رہنا ہے،
اگر ہم کو اپنے ابنائے جنس کے ساتھ زندگی بسر کرنا، اور انھیں کے درمیان
مرنا ہے، تو بغیر اس کے چارہ نہیں ہے، کہ ہم اپنے تجربات گوناگوں میں
ایک ربط یا نظم پیدا کریں، اور ان سب کو ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں
قرار دیں، ورنہ ہم کو ایک شے ایک ہی وقت میں سیاہ و سفید دونوں
نظر آسکتی ہے، اور اس سے کارخانۂ عالم کے درہم برہم ہو جانے کا سخت
اندیشہ ہے۔ اسی تناقض و اتضاد سے بچنے کے لئے ہم چند قضایا وضع کرتے
ہیں، ان کی صحت بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں، اور انھیں کی بنیاد پر اپنی آیندہ
تحقیقات کی عمارت قایم کرتے ہیں، مثلاً ہر جزو کل سے چھوٹا ہوتا ہے؛
متناقض چیزیں ایک جگہ ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتیں؛ وغیرہ ہم

---

[1] Pyrrho یونان کا وہ مشہور فلسفی، جس نے فرقۂ متشککین کی بنا ڈالی۔

ان دعاوی کے ثبوت میں کوئی منطقی استدلال نہیں پیش کر سکتے، مگر ان کی صحت پر صرف اسلئے یقین کرتے چلے آتے ہیں، کہ ان کی وساطت سے ہمارے دیگر تجربات کی ایک منتظم و مرتب شکل پیدا ہوتی ہے۔ یہ قضایا، جنھیں ہم اولیات عامہ سے تعبیر کرتے ہیں، کسی خاص علم وفن کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام معلومات انسانی کی منزلیں انہیں کی رہبری میں طے ہوتی ہیں۔

اس حد تک عام افراد انسانی مشترک ہیں، اور متمدن و غیر متمدن میں چنداں تفرق نہیں، مگر آگے چلکر، جب تمدن و مشاغل زندگی کی وسعت کے ساتھ نئے نئے علوم پیدا ہونے لگتے ہیں، تو ہر علم کے لئے علحدہ علحدہ چند اشیاء کا وجود مثل اولیات کے، مسلم فرض کر لیا جاتا ہے، اور یہی مفروضات اس علم کیلئے اصول موضوعہ کا کام دیتے ہیں، جنکے بغیر اسکے آیندہ مدارج طے ہونا ممکن نہیں۔ مثلاً علم افعال الاعضا کا اصل مقصد محض یہ بتانا ہے، کہ ہر حصۂ جسم چھوٹے سے لیکر بڑے تک، کون کون اعمال اور کس طرح انجام دیتا ہے، لیکن علماء فزیالوجی سب سے پیشتر، ایک عام کیفیت یعنی "حیات" کا وجود تسلیم کرتے ہیں، جس کا عمل، جسم کے ہر رگ و ریشہ پر جاری ہے، اور جسکی بقا، افعال اعضا کی صحت پر موقوف ہے۔ یا مثلاً علم النفس کا موضوع بحث صرف اسقدر ہے، کہ انسانی جذبات، ارادات، و ادراکات کی تحلیل و تشریح کے ساتھ انکے باہمی تعلقات کو بتائے، لیکن اس علم کی لازمی تمہید یہ ہے، کہ ایک "نفس" (Mind) کا وجود فرض کیا جائے۔ ان دونوں مثالوں میں، یہ ظاہر ہے کہ "حیات" اور "نفس" پر بحث کرنا مقصود بالذات نہیں، اور نہ ابتک کوئی بڑے سے بڑا عالم انکا ادراک تو ایک طرف، ان کی منطقی تعریف بھی کر سکا ہے، باایں ہمہ ان کے وجود کو تسلیم کرنا محض اسلئے ناگزیر ہے، کہ ان فنون کے متعلق متفرق معلومات ایک عام و مشترک سطح پر قایم ہوں، اور ان سب کا وجود، ایک ہی محور، ایک ہی مرکز کے ساتھ وابستہ رہے۔ چنانچہ علماء افعال الاعضا علانیہ کہتے ہیں، کہ ہم حیات کے وجود پر کوئی استدلال نہیں قایم کر سکتے، بلکہ اسکا وجود محض اسلئے تسلیم کرتے ہیں، کہ جسم انسانی سے متعلق جتنے کیفیات و افعال ہیں، انھیں کسی قدر مشترک کے لحاظ سے ایک عام ترکیفیت کے ماتحت داخل کیا جاسکے، اور یہ بتایا جاسکے، کہ یہ سب ایک ہی ذات کی مختلف نیرنگیاں اور مختلف مظاہر ہیں۔

غرض اولیات عامہ کے علاوہ، ہر علم کی تدوین کے وقت، کچھ ایسے اصول کے وجود، یا کم از کم ان کی کیفیات کو بلا دلیل تسلیم کرنا پڑتا ہے، جو اس علم کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، اور جنھیں اس علم کے اصول موضوعہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہی عام قاعدہ سائنس پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کو بھی چند چیزوں کا وجود بغیر کسی منطقی ثبوت کے تسلیم کرنا پڑا۔ طبعیات و کیمسٹری کے مہمات مباحث صرف یہ ہیں، کہ عالم کی ترکیب کن کن اجزاء سے ہوئی ہے؟ ان کے باہمی تعلقات کیا ہیں؟ آپس میں ان کے تاثیر و تاثر کے قوانین و اصول کیا ہیں؟ لیکن ایک سائنس داں کو ان سوالات کے جواب سے قبل یہ نظر آتا ہے، کہ گو اشیاء عالم میں بلحاظ اپنے افعال و خواص کے، ایک دوسرے کی ضد موجود ہے، مثلاً برف ہمارے جسم کو سرد کرتی ہے، آگ جلاتی ہے، لیمپ کی روشنی آنکھ کو خیرہ کئے دیتی ہے، ہوا نظر تک نہیں آتی، جمادات ہمیشہ ایک ہی وضع پر بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں، حیوانات ہر لحظہ نشو و نما پاتے ہیں، تاہم اس اختلاف و تناقض کے باوجود بھی، بعض حیثیات سے دنیا کی تمام اشیاء میں اشتراک و یکرنگی بھی پائی جاتی ہے، مثلاً ہر شے میں کچھ نہ کچھ وزن ہوتا ہے، ہر شے میں قوت کشش موجود ہے، ہر شے میں طول و عرض پایا جاتا ہے، وغیرہ انھیں خصائص مشترکہ کو اعراض مادی کہا جاتا ہے، اور ایک سائنس داں، طبعیات و کیمسٹری کے مسائل منضبط کرنے سے پیشتر، سب سے پہلے، یہ اصول موضوعہ قرار دیتا ہے، کہ تمام اشیاء عالم بعض خصوصیات مشترکہ کے لحاظ سے ایک ہی ذات یا ماہیت کے مختلف مظاہر ہیں، اور اس ذات کا نام **مادہ** ہے۔

اسکے بعد سائنس کا دوسرا اصول موضوعہ یہ ہے، کہ مادہ کی ایک لازمی خصوصیت اسکا **استمرار** ہے۔ یعنی یہ کہ مقدار مادہ عالم میں کمی و بیشی،

خلق و فنا کی گنجایش نہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ سائینس داں اس دعویٰ میں بھی صریحاً حق بجانب ہے۔ اسلئے کہ اگر مادہ کا دفعتہً عدم سے وجود میں چلا آنا، اور وجود سے عدم میں چلا جانا تسلیم کر لیا جائے، تو ہمارے معلومات و تجربات میں سخت ابتری پھیل جائے گی۔ غور کرو، کہ فناء مادہ کے کیا نتائج ہونگے؟ یہ ہونگے، کہ ہم کسی شخص سے چوری و خیانت پر باز پرس نہ کر سکیں گے، اسلئے کہ جس شے کو ہم مسروق سمجھ رہے ہیں، ممکن ہے، وہ از خود فنا ہوگئی ہو ہمکو اپنی جائداد و املاک میں سے کسی چیز پر اعتماد نہ رہیگا، کیونکہ ممکن ہے، وہ خود بخود فنا ہو جائے۔ ریاضی اور وہ تمام علوم جو مقدار مادہ سے بحث کرتے ہیں، بے حقیقت ہو جائیں گے، کیونکہ مقدار مادہ میں ہر وقت کمی و بیشی کا احتمال باقی رہے گا۔ خلاصہ یہ کہ نظام عالم درہم و برہم ہو جائے گا، اور سطح کائنات ابتری و فساد کی تماشا گاہ بن جائے گی۔

اسکے علاوہ (جیسا کہ اسپنسر نے ایک لطیف پیرایہ میں لکھا ہے) مدعیان فنائے مادہ اپنا دعویٰ پیش کرتے ہوئے خود بھی تناقض کے مرتکب ہو رہے ہیں، اسلئے کہ وہ فناء مادہ کے ثبوت میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ فلاں مادہ کو وزن کرنے سے معلوم ہوا، کہ اسکی مقدار میں اتنی کمی ہوئی ہے، لیکن سوال یہ ہے، کہ جب مادہ قابلِ فنا ٹھہر چکا، تو کسی میزان ہی کی صحت پر کیا اعتماد ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے کہ اسی ترازو کے بانٹ، خود بخود کچھ گھٹ یا بڑھ گئے ہوں۔ مزید برآں، کسی وزن کی بنا پر فناء مادہ کے دعویٰ کے معنی یہ ہیں، کہ وزن و میزان قابل اعتماد چیزیں ہیں، اور مقدار مادہ کی جانچ کے لئے صحیح و ناقابل اشتباہ معیار ہیں، لیکن یہ کہنا، صراحتہً استمرار مادہ کا اعتراف کرنا ہے۔ اس سے بھی قطع نظر کرکے یہ دیکھو، کہ کیا کسی محسوس شے (یعنی مادہ) کے معدوم محض ہو جانے کا تصور ہمارے امکان میں ہے؟ ہم اس تصور کی سو سو طرح کوشش کرتے ہیں، مگر ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ ہم یہ تصور کر سکتے ہیں، کہ کوئی دوسری شے اس شے کو ہمارے سامنے سے ہٹا لیگئی، یا یہ کہ اسکے نہایت باریک باریک ریزے ہو گئے، یا یہ کہ اسکو آگ میں جلا دیا، اور وہ خاکستر ہو گئی، غرض ان سب تصورات کو ہمارا ذہن بہ آسانی قبول کر لیتا ہے، لیکن کسی مادہ کی معدومیت ایسی چیز ہے، جس کے تصور پر ہمارا ذہن کسی طرح قادر نہیں۔

یہاں تک تمام گفتگو کا ماحصل یہ نکلا، کہ استمرار مادہ کا دعویٰ بھی منجملہ اُن دعاوی کے ہے، جو اپنے ثبوت کے لئے کسی خارجی شہادت کے محتاج نہیں، بلکہ جنکے بلا دلیل تسلیم کرنے پر ہم بالکل حق بجانب ہیں، لیکن مزید غور کے بعد معلوم ہوگا، کہ ابتک ہمیں جتنے تجربات و مشاہدات ہو چکے ہیں، وہ بھی سب اسی کی تائید کرتے ہیں، چنانچہ ہم جن جن ذرایع سے مرکبات مادی کو مٹا سکتے ہیں، وہ سب ذرایع ایک ذرہ کو بھی فنا کرنے سے عاجز ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ مرکبات مادی کے فنا کے وقت جس شے کو درحقیقت فنا ہوتی ہے، وہ صورت ہے۔ یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہنا چاہیئے، کہ مادہ جس خاص طرز سے پہلے ہمارے حواس ظاہری کو متاثر کرتا تھا، اب اس سے ایک مختلف طرز سے کرنے لگا ہے، مگر قوت مزاحمت (Inertia) جو مادہ کی امتیازی خصوصیت ہے، بدستور قایم ہے۔ گویا ذرات مادہ کی ترتیب بدلتی رہتی ہے، مگر ذرات خود فنا قبول نہیں کرتے۔

سائنس کا یہ مسئلہ گو نہایت اہم ہے، لیکن چنداں غامض نہیں۔ اسکو اسکول کا بچہ بچہ جانتا ہے، اور اس بنا پر اسکی مطلق ضرورت نہ تھی، کہ اس عنوان پر کوئی خاص مضمون تیار کیا جاتا۔ لیکن ابھی چند ماہ کا عرصہ گذرا، کہ ایک مشہور مصری رسالہ سے ایک مضمون ترجمہ ہو کر اردو میں آیا ہے، جس کا ماحصل یہ ہے، کہ

سائنس فنائے مادہ کا قایل ہو گیا، کل تک فنائے مادہ کے خیال پر سائنس کو ہنسی آتی تھی، لیکن آج یہی خیال مسئلہ مسلمہ بنتا جاتا ہے۔ مشہور فرنچ فلسفی گسیٹو لی بان نے دس سالہ کوششوں سے ثابت کر دیا، کہ مادہ کا ہر ذرہ فنا کی طرف جا رہا ہے۔

اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے، کہ فناء مادہ کا لازمی نتیجہ "حدوث عالم" ہے

بازاری پرچوں میں اس قسم کی خبروں کی اشاعت پر کسی سنجیدہ شخص کو اعتنا کی حاجت نہیں، لیکن ان مضامین کا ایک ایسے رسالہ میں شایع ہونا، جو ملک میں علمی حیثیت سے ایک خاص وقعت و وقار حاصل کر چکا، پبلک کی سخت بدقسمتی ہے۔ ذیل میں ہم اس مسئلہ کے متعلق سائنس کی واقعی تحقیقات کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ اس بحث کے دراصل چار حصہ ہیں:-

(۱) مادہ کے متعلق حکماء حال کی کیا تحقیق ہے؟

(۲) ڈاکٹر لی بان کے، مادہ کے بابت مجتہدانہ خیالات کیا ہیں؟

(۳) ڈاکٹر لی بان کے اجتہادات کا، سائنٹفک نقطۂ خیال سے کیا درجہ ہے؟

(۴) اس تحقیق کو حدوث و قدم عالم سے کیا تعلق ہے؟

پہلا مسئلہ - اتنی بات ہر شخص کو معلوم ہے، کہ اعراض کے علاوہ ہمارے معلومات میں جتنی چیزیں داخل ہیں، انھیں یا تو ہم نے براہ راست حواس ظاہری سے محسوس کیا ہے، یا ایسی ہیں، جن میں محسوسیت کی یہ استعداد موجود ہے، گو ہمارے حواس میں اس وقت تک اتنی قوت نہیں، کہ انھیں محسوس کر سکیں۔ سائنس کی اصطلاح میں یہ تمام چیزیں، مادہ کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہ بھی بداہتہً نظر آتا ہے، کہ جو مادی اشیا، روزمرہ ہمارے تجربہ میں آتی رہتی ہیں، وہ مفرد و ناقابل تقسیم نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے صدہا ہزارہا ٹکڑے ہو سکتے ہیں، مثلاً پانی، جو ایک گلاس میں ہمارے سامنے رکھا ہوا ہے، اسکو ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے قطرہ کر کے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سائنٹفک اختبارات[1] نے اس معمولی مشاہدہ پر اتنا اور اضافہ کیا، کہ ان چیزوں کے صرف اجزائے ترکیبی ہی نہیں، بلکہ اجزائے تحلیلی بھی ہوتے ہیں، یعنی اگر ان کی تحلیل کیمیائی کی جائے، تو معلوم ہوگا، کہ یہ چیزیں، بعض اور دو یا زائد چیزوں سے بنی ہیں، مثلاً پانی کو جب تحلیل کیا گیا، تو معلوم ہوا، کہ اسکی ترکیب میں دو مختلف گیسی اجزا آکسیجن و ہائڈروجن شامل ہیں۔ حکماء قدیم نے موجودات مادی کے مشاہدات و ناقص تجربات کے بعد یہ رائے قایم کی، کہ تمام اجسام مرئی نہایت باریک باریک ذرات سے مرکب ہیں، جو ہمیں نظر تک نہیں آتے، اور انکا اصطلاحی نام جواہر فردہ[2] ہے۔ عالم میں ہم کو جتنے اجسام نظر آتے ہیں، وہ سب ان ہی جواہر فردہ کے مرکبات ہیں، ان کی شکل و صورت، رنگ روپ، بو و مزہ، وغیرہ میں اختلاف کی وجہ یہ ہے، کہ ہر شے کے جواہر فردہ دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، مثلاً آگ کے جو ہر فرد، ایک نوعیت کے ہوں گے، پانی کے دوسری نوعیت کے، ہوا کے تیسری نوعیت کے۔ غرض اس طرح دنیا میں جتنے انواع کے اجسام ہیں، اُتنے ہی انواع کے جواہر فردہ بھی ہیں۔

یہ قدما کا خیال تھا۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں ڈالٹن نے بتایا، کہ جواہر فردہ، ناقابل تجزی نہیں، بلکہ ان کی تحلیل ابھی اور زیادہ باریک ذرات میں ہو سکتی ہے، جنھیں اصطلاح میں سالمات کہتے ہیں۔ اسکی تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا، کہ سالمات، بیشمار نوعیت کے نہیں، بلکہ ان کے اقسام تقریباً ستر تک محدود ہیں، انھیں انواع سالمات کو عناصر کیمیائی بھی کہتے ہیں، اور ایک ہی صنف موجودات کے افراد میں جو اختلاف و تنوع نظر آرہا ہے، اسکی وجہ یہ ہے، کہ مختلف عناصر[3] مختلف تعداد میں باہم ملتے ہیں۔

۱۸۱۵ء و ۱۸۱۶ء میں پراوٹ نے یہ تھیوری پیش کی، کہ عناصر کیمیائی دراصل مختلف النوع نہیں، بلکہ سارے عالم کی ترکیب صرف ایک عنصر سے ہوئی ہے، اور باقی جن چیزوں کو عناصر کہا جاتا ہے، وہ سب اُسی واحد عنصر کی مختلف تعدادوں کے مرکبات ہیں، اور وہ عنصر حقیقی، ہائڈروجن ہے۔ اس

۱؎ یہ لفظ Experiments کا ترجمہ ہے۔ عام اردو مصنفین ایسے موقع پر "تجربات" استعمال کرتے ہیں، لیکن انگریزی داں اصحاب خود سمجھ سکتے ہیں، کہ "تجربہ" کا لفظ، انگریزی لفظ کے مفہوم کو کس قدر ناقص طور سے ادا کرتا ہے۔ بعض مصری مترجمین یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔

۲؎ Molecules ۳؎ Atoms ۴؎ انسائیکلوپیڈیا برٹیانکا، جلد ۱۷، صفحہ ۵۹۱

اعلیٰ حضرت قدر قدرت مظفرالممالک نظام الدولہ نظام الملک آصف جاہ نواب میر عثمان علیخاں فتح جنگ بہادر
نظام دکن جی سی ایس آئی' خلداللہ ملکہ و سلطنتہ

دعوے کا نہایت صحیح ثبوت یہ تھا، کہ دیگر "عناصر" کے سالمہ کا وزن، ہائیڈروجن کے سالمہ کے وزن کا، ایک خاص تعداد میں مضروب دکھا دیا جاتا۔ مثلاً اگر آکسیجن کا ایک سالمہ، ہائیڈروجن کے ۱۶ سالمات سے مرکب ہے، تو وزن کے لحاظ سے بھی آکسیجن کے سالمہ کو ہائیڈروجن کے سالمہ کا سولہ گنا ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ اس قسم کے اختبارات کئے گئے۔ لیکن گو اس معیار پر عناصر کی ایک تعداد کثیر پوری اتری تاہم بعض مستثنیات بھی نکلے، مثلاً چاندی، کلورین، سوڈیم، پوٹاشیم، وغیرہ[1] اس لئے علماء سائنس اس باب میں کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکے، لیکن یہ تذبذب صرف ہائیڈروجن کی تعین کے بابت تھا، ورنہ اتنے جزو پر سائنس دانوں کا اجماع ہوگیا، کہ وہ "عناصر" جنکی تعداد ستر سے متجاوز ہو چکی ہے، کوئی مستقل انفرادی ہستی نہیں رکھتے، بلکہ ایک ہی عنصر کے مختلف مظاہر ہیں[2]۔ اسی اثنا میں پروفیسر منڈلیف و نیو لینڈز نے اپنا **قانون دوری**[3] پیش کیا، جس سے اس خیال کو اور تقویت ہو گئی۔ اس قانون کا منشا یہ ہے، کہ مختلف عناصر جو کیمیائی حیثیت سے باہمدگر مشابہ ہیں، ان کے اوزان سالمی[4] کے درمیان ایک خاص قسم کا تناسب پایا جاتا ہے، مثلاً اسٹرونیشم، جسکا وزن سالمی، ہائیڈروجن کے ایک سالمہ کے مقابلہ میں ۸۸ ہے، وہ کیلسیم اور بیریم کے اوزان سالمی کے وسط میں ہے، جنکے اوزان علی الترتیب ۴۰ اور ۱۳۷ ہیں[5]۔ اسی قانون کی بنا پر یہ بھی قرار پایا، کہ عناصر کے خواص کیمیائی و نیز طبعی کا دارومدار ان کے اوزان سالمی کے اوپر ہے[6]، چنانچہ انھیں اوزان کی مناسبت سے کل عناصر، آٹھ طبقات میں تقسیم کر دیئے گئے، اور یہ جدولی تقسیم کیمسٹری کی موجودہ مستند کتابوں میں مندرج پائی جاتی ہے[7]۔

۱۸۹۶ء میں ایک فرنچ محقق بیوکرل نے یہ دریافت کیا، کہ بعض عناصر میں سے ہر وقت نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات، جنھیں اصطلاح میں دقایق کہتے ہیں، خارج ہوا کرتے ہیں، اور یہ ایسے اجسام کو چیر کر ان کے پار ہو جاتے ہیں، جنکے درمیان سے معمولی نور نہیں گزر سکتا۔ ان خواص کا نام ریڈیو ایکٹوٹی (Radio-activity) رکھا گیا، اور اسکی پہلی مثال یورنیم میں پائی گئی۔ رفتہ رفتہ تھوریم، ایکٹینیم، وغیرہ چند دیگر عناصر میں بھی ان خواص کا وجود ثابت ہوا، یہانتک کہ ۱۸۹۹ء میں میسو و میڈم کیری نے ایک جدید عنصر ریڈیم کا انکشاف کیا، جس میں انتشار دقایق کی بیسیہ خصوصیات ایک نہایت حیرت انگیز درجہ پر موجود ہیں، چنانچہ اس میں انتشار دقایق کی قوت بہ مقابلہ یورنیم کے بیس لاکھ گنی زاید ہے[8]۔ یہ سب ریڈیو ایکٹو اجسام، گو اکثر حیثیات سے باہمدگر سخت مختلف ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک کے دقایق کے انتشار سے ایک خاص قسم کی گیس ہیلیم پیدا ہوتی ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ ہیلیم آفریں ذرات ان سب اجسام میں قدر مشترک ہیں۔ اس سے بھی قوی تر شہادت اُن اجسام کی ہے، جو ریڈیو ایکٹو نہیں ہیں۔ ان اجسام پر اختبارات کرنے سے معلوم ہوا ہے، کہ بعض خاص حالات میں، مثلاً جب یہ الٹرا وایلٹ روشنی (Utra-violet light) سے متاثر کئے جاتے ہیں، تو یہ بھی اپنے میں سے کہربائی دقایق خارج کرتے ہیں، اور ہر جسم کے خارج کردہ دقایق، دوسرے جسم کے خارج کردہ دقایق سے بالکل مشابہ و متحد ہوتے ہیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے، کہ اُن بیشمار اجسام میں جو ان دقایق کے مخرج ہوتے ہیں، طبعی و نیز کیمیائی خواص کے لحاظ سے

---

[1] دیکھو Radio-active Substances مصنفہ مکور صفحہ ۲۰
[2] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، حوالہ مذکور
[3] Periodic Law کا ترجمہ ہے
[4] یعنی Atomic Weights عناصر کے اوزان کے پیمانہ میں ہائیڈروجن کا سالمہ ہمیشہ ا کائی فرض کیا جاتا ہے، اور سب اوزان اسی نسبت سے ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی عنصر کا وزن سالمی ۱۱۵ ہے، تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکا سالمہ ہائیڈروجن کے سالمہ سے ۱۱۵ گنا وزنی ہے
[5] دیکھو Seward's "Darwin and Modern Science"
[6] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، حوالہ مذکور
[7] دیکھو Roscoe and Schorlemmers "Treatise on Chemistry" وغیرہ
[8] دیکھو "Radio-activity" مصنفہ روذرفرڈ صاحب۔

زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔[1]

غرض ان سب اختبارات سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ تمام مادی اجسام بلا استثناء اپنے میں سے ایک ہی نوعیت کے دقایق خارج کرتے ہیں، اور ماہرین سائنس انھیں کو مادہ کے آخری اجزائے ترکیبی خیال کرتے ہیں، جو خود نا قابل تجزی اور نا قابل فنا ہیں۔ یہ دقایق کہربائی ہوتے ہیں، اور مادہ کا ہر سالمہ برابر برابر کی تعداد میں ایجابی اور سلبی کہربائی دقایق سے مرکب ہوتا ہے۔ ان کہربائی دقایق سے زیادہ چھوٹی اور ہلکی شے ابتک انسانی معلومات میں نہیں آئی، چنانچہ ایک کہربائی دقیقہ کی جسامت ہائیڈروجن کے ایک سالمہ کے مقابلہ میں، جو چند سال پیشتر تک دنیا میں سبک ترین شے خیال کی جاتی تھی، ۱/۱۰۰۰ ہے، اور اسکا قطر ہائیڈروجن کے ایک سالمہ کے مقابلہ میں ۱/۱۰۰۰ ہوتا ہے۔ سلبی کہربائی دقیقہ، ایجابی کہربائی دقیقہ کے مقابلہ میں اور چھوٹا ہوتا ہے، یہانتک کہ آخر الذکر سے اسکی نسبت ۱/۱۲۰۰ کی ہوتی ہے۔ اس تحقیقات کی بنا پر تنوع عناصر کی وجہ، صرف اُن میں ان ہی کہربائی دقایق کی کثرت یا قلت قرار پاتی ہے، اور انھیں کے تناسب تعداد سے عناصر کے اوزان سالمی میں بھی اختلاف ہے۔[2]

اس موقع پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ خود ان دقایق کہربائی کا وجود کیونکر ہوا؟ لیکن اس سوال کا جواب دینا، درحقیقت سائنس کے تجربی و اختباری حدود سے نکل کر فلسفہ کے ظنی و نظری میدان میں قدم رکھنا ہے۔ تاہم اسکے متعلق جس نظریہ پر طبعیات جدیدہ کے مشہور ترین اساتذہ مثلاً لارڈ کیلون، لارڈ ریلے، سر جے، جے، ٹامسن، پروفیسر آسولڈ، میسو پونیکیر، وغیرہ کا اجماع ہے، وہ یہ ہے، کہ ایک لطیف ترین دخانی شے جسے ایتھر کہتے ہیں، ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس میں بعض نامعلوم اسباب سے کچھ شکنیں یا گتھیاں پڑ گئیں، اور یہی گتھیاں منجمد ہوکر دقایق کہربائی کہلائیں۔ ایک فلسفی اب بھی پوچھ سکتا ہے، کہ آخر یہ ایتھر کہاں سے آیا؟ لیکن سائنس داں، جو الٰہیات و مابعد الطبعیات کے مباحث میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا، اسکے پاس اس سوال کا جواب سکوت اور صرف سکوت ہی ہے۔

دوسرا مسئلہ - یہ خیال صحیح نہیں کہ لی بان کو ابتک دنیا صرف ایک فلسفی مورخ کی حیثیت سے جانتی تھی، بلکہ واقعہ یہ ہے، کہ وہ علم المعاشرت، علم النفس، اور تاریخ سے لیکر فن شہسواری و تمباکو نوشی تک متعدد اور مختلف النوع علوم و فنون پر مضامین و تصانیف تیار کر چکے ہیں۔[3] تاہم یہ ایک امر واقع ہے، کہ آج سے سولہ سال قبل تک دنیائے سائنس ڈاکٹر لی بان کے نام سے ناآشنا تھی۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں جبکہ کروکس مادہ شعاعی (Radiant Matter) اور پروفیسر رنتجن، اکس ریز (X-Rays) کا انکشاف کر چکے تھے، اور اصلیت مادہ کے متعلق جدید تحقیقات شروع ہو چکی تھی، ڈاکٹر موصوف نے اول اول اپنی توجہ طبعیات کے مسائل پر مبذول کی، چنانچہ اپنی ابتدائی تحقیقات کا نتیجہ انھوں نے ۲۲ فروری سنہ مذکور کو فرانس کے ایک سائنٹفک اخبار میں شایع کیا۔ اس مضمون کا ماحصل یہ تھا، کہ بعض اجسام جب روشنی سے متاثر ہوتے ہیں، تو اُن سے ایسے ذرات خارج ہوتے ہیں، جو عام مادہ کو چیر کر اسکے پار ہو جاتے ہیں۔ ان ذرات نور کا اس نے عجیب و غریب نام "سیاہ روشنی" رکھا، لیکن دنیائے سائنس میں اسکا یہ انکشاف نامقبول ہوا، چنانچہ پروفیسر رگھی، جو بولونا یونیورسٹی میں طبعیات کے پروفیسر ہیں، ریڈیو ایکٹیوٹی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ "اُس قسم کے اثرات، جن کی تشریح لی بان نے کی تھی ہم اُن پر یہاں غور کریں گے، اسلئے کہ یہ اسی وقت ثابت ہو گیا تھا، کہ ان کے اختبارات کو ..... بمضمون زیر بحث سے کسی قسم کا تعلق نہیں"۔[4] لیکن اس سے بھی قطع نظر کرکے خود لی بان نے آگے چل کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور اپنی پہلی رائے سے ان الفاظ میں رجوع کیا، کہ

"اپنے اختبارات کے آغاز میں میں نے خواہ مخواہ مختلف چیزوں میں

۱؎ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، جلد ۷، طبع ۱۹۱۰ء، صفحہ ۹۲۲ ۲؎ ایضاً

۳؎ پرچہ "نیچر" مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۱۰ء ۴؎ دیکھو Righi's "Modern Theory of Physical Phenomena" صفحہ ۵۵

خلط مبحث کر دیا تھا، جنھیں مجھے علیحدہ رکھنا چاہیئے تھا۔[1]

اس کے بعد وہ مادہ و قوت کے انحلال پر متعدد مضامین لکھتے رہے، یہانتک کہ ۱۹۰۵ء میں ان کی ایک کتاب "ارتقاء مادہ" پر اور ۱۹۰۷ء میں "ارتقاء قوت" پر ایک دوسری کتاب، فرنچ زبان میں شایع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں کے ترجمے انگریزی میں ہو چکے ہیں،[2] اور ہمارے پیش نظر ہیں ذیل میں ہم ڈاکٹر موصوف کے نظریات و خیالات کا ضروری خلاصہ انھیں کتابوں سے لیکر درج کرتے ہیں۔[3]

لی بان کہتا ہے، کہ ان کتابوں سے میری غرض یہ دکھانا ہے، کہ اولاً جس طرح دنیا کی تمام چیزیں فنا ہوتی ہیں، اسی طرح مادہ اور قوت جنکی بقا و استمرار اس وقت تک بطور علوم متعارفہ کے دنیا کو مسلم تھی، وہ بھی فنا و موت کے قانون سے مستثنیٰ انہیں؛ ثانیاً یہ کہ مادہ کا ہر سالمہ ایک خاص قسم کی قوت کا ذخیرہ ہوتا ہے، جسکی ماہیت سے دنیا اسوقت تک ناواقف تھی، مگر جو دوسری قوتوں سے نسبتاً زیادہ تیز، اور شاید ان کی (یعنی کہربائیت و حرارت شمسی وغیرہ کی) اصل ماخذ ہے؛ ثالثاً یہ کہ عالم مرئی (یعنی مادہ) اور عالم غیر مادی (ایتھر) کے درمیان ایک عالم برزخ موجود ہے۔[4]

اس متن کی شرح ڈاکٹر موصوف یوں کرتے ہیں، کہ شروع میں یہ نظام شمسی، لاپلیس کی تھیوری کے بموجب، بنیولا (ضبابہ) کا ایک عظیم الشان ذخیرہ تھا، جو ایک قسم کا دخانی مادہ ہے، اور جس میں گردش ہوا کرتی تھی رفتہ رفتہ اسی حرکت دوری کا یہ اثر ہوا، کہ چند گیسی حلقے بنیولا کے اسی ذخیرہ سے جدا ہو کر فضا میں الگ جا پڑے، اور رفتہ رفتہ سرد ہونا شروع ہوئے، یہانتک کہ منجمد کرے بن گئے، اور آفتاب، ماہتاب، زمین اور سیارے کہلائے۔ اسی طرح سالمات مادہ بھی وجود میں آئے ہیں۔ ہر سالمہ گویا ایک چھوٹے پیمانہ پر آفتاب ہوتا ہے، جس کے گرد، سیارگان نظام شمسی کیطرح، ہزاروں ذرے، بے انتہا سرعت کے ساتھ، ہر وقت گردش کیا کرتے ہیں۔[5]

لاپلیس کی تھیوری پر بنیولا عالم مادی کی اصل قرار پاتا ہے، لیکن ڈاکٹر لی بان کہتے ہیں، کہ خود بنیولا بھی کسی اصل کا محتاج ہے، اور وہ ایتھر ہے۔ ایتھر ہی تمام مادہ کا مبدا، اولین ہے، اور یہی اس کا مرجع آخرین بھی ہے، کیونکہ فنا ہوتے وقت سب مادہ اسی کی طرف رجوع ہوتا ہے، گویا یہی اسکا مولد اور یہی اسکی لحد ہے،[6] آفرینش سالمات کا طریقہ یہ ہے، کہ ایتھر میں گردش ہوتے ہوتے کچھ بھنور یا گرداب پڑ گئے، ان گردابوں کو ذرات مادی کہتے ہیں، اور ان کے ایک ایک ذخیرہ کو سالمہ کہتے ہیں، یہ ذرات جو نہایت سرعت کے ساتھ گردش کیا کرتے ہیں، قوت کے بھی مخزن ہوتے ہیں، اور جس نسبت سے ان کے توازن میں خلل ہوتا ہے، اسی نسبت سے (یعنی اپنی سرعت رفتار کی مناسبت سے)، ان سے مختلف قوتیں ظاہر ہوتی ہیں، مثلاً حرارت، نور، کہربائیت وغیرہ۔ رہی مادہ کی صلابت، تو وہ اسکے ذرات کی سرعت رفتار کا نتیجہ ہے، اسلئے کہ یہ امر اختبارات سے ثابت ہو چکا ہے، کہ اجسام میں صلابت یا قوت مزاحمت، ان کے اجزائے ترکیبی کی سرعت رفتار ہی کی معلول ہے، چنانچہ اگر ہم کسی بلندی سے پانی کی ½ انچ موٹی دھار کو ایک ۱۲ انچ کی لمبی نل کے ذریعہ سے نیچے گرائیں، اور اس حالت میں اس دھار کو تلوار کی ضرب سے کاٹنا چاہیں، تو کامیاب نہیں ہو سکتے، بلکہ اس تجربے سے ہمارے ہاتھ کو ایسا جھٹکا پہنچے گا، کہ گویا وہ کسی دیوار پر پڑا تھا۔ اسی بنا پر بعض علماء طبعیات کا خیال ہے، کہ اگر پانی کی روانی کی شرح رفتار ایک کافی حد تک بڑھا دی جائے، تو اس پر توپ کے

---

[1] "ارتقاء مادہ" صفحہ ۷ [2] "Evolution of Matter" اور "Evolution of Forces" مطبوعہ ۱۹۰۷ء و ۱۹۰۸ء [3] لی بان کی ان دونوں تصانیف میں بعض بعض جگہ ایسی صریح تناقض بیانیاں موجود ہیں، کہ اگر ہم انھیں بجنسہ اردو میں ادا کر دیں، تو ناظرین کو مشکل سے ان پر اعتبار آئیگا۔ ہمنے ایسے مواقع ترجمہ میں اکثر قصداً چھوڑ دیئے ہیں۔ [4] "ارتقاء مادہ" صفحہ ۱ و ۲ نیز "ارتقاء قوت" باب اول و دوم۔

[5] "ارتقاء مادہ" صفحہ ۱۳ [6] "ارتقاء مادہ" صفحہ ۱۳

گولوں کا کچھ اثر نہ ہوگا، اور اگر کسی شے کو سریع السیر پانی کی کئی انچہ موٹی تہ سے ڈھک دیا جائے، تو وہ گولہ باری سے ایسی ہی محفوظ رہیگی، جیسے کوئی فولادپوش۔ اس تمثیل کی مدد سے، لی بآن کہتا ہے کہ عام ذرّات مادّہ کی صلابت کو سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ جس طرح پانی میں بذات خود صلابت و مدافعت کی قوّت نہیں، مگر جب اسکی رفتار یا حرکت تیز ہو جاتی ہے، تو یہ کس قدر سخت اور مضبوط ہو جاتا ہے، اسی طرح گرداباہائے ایتھر، جو بجائے خود، کوئی صلابت و مدافعت نہیں رکھتے، مگر جب تیز تیز حرکت کرنے لگتے ہیں، تو ان میں صلابت وبستگی پیدا ہو جاتی ہے، اور ان ہی گردابوں کا نام مادّہ ہے۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ جوں جوں ان ذرّات مادّہ کی رفتار دھیمی پڑتی جاتی ہے، مادّہ میں کمی آتی جاتی ہے، اور وہ مرتبۂ فنا کے نزدیک ہوتا جاتا ہے، یہانتک کہ جب اسکی حرکت سکون سے بدل جاتی ہے، تو جس شے کو ہم مادّیت کہتے ہیں، یعنی قوّت مدافعت، صلابت وغیرہ، یہ بھی فنا ہو جاتی ہے، اور مادّہ غیرمادّیت کو اختیار کرکے پھر ایتھر کا جزو بن جاتا ہے۔ اس بنا پر مادّہ گویا حرکت ہی کا نام ہے، اور چونکہ حرکت قوّت سے علٰحدہ نہیں، اسلئے مادّہ بھی قوّت ہی کی ایک نوع ہے،[1] جو دوسری قوّتوں سے صرف اسلئے ممتاز ہے، کہ اس میں صلابت یا جمود نسبتاً زیادہ ہوتا ہے،[2] مگر یہ فرق محض اضافی ہے، ورنہ نوعی حیثیت سے مادّہ کو قوّت کے دیگر مظاہر سے ممتاز کرنے والی کوئی شے نہیں۔

لی بآن کی تھیوری کا اصل زور اس دعوٰی پر ہے، کہ جس طرح ریڈیم، یورینیم، وغیرہ میں قوّت انتشار دقایق کا وجود ہر سائنس داں کو مسلّم ہے، اسی طرح یہ خاصہ تمام اجسام مادّی میں پایا جاتا ہے، چنانچہ متعدد اختبارات سے معلوم ہوا ہے، کہ جب عام اجسام چند خاص قسم کی قوّتوں مثلاً حرارت، نور، کہربائیت، یا کیمیائی تحلیل و تعقید سے متاثر کئے جاتے ہیں، تو اُن میں سے بھی نہایت تیز تیز حرکت کرنے والے ذرّات خارج ہونے لگتے ہیں، اور یہ سب بالکل یکساں ہوتے ہیں۔ ان دقایق کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے، کہ اسکی نظیر دیگر قوائے طبعی میں کہیں نہیں ملتی، چنانچہ اگر انحلال مادّہ کی رفتار کی شرح کے مطابق ہم معمولی بندوق کی ایک گولی چلانا چاہیں، تو اسکے لئے ....۷ کیلوگرام یا ....۷ گرام، بارود کی ضرورت ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ انحلال کے وقت مادہ میں یہ حیرت انگیز قوّت کہاں سے آگئی؟ لی بآن کہتا ہے، کہ قدیم تھیوری کے مطابق، مادّہ میں کسی قوّت کے تخلیق کی قابلیت نہیں، بلکہ اُس سے ہمیشہ وہی قوتیں خارج ومنتشر ہو سکتی ہیں، جو اُس میں پیشتر باہر سے داخل ہو چکی ہیں۔ اسلئے اس نو دریافت قوت کا حل، قدیم تھیوری سے نہیں ہو سکتا، اور اسلئے ایک جدید قوّت کا فرض کرنا ضروری ہے، جس کا نام قوت بین السالمی ہے،[3] جو بجائے ایک جسم سے دوسرے جسم پر عمل کرنے کے، خود ذرّات ہی کے درمیان عمل کرتی ہے،[4] اور جسکے ماتحت اصناف، عام قوائے طبیعہ ہیں۔

ذرّات کہربائی کے متعلق، جو انحلال مادّہ کے وقت خارج ہوتے ہیں، لی بآن کہتا ہے، کہ ان میں بجز انرشیا (یعنی قوت مدافعت) کے اور کوئی خواص مادّہ نہیں پائے جاتے، اور یہ قوّت بھی ان کی شرح رفتار کے ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے۔ صورت کے لحاظ سے نہ یہ منجمد کہے جا سکتے ہیں، نہ سیّال، اور نہ گیسی۔ اسی کے ساتھ یہ ٹھوس اجسام کے بھی پار ہو جاتے ہیں، ان وجوہ پر ان کو مادّہ کے ماتحت نہیں رکھا جا سکتا، اور نہ ان میں ایتھر کے خواص موجود ہیں، اسلئے یہ ایسی ہستیاں ہیں، جو عالم مادّی و غیرمادّی کے درمیان ایک برزخ قایم کرتی ہیں۔[5]

تیسرا مسئلہ۔ لی بآن نے مادّہ کے متعلق جس تھیوری کو تقریباً آٹھ سو صفحات میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا تھا، اسکا ضروری خلاصہ جس حد تک کہ ایک آرٹکل کے حدود میں سما سکتا تھا، ہم نے اوپر درج کر دیا۔

---

[1] ارتقاء قوت، صفحہ ۷۰ تا ۸۰ [2] ارتقاء قوت، صفحہ ۹۰ و صفحہ ۵۵

[3] Intra-atomic Energy [4] ارتقار مادہ، صفحہ ۳۴ تا ۵۱ [5] ارتقاء مادہ، صفحہ ۱۹۶ و صفحہ ۸۵-۸۶

اسکے مطالعہ سے معلوم ہوا ہوگا، کہ لی بان نے جن دعاوی کو اپنی جانب منسوب کیا ہے، اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جنھیں دیگر علماء سائنس اُس سے بہت پیشتر پیش کر چکے ہیں، اور بعض کو اُن میں سے سند قبول حاصل کئے آج سالہا سال گزر چکے ہیں - لی بان نے ان کے متعلق جو کچھ کیا ہے، وہ صرف اتنا ہے، کہ پیرایۂ بیان کسی قدر مختلف رکھا ہے، لیکن اگر صرف طرز ادا کی جدت ہی دلیل فضلیت ہے، تو مصنفین کے گروہ میں ہر متاخر کو متقدم پر فضیلت حاصل ہے - لی بان نے اپنی تصانیف میں کئی درجن بار اس دعویٰ کی تکرار کی ہے، کہ مادہ اور قوت دو مختلف النوع چیزیں نہیں، بلکہ ایک ہی ہستی کے دو مختلف مظاہر ہیں - حالانکہ یہ دعویٰ انگلستان کا مشہور عالم طبعیات، فیراڈے، آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر کر چکا ہے، چنانچہ خود لی بان کو بھی اسکا حق تقدم مسلّم ہے[1]، اور جرمنی کے نامور سائنس داں ارنسٹ ہیکل کے فلسفہ کا تو دار و مدار ہی اس تھیوری پر ہے، کہ دنیا میں مستقل وجود صرف ایک "ذات" کا ہے، اور مادہ، قوت، وایتھر سب اسی کے مظاہر یا پرتو ہیں[2] اس سے بھی قطع نظر کر کے، طبعیات پر جو جدید کتابیں ادھر ۱۰-۱۵ سال سے شایع ہو رہی ہیں، اُن میں بجائے مادہ کے "اُنرجی" کا لفظ علی العموم استعمال ہوتا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ اگرچہ عام سائنس کے لئے مادہ کا وجود ناگزیر ہے، لیکن علم طبعیات جن اشیاء سے براہ راست بحث کرتا ہے، وہ مادہ نہیں، بلکہ اسکے خواص طبعی ہیں، اور انھیں کا مجموعی نام قوت ہے - غرض مادہ اور قوت کا تضاد جسے بعض قدما مانتے چلے آئے ہیں، علم و سائنس کی عام ارتقائی رفتار کے ساتھ از خود مٹ گیا ہے، اور اس کے مٹانے میں لی بان کا کوئی نمایاں حصہ نہیں -

اسی طرح لی بان کا یہ دعویٰ بھی، کہ عالم مادی کی ابتداء ایتھر کی سطح میں کچھ ورطات یا گردابوں کے پڑجانے سے ہوئی ہے، سائنٹفک دنیا میں مطلق نیا نہیں، بلکہ سائنس داں اسکو عرصہ سے تسلیم کر رہے ہیں، اور اس نظریہ کے اول اول قایم کرنے کا فخر ہمارے علم میں لارڈ کیلون کو حاصل ہے، یا ممکن ہے کہ یہ نظریہ اس سے بھی زیادہ قدیم ہو -

غرض اس قسم کے اُن تمام مسائل سے قطع نظر کر کے، جو دنیاے سائنس میں متعارف ہیں، اور جن کے انکشاف کا اپنی جانب، لی بان نے غلط انتساب کیا ہے، نیز اُن مکررات کو حذف کر کے، جنکی افراط بے محل سے لی بان کے سنجیدہ ناظرین بھی بمشکل اپنی متانت قایم رکھ سکتے ہیں، اور اُن اختبارات مصوّر کو بھی نکال کر کے، جو اسکے دعاوی کی گویا محض تصریحات ہیں، ہماری پیش نظر ضخیم تصانیف کا حجم گھٹ کر صرف چند صفحات رہ جاتا ہے - اب ان صفحات میں لی بان کا اہم ترین دعویٰ، جو ہمیں نظر آتا ہے، اور جسکے اوپر، درحقیقت، اسکی ساری تھیوری کی صحت کا انحصار ہے، یہ ہے کہ

ہر جسم میں ریڈیو ایکٹوٹی کا خاصہ موجود ہے -

یہ دعویٰ بجائے خود، دو اجزا سے مرکب ہے :-

(۱) ہر جسم میں انحلال ہوتا ہے،

(۲) یہ انحلال وہی ہے، جس کی بنا پر کوئی جسم ریڈیو ایکٹو کہا جاتا ہے -

پہلے دعویٰ کے ثبوت میں ڈاکٹر لی بان نے اپنے متعدد اختبارات کی تفصیل پیش کی ہے، جنکا ماحصل یہ ہے، کہ جب انھوں نے حرارت، کہربا وغیرہ قواے طبیعیہ سے بعض ایسے اجسام کو متاثر کیا، جن میں ابتک انحلال کا خاصہ نہیں ثابت ہوا تھا، تو معلوم ہوا، کہ اُن میں بھی موجود ہے - اس موقع پر سب سے پہلے تو ایک سخت اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے، کہ بعض اجسام پر عمل کرنے سے ڈاکٹر صاحب کو کُل اجسام کے متعلق نتیجہ نکالنے کا کیا حق ہے ؟ ممکن ہے، کہ ڈاکٹر صاحب بجائے "بعض" کے "اکثر" کا لفظ استعمال کریں، لیکن منطق خواں ناظرین جانتے ہیں، کہ اعتراض کے وزن میں اس ترمیم سے ذرہ بھر بھی کمی نہیں ہوئی - لیکن اس سے قطع نظر کر کے، دوسرا سوال

---

[1] ارتقاء مادہ صفحہ ۱۳۰ [2] دیکھو ہیکل کی "The Riddle of the Universe" اور "Wonders of Life"

یہ ہے، کہ کیا یہ اختبارات صحیح ہیں؟ ہم خود اسکے جواب کی جرأت نہیں کرسکتے، لیکن اتنا عرض کردینا ضروری سمجھتے ہیں، کہ مسٹر نارمن کیمبل جو کیونڈش لیبورٹیری (Cavendish Laboratory) کا ممبر اور طبعیات کا عالم ہے، اس سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے، اور بیان کرتا ہے، کہ خود اس نے اور نیز مس گیٹس و پروفیسر کیلین نے (Hydration of Quinine Sulphate) کے اختبارات میں لی بان کی غلطیاں ثابت کی ہیں، جس کی وجہ یہ ہے، کہ ڈاکٹر موصوف اُن احتیاط آمیز شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتا، جو اختبارات کو معتبر و مستند بنانے کے لئے لازمی ہیں۔[1]

اب رہا ڈاکٹر صاحب کا دوسرا دعویٰ، تو وہ پہلے سے صرف غلط تر ہی نہیں، بلکہ عجیب تر بھی ہے۔ ریڈیو ایکٹو اجسام کا امتیازی خاصہ جیسا کہ بالاتفاق تمام علماء طبعیات نے لکھا ہے، یہی ہے، کہ اُن سے دقایق یا ذرات اشعاعی، بلا موثر خارجی، از خود، خارج ہوتے رہیں، چنانچہ ریڈیم، یورینیم، وغیرہ، جن عناصر کے ریڈیو ایکٹو ہونے پر اس وقت تک محققین کا اجماع ہوچکا ہے، اُن سب میں یہ وصف قدر مشترک ہے، اور پروفیسر رو فورڈ، پروفیسر فورنیر، مسٹر وٹیم، وغیرہ اُن طبیعین نے، جنکے نام آج ریڈیو ایکٹو کے مسئلہ پر خاص سند رکھتے ہیں، اسکی تعریف ہی یہ کی ہے، کہ یہ عناصر کی وہ حالت ہے، جس میں اُن سے مادہ اشعاعی از خود خارج ہوتا ہے، ٹھوس اجسام کے پار ہوجاتا ہے، وغیرہ۔ اب غور کرو، کہ ڈاکٹر لی بان اس امر کے مدعی ہیں، کہ سارے اجسام ریڈیو ایکٹو ہیں، یعنی از خود ذرات شعاعی خارج کیا کرتے ہیں؟ اور اس دعویٰ پر اپنے مشاہدہ کی دلیل یہ لاتے ہیں، کہ جب اجسام پر فلاں فلاں موثرات خارجی (یعنی حرارت، نور، کہربائیت یا بعض عوامل کیمیاوی) اپنا عمل کرتے ہیں، تو اُن میں سے ذرات خارج ہونے لگتے ہیں!!! اس طرز استدلال کے ساتھ، اگر دنیا میں ابھی ڈاکٹر صاحب کے بہت سے ہم خیال نہیں پیدا ہوئے، تو ان کو خاطر شکستہ ہرگز نہ ہونا چاہئے، پہلا ایک نیا فن منطق مدون ہولے، تب شاید لوگ اس قسم کی دلیل و دعویٰ میں ربط محسوس کریں، اور ڈاکٹر صاحب کے اجتہاد کی داد دے سکیں۔

یہ مسئلہ لی بان کے نظریہ کا ستون اعظم تھا، جسکے انہدام کے بعد ان کی تھیوری کی ساری عمارت مسمار ہوئی جاتی ہے، تاہم اسکے سہارے کی جو چند چیزیں باقی رہ گئی ہیں، جانچ کے بعد ان کی بنا بھی نقش برآب ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً قوت بین السالمی، جسکے وجود کا بہت زور شور سے دعویٰ کیا ہے، اور جسکے متعلق مباحث پر اپنی کتابوں کے متعدد ابواب وقف کردیئے ہیں،[2] لیکن جانتے ہو، کہ ان کثیر التعداد صفحات کے اندر کیا ہے؟ قوت بین السالمی کے حدود، اسکے اصناف، اسکا طریقہ فعلیت، وغیرہ۔ حالانکہ سب سے مقدم یہ مسئلہ تھا، کہ اس قوت کا وجود ثابت کیا جاتا، اصناف و حدود کی تعیین تو بعد کو بھی ہوسکتی ہے، پہلے اس معترض کی تشفی کرنی چاہیئے، جو سرے سے اس قوت کے وجود ہی کا منکر ہے۔ لیکن خاص اس عنوان پر آٹھ سو صفحات کی ضخامت میں ایک سطر بھی نہیں ملتی۔ اس مسئلہ سے متعلق لی بان کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے، کہ اس نے تکوین عالم کی ایک امکانی صورت پیش کی ہے، حالانکہ محض اتنا، بالکل ناکافی ہے، سائنس کے بارگاہ میں کوئی نظریہ اس وقت تک قطعاً مقبول نہیں ہوسکتا، جبتک یہ نہ ثابت ہوجائے کہ وہ، دوسرے نظریات کے مقابلہ میں، واقعات کی تشریح و توجیہ زیادہ صحیح و معقول طور پر کرسکتا ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر موصوف نے عالم مادی و غیر مادی کے درمیان جو برزخ فرض کیا ہے، اسکا وجود بھی کسی مستحکم دلیل سے ثابت نہیں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، کہ چونکہ دقایق کہربائی میں فلاں فلاں خواص مادی موجود نہیں، اسلئے ہم ان کو اشیاء مادی نہیں کہہ سکتے،[3] لیکن

[1] دیکھو پرچہ اتھینیم (Athenæum) بابت ۳ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء۔

[2] "ارتقاء مادہ" حصہ دوم۔ باب ۱-۴

[3] "ارتقاء مادہ" صفحہ ۱۹۶۔

اسکا جواب یہ ہے، کہ خود مادہ ہی کے مفہوم کو اس قدر وسیع کیوں نہ کر دیا جائے، کہ یہ دقایق، بعض اہم خواص مادی سے معرا ہونے کے باوجود بھی اسکے اندر شامل رہ سکیں؟ مثلاً، اگر دقایق، مادہ کی کیفیات ثلثہ یعنی منجمد سیال، اور گیسی کے تحت میں نہیں آتے، تو ہم مادہ کی ایک چوتھی کیفیت یعنی کہربائی کا کیوں نہ اضافہ کر لیں؟ علاوہ بریں، اتنا تو ڈاکٹر موصوف کو بھی مسلم ہے، کہ دقایق میں قوت مزاحمت پائی جاتی ہے[1]، اور چونکہ یہ مادہ کا ایک وصف امتیازی ہے، اسلئے اسکا وجود، دقایق کو مادی قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا، اسکا ماحصل یہ نکلا، کہ لی بان نے جس طرح سے ریڈیو ایکٹویٹی کے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا، وہ صحیح نہیں۔ لیکن یہ بالکل ممکن ہے، کہ لی بان نے جو طرز ثبوت اختیار کیا ہو وہ اگرچہ غلط ہو، تاہم جس نتیجہ پر وہ پہنچا ہے، وہ صحیح ہو؟ اس بنا پر ہم مناظرانہ حیثیت سے قطع نظر کرکے، اب یہ دیکھنا چاہتے ہیں، کہ کیا عام اجسام میں ریڈیو ایکٹویٹی کا خاصہ عموماً علمائے سائنس کو مسلم ہے؟

لی بان نے اپنی تائید میں بار بار ایک ایسے محقق کا حوالہ دیا ہے جو اس وقت انگلستان میں طبعیات کا سب سے بڑا عالم تسلیم کیا جاتا ہے اور جسکی قوت تحقیق کا شہرہ تمام یورپ میں بلند ہے۔ یعنی سر جے جے ٹامسن لیکن واقعہ یہ ہے، کہ ان کے اختبارات سے لی بان کے دعاوی کی مطلقاً تائید نہیں ہوتی ہے۔ ذیل میں ہم ٹامسن کی تحقیقات کے خلاصہ کو اُن ہی کے الفاظ (بترجمہ) میں درج کرتے ہیں[2] وہ کہتے ہیں۔

یہ مسئلہ، کہ آیا تمام اجسام خفیف مقدار میں دقایق (ریڈیو ایکٹو) خارج کرتے رہتے ہیں، عرصہ دراز تک میرے زیر غور رہ چکا ہے، لیکن ابتک مجھے ان کے وجود کی شہادت نہیں ملی بجز اُن دقایق کے جو ریڈیو ایکٹو اجسام کے اجزا کے ان عام اجسام کے ساتھ مل جانے سے پیدا ہوئے یعنی عام اجسام سے جب کبھی دقایق ریڈیو ایکٹو خارج ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، تو وہ دراصل ان کے خارج کردہ نہیں ہوتے، بلکہ اُن چند ریڈیو ایکٹو اجسام کے خارج کردہ ہوتے ہیں، جنکے اجزا عموماً عام اجسام میں مخلوط رہتے ہیں۔

ٹامسن، جس پایہ کا شخص ہے، اسکے لحاظ سے اگرچہ تنہا اسی کی شہادت اس مسئلہ کا فیصلہ، لی بان کے خلاف کر دینے کے لئے کافی ہے، تاہم احتیاط مزید کی غرض سے، ہم ایک شہادت اور نقل کرتے ہیں۔ مسٹر ڈیتھم، ایک مستند عالم سائنس تحریر کرتے ہیں:-

چند قلیل التعداد عناصر کے اندر، ریڈیو ایکٹویٹی کے خاصہ کے انکشاف نے علمائے طبعیات کے دل میں یہ سوال پیدا کیا، کہ آیا یہ خاصہ دیگر عناصر میں بھی تو نہیں پایا جاتا، گو خفیف مقدار میں سہی؟ اور یہ کہ عام اجسام تو ریڈیو ایکٹو نہیں؟ .... اس سوال کا جواب دینا ذرات ریڈیم کے ہمہ جائی ہونے کی وجہ سے بہت دشوار ہے (یعنی چونکہ ریڈیم کے اجزا تقریباً ہر جسم کے ساتھ پائے جاتے ہیں، اسلئے یہ بتانا مشکل ہے، کہ خارج شدہ ذرات اشعاعی کا مخرج آیا وہ جسم ہے، یا ذرات ریڈیم) .... مدت گیر و شفقت طلب تحقیقات کے بعد اتنا تو ثابت ہو گیا، کہ بعض معدنیات مثلاً پوٹاشیم میں ریڈیو ایکٹوٹی کے خفیف آثار موجود ہیں، لیکن عام اجسام کے متعلق جو سوال تھا، وہ ابتک غیر طے شدہ ہے۔ تاہم یہ لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اگر عام عناصر ریڈیو ایکٹو نہ ہوں، تاہم اُن میں ذاتی انحلال ہوتے رہنا ممکن ہے (یعنی محض انحلال ریڈیو ایکٹوٹی کی دلیل نہیں) ... بہرحال ابتک اس قسم کے غیر شعاعی تغیرات (یعنی ریڈیو ایکٹوٹی) کا ثبوت عام اجسام میں نہیں ملا ہے، اور شاید کبھی بھی نہ ملے۔ تاہم اس کے امکان کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے[3]۔

---

[1] ارتقاء مادہ صفحہ ۱۹۶

[2] دیکھو "Proceedings of the Cambridge Philosophical Society" بابت اپریل [illegible]

[3] Seward's "Darwin and Modern Science"

اسی کے قریب قریب مشہور محقق، پروفیسر رذرفورڈ کی بھی رائے ہے۔ ناظرین کو یہ نہ خیال کرنا چاہیئے، کہ یہ لی بان سے قبل کی تحقیقات ہے بلکہ برعکس اسکے ہم نے یہاں جن تحریروں سے فائدہ اُٹھایا ہے، وہ سب لی بان کے تصانیف کے بعد کی ہیں۔

بحث کی اصولی حیثیت کا جہاں تک تعلق ہے، ہم نے سطور بالا میں یہ مختصراً مگر کافی طور سے دکھا دیا، کہ لی بان کے دعاوی سائنٹفک معیار پر پورے نہیں اُترتے، لیکن معترض اب بھی کہہ سکتا ہے، کہ جس کتاب کی تائید میں علما، یورپ نے نہایت ہی اعلیٰ تنقیدیں لکھی ہوں، اور جسکو وہ ڈاروِن کی "اصل الانواع" کا ہمپایہ سمجھتے ہوں، اسکے متعلق تمہارا یہ دعویٰ کیونکر قابل تسلیم ہو سکتا ہے؟ ضرور ہے، کہ خود تمہارے ہی دلایل و بیانات کی تہ میں کوئی مغالطہ شامل ہو۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ کیا واقعی علما، یورپ نے لی بان کے نظریات کے سامنے گردنیں ڈال دی ہیں؟ اسکے جواب میں ہم اُن خطوط کے ترجمہ اور ضروری اقتباسات درج کرتے ہیں، جو راقم مضمون ہذا کو متعدد علما، سائنس سے، اس مسئلہ سے متعلق استفسار پر، موصول ہوئے ہیں۔

سر الفرڈ رسل ولیس (Wallace) جو مسئلہ ارتقاء کے اکتشاف میں ڈاروِن کا، برابر کا شریک تھا، لکھتا ہے، کہ

میں لی بان کی کتابوں سے بالکل واقف نہیں (خط مؤرخہ ۲ اپریل ۱۹۱۲ء)

سر ہنری راسکو (Roscoe) جسکا شمار یورپ کے مشہور ترین علما، کیمسٹری میں ہوتا ہے، ایک طعن کے ساتھ تحریر کرتے ہیں، کہ

میسو لی بان کے خیالات اسقدر مافوق الفہم طور پر غامض ہیں، کہ میں انھیں نہیں سمجھ سکتا (خط مؤرخہ ۱۴ اگست ۱۹۱۲ء)

سر ولیم ریمزے (Ramsay) جو اس وقت انگلستان میں کیمسٹری کے اُستاذ الاساتذہ ہیں، یوں رقم طراز ہیں:-

ڈاکٹر لی بان کے اختبارات، اجسام سے الٹرا وایلٹ روشنی سے متاثر ہونے پر، انتشار ذرات کے متعلق صحیح ہیں۔ چنانچہ چند سال ہوئے میرے معمل میں ان کی تصدیق ڈاکٹر اسپنسر نے کی تھی، جنکی تفصیل ہمارے مشترکہ ناموں کے ساتھ رسالۂ فلاسوفیکل میگزین میں شایع ہو چکی ہے[1] لیکن اس حصہ کے علاوہ، باقی کتاب میں ڈاکٹر لی بان مجھے کچھ صوفی منش (یعنی مافوق الفہم باتیں کرنے والے) سے معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی کتاب دلچسپ ضرور ہے (خط مؤرخہ ۲۴ مارچ ۱۹۱۲ء)

پروفیسر رافیل ملڈولا (Meldola) اف، آر، اس، جنکو حلما، ارتقاء میں ایک نہایت ممتاز رتبہ حاصل ہے، فرماتے ہیں کہ

لی بان کی کتاب "ارتقاء مادہ" میری نظر سے نہیں گزری۔ اور نہ میرے علم میں اُس نے آج کل کے علماء ارتقاء پر کوئی خاص اثر ڈالا ہے (خط مؤرخہ یکم اپریل ۱۹۱۲ء)

مسٹر ویٹھم (Whetham) نے، جنکے سائنٹفک مرتبہ کا اندازہ اسی ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے، کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع جدید میں "سائنس" کے اوپر انھیں کا آرٹیکل ہے، جن الفاظ میں اپنا اظہار خیال کیا ہے، اسکا ہم بجنسہٖ ترجمہ کر دینا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں:-

ٹرینیٹی کالج، کیمبرج۔

۲۶ - مارچ ۱۹۱۲ء

مسٹر ڈبلو، سی، ڈی، ویٹھم اپنے آداب مسٹر عبد الماجد کی خدمت میں پیش کرنیکے بعد یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ ان کی رائے میں ڈاکٹر لی بان کی کتاب "ارتقاء مادہ" نہایت خیالی (یا نظری) تصنیف ہے، اور گو ادبی حیثیت سے دلچسپ ہے، تاہم موجودہ اختبارات و تجربات کے لحاظ سے، اسکو واقعات کے مطابق کہنا دشوار ہے۔

ہمارے قابل فخر ہموطن، ڈاکٹر جے، سی، بوس (Bose) پروفیسر پریسیڈنسی کالج، کلکتہ، جنکی سائنٹفک عظمت اور طبعیات دانی کا اعتراف

---

[1] دیکھو، فلاسفیکل میگزین، بابت اکتوبر ۱۹۰۶ء۔

حضور نظام (خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ) مع اسٹاف

درمیان میں حضور نظام ھیں - حضور کے دھنی جانب پیچھے کی طرف کرنل سر افسرالملک بہادر سپہ سالار عساکر دولت آصفیہ وایڈیکانگ حضور نظام کھڑے ھیں' اور بائیں جانب مولوی احمد حسین صاحب سی ایس آئی' ایم اے' بی ال' پرسنل و پرائویٹ سکرٹری حضور نظام ھیں - کرنل سر افسرالملک بہادر کے دھنی جانب' مغلائی لباس میں مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ بہادر پیشکار حضور نظام و سابق مدارالمہام دولت آصفیہ ھیں -

نہ صرف جرمنی، فرانس، و انگلستان کے دیگر صدہا علما کو ہے، بلکہ خود لی بان تک کو ہے[۱]، کہتے ہیں، کہ

> لی بان کے اختبارات کے نتائج قابل تسلیم ہیں، مگر اسکے نظریات نہیں (خط مؤرخہ ۔ مارچ ۱۹۱۲ء)

پروفیسر ردرفورڈ (Rutherford) جنکا خط ہمکو مضمون کا اس قدر حصہ لکھ جانے کے بعد موصول ہوا، وہ شخص ہیں، جنکی ایک عمر ریڈیو ایکٹوٹی کی تحقیقات میں صرف ہوئی ہے، اور جنکے اقوال اس مسئلہ پر ایک خاص سند رکھتے ہیں، وہ فرماتے ہیں :۔

> لی بان کی تھیوری ایک عجیب خیال بندی ہے، گو میرا ذاتی خیال یہ ہے، کہ اسکی بنیاد سائنٹفک شہادت پر ہے۔ مادہ کے انحلال کا قطعی ثبوت، ابتک صرف اُن اجسام میں ملا ہے، جو ریڈیو ایکٹو ہیں
> (خط مورخہ ۱۶۔ اگست ۱۹۱۲ء)

ناظرین نے دیکھا ہوگا، کہ سر الفرڈ ولیس اور پروفیسر ملڈولاؤ، لی بان کی کتاب سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں، جس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے، کہ اسکو سائنٹفک جماعت میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں مسٹر وہیٹم دبی زبان سے اور سر ہنری راسکو، علانیہ اسکو محض واہیانہ بکر قرار دیتے ہیں۔ اور سر ولیم ریمزے، پروفیسر ردرفورڈ، و ڈاکٹر بوس جو نسبتاً لی بان کے ہمدرد ہیں، وہ تک اسکے نظریات کو مہمل بتاتے ہیں۔ پھر جب ان اقوال پر ہم ٹامسن (Sir J. J. Thomson) میڈم کری (Mme. Curie) بیکیورل (Becquerel) جیسے جلیل القدر علماء طبیعیات کی شہادتوں کا اضافہ کرتے ہیں، جو بہ قول مسٹر ٹامسن کیمبل کے، سب کے سب لی بان کے مخالف ہیں، تو اس امر کے اظہار کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، کہ سائنٹفک دنیا میں لی بان اور اسکے نظریہ کو کیا وقعت حاصل ہے[۲]!

چوتھا مسئلہ۔ ترتیب کلام کے لحاظ سے سب سے پچھلی، مگر اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلی بحث یہ ہے، کہ مادہ کی بقاو فنا کو قدم و حدوث عالم سے کیا تعلق ہے، کیا اگر لی بان کی تھیوری آگے چلکر ثابت ہو جائے، تو عالم کے حدوث، اور اس کے خالق کی ضرورت، کو لازمی طور پر ماننا پڑے گا؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمکو ایک بار پھر لی بان کی اصل تھیوری پر نظر کرنی چاہیئے۔ اسکا دعویٰ یہ ہے، کہ موجودات عالم کا وہ حصہ، جسے ہم مادہ کہتے آئے ہیں، اور جسکا امتیازی خاصہ وزنیت ہے، وہ رفتہ رفتہ منحل ہو کر قوت کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور قوت، ایتھر کی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے[۳]۔ لیکن اصل سوال یہ ہے، کہ ایتھر کیا ہے؟ کیا وہ مادہ سے مستقلاً علیحدہ کوئی وجود رکھتا ہے؟ کیا اُس میں کوئی بھی خواص مادی نہیں؟ اسکا جواب خود لی بان کی زبان سے سنو۔ ایک جگہ یہ ذکر کرتے ہوئے کہ ایتھر کی ماہیت حقیقی کا ہمیں علم نہیں[۴]، فرماتے ہیں کہ تاہم

> ایتھر وہ شے ہے، جسکا جلوہ ہمیں اپنے گرد ہر جگہ نظر آتا ہے، جسمیں ہم تموج پیدا کرسکتے ہیں، جس میں ہم کچی پیدا کرسکتے ہیں، اور جسے ہم جب چاہیں وزن (یا پیمائش) کرسکتے ہیں[۵]

اسی سے چند صفحات قبل، ایک جگہ لکھتے ہیں[۶]، کہ

> چونکہ رفتار نور کا باعث تموجات ہیں، یہ ضرور ہے، کہ یہ تموجات

---

[۱] لی بان نے ڈاکٹر موصوف کے اقوال کو متعدد بار سنداً پیش کیا ہے۔ دیکھو "ارتقاء مادہ" صفحہ ۲۵۱ نیز "ارتقاء قوت" صفحہ ۱۵۱ و ۱۵۲ و ۱۵۴ —

[۲] علاوہ اُن شواہد کے جو درج متن کئے گئے، راقم مضمون نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے صیغہ سائنس کے تین ممتاز ارکان سے لی بان کی کتاب کے متعلق استصواب رائے کیا۔ ان اصحاب ثلثہ میں سے دو نے، جو کیمسٹری میں متعدد معزز ڈگریاں رکھتے ہیں، لی بان کے نام تک سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا، اور تیسرے پروفیسر نے، جو اس یونیورسٹی میں اسوقت طبعیات کے بہترین عالم سمجھے جاتے ہیں، اسکی کتاب پر نہایت مخالفانہ رائے ظاہر کی۔ [۳] "ارتقاء مادہ" صفحہ ۹۲ [۴] ایضاً [۵] ایضاً صفحہ [illegible] [۶] ایضاً صفحہ ۱۴۳

کسی نہ کسی "شے" میں واقع ہوں گے، اور اسی شے کا نام ایتھر ہے... جسکے وجود کے بغیر اکثر مظاہر طبیعی ناقابل توجیہ رہیں گے، چنانچہ ایتھر کے بغیر، کشش ثقل، نور، حرارت، کہربائیت، غرض جتنی چیزیں ہمارے معلومات میں داخل ہیں اُن میں سے کسی کا وجود نہ ہوتا۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ایتھر کوئی سلبی شے نہیں بلکہ فضا میں جگہ گھیرے ہوئے ہے، محلِ حرکت و سکون ہے، اور مختلف قوائے طبیعیہ کی حامل ہے، اور یہ بداہتہً خواص مادی ہیں۔ ایک جگہ اس سے بھی علانیہ تر، مادہ و ایتھر کا متحد النوع ہونا اِن الفاظ میں تسلیم کر لیا ہے:-

مادہ اور ایتھر ایک ہی نوعیت کی ہستیوں کے مظاہر ہیں۔

اس قسم کی متعدد عبارتیں، "ارتقاء مادہ" و نیز "ارتقاء قوت" میں موجود ہیں، جنھیں ہم یہاں طوالت کے خوف سے نقل نہیں کرتے۔ اُن سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے، کہ موجودات عالم کا وہ حصہ، جسکا ادراک ہمیں حواس ظاہری کے ذریعہ سے ہوتا ہے، لی بان نے اسکے تین درجات قرار دیئے۔ پہلا درجہ، جس میں وہ کثیف ہوتا ہے، اُس میں وہ محض "مادہ" کا لقب دیتا ہے۔ دوسرا درجہ، جس میں وہ نسبتاً لطیف ہوتا ہے، قوت کہتے ہیں، اور تیسرا درجہ، جو اس سے بھی لطیف تر ہے، وہ ایتھر ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں، کہ تینوں چیزیں ایک ہی نوعیت کی ہیں، فرق جو کچھ ہے، صرف مدارج کا ہے، اور اس صورت میں ایتھر کا وجود تسلیم کر لینے سے عالم کے حدوث و قدم پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موجودات عالم کے محسوس حصہ کی مجموعی مقدار جو تھی، وہ اب بھی برقرار ہے، اور یہی استمرار مادہ کا مفہوم ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ لی بان کی تھیوری صحیح ثابت ہوجائے، یا کوئی دوسرا محقق یہ بھی ثابت کردے، کہ یہ ایتھر ایک اور لطیف تر ہستی کی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے، تاہم اس تحقیقات سے تکوین عالم پر فلسفیانہ حیثیت سے کوئی اثر نہ پڑیگا۔ البتہ ایک سائنس داں کو صرف اتنا کرنا پڑے گا، کہ وہ مادہ کے مفہوم کو زیادہ وسعت دیدے، اور اس وقت تک مادہ کی جتنی حالتیں یا مدارج سمجھتا تھا، اُن پر ایک یا چند کا اضافہ کردے۔[۱]

عبد الماجد

[۱] بدقسمتی سے ایک عام خیال یہ پھیلتا جاتا ہے، کہ جدید اختبارات نے مادہ کی مقدار میں کمی و بیشی کا ہونا ثابت کر دیا ہے، لیکن یہ خیال قطعاً غلط اور ماہرین فن کی شہادت کے برخلاف ہے، چنانچہ مسٹر جے ٹامسن متعدد محققین کے حوالہ سے لکھتے ہیں، کہ ابتک کسی طبعی یا کیمیائی تجربہ سے مادہ کے وزن میں خفت و اضافہ نہیں ہوسکا ہے۔ (دیکھو، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱، صفحہ ۹۴۸ مطبوعہ ۱۹۱۱ء) سر الیور لاج کو بھی، رد و قدح کے بعد، بادلِ ناخواستہ یہ ماننا پڑا ہے، کہ مادہ کی اصل بنا کی فنا کا ابتک کوئی تجربہ نہیں ہوسکا ہے (دیکھو لائف اینڈ میٹر صفحہ ۲۱-۲۳ مطبوعہ ۱۹۱۲ء)

مبادی الاخلاق

(سلسلے کے لئے ملاحظہ ہو "علم الاخلاق" مطبوعہ ادیب بابتہ مئی ۱۹۱۲ء)

ہر علم میں چند اصول ایسے ہوتے ہیں جنکو اُس علم میں بلا ثبوت مان لیتے ہیں۔ یہ اصول اُس علم کے اصولِ موضوعہ کہلاتے ہیں، اور ان پر اس کے تمام قضایا مبنی ہوتے ہیں۔ اب یہ اصول موضوعہ یاتو قضایائے مبحوث عنہ کسی دوسرے علم کے ہوتے ہیں اور یا ایسے بدیہی قضایا یا اولیات ہوتے ہیں جو کسی بحث کے متحمل نہیں ہوسکتے، چنانچہ اقلیدس کے اصولِ موضوعہ ایسے ہی اصول ہیں جنکو عقل سلیم فوراً مان لیتی ہے۔

علم الاخلاق کے اصول موضوعہ حقیقت میں تمام تر علم النفس (Psyehology) پر مبنی ہیں۔ آخر الذکر کے نتائج متحققہ، اوّل الذکر میں بلا ثبوت مان لئے جاتے ہیں، ان اصول کا فلسفہ دریافت کرنا ہو تو علم النفس کا مطالعہ کرو۔ اس موقعہ پر ہم علم النفس سے روشناس کرا دینا کافی سمجھتے ہیں، اگر اُردو میں علم النفس پر کوئی رسالہ ہوتا تو اسکی بھی ضرورت نہ تھی، مگر چونکہ اُردو پبلک علم النفس سے نابلد محض ہے اور اس سلسلۂ مضامین میں علم مذکور کا حوالہ جابجا آئیگا، لہذا خاص خاص مصطلحات کا اجمالی ذکر ناگزیر ہے۔

یوں تو متقدمین کی تصنیفات میں علم النفس کے ابتدائی جراثیم اُسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح دیگر علوم کے طبعیات، علم الکیمیا، علم الحیات اور علم النفس، ان سب پر سب سے پہلے ارسطو ہی نے قلم اُٹھایا، مگر یہ کہنا کہ اُس نے ان علموں کو علم بنا دیا، واقعہ بیانی سے زیادہ، اظہار خوش ظنی ہے۔ قدامت پرستی ہماری طبیعت ثانیہ ہے، ہمکو سراب پر ہمیشہ چشمۂ شیریں کا یقین ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس علم کی تدوین سترھویں صدی میں ہوئی۔ جان لاک[۱] اسکا مدون اوّل ہے نہ کہ ارسطو۔ مگر اس علم کو اوج کمال پر اُنیسویں اور بیسویں صدی کے فلاسفروں نے پہنچایا۔ ولیم جمیس[۲]، ہربرٹ اسپنسر، ولہلم میکس ونٹ[۳]، جمیس وارڈ[۴]، ایڈوا ڈبریڈ فورڈ ٹشنر[۵] ان سب کے احسانات علم النفس پر بہ کثرت ہیں۔ اور صحیح معنی میں یہی لوگ اس فن کے مبصر کہے جا سکتے ہیں

[۱] جان لاک انگلستان کا مشہور فلاسفر ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا ۱۷۰۴ء میں فوت ہوا رسالہ فہم انسانی اسکی ایک نہایت معرکتہ الآرا کتاب ہے [۲] ولیم جمیس امریکہ کا مشہور و معروف علم النفس کا عالم ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوا ۱۹۱۰ء میں مر گیا علم النفس پر اس نے دو جلدوں میں نہایت مبسوط کتاب لکھی ہے جمیس نے الہیات کا ایک جدید اسکول قایم کیا ہے جو Pragmatism کے نام سے موسوم ہے [۳] ولہلم میکس ونٹ جرمن کا علم النفس اور علم فیسیولوجیا کا ماہر یہ فلاسفر حیات ہے [۴] جمیس وارڈ، عصر جدید کا عالم علم النفس ابھی زندہ ہے [۵] ٹشنر علم النفس کا مبصر یہ فلاسفر بھی ابھی حیات ہے

علم النفس کا موضوع بحث مظاہر ذہنیہ کی تحقیق اور ترتیب ہے، ذہن اور نفس مرادف الفاظ ہیں عصر جدید نے انا اور الیغو کے لفظ ان پر اور اضافہ کئے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ یہ سب لفظ ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں علم النفس کے مہمات موضوع حسب ذیل ہیں۔

(۱) احساس (Sensation)
(۲) ادراک (Perception)
(۳) تخیل (Imagination)
(۴) توجہ (Attention)
(۵) تعقل (Reasoning)
(۶) حافظہ (Memory)
(۷) الہام فطری (Instinct)
(۸) جذبات (Emotions)
(۹) ارادہ (Volitions)
(۱۰) عادت (Habit)

ذیل میں ان پر فرداً فرداً ہم ایک اجمالی ریویو کرتے ہیں۔

(۱) احساس | نظام عصبی (Nervous System) اُسے نفس اور عالم خارجی کے درمیان واسطہ ہے۔ نظام عصبی عبارت ہے ہمارے دماغ اور اُن اعصاب سے جو دماغ سے نکلکر تمام بدن میں مبثوث و متفرع ہیں دماغ کے دو حصے ہیں: مقدم دماغ اور موخر دماغ۔ اوّل الذکر نسبتاً بڑا ہے۔ اصطلاح فیسیولوجیا[۱] میں مقدم دماغ کو مخ (Cerebrum) اور موخر دماغ کو مخیخ (Cerebulum) کہتے ہیں۔ مخیخ سے متصل نخاع مستطیل (Medulla Oblongata) ہے، انکا اتصال جسر فرولیوس (Pon Varolii) کے ذریعہ سے ہوتا ہے نخاع مستطیل ہی مرکز احساس ہے اب اعصاب کی دو قسمیں ہیں احساسہ (Sensory)

[۱] معرب از فزیالوجی۔

اور محرکہ (Motor) اعصاب حاسہ، احساسات کو نخاع مستطیل تک لے جاتے ہیں اور اعصاب محرکہ، مرکز ادراک سے تحریکات عضلات (Muscles) تک پہنچاتے ہیں۔

عالم خارجی کے جملہ اثرات ہمارے نفس تک پانچ راستوں سے پہنچتے ہیں۔ انکا نام حواس خمسہ ظاہری ہے۔ ہر حاسہ ظاہری میں اُس کے مخصوص اعصاب پھیلے ہوئے ہیں۔ اور خاص خاص اشیاء کے احساس کا کام انجام دیتے ہیں۔ آنکھ کے آخری پردے میں جسکو شبکہ (Retina) کہتے ہیں، اعصاب بصری متفرع ہیں۔ انکے ذریعہ سے مبصرات کا احساس ہوتا ہے، کان کے پردہ کے پیچھے اعصاب سمعی ہیں، ان کے ذریعہ سے مسموعات کا احساس ہوتا ہے، ناک کے اندر مشام میں اعصاب شمی موجود ہیں، ان کے ذریعہ سے مشمومات کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح کام وزباں میں اعصاب ذوقی کے سرے ختم ہوتے ہیں چنانچہ ان کے ذریعہ سے مذوقات کا احساس ہوتا ہے اور ہمارے بدن کی تمام جلد میں اعصاب لمسی مبثوث ہیں ان کے ذریعہ سے ملموسات کا احساس ہوتا ہے، حاسہ لمس انگلیوں کے سروں میں سب سے زیادہ قوی ہے۔

(۲) ادراک | محسوسات کا اثر نظام عصبی پر یہ ہوتا ہے کہ ایک طرح کا تموج اعصاب میں پیدا ہوتا ہے: روشنی کے اثر سے ہمارے اعصاب بصری متموج ہوتے ہیں آواز ہوا کی مدد سے اعصاب سمعی میں ایک قسم کا تموج پیدا کرتی ہے۔ یہ تموج نخاع مستطیل سے جا کر ٹکراتا ہے وہاں پہنچکر اس مبہم احساس کی ایک متعین صورت ہو جاتی ہے۔ اسی کو ادراک کہتے ہیں اس کی تشریح مثال ذیل سے ہوگی۔

ہم ایک کمرہ میں داخل ہوتے ہیں، اندر قدم رکھتے ہی ہمارے مشام میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ خالص احساس ہے۔ دفعتاً ہمارے ذہن میں گلاب کی خوشبو کا نام آجاتا ہے ہم دل میں کہتے ہیں کہ یہ گلاب کی خوشبو ہے۔ اب احساس کی نوعیت متعین ہوگئی۔ یہ ادراک ہے۔

جس قدر ہمارے تجربات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی نسبت سے سرعت ادراک ترقی کرتی جاتی ہے۔ ابتداءً گلاب کی بو کے ادراک کے لئے ایک وقت کی ضرورت تھی، مگر اب متواتر ادراک کی وجہ سے ایسا ملکہ پیدا ہوگیا ہے کہ آناً فاناً میں ادراک ہوتا ہے۔

(۳) تخیل | تخیل ذہن کی اس قوت کا نام ہے جو غیر موجود شے کی تصویر ذہن کے سامنے کھینچ دیتی ہے۔ اس قوت کی مدد سے ہم غیر مرئی اشیاء کا ادراک کرسکتے ہیں مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری قوت مدرکہ اُسکے مشابہ مادی اشیاء کا ادراک کرچکی ہو۔ فی الحقیقت ہم اُس شے کا ہرگز تصور نہیں کرسکتے جسکا ادراک یا جسکے مماثل کا ادراک زمانۂ ماضی میں نہوا ہو۔ یہ وہ مسائل ہیں جنکو اگر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو ایک مستقل کتاب طیار ہو جائے۔

(۴) توجہ | توجہ ذہن کی وہ قوت ہے جو ایک ادراک کو ہمارے ذہن کے سامنے دیر تک قایم رکھ سکتی ہے۔ یہ سوائے اس خاص ادراک کے دیگر ادراکات کا راستہ بند کر دیتی ہے۔ مثلاً گو کہ اسوقت میرے سامنے ایک سفید کاغذ میرے ہاتھ میں ایک سرخ قلم ہے، مگر میں سطور بالا لکھنے میں اسقدر منہمک تھا کہ اسوقت تک ان چیزوں کا ادراک معطل رہا جس وقت تک میری توجہ اُن کی طرف منتقل نہوئی۔

(۵) تعقل | تعقل وہ قوت ہے جو مقدمات کو ترتیب دیتی ہے اور اُن سے نتایج اخذ کرتی ہے۔ یہی قوت انسان اور دیگر حیوانات کے درمیان حدِ فاصل ہے۔

(۶) حافظہ | حافظہ اُس قوت نفس کا نام ہے جو اُن چیزوں کے نام، صورت، تعداد وغیرہ پیش نظر کر دیتی ہے جنکا ادراک زمانۂ ماضی میں ہوچکا ہے

(۷) الہام فطری | وہ تمام حاسے جو فطرتاً ہم میں ودیعت ہیں الہامات فطریہ کہلاتے ہیں، اپنی حفاظت کل حیوانات اسی حاسہ کی بنا پر کرتے ہیں

الہام فطری اور تعقل میں فرق یہ ہے کہ الہام فطری کا فعل ترتیب مقدمات اور ارادہ سے بالکل خالی ہے مگر نتایج کے لحاظ سے دونوں کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔

(۸) جذبات | جذبات کے اقسام کا استقصا تقریباً محال ہے۔ غم و غصہ مسرت و انبساط، محبت و شرم سے تم بخوبی واقف ہو۔ مگر مفرد جذبات ایک دوسرے سے ممتزج ہو کر گوناگوں جذبات پیدا کرتے ہیں جذبۂ شرم و محبت، جذبۂ عشق و فراق، یہ دو مستقل جذبات ہیں لیکن ہر ایک دو مفرد جذبوں سے مرکب ہے۔

پروفیسر جیمس نے الہام فطری اور جذبہ میں ایک نہایت دقیق فرق بتایا ہے وہ یہ ہے کہ

جذبہ کا رجحان ہمیشہ اُس شے کے محسوس کرنے کی طرف ہوتا ہے جسنے اُسے تحریک دی ہے، بخلاف اسکے الہام فطری کا رجحان اس شے پر عمل کرنے کی طرف ہوتا ہے جو باعث تحریک ہو۔

جذبات کے متعلق پروفیسر جیمس کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے پروفیسر موصوف کا قیاس ہے کہ ذہن پر حالات جذباتی طاری ہونے سے قبل ایک مادی تغیر جسم انسانی میں واقع ہوتا ہے مثلاً زید پہلے طمانچہ ماریگا بعد کو غصہ ہوگا۔ نہ یہ کہ پہلے اسے غصہ آئے اور طمانچہ مارے بعد کو جیمس کا یہ نظریہ موجودہ علمی دنیا میں مقبولِ عام ہے۔ افسوس ہے اسکا فلسفہ ہم یہاں نہیں بتا سکتے۔

(۹) ارادہ | فعل کی دو قسمیں ہیں، ارادی اور غیر ارادی، ہاتھ ہلانا حرکت ارادی ہے، حرکت قلب غیر ارادی، جدید علمائے[1] علم النفس کا خیال ہے کہ وہ افعال جو اب غیر ارادی ہیں، ابتداءً ارادی تھے۔

اس قدر مسلم ہے کہ کسی حرکت کے متواتر واقع ہونے سے ایک طرح کا ملکہ ہو جاتا ہے، شروع میں ایک فعل سرزد ہونے کے قبل اس فعل کا تصور ہمارے نفس کے روبرو قایم رہتا ہے مگر کثرتِ مشق سے تقریباً غیر ارادی طور سے سرزد ہونے لگتا ہے، مثال کے لئے کتابت کو لو، ابتداءً میں ایک ایک حرف کو ارادتاً لکھنا ہوتا ہے، مگر کثرتِ مشق کے بعد کتابیں لکھتے چلے جاتے ہیں لیکن توجہ حروف اور الفاظ کی طرف منعطف نہیں ہوتی۔

فلسفۂ ارادہ کے ضمن میں اکثر اساتذۂ علم النفس نے مسئلہ جبر و قدر پر نہایت تفصیلی بحثیں کی ہیں، لیکن حقیقت میں یہ مسئلہ مابعد الطبعیات کا جزو مبحث ہے اسکو موضوع علم النفس سے براہِ راست کوئی علاقہ نہیں ناظرین کے فائدے کے لئے مجملاً اسکا ذکر کیا جاتا ہے۔

مابعد الطبعیات کا یہ ایک مسلمہ ہے کہ ہر تبدیلی چند اسباب کی محتاج ہے، عالمِ وجود میں کوئی تغیر بغیر ان علل کے مجتمع ہوئے، وجود پذیر نہیں ہو سکتا جو اس تغیر سے "علاقہ سببیت" رکھتے ہیں۔ اس مسئلہ کی روشنی میں حدلپسند قدریین کے مذہب کی قلعی کھل جاتی ہے! یہ ظاہر ہے کہ فعلِ انسانی ایک تغیر یا ایک تبدیلی ہے، پھر یہ عقیدہ، کہ اسباب مخصوصہ مجتمع ہو جانے کے بعد بھی انسان مختار کل ہے، کس قدر لغو عقیدہ ہے؟

ان سے زیادہ حیرت افزا اُن لوگوں کا مذہب ہے جنکا حافظ کے اس شعر پر نہایت عقیدتمندانہ عمل ہے۔

بروا ے ناصح و بر دردکشاں خردہ مگیر
کارِ فرمائے قدر می کند ایں من چہ کنم

سخت تعجب ہے کہ بعض مسلمان اس فاش غلطی میں مبتلا ہیں حالانکہ قرآن مجید علانیہ اسکے خلاف شہادت دیتا ہے۔ ان آیات کو پڑھو اور غور کرو۔

---

[1] ونٹ، وارڈ، کوپ، اور رنشنر کا خیال ہے کہ تمام موجودہ افعال غیر ارادی ابتدا میں ارادی تھے چنانچہ حرکتِ قلب شروع میں ارادی تھی، مگر ارتقاء (Evolution) کے اثر سے غیر ارادی ہوگئی۔

وقل الحق من ربکم فمن شآء فلیؤمن ومن شآء فلیکفر
وما ظلمنٰہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون
لا اکراہ فی الدین قد تبیّن الرّشد من الغیّ فمن یکفر
بالطّاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ
لا انفصام لہا۔ واللہ سمیع علیم

کیا ان آیات کو پڑھکر، انسان کے مسبب فعال ہونے میں ذرہ برابر بھی شک باقی رہتا ہے ؟

الٰہیین (Metaphysicians) کا طریقہ، جاہل جبریین و قدریین کے بین بین ہے۔ اُن کے نزدیک انسان ذی شعور ہے، بلاشبہ وہ اس پر قادر ہے کہ چند ایسے اسباب کا انتخاب کرے، جو نوع مخالف کے عمل کے مزاحم ہوں، وہ اس پر قادر ہے کہ اپنے موجودہ حافیات کو مختلف النوع حافیات سے بدل دے، وہ مختار ہے، چاہے مسجد کا راستہ اختیار کرے چاہے بتخانہ کا، اسی امکانی قوت، اسی قوت خود اختیاری کی جانب کلام پاک میں جابجا اشارہ کیا گیا ہے۔ جب ہمکو مے نوشی کی عادت پڑگئی تو بلاشبہ جب جب بادہ پرستوں کی صحبت، میسّر آئے گی، جب جب ساقی و صراحی کا سامنا ہوگا، ہم اپنا عہد شکست کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس عادت سے قبل بھی ہم اسی طرح مجبور تھے ؟ کیا شروع شروع میں بادہ کشی اور ترک بادہ کشی، دونوں پر برابر ہم قادر نہ تھے ؟

علم الاخلاق کے پہلے نمبر میں تم پڑھ چکے ہو کہ اسباب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم صحیح صحیح قیاس کر سکتے ہیں کہ ان کے نتائج کیا ہوں گے : چنانچہ ہمکو اگر کسی شخص کی خصلت سے جو اسباب افعال کا مجموعہ ہے پوری پوری واقفیت ہو جائے تو ہم صحیح صحیح قیاس کر سکتے ہیں کہ اس سے کس قسم کے افعال سرزد ہوں گے۔ جان اسٹوآرٹ مل لکھتا ہے[۵]۔

اگر ہم زید کی سیرت سے کماحقہ واقف ہو جائیں، اگر ہمکو اس کے عادات و اطوار پر پوری پوری اطلاع حاصل ہو جائے گو کہ یہ فی الجملہ مشکل ہے، تو ہم صحیح صحیح پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ متعین مواقع پر اس سے کون کون فعل صادر ہوں گے۔

جبر و قدر کی بحث میں پڑکر اپنے حدود سے بہت آگے نکل جانا پڑا

گفتہ گفتہ مے شدم بسیار گو

مگر مضمون ہی کچھ ایسا دلچسپ تھا کہ مجبوری تھی۔

(۱۰) عادت | نیا قفل کھولتے بند کرتے وقت، اندرونی پرزوں میں ایک طرح کی گرفتگی محسوس ہوتی ہے، کچھ عرصہ کے استعمال کے بعد یہ رکاوٹ جاتی رہتی ہے، نیا جوتا ابتداءً تکلیف دیتا ہے، بعد ازاں ٹھیک ہو جاتا ہے، شکن دار کاغذ کو شکن پر تہ کرو بآسانی تہ ہو جائیگا، خمیدہ شاخ کو سیدھا کرو، پھر ایک سرا چھوڑ دو، بدستور خم ہو جائے گی، چڑیوں نے بالائے سقف، مشرقی گوشہ میں گھونسلہ لگایا ہے، تم اسے اٹھا کر مغربی گوشہ میں رکھدو، چڑیاں جب کمرے میں داخل ہوتی ہیں بیساختہ شرقی گوشہ کی طرف اُڑ کر جاتی ہیں، وہاں ایک لمحہ دم لے لیتی ہیں بعد ازاں مغربی گوشہ کی طرف جاتی ہیں، چند روز کے بعد تم یہ تماشہ دیکھتے ہو کہ چڑیاں جب کمرے میں آتی ہیں اُنکا رُخ مشرقی گوشہ کی طرف ہوتا ہے مگر درمیان ہی سے گویا کچھ سوچکر پرواز مغربی گوشہ کی طرف پھیر دیتی ہیں، یہاں تک کہ اب بلا تکلف مغربی گوشہ کی طرف چلی جاتی ہیں۔ تم کو اس امر کا بھی تجربہ ہوا ہوگا کہ بعض اشخاص خاص خاص موسموں میں بیمار ہو جاتے ہیں، اگر تم کھانا کھانے کے بعد پان کھایا کرتے ہو تو جبتک پان نہ ملے طبیعت کیسی بدمزہ رہتی ہے : متبا کو کھانے پینے والوں کا ماہ صیام میں کیا حال ہوتا ہے، شرابیوں کو جب شراب نہیں ملتی کیا گت ہو جاتی ہے اور جب شراب پینے کا موقع ملتا ہے کیسے

---

[۵] جان اسٹوآرٹ مل، انگلستان کا رئیس الفلاسفہ ۱۸۰۶ء میں تولد ہوا ۱۸۷۳ء میں وفات پائی، منطق استقرار کو اس فلاسفر سے وہی نسبت ہے جو منطق قیاسی کو ارسطو سے،

مضطربانہ بوتلوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔[۱]

متذکرہ بالا امثال میں یہ قدر مشترک ہے کہ

کسی مادہ پر جب ایک عمل متواتر لاحق ہوتا ہے تو وہ اس سے

ایسا متاثر ہو جاتا ہے کہ اسی عمل کے مطابق افعال صادر ہونے لگتے ہیں

مگر مادہ کی دو قسمیں ہیں، ذیروح[۱] اور غیر ذیروح[۲]، امثال مذکورہ

میں، دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں ہم نے ذیروح مادہ کو دو قسموں

میں مزید تقسیم کیا ہے، یعنی

(۱) ایک وہ ذی روح مادہ جس سے حیوان مطلق مرکب ہے۔

(۲) دوسرے وہ ذی روح مادہ جس سے انسان بنا ہے۔

اور ان کی الگ الگ مثالیں دی ہیں چنانچہ ذی روح مادّہ

کی مثالوں میں جو امر مشترک ہے وہ یہ ہے،

نظام عصبی میں، خارجی اثرات سے متاثر ہونے کی ایک خاص

قابلیت ہے اور جوں جوں ان اثرات کا عمل متواتر ہوتا ہے اُسی

نسبت سے اعصاب پر خط اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔

اس تمام عبارت کے مفہوم کو ادا کرنے کے واسطے زبان نے

ایک لفظ وضع کر لیا ہے اور وہ عادت ہے۔

جب کسی فعل کی عادت ہو جاتی ہے تو اُسکا صدور بالکل

غیر ارادی طور سے ہوتا ہے، اوّل اوّل ہم اس فعل کا تصور کرتے ہیں،

اہتمام کرتے ہیں، اس کے کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، مگر جب عادت

ہو جاتی ہے نہ تصور کی ضرورت رہتی ہے اور نہ کسی اہتمام کی، فعل گویا از خود

صادر ہوتا ہے۔

پروفیسر ہنری ہکسلے[۲] نے ایک نہایت دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے:

اس لطیفہ میں قانون عادت نہایت واضح اور جلی نظر آتا ہے:

ایک سپاہی عرصہ دراز تک فوج میں ملازم رہا۔ جب فوج سے

علیٰحدہ ہوا، کسی امیر کی خدمتگاری کر لی۔ ایک روز کھانے کا طباق

سر پر رکھے سڑک پر جا رہا تھا، کسی ظریف کو تمسخر سوجھا، انھیں دیکھ کر

زور سے چلایا "اٹینشن" یہ سُننا تھا کہ انھوں نے طباق چھوڑ دونوں ہاتھ

لٹکا دیئے۔ طباق نالی میں گر پڑا۔

نکتہ یہ ہے کہ فوج میں حسب دستور اس سپاہی کو ڈرل کرنا پڑتی

تھی، ڈرل کے ہدایات پر عمل کرنے کی عادت اس قدر راسخ ہو گئی کہ

جوں ہی "اٹینشن" کا لفظ سُنا، ہاتھ لٹکا دیئے۔

ہم عادت کے اسباب بیان کر چکے، اب عادت کے نتائج بتاتے ہیں۔

(۱) عادت کا پہلا نتیجہ یا اثر یہ ہے کہ جب ایک حرکت کی عادت

ہو جاتی ہے تو اُس میں سہولت اور بے ساختگی پیدا ہو جاتی ہے، اور اسکے

کرنے سے ہم کم تھکتے ہیں۔

(۲) دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ قوت توجہ کا تصرف برائے نام رہجاتا ہے

فلسفہ عادت کے مطالعہ سے جو چند عملی اصول منتزع ہوتے

ہیں، ہم اُن کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) جدید عادت کے اکتساب اور قدیم عادت کے ترک کے

وقت، تمہارا عزم نہایت مستقل اور مضبوط ہونا چاہیے۔

(۲) جبتک نئی عادت خوب اچھی طرح جڑ نہ پکڑ لے، اُسوقت تک

چاہیئے کہ تمہارے طرز زندگی میں مستثنیات داخل نہوں۔

(۳) کسی جدید عادت کی بنا ڈالنے کے لئے تمکو جلد سے جلد عازم

ہو جانا چاہیئے، جب جذبات کا رنگ موافق مطلب دیکھو تو اس قوی

تحریک سے فائدہ اُٹھانے میں تعجیل کرو۔

(۴) تم کو چاہیئے کہ بالمرہ کوئی نہ کوئی بات ایسی کر لیا کرو جو تمہاری

خواہش کے خلاف ہو مثلاً اگر اسوقت انگور کھانے کو دل چاہتا ہو اور انگور

بآسانی مل بھی سکتے ہیں تو تمکو چاہیئے کہ اپنی طبیعت کو روکو۔ اس سے قوت

---

[۱] ان مثالوں میں سے اکثر جیمس سے ماخوذ ہیں [۲] انگلستان کا مشہور و معروف لاادری، علم الحیات کا عالم، تولد ۱۸۲۵ء وفات ۱۸۹۵ء۔

سالار جنگ اعظم

سالار جنگ اعظم کو اُن کی دماغی قابلیت اور اعلیٰ شان تدبّر کے لحاظ سے بسمارک ہند کا ممتاز و ممیز لقب دیا جاتا ہے لیکن ہم اسوقت کی عام ملکی حالت کا اندازہ کرتے اور سوسایٹی کی پست زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسی آب و ہوا میں ایسا قابل جوہر کس طرح پیدا ہوا اور اسی لحاظ سے ہم سالار جنگ کو گرد و پیش کے اسباب کے اعتبار سے بسمارک پر فوقیت پانے کا مستحق سمجھتے ہیں لیکن یہ امر مسلّمہ ہے کہ خواہ انھیں بسمارک ہند کہو، یا سالار جنگ دونوں نام یکساں عظمت و توقیر کے مرجع ہیں، جس طرح سورج اور آفتاب کہ دونوں میں رتی برابر فرق نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سر سالار جنگ مختلف خصوصیات کے جامع تھے اور آج بھی جبکہ نسبتاً تعلیم کا دائرہ ہندوستان میں بہت وسیع ہو گیا ہے اور قدرتی طور پر اُسکے نتائج قابل آدمیوں کی شکل میں ظاہر ہونے چاہئیے تھے، تعجب ہے کہ ہندوستان کا کوئی خطہ اسوقت تک سالار جنگ کا ثانی نہیں پیدا کر سکا۔ اور یورپین پالٹکس کی رمز شناسی میں اُنھیں جس حد تک مہارت تھی اُس کی مثال اسوقت بڑے بڑے ممبران کونسل میں بھی نہیں ملتی۔ اُن کا دماغ صحیح، اُن کی رائے صحیح اور اُن کی تدبیر صحیح تھی اور اس لئے اُن کا کوئی نشانہ خطا نہ ہوتا تھا۔ وہ صرف حکومت دکن کے معمولی وزیر اعظم ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک جلیل القدر مدبّر تھے کہ اگر انگلینڈ میں پیدا ہوتے تو قابل ترین پالیٹیشن سمجھے جاتے اور جو جگہ ولیم پٹ، والپول، گلیڈسٹون اور سالسبری وغیرہ نے باری باری سے پُر کی وہ ان کیلئے خالی کیجاتی

کام کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ پرنس بسمارک کے بالکل مدّ مقابل ہیں اور ایک طرح تفوق بھی رکھتے ہیں کہ پرنس موصوف نے جو کچھ کیا ایک مہذب اور تعلیم یافتہ ملک میں کیا، جہاں کے رہنے والوں کو کم از کم اتنی سمجھ ضرور تھی کہ وہ بھلے بُرے کی تمیز کر سکتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے تمام ملک کے لئے مجموعی طور پر مفید ہے، لیکن اسکے برخلاف سالار جنگ کو زمین شور میں تخم ریزی کرنا پڑی تھی۔ ملک میں جہالت، نفسانیت، اور خودغرضی کا طوفان برپا تھا اصلاح کے نام سے لوگوں کی طبیعتیں متنفر تھیں، ذاتی نفع کا خیال انھیں ایسا جما تھا کہ ملکی فلاح و بہبود کی تدابیر بھی انھیں ٹس سے مس نہ ہونے دیتی تھیں۔ لیکن مخالفت کے ان تمام اسباب کے باوجود انھیں اپنی کوشش میں کامیابی ہوئی، ہمت مردانہ کی بدولت بنجر زمین میں بھی لالہ و یاسمن کے تختے لگ گئے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر انھیں اتنی جلدی شکار اجل نہ ہو جانا پڑتا تو وہ اور کیا کچھ کر نہ جاتے۔ حیدرآباد میں اب بھی جو کچھ ہو رہا ہے یا اُن کے انتقال کے بعد سے لیکر اب تک ہوتا چلا آیا ہے اُسکا کریڈٹ سر سالار جنگ کے حصے کا ہے۔ اُنھوں نے مضبوط بُنیاد قایم کر دی تھی، اب اُس پر دو منزلہ، سہ منزلہ عمارت بناتے چلے جاؤ۔ حق یہ ہے کہ سالار جنگ خدا کی طرف سے ریفارمر بنا کر بھیجے گئے تھے ورنہ حکومت آصفیہ کی کمزوری جو اُسوقت تھی اگر اُسکا علاج سالار جنگ کے ہاتھوں نہ ہو گیا ہوتا تو خاکم بدہن آج حالت دگرگوں ہوتی۔ اس جگہ بھی اُن میں اور پرنس بسمارک آف جرمنی میں ایک خاص قسم کی تطبیق پیدا ہوتی ہے، کیونکہ یہ امر بھی مسلّمہ ہے کہ پرنس کی ساعی سے جرمنی کی منتشر و پریشان ریاستیں ایک مستحکم و پایدار شیرازہ بندی کے ذریعہ متحد کی گئی ہیں، ورنہ فرداً فرداً نہ اُن کا اثر چنداں وقیع تھا نہ اُن کے آیندہ قیام و بقا کا کوئی بھروسہ تھا۔

سر سالار جنگ کا نام نامی میر تراب علی خاں تھا، اور سالار جنگ شجاع الدولہ مختار الملک خطابات تھے جو فرمانروائے دکن کی جانب سے

سر سالار جنگ اعظم میر تراب علیخاں بہادر، جی سی ایس آئی

مرحمت ہوئے تھے۔ لیکن کسی قدر عجیب بات ہے کہ حیدرآباد سے باہر اور کتابوں اور تحریرات میں وہ زیادہ تر "سالار جنگ" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور حیدرآباد کی پبلک انھیں مختار الملک کہتی ہے جو امتیازی حیثیت میں جنگ' اور دولہ سے زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں سالار جنگ کوئی نہیں کہتا (میرا مطلب تعلیم یافتہ گروہ سے نہیں بلکہ رعایا کے عام طبقے سے ہے)، بلکہ اُن کا اول درجہ کا خطاب مختار الملک ہر ایک کی زبان پر ہے۔ مختار الملک کی ڈیوڑھی، مختار الملک کی بارہ دری، مختار الملک کا اصطبل، مختار الملک کا خانہ باغ ہے۔ میر یوسف علی خاں جو ایک جلیل القدر اور مُدبّر دادا کے جوان بخت و جواں سال پوتے ہیں صرف سالار جنگ (ثالث) کے خطاب سے ممتاز ہیں اسلئے انھیں عام طور پر اسی لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور کبھی اسکا مترادف "مختار الملک کے پوتے" بھی استعمال کیا جاتا ہے غرضکہ دکن میں وہ "مختار الملک" اور حدود دکن سے باہر سالار جنگ مشہور ہیں لیکن اب سالار جنگ اُن کا خاندانی خطاب بن گیا ہے اور اسوقت یہ تیسری پُشت ہے جو اسی خطاب سے مخاطب ہے۔

سر سالار جنگ اعظم ۱۸۲۹ء مطابق ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اُن کا خاندان نسبی و حسبی فضایل کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہ چکا ہے۔ انکے بزرگ دربار بیجاپور میں نمایاں منزلت کے آدمی تھے۔ میر عالم کا نام ایسا نہیں جو تاریخ دکن پر عبور رکھنے والے اصحاب کے لئے اجنبی ہو۔ دکن کی وزارت کا قلمدان اُن کے سپرد تھا لیکن اسکے ماسوا اُن کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا، رفاہ عام کے کاموں سے بھی انھیں خاص دلچسپی تھی۔ خاص حیدرآباد میں اُن کا ایک بہت بڑا بازار ہے جسے میر عالم کی منڈی کہتے ہیں، دریائے موسیٰ کے کنارے ایک طویل بارہ دری ہے۔ جسے حال میں طوفان سے بہت نقصان پہنچ چکا ہے۔ شہر سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ تالاب ہے جسکا بیضاوی بند فن انجینیری میں دستگاہ رکھنے والوں کے لئے خاص دلچسپی کی چیز ہے۔ اُسی تالاب کا پانی شہر میں پینے کے لئے آتا ہے۔

میر عالم کے بعد مسند وزارت نے اُن کے داماد، امیر الامرا منیر الملک سے رونق پائی۔ یہ میر تراب علی سالار جنگ کے جد تھے۔ منیر الملک کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے سراج الملک اپنے خاندانی اعزاز کے مالک ہوئے۔ یہ سالار جنگ اعظم کے حقیقی چچا تھے۔ نواب سراج الملک کا انتقال ۲۷ مئی ۱۸۵۳ء کو ہوا تو نواب ناصر الدولہ فرمانروائے دکن نے سالار جنگ کو باوجود اُن کے حداثت سن کے قلمدان وزارت سپرد کیا۔ اسوقت ان کی عمر مشکل سے بیس برس کی ہوگی کہ ایک سلطنت کے انتظام کا ناقابل برداشت بوجھ یکایک ان کے کندھوں پر آ پڑا۔ نوعمری تھی اور تجربہ کم، کوئی اور ہوتا تو پریشان ہو جاتا لیکن ہمت بلند تھی طبیعت میں عزم و استقلال کا مادّہ تھا، نہایت اُولوالعزمی سے بوجھ کو اُٹھایا کہ چہرے سے گرانی کے آثار تک نہ ظاہر ہوئے۔

سر سالار جنگ جس وقت مسند آرائے وزارت ہوئے اُسوقت کی ملکی حالت نہایت غیر قابل اطمینان تھی۔ حکومت کمزور ہو رہی تھی خزانہ خالی تھا، انتظامی نقایص زوروں پر تھے، امن و امان کا نام ہی نام تھا، عربوں، روہیلوں، مہدیوں اور اسی قسم کے جنگجو لوگوں کی وجہ سے آئے دن فتنہ و فساد برپا ہوتے رہتے تھے اور پبلک کے لئے جان مال آبرو کی حفاظت دشوار تھی۔ عربوں کا زور بیحد تھا۔ ان کا قرضہ تمام امرا و حکام پر پھیلا ہوا تھا، بیش قرار رقم سود میں لیا کرتے تھے اور جو کوئی ان سے ایک دفعہ قرض لے لیتا پھر اُسے نجات ملنا دشوار ہو جاتی۔ پہلی تاریخ کو قرضخواہ عرب خزانے پر جمع ہوتے اور قرضداروں کی تنخواہیں وصول کر لیتے، اسی طرح رؤسا کی جاگیروں کے محاصل اُنھیں کے قبضے میں جاتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ اُن کا اثر ہر ایک طبقے پر

پھیلا ہوا تھا۔ اُن کی زیادتیوں سے سب نالاں تھے لیکن کسی کو اُنکے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ نواب سالار جنگ مرحوم نے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ منعطف کی اور گو اُنھیں معلوم تھا کہ اِس کام میں اُنھیں ایک سرکش جماعت کا مقابلہ کرنا ہے جس میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آئینگی لیکن اُنھوں نے اس میں جرأت و مردانگی سے ہاتھ ڈالا، مخالفت اور عناد کے پُرجوش طوفان کا مقابلہ کیا، اور آخر کار کامیاب ہوئے۔ اُنھوں نے خزانہ شاہی سے ان عربوں کا قرضہ ادا کردیا اور پھر قرضداروں سے باقساط وصولیابی بھی ہوتی رہی۔ بعض سہولتیں قانون کی مدد سے بہم پہنچائی گئی تھیں غرضکہ اُنھوں نے عربوں کا زور ایک قلم توڑ دیا جس سے ایک طرف رعایا کی فراغبالی بڑھی اور دوسری طرف امن عامہ میں بھی خاطرخواہ ترقی ہوئی۔

مالی اصلاحات کے ذریعہ سے بیت المال کی حالت درست کی، مداخل ومخارج سلطنت کو ایک پیمانہ پر لاکر رکھا، اخراجات کی زیادتی کا سدِ باب کیا، تنخواہوں میں تخفیف کرکے بچت کی ایک صورت پیدا کی۔ خود اپنا درماہہ جو پچیس ہزار ماہانہ تھا صرف بارہ ہزار رکھا اور اس طرح ریاست کی آمدنی وخرچ میں غیر معمولی تغیرات پیدا کردیئے جنکا نتیجہ آخر کار ریاست کے لئے بہت اچھا ثابت ہوا۔

ان اصلاحات کے عملدرآمد کے ساتھ حکومت کی جڑ مضبوط اور کمزوریاں ایک ایک کرکے دور ہوتی گئیں۔ حکومت کا رُعب رعایا پر بہت کم تھا، اس نقص کو مٹانے کے لئے اُنھوں نے پولیس کو بہت کچھ تقویت دی اور ضروری الوقت قوانین کے نفاذ سے سرکش اور فتنہ پرداز جماعتوں کا سر نیچا کیا۔ غرضکہ چند ہی سال کی محنت شاقہ سے اُنھوں نے حیدرآباد کی کایا پلٹ دی اور بیس[۲۰] پچیس[۲۵] سال کے بعد تو ریاست کچھ سے کچھ ہوگئی تھی۔ مداخل سلطنت ۴۷ لاکھ سے متجاوز ہوکر ۲½ کروڑ تک پہنچ گئے تھے، آبادی بقدر ایک ثلث کے اور بڑھ گئی تھی۔ رفاہِ عام کے کاموں کا مستقل سلسلہ شروع ہوگیا تھا، سڑکیں بنائی گئیں، ریل نکالی گئی، آبپاشی کا انتظام کیا گیا، اشاعت تعلیم کی غرض سے مدارس کھولے گئے اور ملک میں تشویق وتحریص کے وسایل پیدا کئے گئے، بے قاعدہ فوج میں جایز حد تک ترمیم کی گئی کہ کسی کو شکایت کا موقع ہی نہ ملا اور اصل مقصد بھی فوت نہوا۔ اسی طرح طبابت کے صیغہ میں بھی اُن کی توجہ سے کافی ترقی ہوئی اور مختصر یہ ہے کہ ریاست کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں اُن کی اصلاح کا ہاتھ نہ پہنچا ہو اور جس نے اُنکی توجہ سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔ ایک نکتہ رس کا یہ کہنا کس قدر صحیح ہے کہ جو کام سرسالارجنگ نے برسوں میں کرکے دکھا دیا وہ بڑے بڑے مدبروں سے عمروں میں بھی نہیں ہوسکتا۔ کچھ شک نہیں کہ سرسالارجنگ کے کارنامے آفتاب کی طرح روشن ہیں اور دکن کے دیوار و در سے اُن کی بے غرض خدمات کا اعتراف ہو رہا ہے لیکن جن لوگوں کو اس مدبرِ اعظم کو اُس کی اصلی شان میں دیکھنا ہو اُنھیں ہماری رائے میں "حیدرآباد انڈر سرسالار جنگ" کے دلنشین اور دلچسپ مرقع کی سیر کرنا چاہیئے جس میں مولوی چراغ علی مرحوم کے جادو نگار قلم نے اپنی معجز نما سحر کاریوں سے تصویر میں نرالی آن بان پیدا کردی ہے اور جسکے بغیر اسکے اصلی خط وخال ذہن میں آ بھی نہیں سکتے۔

سرسالارجنگ کی زندگی میں واقعۂ غدر نہایت عظیم الشان اور خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس پُرآشوب زمانے میں اُنھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ حیدرآباد کو فساد سے محفوظ رکھا ہو بلکہ ہندوستان میں بھی انگریزوں کی امداد سے دریغ نہیں کیا اور اسی ایک بات سے اُن کی مآل اندیشی اور قوت انتظامی کا ثبوت مل سکتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اسوقت یہ چوبیس[۲۴] سال کے تھے اور عنانِ وزارت ہاتھ میں لئے ابھی پورے چار برس بھی نہ ہوئے تھے۔ لیکن اسکے باوجود صبر و استقلال اور مصلحت شناسی کی مثال جو اُنھوں نے قایم کی وہ ہر پہلو سے نادر ہے

اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی تھے۔

غدر کا ہنگامہ ہندوستان کی تاریخ میں اکیلی چیز ہے۔ سارے ملک میں بغاوت کی آگ مشتعل تھی اور برٹش گورنمنٹ آخر کار جس حد تک پہنچ گئی تھی اسکا اندازہ ایک تار کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو گورنر بمبئی نے رزیڈنٹ حیدرآباد کو دیا تھا کہ "اگر نظام نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تو پھر ساری اُمیدیں منقطع ہیں"۔ اس مضمون سے صرف برٹش گورنمنٹ کی نازک حالت ہی نہیں ظاہر ہوتی بلکہ حکومت دکن کی پوزیشن پر بھی بالوضاحت روشنی پڑتی ہے۔ یہ بالکل ممکن تھا کہ ملک گیری کی ہوس خام نظام کو بھی انگریزوں کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ کر دیتی یا خود انکے ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھتی جسکا دبانا خود اُن کے اختیار سے باہر ہوتا لیکن یہ بھی خدا کی کوئی خاص مصلحت تھی کہ اس وقت زمام وزارت سر سالار جنگ ایسے پالیٹیشین کے ہاتھ میں تھی جو بزرگی بعقل است نہ بہ سال، کی ایک پُر معنی نظیر تھے۔ یہ انھیں کی معاملہ فہمی اور وقت شناسی کا اقتضا تھا کہ نہ حکومت دکن نے جادۂ دوستی سے قدم ہٹایا اور نہ رعایا کو شرارت یا فساد کی جُرأت ہوئی۔ سر سالار جنگ نے رزیڈنٹ حیدرآباد کو حضور نظام کی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور آخر وقت تک اپنے قول پر قایم رہے۔ چند شریر الطبع مفسدوں نے ایک مرتبہ ملکر رزیڈنسی کی عمارت پر حملہ کیا لیکن نواب سالار جنگ نے اُسکا بروقت قلع و قمع کر دیا اور اشرار کو معقول سزا دی کہ دوسروں کو پھر ہمت نہ ہوئی۔ اسی ایک معمولی واقعہ کے علاوہ اور کوئی بات وہاں قابل ذکر نہیں ہوئی اور یہ سب سالار جنگ کی عقل و تدبیر کا ایک مادی کار نتیجہ تھا ورنہ دکن میں جہاں نوع بہ نوع کی جنگ جو اور سرکش قومیں آباد ہیں امن و سکون کا ایک ایسے زمانہ میں قایم رہنا کہ تمام ہندوستان قتل و غارت کا گھر بنا ہوا تھا، قریب قریب محال تھا۔

اسی زمانے میں جبکہ ہندوستان میں فتنۂ غدر نمودار ہو چکا تھا حیدرآباد کے حکمراں ناصر الدولہ مرحوم نے انتقال کیا، مشرقی ممالک میں فرمانروائے وقت کی وفات گوناگوں تغیرات و حادثات کا پیش خیمہ سمجھی جاتی ہے اور کم از کم ایسی حالت میں تو ضرور تشویش انگیز ہو سکتی ہے کہ عام طبایع مخالفت اور فساد پر مایل ہو رہی ہوں۔ وزیر اعظم کا منصب سنبھالے ہوئے انھیں زیادہ سے زیادہ چار سال ہوئے ہوں گے لیکن کمال دور اندیشی کے ساتھ واقعات کی دیکھ بھال کی۔ امن عامہ میں کسی قسم کا نقص بھی نہ آنے دیا اور نواب افضل الدولہ مرحوم کی تخت نشینی کی رسم بھی خیر و خوبی کے ساتھ ہو گئی۔

۱۸۶۹ء میں جب ہز ہائینس نواب افضل الدولہ رگرائے عالم بقا ہوئے۔ اور میر محبوب علی خاں مرحوم جو ابھی بالکل کمسن تھے سند حکومت پر جلوہ فرما ہوئے تو سر سالار جنگ ریجنٹ مقرر ہوئے اور نواب امیر کبیر ان کے شریک بنائے گئے۔ اسوقت انھیں انتظام مملکت کے علاوہ کم عمر آقا کی تعلیم و تربیت کی نگرانی بھی کرنا تھی اور سچ یہ ہے کہ حضور نظام مرحوم کی نگہداشت اور تعلیم و تعلّم کا کوئی دقیقہ انھوں نے فروگذاشت نہیں کیا جس کا ناقابل انکار ثبوت حضور مرحوم کے روشن و مجلّے کارناموں سے بھی ملتا ہے۔

اسی زمانے میں حضور ایڈورڈ ہفتم آنجہانی، بہ حیثیت ولیعہد سلطنت فرمائے ہندوستان ہوئے اور سالار جنگ مرحوم شرف باریابی حاصل کرنیکے لئے بمبئی پہنچے حضور شاہزادہ صاحب کمال مکرمت و شفقت سے پیش آئے اور لندن آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ سر سالار جنگ کا تھوڑے دنوں کے بعد لندن جانا شاہزادے صاحب کے ارشاد پر زیادہ تر مبنی تھا۔

سفر یورپ میں آپ کو کئی ممالک کے دیکھنے کا موقع ملا اور جہاں جہاں گئے وہاں شاہانہ اعزاز و اکرام کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کیا گیا۔ خود لندن میں بعض لوگ انھیں مستقل بادشاہ جانتے تھے اور

ریاست کا خاندانی وارث تصور کرتے تھے۔ پیرس میں آپ کو ایک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوٹل کے زینے سے اترتے ہوئے پیر پھسل گیا اور ایسا صدمہ پہنچا کہ یہ ذرا سی لغزش دائمی لنگ کی صورت پکڑ گئی۔ اس واقعہ پر یورپ کے اعلیٰ طبقوں میں آپ کے ساتھ خاص ہمدردی و اُنسیت کا اظہار کیا گیا تھا۔

سفر ولایت سے واپسی کے بعد آپ نے محسوس کیا کہ لارڈ لٹن اور اُن کے ممبران کونسل اُن کی طرف سے کبیدہ خاطر ہیں اور جب اس کے اسباب کی در پردہ چھان بین کی تو ثابت ہوا کہ اس ناراضی و ناخوشی کی وجہ سر سالار جنگ کی وہ کوششیں تھیں جو اُنھوں نے بزمانۂ قیام لندن استردادِ صوبہ برار کے متعلق کی تھیں۔ صوبہ برار کا قضیہ لارڈ کرزن کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے طے ہو گیا اور خواہ اس استمراری معاہدے میں کسی قسم کے سقم ہی کیوں نہ پائے جائیں لیکن اب اس مسئلہ پر از سرِ نو کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ مگر سر سالار جنگ کے وقت میں نہ اس میں کوئی پیچیدگی تھی نہ پریشانی۔ مالی مطالبات کی بناء پر صوبہ برار برٹش گورنمنٹ کے تفویض کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ سالار جنگ کے وقت سے کسی قدر پیشتر کا تھا۔ خاص و عام، ملک کے ایک زرخیز حصے کے اس طرح نکل جانے پر متاسف تھے۔ چنانچہ جب وقت ان کو قلمدان وزارت سپرد ہوا تب ہی عوام اور خواص دونوں میں مسئلہ برار مبحث فیہ بنا ہوا تھا۔ جن شرایط پر وہ تفویض ہوا تھا وہ بھی معمولی تھیں۔ ان تمام حالات پر نظر ڈالنے کے بعد قدرتی طور پر سر سالار جنگ کو واپسی برار کے لئے ساعی ہونا چاہیے تھا اور اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ اُن کی ساری عمر اسی فکر میں بسر ہوئی۔ لندن میں بھی اُنھوں نے سعی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور اس میں شک نہیں کہ اُن کے قوی دلایل کے آگے مخالفین کا زور باقی نہ رہتا تھا اور یہ بالکل ممکن تھا کہ اگر وہ کچھ اور زندہ رہتے تو شاید اُن کی یہ حسرت بھی پوری ہو گئی ہوتی۔

لارڈ لٹن کو اُن کی اس جایز خواہش سے کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ وہ اُنھیں اس بات کا بھی مستحق نہ سمجھتے تھے کہ استرداد صوبہ برار کا وہ خیال بھی کریں، اب گویا دو متضاد و متناقض طبیعتیں ایک دوسرے کے مدِمقابل تھیں۔ جو چیز ایک کی ایک کے لئے ناگزیر تھی، دوسرے کو اُس سے ضد تھی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ باہمی شکر رنجی بڑھتی گئی اور حالت نہایت تشویشناک ہو گئی تھی۔ لیکن لارڈ لٹن کا ادھر تبادلہ ہوا، ادھر لارڈ رپن ایسے شریف و عالی ہمت ویسرائے نے ہندوستانیوں کی قسمت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اسی کے ساتھ وزارت دکن اور حکومت ہند کے تعلقات میں جو عارضی کشیدگی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔

سر سالار جنگ غیر معمولی عزم و استقلال کے آدمی تھے، ابتدائے عہد وزارت میں جن جن مخالفتوں کا اُنھیں سامنا کرنا پڑا وہ اُنھیں کا کام تھا۔ لارڈ لٹن کی ناراضی کو جس طرح اُنھوں نے برداشت کیا وہ اُنھیں کا حوصلہ تھا۔ بعض اوقات تو گمان ہوتا تھا کہ وہ ان تمام مصائب سے بچنے کے لئے وزارت عظمیٰ کے منصب سے مستعفی ہو جائیں گے لیکن اُنھوں نے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹایا اور آخر کار فکر و پریشانی کے بادل جو گھٹا ٹوپ چھائے ہوئے تھے خود بخود پھٹ گئے۔

عادات و صفات کے اعتبار سے وہ بے مثل تھے۔ مردم شناسی کا مادہ اُن میں خداداد تھا۔ محسن الملک، وقار الملک، سید حسین، سید علی، چراغ علی ان گرانمایہ جواہرات کی قدردانی سالار جنگ کے ہاتھوں ہوئی۔ ہندوستان کے قابل اشخاص چن چن کر حیدرآباد بلائے گئے، اعلیٰ عہدوں پر فایض ہوئے اور اپنی کارگزاریوں سے ریاست کو متمتع کیا۔

قومی اور مُلکی ہمدردی میں بھی وہ کسی سے کم نہ تھے۔ سرسید کے مشن کو اُن کی ذات سے جو تقویت پہنچی ہے اور علی گڑھ کالج نے اُنکی بدولت جو فائدہ اُٹھایا ہے اُس کا حسن و قبح حال باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہیں

تالیف قلوب میں بھی انھیں بدرجۂ کمال دستگاہ تھی۔ اُن سے رعایا سے
لیکر حکام و امراء تک کوئی ناراض نہ تھا۔ اُن کے ابتدائی اصلاحی کاموں
نے پہلے پہل تو بہت سے مخالف پیدا کر دیئے تھے لیکن پھر سب کے سب
سیدھی راہ پر آگئے۔ مذہبی اختلاف کو کبھی درمیان میں نہ لاتے تھے
مذہبًا وہ شیعہ اور راسخ الاعتقاد شیعہ تھے لیکن انتظامی امور میں اعتقاد
کو دخل نہ تھا علیٰ ہٰذالقیاس پرائیویٹ زندگی میں بھی۔ ذاتی طور پر
وہ جو کچھ تھے، تھے۔ بہت سے اُن کے خاص ملازم بھی ناواقف
تھے کہ عقیدہ کے رُو سے یہ کیا ہیں۔ "سیدی عنبر" جن کے نام سے ایک
بہت بڑا بازار حیدرآباد میں مشہور ہے سر سالار جنگ کے خانساماں
اور پکے سُنّی تھے۔ جب اُن کے روزے کا وقت آجاتے تو خود نواب
مرحوم اُن سے کہتے کہ ہاں افطار کرو اور دکھانے کے لئے خود بھی طرح
اُٹھا کر مُنہ سے لگا لیتے۔ حالانکہ خود درحقیقت افطار ذرا دیر بعد کرتے
تھے۔ اسی قسم کی اور بہت سی روایتیں اُن کے متعلق مشہور ہیں جن سے
اُن کی بے تعصبی بلکہ دلی اور دوسری بہترین صفات آشکارا ہوتی ہیں

لباس اُن کی سادگی اور صفائی کا مجموعہ ہوا کرتا تھا۔ باوجودیکہ
انگریزی جانتے تھے، انگریزی سوسائٹی میں آنا جانا رہتا تھا لیکن
بزرگوں کی قدیم وضع کے پابند تھے۔ آرایش و زیبایش سے انھیں
طبعًا تنفر تھا اور یقینًا انھیں کی تعلیم کا اثر تھا کہ حضور مرحوم میر محبوب علیخاں
نور اللہ مرقدہٗ بھی سادہ پوشاک کے عاشق تھے۔ قد و قامت کے
لحاظ سے وہ شاندار تھے، چہرہ سے تدبر، متانت اور سنجیدگی ہویدا تھی
گفتگو میں وقار تھا۔ لب و لہجہ دلنشین کہ اگر کوئی بات کہیں تو سامع کے
دل پر جا کر بیٹھے۔

وقت کے پابند تھے اور صبح سے شام تک اُن کے سامنے
کام پابندی و انضباط کے ساتھ اپنے اپنے وقت پر ہوا کرتے تھے۔
علی الصباح بستر استراحت سے اُٹھتے، چھ بجے دربار کرتے، پھر مطالعۂ
کتب ہوتا۔ ساڑھے دس بجے تک حسابات خزانہ کی جانچ پڑتال ہوتی
اور رزیڈنسی کے خطوط کا جواب لکھا یا کرتے۔ کھانا کھانے کے بعد متفرق
کاغذات و عرایض پر احکام صادر ہوتے۔ دوپہر کو مخصوص معززین
سے ملاقات ہوتی۔ سہ پہر کو حکام دفاتر باریاب ہوتے، شہر کے
ساہوکار حاضر ہوتے اور شام کو بگھی یا گھوڑے پر سیر کے لئے نکلتے۔ سیر
واپس آکر کھانا تناول فرماتے اور شب کو ذاتی جاگیر وغیرہ کے کاغذات
پیش ہوتے تھے۔

سر سالار جنگ کا یہ روزمرّہ کا ایک نامکمل پروگرام ہے۔
ان کے علاوہ اور بیسیوں امور تھے جن کے لئے دن میں تھوڑا بہت
وقت ضرور نکالا جاتا تھا لیکن انھیں چند باتوں پر غور کرنے سے
اُن کی مصروفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

گھوڑوں کا انھیں بیحد شوق تھا۔ روز شام کو اُن کا معائنہ
بچشم خود کرتے تھے۔ اصطبل بھی نہایت نفیس بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ
یہ اصطبل پیرس کے طویلۂ شاہی کے نمونے پر تعمیر ہوا ہے۔ اُن کے
اور مکانات بھی وضع داری اور خوشنمائی کے لحاظ سے اُن کے سلجھے
ہوئے مذاق کا نمونہ ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے آئینہ خانہ جہاں
پیرس اور دیگر مقامات کی بنی ہوئی دلفریب تصویریں اور فنون لطیفہ
کی اور اشیاء رکھی ہوئی تھیں گذشتہ سیلاب رود موسے کی دست
درازیوں سے مٹی میں مل گیا۔ اسی میں وہ روغنی تصویر بھی تھی جو
سر سید کی طباعی کو یاد دلاتی تھی اور جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ قوم
حزیں کا بچانے والا اگر کوئی ہے تو وہ سالار جنگ ہے۔

اس مختصر مضمون میں اُن کی زندگی کا صحیح اور مکمل خاکہ کھینچنے
کی گنجایش نہیں۔ اُن کے حالات اُن کے فضایل، بمنزلہ ایک دریا کے
ہیں جو اس مضمون کے کوزے میں نہیں سما سکتے۔ یہ سمجھ لو کہ وہ ہر ایک
پہلو سے ثناء و صفت کے مستحق تھے۔ دکن میں اُن کی وزارت سب سے زیادہ

کامیاب تسلیم کیجاتی ہے - بلاشبہ وہ اعلیٰ پایہ کے مُدبّر تھے، اور اُن کی پولیٹکل قابلیت سے یورپین صاحب تدبیر اشخاص کو بھی انکار نہیں برٹش گورنمنٹ میں اُن کی خاص وقعت تھی ۱۸۶۷ء میں اُنھیں کے سی - ایس - آئی کا اور ۱۸۷۱ء میں جی - سی - ایس - آئی کا خطاب مرحمت ہوا اور پھر ۱۸۷۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی - سی - ایل کی اعزازی ڈگری ملی - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی سوسائٹی میں وہ کس عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے -

۱۸۸۳ء ہندوستان میں عموماً اور مملکت دکن میں خصوصاً ماتم کا سال گنا جائیگا کیونکہ اسی میں سالارجنگ اعظم کا سا یگانۂ روزگار اور سرمایۂ زمانہ مدبّر ہمیشہ کے لئے اپنے وطن سے، ہندوستان سے، اور دُنیا سے مفارقت کر گیا ہے - وہ بھی یکایک، غیر متوقع اور اچانک - خدا اُس کی روح کو اعلیٰ علیئین عطا فرمائے -

سر سالارجنگ کے دو صاحبزادے نواب سعادت علیخاں اور نواب لایق علیخاں تھے - آخر الذکر بڑے تھے اور سالارجنگ ثانی کے خطاب سے ممتاز تھے - انھوں نے بھی اپنے والد کی جانشینی کچھ دنوں کی لیکن پھر دونوں بھائیوں کے جوانمرگی نے یہ گدّی سُونی کر دی تھی - جیسے اب ایک مدّت کے بعد سالارجنگ ثالث میر یوسف علیخاں بہادر خلف نواب لایق علیخاں مغفور کے دم قدم سے جاگنے کا موقع ملا ہے - دعا ہے کہ یہ بھی عظمت و ناموری میں اپنے گرامی قدر دادا کے قدم بقدم رہیں، اپنے بزرگوں کا نام روشن کریں اور دکن کی صدارت عظمیٰ کے جلیل القدر منصب کی گرانقدر ذمہ داریوں کو محسوس فرما کر انھیں اس طرح انجام کو پہنچائیں کہ دادا کی طرح پوتے کو بھی لوگ کہیں ع

بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال

سید محمد فاروق

آزمایش

نہ تو یہ آرام کی جگہ ہے نہ عیش کا ہے مقامِ دنیا ✤ یہ آزمایش کی ایک جا ہے کہ جسکا رکھا ہے نام دنیا

(۱)

رات کے نو بج چکے تھے لیکن ڈاکٹر فیروزشاہ دوباش ابھی تک مریض دیکھنے کے کمرہ میں بیٹھا تھا - چھت سے جو پُرانا لمپ لٹک رہا تھا اس کی روشنی بہت ہی مدّھم ہو چکی تھی لیکن اس نے اٹھکر اسے تیز کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی - گذشتہ چند سال سے ڈاکٹر صاحب کی مالی حالت اچھی نہ تھی شاید اس لئے تصفیہ بچت کی ایک صورت یہ بھی نکالی کہ لمپ میں تیل کم جلا کرے - سرِ شام سے بارش بڑے زور سے ہوتی رہی تھی اور اس وقت بھی شیشہ کی بند کھڑکی سے پانی کے قطرات ہوا کے زور سے کبھی کبھی ٹکراتے تھے - بمبئی کے محلہ دھوبی تلاؤ میں جہاں ڈاکٹر دوباش کا مکان تھا چونکہ اور کوئی ڈاکٹر نہ رہتا تھا اس لئے یہ اس توقع پر بیٹھے تھے کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مریض یا کسی خراب حالت کے مریض کا کوئی رشتہ دار آ نکلے - لمپ میں تیل بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا اور اسکی روشنی ٹمٹما رہی تھی - انسان کی زندگی بھی حقیقت میں لمپ کے تیل ہی کی مانند ہے - جب تک تیل موجود ہے انسانی زندگی کا چراغ جلتا رہے جب تیل کم ہو جاتا ہے تو زندگی بھی آخری دموں پر آجاتی ہے - پاس کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب کی بیوی نازاں ایک مدّت سے بستر علالت پر دراز تھی - اسکی زندگی کا تیل دن بدن کم ہوتا جا رہا تھا اور اسکی ہستی کا چراغ اس لمپ کی مانند ٹمٹما رہا تھا

جو ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں لٹکتا تھا۔

نازاں مرض شش میں مبتلا تھی لیکن اس سے بڑھ کر مرض افلاس نے اسے خستہ حال بنا رکھا تھا۔ ڈاکٹر دوباش اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس حالت میں بھی روپیہ کافی موجود ہو اور اسے کارلا یا دھرمپور کی صحت گاہ میں پہنچایا جاسکے تو نازاں کے زرد رخسارے پھر ایکبار سُرخ ہوسکتے ہیں۔ لیکن وہ تو بیچ۔ غریب اور حد درجہ کا مفلوک الحال تھا۔ کہتے ہیں مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی اور بجلی بھی اسی وقت زور سے کڑکتی ہے جب آسمان پر بڑی گہری گھٹا چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ جب سے افلاس کا دورہ شروع ہوا مریض آنے بند ہوگئے۔ چند ایک آدمی جو آس پاس کے محلوں سے آتے بھی تھے وہ افلاس میں ڈاکٹر صاحب پر فوق رکھتے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ڈاکٹر یا اہل قلم ہونا بڑی بھاری غلطی ہے۔ لوگ ہر پیشہ کے آدمی سے اُجرت پر کام کراتے ہیں مگر ان دونوں سے مفت خدمت لینا حق اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر دوباش کے ہاں جو مریض آتے تھے ان میں سے اکثر تو ان کی خدمات سے بلا معاوضہ ہی مستفید ہونا چاہتے تھے اور جو چند ایک معاوضہ دینے کی توفیق رکھتے تھے وہ لینے دینے کے معاملہ میں حافظہ کی کمزوری میں مبتلا تھے۔ ان دنوں بائیکلا کا ایک خبطی سا بخیل مریض جو ان کے زیر علاج تھا اس سے ایک کوڑی ملنے کی توقع نہ تھی لیکن ڈاکٹر فیروز شاہ دوباش ان معدودے چند آدمیوں میں سے تھے جو اس پیشہ کا نام روشن کرتے ہیں۔ وہ کسی قسم کی بھلائی کرتے وقت ذاتی مفاد کا بہت کم خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بائیکلا کے مریض کو بھی اپنی توجہ کا ویسا ہی مستحق تصور کرتے تھے جیسے کسی نامی گرامی سیٹھ یا نواب کو کرتے بشرطیکہ ان کی خوش قسمتی سے انھیں کسی ایسے شخص کے علاج کے لئے جانا پڑتا۔

(۲)

بارش کسی قدر کم ہوگئی تھی اور ڈاکٹر صاحب کرسی پر سر جھکائے بحر تفکرات میں غوق بیٹھے تھے کہ باہر کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ جس وقت انھوں نے سر اٹھایا تو ان کی آنکھوں میں خوشی کی ہلکی سی جھلک پائی جاتی تھی۔ رات کے وقت بہت کم لوگ ان کے پاس آتے تھے وجہ یہ کہ جن لوگوں میں ان کی طبابت چلتی تھی وہ زیادہ تر غریب تھے اور اس لئے رات کے وقت ڈاکٹر کو بلانا ایک اس قسم کی فضول خرچی تصور کرتے تھے جس کے وہ کسی صورت میں متحمل نہ ہوسکتے تھے۔ ایک لمحہ بھر کے لئے انھیں اس قسم کے لوگوں کی بعض کہانیاں یاد آئیں جو آدھی رات کے وقت کسی سے ملنے گئے اور اسے مالامال کر آئے لیکن معاً انھوں نے ایک ہلکی تلخ ہنسی کے ساتھ اس خیال کو دماغ سے خارج کر دیا اور جا کر دروازہ کھولا۔

اگر کسی غیبی خوش قسمتی کی رہی سہی توقع ان کے دل میں باقی تھی تو وہ اس شخص کی صورت دیکھنے سے جاتی رہی جو دروازہ پر کھڑا تھا۔ اس نے اعلیٰ قسم کے کپڑے کا سوری کوٹ نہ پہنا ہوا تھا جس سے اس کے امیر ہونے کا خیال گزرتا نہ انھیں کوئی شاندار وردی والا نوکر دکھائی دیا جسے کسی پیسہ والے مریض کا قاصد خیال کیا جاسکتا۔ دروازہ کے باہر بارش میں ایک چھوٹے قد کا بدنما سا شخص کھڑا تھا جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور بظاہر اضطراب قلب کی حالت میں نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ رہ رہ کر حرکت کرتے تھے اور اس کی آنکھوں سے ایک عجیب قسم کی روشنی نکل رہی تھی۔ لیکن جب وہ بولا تو اس کے لہجہ میں شائستگی کی جھلک پائی جاتی تھی جس سے اس کا تعلیم یافتہ مفلس ہونا ظاہر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھکر وہ کہنے لگا "ڈاکٹر فیروز شاہ آپ ہی کا نام ہے"؟

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "جی ہاں میرا نام ڈاکٹر فیروز شاہ دوباش ہے آپ مجھ سے طبی مشورہ چاہتے ہیں"؟

اجنبی کہنے لگا "ہاں مشورہ ہی سمجھئے گو میں خود مریض نہیں ہوں"۔

ڈاکٹر صاحب نے اسے اطمینان دلانے کے لہجہ میں کہا "ہاں ہاں بیشک آپ مریض نہیں شاید آپ اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کے متعلق کچھ مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ خیر اندر تشریف لے آیئے اس جگہ بارش میں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ ہے"؟

ڈاکٹر فیروزشاہ نے دروازہ بند کیا اور مریض کے آگے آگے ہو لیا۔ کمرہ میں پہنچکر اس نے لمپ کو ذرا تیز کیا اور معذرت کے طور پر کہنے لگا "بات دراصل یہ ہے کہ میں روشنی مدھم کر کے سونے لگا تھا کہ آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا"۔

اجنبی بولا "آپ کی معذرت غیر ضروری ہے۔ بعض کاموں میں روشنی کے بجائے تاریکی زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ میرا کام بھی اسی قسم کا ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے اسکی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ اب انھیں کسی قدر شک پیدا ہو چلا تھا کہ یہ شخص یا تو دیوانہ یا مشتبہ چلن کا آدمی ہے۔ اسکے الفاظ اس کے انداز سے کچھ کم عجیب نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کی مزید تصدیق اس وقت ہو گئی جب اجنبی نے سر آگے کی طرف کر کے آہستگی سے ان کے کان میں کہا "پاس کے کمرہ میں کون ہے؟ کوئی غیر تو نہیں جو ہماری گفتگو کو سن لے"؟

فیروزشاہ کا چہرہ تمتما اُٹھا اور وہ بولا "میں نہیں سمجھتا اس کا آپ کے مدعا سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میری بیوی ہی میرے سوا اس مکان میں رہتی ہے اور وہ یقیناً اسوقت تک سو چکی ہوگی"۔

اجنبی کہنے لگا "خیر یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں اس معاملہ میں کسی خطرہ میں پڑنا نہیں چاہتا"۔

اس نے تھوڑے عرصہ کے لئے توقف کیا اور اس اثنا میں بڑے غور سے ڈاکٹر صاحب کے چہرہ کی طرف دیکھتا رہا۔ فیروزشاہ مضطرب ہونے لگا۔ درحقیقت وہ اس شخص کی نگاہ کو پسند نہ کرتا تھا اس میں ایک قسم کا بھیانک اثر پایا جاتا تھا۔

آخرکار وہ کہنے لگا "آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں چند لفظوں میں بہت جلد کہہ ڈالیں۔ میں دن بھر کا تھکا ماندہ ہوں اور آرام کیا چاہتا ہوں"۔

اجنبی مسکرایا اور کہنے لگا "بیشک آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ آپ کو تھکانے کے لئے دنیا میں بہت سے اسباب موجود ہیں۔ سب سے زیادہ انسان کو زندگی کی کشمکش تھکا دیتی ہے۔ لیکن آپ کو تو وہ مریض بھی تھکا دیتے ہوں گے جو مفت علاج کرانا چاہتے ہیں اور ہاتھ سے ایک کوڑی دینا گوارا نہیں کرتے۔ مسٹر دوباش! میں نے آپ کے متعلق چند شخصوں سے اپنے طور پر تحقیقات کرلی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں اسی سلسلہ میں میں اسوقت آپ کے پاس آیا ہوں"۔

فیروزشاہ اُٹھ کر دروازہ کی طرف بڑھا اور چیخ کر کہنے لگا "دیکھئے صاحب میں اس قسم کی دل لگی پسند نہیں کرتا یا تو کام بیان کیجئے یا اپنا راستہ لیجئے"۔

اجنبی پھر مسکرایا اور بولا "ڈاکٹر صاحب بیٹھ جایئے۔ گھبرانے کی کچھ بات نہیں میں ابھی آپ کو سارا قصہ سنائے دیتا ہوں۔ میرا نام دھنجی کھیتسی ہے"۔

اس نام کو سنکر ڈاکٹر صاحب حیران ہو گئے اور چپکے سے کرسی پر آ بیٹھے پھر بولے "کھیتسی! یہ نام تو اس شخص کا ہے جو بائیکلا میں میرے زیر علاج ہے"۔

اجنبی کہنے لگا "جی ہاں! آپ کا خیال درست ہے۔ میں اسکا بھائی ہوں۔ اسلئے ہم دونوں کے آخری نام یکساں ہیں۔ اب میں آپ کو مطلب کی بات سناتا ہوں۔ آپ میرے بھائی کو ایک غریب آدمی سمجھتے ہیں۔ یہی خیال اکثر دوسرے لوگوں کا ہے لیکن میں اسکی حقیقت سے

جنرل ولیم بوتھ
(پیدائش ۱۰ - اپریل سنہ ۱۸۲۹ع - وفات ۲۰ - اگست سنہ ۱۹۱۲ع)

خوب واقف ہوں۔ واقعہ میں وہ بے حد دولت مند ہے۔ اتنا دولتمند کہ اسکے سرمایہ کے نصف سود سے مَیں اور آپ دونوں لکھ پتی بن سکتے ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب بے اعتباری کے لہجہ میں پوچھنے لگے "تو پھر وہ بائیکلا کے اس ویران محلہ میں کیا کرتا ہے"؟

اجنبی نے جواب دیا "آپ کو معلوم نہیں وہ ایک خبطی آدمی ہے۔ اس جگہ رہ کر وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ غریب لوگ کیونکر اپنی زندگی کے دن گزارتے ہیں۔ یقیناً آپ نے مولجی کھیتسی مشہور خیر خواہ بنی نوع انسان کا نام سنا ہوگا"۔

ڈاکٹر صاحب نے مُنہ آگے بڑھا کر پوچھا "تو کیا آپکا یہ مطلب ہے کہ ۔۔۔"۔

اجنبی نے جواب دیا "جی ہاں میرا یہ مطلب ہے کہ وہ مریض جو بائیکلا میں آپ کے زیر علاج ہے اور یہ شخص جس کا مَیں نے ابھی ذکر کیا دونوں ایک ہی ہیں۔ مجھے یہ بات تحقیق معلوم ہوئی ہے کہ وہ چونکہ اپنے آپ کو خطرناک حالت میں سمجھتا ہے اسلئے اس نے کل صبح وصیت لکھوانے کا ارادہ کر لیا ہے اور اس کا منشا ہے کہ اپنا تمام روپیہ بعض فضول سی خیراتوں میں وقف کر جائے۔ خود مجھے اس میں سے ایک کوڑی نہ ملے گی۔ مَیں اس دُنیا میں اس کا واحد رشتہ دار ہوں لیکن وہ مجھ سے ویسی ہی نفرت کرتا ہے جیسی کسی بھائی کو بھائی سے ہو سکتی ہے۔ اس قدر حالات سننے کے بعد شاید آپ کسی حد تک یہ بات سمجھ گئے ہوں گے کہ مَیں آگے چلکر کیا کہنے والا ہوں"؟

اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا اور اس نے کرسی آگے کھسکا کر ڈاکٹر صاحب کے قریب کر لی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا "مَیں تو کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں"۔

اجنبی بولا "ہوں! معلوم ہوتا ہے مفلسی نے تمہارے دماغ پر بھی اثر ڈالا ہے۔ تعجب ہے کہ جو شخص جسم انسانی کا حال جان سکتا ہو وہ دماغ انسانی کا حال معلوم نہ کر سکے۔ درحقیقت مَیں آج رات تمہارے پاس اس غرض سے آیا ہوں کہ تمھیں ہندوستان بھر میں سب سے دولت مند ڈاکٹر بنا دوں۔ القصہ مَیں ایک خاص شرط پر لاکھ روپیہ کی رقم آپ کو دینے پر آمادہ ہوں"۔

ڈاکٹر دوباش گھبراہٹ کے مارے کرسی پر سے اُچھلا اور کہنے لگا "تم کیا کہتے ہو؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو"؟

اجنبی نے بدستور اطمینان کے لہجہ میں جواب دیا "مَیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بعض اوقات لایق سے لایق ڈاکٹر بھی دوا مرکب کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں اور وہ غلطیاں مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ یقیناً تم بھی اس قسم کی غلطی کر سکتے ہو۔ کیا اب تم میری بات کو سمجھتے ہو"؟

ڈاکٹر فیروز شاہ نے کچھ جواب نہ دیا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے دل کی حرکت رُک گئی ہے۔ کمرہ میں اب اسے سوائے اجنبی کے چہرہ کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ شاید بارش بھی تھم چکی تھی کیونکہ پانی برسنے کی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔ صرف ڈاکٹر اور اس عظیم تحریص کا مقابلہ تھا!

(۳)

آخر کار اجنبی نے مہر سکوت کو توڑا اور کہنے لگا "آپ اس پر عام واقعات کو روشنی میں غور کریں۔ میرا بھائی قبر میں پانوں لٹکائے بیٹھا ہے۔ تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ صرف چند ماہ زندہ رہ سکیگا۔ اگر کل دوپہر کو وکیل کی آمد سے پیشتر اسے کچھ ہرج مرج ہو جائے تو مَیں حلف لیتا ہوں کہ اسکی جائداد پر قابض ہوتے ہی مَیں وہ رقم جس کا ابھی ذکر کر چکا ہوں تمہارے حوالہ کر دونگا۔ فی الحقیقت آپ کی منظوری کی توقع سے مَیں نے یہ

کاغذ بھی تیار کر لیا ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی پاکٹ بک سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ دو باش کی آنکھیں دہکتے کوئلوں کی طرح جل رہی تھیں۔ اس نے کاغذ کو ہاتھ میں لیکر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا کہ راقم الحروف ایک لاکھ کی رقم اس صورت میں ڈاکٹر فیروز شاہ کرسٹ جی دو باش کو دینا منظور کرتا ہے کہ اسے اپنے بھائی مولجی کھیتسی کی جائداد ورثہ میں ملجائے۔

ڈاکٹر صاحب کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس کاغذ کو پڑھ ہی رہے تھے کہ اجنبی پھر بولا "تم دیکھتے ہو کہ میں اپنے آپ کو تمہارے اختیار میں دے رہا ہوں لیکن مجھے اس کی چنداں پروا نہیں۔ جب کوئی شخص کسی بڑے کام پر ہاتھ مارنا چاہے تو اسے حوصلہ بھی بہت کرنا پڑتا ہے۔ مرکر ہی انسان سورگ میں پہنچتا ہے میں اپنی موجودہ مصیبت کی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ میرے لئے اب سونا اُچھالنے کا وقت آگیا ہے اور میں اس کام میں کامیاب ہونے کے لئے جان تک لڑانے کو تیار ہوں۔ اب آپ میرے ارادہ کو بخوبی سمجھ گئے ہوں گے"۔

فیروز شاہ کو جواب کے لئے الفاظ نہ ملتے تھے۔ کبھی تو وہ اجنبی کے خوفناک اشارہ پر غور کرکے کانپ اُٹھتا تھا لیکن دوسرے لمحہ میں اس کے الفاظ کا اثر اس پر غالب آجاتا تھا۔ جس طرح جذامی کو چھونے سے دوسروں کو بھی جذام ہو جاتا ہے ایسے ہی بار بار اس بُرے منصوبہ کی کیفیت سننے سے ڈاکٹر صاحب بھی نیم رضامند ہو چلے تھے۔ ان کے لئے ایک عجیب الجھن کا سامنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر میں "ہاں" کہہ دوں تو نازاں کی جان بچا لینا بالکل قرین قیاس ہے۔ بخلاف اس کے بصورت انکار انھیں اس کی موت بھی یقینی نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اجنبی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل سنجیدگی سے کہتا ہے۔ کاغذ کے پرزہ کی موجودگی سے اس کے ارادہ کی صداقت ظاہر تھی۔

اس وقت ایک جان کے لئے دوسری جان لینے کا سوال درپیش تھا۔ ایک جان جوان تھی دوسری بوڑھی۔ ڈاکٹر فیروز شاہ بڑا دیانتدار اور نیک خیال آدمی تھا لیکن اچھے سے اچھے آدمی میں بھی کچھ نہ کچھ کمزوری ضرور پائی جاتی ہے۔ سنسکرت کا ایک شلوک ہے کہ قدرت نے ہر جاندار کے اندر کوئی نہ کوئی کمزوری رکھی ہے۔ کوا جس کے من میں سب کی طرف سے بے اعتباری ہوتی ہے دوسرے پرندوں (کوئل) کے بچوں کو اپنا بنا لیتا ہے۔ راج ہنس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنی چونچ سے دودھ اور پانی الگ کر سکتا ہے تاہم وہ ایک خالی بادل سے ڈرتا ہے۔ اجنبی کی تحریص کے آگے ڈاکٹر صاحب کی ایمانداری اس طرح نرم ہو گئی جیسے سورج کی گرمی میں برف پگھل جاتی ہے۔ انھوں نے ارادہ کر لیا کہ "ہاں" کہہ دیں۔ الفاظ ان کے حلق سے نکلا نوکِ زبان تک پہنچ چکے تھے کہ یکایک رک گئے۔ معاً دل کے اندر خوف اور نفرت کا احساس پیدا ہوا اور انھوں نے جب میز کے دوسری طرف دھنجی کھیتسی کو بیٹھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں انھیں وہ چمک نظر آئی جس کی نسبت مذہبی کتابیں شاہد ہیں کہ دشمنی انسان کی آنکھوں میں اسوقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ان میں سے کسی کو مغلوب کر لیتا ہے۔ آخر انھوں نے حوصلہ کرکے کہا "آپ تشریف لے جایئے۔ آج کے بعد میں پھر آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ یاد رکھئے کہ میں قاتل نہیں ہوں"۔

اجنبی مسکراتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کی طرف بڑھا لیکن باہر نکلنے سے پہلے اس نے پھر کہا "مسٹر فیروز شاہ میں چلا جاتا ہوں لیکن امید ہے آپ دوبارہ غور کرنے پر اپنے آپ کو میرا ہمخیال پائیں گے۔ دوائی کی ترکیب میں غلطی ہو جانا ایک معمولی بات ہے۔ الوداع"

اتنا کہکر وہ چلا گیا اور ڈاکٹر فیروز شاہ تنہا اس کمرہ میں

رہ گیا۔ عین اس وقت چاند بادلوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور اس کی روشنی کی زرد کرنیں کھڑکیوں کے شیشوں میں سے ہو کر کمرہ کے اندر پڑنے لگیں۔ بارش تھم چکی تھی اور چاند ڈاکٹر صاحب کو ان کے اس فیصلہ پر مبارک باد کہنے نکلا تھا۔

(۴)

اجنبی کے چلے جانے کے بعد گھنٹہ بھر تک وہ بحر تفکرات میں غرق اسی جگہ بیٹھا رہا۔ اب جبکہ وہ کمرہ میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا اسے یہ سارا واقعہ ایک خواب یا الف لیلہ کا سین نظر آتا تھا۔ کیونکہ بمبئی جیسے کاروباری شہر میں ایک اجنبی کی طرف سے اس قسم کی عجیب و غریب شرائط کا پیش کیا جانا خارج از فہم و بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا۔

اتنے میں پاس کے کمرہ سے ایک آواز آئی۔ ڈاکٹر فیروز شاہ جو اس وقت تک بحر تخیل میں غرق تھا چونک کر ہوش میں آیا۔ معلوم ہوا کہ نازاں جاگ اٹھی ہے اور اسے بلاتی ہے اس کے الفاظ نے اس کے شش و پنج میں پڑے ہوئے دل پر گہرا اثر ڈالا۔

نازاں نے کراہتے ہوئے آواز دی "فیروز۔ فیروز جلدی سے میرے پاس آؤ۔ میں ڈر گئی ہوں"۔

ایک لمحہ میں وہ اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کا پتلا پتلا ہاتھ اپنے سرد ہاتھ میں لیکر پوچھنے لگا "کیا بات ہے"؟

نازاں نے نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "میری جان! مجھے ایک بڑا بھیانک خواب نظر آیا ہے۔ اس وقت یہ مجھے بالکل حقیقی معلوم ہوا۔ فیروز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں مر رہی ہوں اور تمھیں اکیلا چھوڑے جاتی ہوں۔ میرے دل و جان کے مالک! مجھے موت کی تاریکی میں اکیلا نہ جانے دو۔ جب میں اس وقت کا خیال کرتی ہوں میرا دل بیٹھا جاتا ہے"۔

اتنا کہکر اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ اس طرح مضبوط پکڑ لیا گویا وہ کسی بھنور میں پڑی ہوئی اور اس کے سہارے اس کے اندر سے نکلنا چاہتی ہو۔ نازاں کے آخری الفاظ نے فیروز شاہ کے دل پر بڑا اثر کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک دن نازاں کو یقیناً موت کی تاریکی میں اکیلا جانا پڑے گا۔ سب سے زیادہ رنج اس اجنبی کو انکار کے ساتھ واپس کرنے کا اسے اس وقت ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا اس کی موعودہ رقم مل جانے سے نازاں کی جان بچ جانا ممکن ہے۔ اپنی نسبت اب اسے بہت کم خیال تھا وہ افلاس کا مقابلہ بڑی خوشی سے کرنے کو آمادہ تھا لیکن نازاں؛ نازاں جو مفلسی ہی کا شکار ہو رہی تھی اسکا کیا حشر ہوگا؟

آخرکار اس نے ایک لمبا سانس کھینچ کر کہا "بخدا میں اسے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ میرے لئے ایسا کرنا ناممکن ہے"۔

مصیبتوں نے ڈاکٹر فیروز شاہ کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ جس طرح سورج کی گرمی پھولوں کو کملا دیتی ہے ایسے ہی مصائب کا ہجوم انسان کے بہترین خیالات پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ تمام رات اسے اسی کشمکش میں نیند نہ آئی۔ کسی وقت وہ اٹھ کر بیقراری کے ساتھ کمرہ میں ٹہلنے لگ جاتا تھا کسی وقت کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے بحالت نیم بیداری خواب دیکھنے لگتا تھا۔ رات بھر میں اس نے اس قسم کے بیسیوں خواب دیکھے لیکن جس وقت کمرہ کی کھڑکیوں میں سے صبح کاذب کی دھندلی روشنی اندر داخل ہوئی اس وقت اسے صرف ایک ہی خواب یاد تھا کہ اس کی جان سے پیاری نازاں ایک سرد لاش کی صورت میں اپنے پلنگ پر پڑی ہے اور عنقریب زیر خاک دفن ہو کر ہمیشہ کے لئے اس کی نظر سے دور ہونے والی ہے۔ اس نظارہ نے اسے دیوانہ بنا دیا اس کے خون میں آگ بھڑک اٹھی اور ایک مرتبہ اس نے پھر چلا کر کہا "بخدا میں اسے اکیلا نہیں جانے دونگا۔ نہیں جانے دونگا"۔

شیطان اب قریب فتحیاب ہو چکا تھا۔ رات بھر اس میں اور ڈاکٹر فیروز شاہ میں جو جدوجہد ہوتی رہی اس میں ڈاکٹر ہی مغلوب ہوتا نظر آتا تھا۔ خیالات فاسدہ نے اس کے دل پر اس طرح قبضہ کر لیا جیسے نہش سانپ نے طاقت و ہیم کو قید کر لیا تھا۔ ایک بار مغلوب ہونے کے بعد اسے سارا کام بالکل آسان نظر آتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے دواخانہ میں پہنچا اور اس دوائی کو تیار کرنے لگا جسکے متعلق وہ اس سے پہلے روز کہہ آیا تھا کہ میں علی الصباح تیار کر کے بھیجدوں گا۔

جس وقت اس نے اس زہر کے جو نامعلوم اثر کے ساتھ اسکے زیر علاج مریض کو مار دینے کی تاثیر رکھتا تھا چند قطرے دوا میں ملائے تو نہ اس کا ہاتھ کانپا اور نہ اس نے کسی قسم کے اضطراب کا اظہار کیا مختلف جذبات کی کشمکش نے اب اسے بالکل تھکا دیا تھا۔ چنانچہ جب وقت مریض کا آدمی دوا لینے آیا تو اس نے شیشی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تاکید کر دی کہ یہ دوا انھیں بیدار ہونے کے ساتھ ہی پلا دینا۔

نوکر دوا لیکر چلا گیا اور فیروز شاہ نے کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اس کا جرم یقیناً اس پر ثابت نہ ہو سکتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کسے اس بات کا یقین آسکے گا کہ ایک گمنام ڈاکٹر نے ایک گمنام شخص کو عمداً مار دیا ہے۔ میں اور نازاں کسی دور دراز ملک برہما سیلون یا سیام میں جا کر از سر نو اپنی زندگی شروع کر دیں گے۔ اور اس وقت ہم کیسے خوش ہوں گے!

لیکن پھر خیال پیدا ہوا "کیا واقعہ میں ہم خوش ہو سکیں گے؟"

یہ سوال اس کے دل پر ہتھوڑے کی طرح پڑا۔ معلوم نہیں اس کے قلب میں اس وقت جبکہ وہ ایک برا کام کرنے پر آمادہ تھا، نہیں! بلکہ اسے ایک خاص حد تک سرانجام دے چکا تھا یہ سوال کیونکر پیدا ہوا۔ شاید وہ اس بہترین تلقین کا ایک چمکدار ذرہ تھا جو بچپن میں اسے اپنی ماں سے حاصل ہوئی تھی جس طرح تاریک بادلوں کے اندر سے بجلی چمک کر نظروں سے غائب ہو جاتی ہے اسی طرح یہ خیال اسکے دل میں پیدا ہو کر اس کے ایمان کی سیاہی پر چمک ڈال گیا۔ فیروز شاہ رہ رہ کر اپنے دل میں سوچتا تھا کیا میں اس صورت میں واقعی خوش ہو سکوں گا جبکہ ایک جرم کی یاد ہر وقت سایہ کی طرح میرے ساتھ لگی رہے گی؟

اس خیال کے آتے ہی پھر اس کے اندر گناہ سے نفرت کا احساس پیدا ہوا اب تک اس کے دل میں ایک عجیب بے قراری جوش زن تھی۔ جس طرح رات میں بغیر چندرماں کے یا کلام میں بغیر صداقت کے چمک نہیں پائی جاتی ایسے ہی ایمان سے خالی دل کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ جب اس نے معاملہ کے تاریک پہلو پر غور کی تو بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ کہنے لگا "اے خدا مجھے تھوڑی سی مہلت دے" اس نے ارادہ کیا کہ میں ابھی گاڑی میں سوار ہو کر مریض کے ہاں جاتا ہوں شاید ہے کہ وہ ابھی تک سویا ہوا ہی ہو۔ اور دوا نہ پلائی گئی ہو۔ ممکن ہے .....

سنا! یہ کیا آواز تھی؟ شاید نازاں کی تھی۔ اس کا دل حرکت کرنے سے رک گیا۔ اس قسم کی چیخ اس نے اس سے پیشتر بارہا ان مریضوں کے منہ سے نکلتی سنی تھی جن کا وہ اپنی زندگی میں علاج کر چکا تھا۔ یہ وہ چیخ تھی جو مریض کے انجام کا پتہ دینے والی تھی۔ ایک پاگل وحشی کی طرح وہ دوڑتا ہوا ساتھ والے کمرہ میں پہنچا چارپائی پر جھکا نازاں کا چہرہ دیکھا پھر اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اس آہ میں اسکی عمر بھر کی حسرتیں مرکوز تھیں۔ نازاں مر چکی تھی! وہی نازاں جو موت کی تاریکی سے ڈرتی تھی۔

(۵)

آہ! یہ ڈاکٹر فیروز شاہ کی کوششوں کا انجام تھا۔ اس نے

جس کی خاطر یہ ساری دوڑ دھوپ کی تھی۔ سنگین سے سنگین جرم اور تاریک سے تاریک گناہ کا بار اپنے سر پر لیا تھا۔ جس کی جان بچانے کی غرض سے اس نے اپنی روح کو شیطان کے ہاتھ بیچنے سے دریغ نہ کیا جب وہی نہ بچی تو اس کی زندگی فضول ہے۔" اے کاش میں ایسا نہ کرتا! تو لیس مرگ اپنی پیاری ناز و نعمت کی پلی نازاں سے ملنے کی توقع کر سکتا تھا۔ خیر اب بھی جو ہو گیا سو ہو گیا۔ میں اس غریب کی جان بچانے کے لئے ایک آخری کوشش ضرور کرتا ہوں۔"

اس کے زرد چہرہ پر ایک آخری نگاہ ڈال کر وہ مکان سے باہر نکلا اور مولجی کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ پشاور سے بمبئی تک کا سفر کسی مسافر کو اتنا طویل نہ معلوم ہوا ہو گا جتنا اس وقت اسے مولجی کے مکان تک ہوا۔ اس کا دل اس زور سے دھڑک رہا تھا جیسے بھاپ کے زور سے ہتھوڑا پڑتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بخار کی چمک پائی جاتی تھی۔ وہ رہ رہ کر سوچتا تھا نہ جانے میرے وہاں جانے تک کیا کچھ ہو چکا ہو گا۔

آخر کار اس نے دروازہ پر پہنچ کر زور سے دستک دی۔ ایک نوکر نے دروازہ کھولا۔ یہ وہ شخص نہ تھا جو اس سے دوائی لینے گیا تھا۔ اسے ایک طرف ڈھکیل کر فیروز شاہ سیدھا مریض کے کمرہ میں داخل ہوا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یقیناً مریض دوائی پی کر سو گیا ہے اور اب قیامت ہی کو اُٹھے گا۔

اتنے میں پاس کے کمرہ سے وہ نوکر بھی آ گیا جس کے ہاتھ دوائی بھیجی گئی تھی ڈاکٹر صاحب نے گھبراہٹ کے لہجہ میں پوچھا "دوا پلا چلے ہو؟"

نوکر نے بڑی آہستگی سے جواب دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز کو اس کے کان تک پہنچنے میں بہت سا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ کہنے لگا "جی ہاں میرے آنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ بیدار ہوئے۔ اس وقت . . . . ."

وہ کچھ کہتا کہتا رہ گیا۔ ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا "بولو! بولو! پھر کیا ہوا؟"

نوکر نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں۔ خدا جانے ہاتھ کانپ گیا یا کیا ہوا بوتل فرش پر گر پڑی اور ٹوٹ گئی۔ وہ دیکھے میں نے اس کے ٹکڑے کھڑکی کے باہر ڈال دیئے ہیں۔"

ڈاکٹر فیروز شاہ نے پھر پوچھا "تو کیا انھوں نے اس کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا؟"

نوکر نے انکار کے طور پر سر ہلایا۔ ان کی گفتگو سے مریض کی بھی آنکھ کھل گئی اور وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "آج آپ بہت جلد آ گئے ہیں۔"

فیروز شاہ نے گھبراہٹ میں کہا "ہاں میں لوٹا جا رہا ہوں مجھے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ دراصل میں اس طرف سے گذر رہا تھا. . . ."

مولجی نے جواب دیا "خیر مضایقہ نہیں۔ مجھے بھی اس وقت زیادہ گفتگو کی فرصت نہیں۔ ابھی میرا وکیل آیا چاہتا ہے۔ ہاں خوب یاد آیا میں نے آپ کے نام ایک پرائیویٹ چٹھی لکھ رکھی ہے۔ اس کا لفافہ انگیٹھی پر سے اٹھا لیجئے لیکن اسے گھر پہنچ کر ہی پڑھیے گا۔"

فیروز شاہ نے بلا ارادہ ہاتھ آگے بڑھا کر خط لے لیا کیونکہ وہ جانتا تھا اس میں میری فیس کی کوئی چھوٹی موٹی رقم ہوگی۔ پھر وہ اسے جیب میں ڈال کر سیدھا گھر کی طرف روانہ ہوا۔

اب جبکہ اس کا سابقہ جوش مدھم پڑ چکا اور اس خوشی کا اثر جو اسے ایک شخص کو موت کے منہ سے بچتے دیکھ کر حاصل ہوئی تھی دور ہو چکا اس کے دل پر غم اور مایوسی کی گھٹا چھا گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ جس سے میری راحت شادمانی وابستہ تھی اب مر چکی ہے بازار میں رات کی بارش کی کم و بیش کیچڑ اس وقت تک موجود تھی۔ جب

آسمان پر پھٹے پھٹے بادلوں کے اندر سے سورج نے سر نکالا تو اس قسم کی دھوپ نکلی جو زردی میں کسی طرح فیروز شاہ کے چہرہ کی رنگت سے کم نہ تھی
مکان پر پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا لیکن جب کمرہ میں داخل ہوا تو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کا نام لے کر بلا رہا ہے۔ آواز سنکر اس کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ انداز او رلہجہ نازاں کا تھا وہ ایک دلیر آدمی اور بھوتوں کا کسی طرح قایل نہ تھا۔ اس پر بھی اس وقت اس کے دل میں خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ آواز نازاں کی روح کی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے جلدی میں اس کمرہ کا دروازہ کھولا جس میں نازاں کو چارپائی پر پڑا چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس وقت خالی پڑی تھی!

حیرت و استعجاب کے عالم میں وہ پیچھے کو ہٹنے ہی کو تھا کہ کمرہ کے دوسری طرف سے اسے نازاں مجسم نازاں اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ خدایا! کیا یہ وہی نازاں ہے جسے میں چارپائی پر مردہ چھوڑ گیا تھا؛ بیشک یہ وہی تھی کیونکہ اس کی مزید تصدیق اس وقت ہو گئی جب اس نے آگے بڑھ کر فیروز شاہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس وقت اس کا بدن گرم تھا اور وہ بدستور سانس لے رہی تھی۔

(۶)

بعد میں یہ راز کھلا کہ ڈاکٹر فیروز شاہ کو دھوکا ہو گیا تھا۔ نازاں در اصل مری نہ تھی بلکہ اس حالت میں تھی جسے ڈاکٹر اپنی اصطلاح میں ٹرینس کہتے ہیں اور جس میں مریض کی حالت بیہوشی بالکل موت کی طرح ہوتی ہے۔

نازاں کہنے لگی "پیارے فیروز! میری حالت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ اب تم سے جُدا نہ ہونگی"۔

اس کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ کون باور کر سکتا ہے کہ اس مادّہ پرستی کے زمانہ میں اس قسم کے معجزات دیکھنے میں آسکتے ہیں جن کی دو مثالیں صبح سے لیکر اس وقت تک وہ دیکھ چکا تھا۔ لیکن تیسرا معجزہ اس وقت ظہور میں آیا جب اس نے مولجی کے خط کو کھولا۔ اس میں لکھا تھا:۔

آپ بغیر کسی معاوضہ کی اُمید کے شب و روز میری خدمت کرتے رہے ہیں۔ میں ایسا ناشکرا نہیں کہ آپ کو بھلا دوں۔ لوگ مجھے خبطی کہتے ہیں لیکن خبطی احسان فراموش نہیں ہوتے۔ میں آج اپنی وصیت لکھوا رہا ہوں اور دس ہزار کی رقم تمہارے نام لکھوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اُمید ہے تم اُسے کسی نیک کام میں صرف کروگے"

آپکا مولجی کھیتسی

اسکے نیچے پوسٹ سکرپٹ کے طور پر لکھا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو یہ رقم ابھی وصول کر سکتے ہیں۔

اس قصہ کا آخری نظارہ المورٗہ میں نظر آتا ہے۔ نازاں کی صحت اب کامل طور پر بحال ہو چکی ہے اور فیروز شاہ اس خوفناک رات کے تمام واقعات اس کے روبرو بیان کر چکا ہے۔ ساری باتیں سننے کے بعد نازاں نے آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا "پیارے فیروز! اس روز میں ایک عجیب نیند سوئی تھی۔ شاید یہ کہ میری ہی روح نے میرے جسم سے نیم آزاد ہو کر تمھیں گناہ کے دائرہ میں داخل ہونے سے بچا یا"

فیروز شاہ کہنے لگا "ہاں ہاں میری جان! یہ بالکل قرین قیاس ہے۔ اس صورت میں مجھے اس تبدیل قسمت کے لئے تمہارا ہی ممنون ہونا چاہیئے"

نازاں بولی "نہیں پیارے! ہمیں اس کیلئے خدا کا شکر گذار ہونا لازم ہے جسکی عنایت سے تم اس آزمایش میں پورے اُترے۔

تیرتھ رام

کمشنر بوتھہ ٹکر

مسز بوتھہ ٹکر

حسنِ تخیلّ

منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی کا نام اُن لوگوں کے لئے ن کے مطالعہ سے اُردو کے ماہانہ علمی و ادبی پرچے گذرتے رہتے ہیں مرفی وشناسائی سے مستغنی ہے۔ منشی صاحب کی نظمیں ملک کے بہترین رسالوں میں شکریہ کے ساتھ جگہ پاتی ہیں اور علمی حلقوں میں جوش سرور کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ انھیں نظموں کا ایک مجموعہ حسنِ تخیل کے نام سے انڈین پریس میں حال میں چھپا ہے۔ بہی خواہان اُردو کے لئے یہ امر خصوصیت سے اطمینان بخش ہے کہ اب مصنفین اور مؤلفین میں اپنی کتابوں کو خاص اہتمام سے شایع کرانے کا رجحان بڑھتا جاتا ہے۔ حسنِ تخیل بھی کاغذ، کتابت اور تقطیع کے لحاظ سے دیدہ زیب کتاب ہے۔ شروع میں خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب مشیر مال ریاست بھاولپور کی ایک نفیس ہاف ٹون تصویر شامل کی گئی ہے اور مرزا صاحب کے نام نامی پر وہ حسنِ تخیل' معنون بھی ہے۔ حضرت ارشد کی تصویر سے بھی اصل کتاب کی دلچسپی میں خاص اضافہ ہوا ہے۔ بہر نوع حسنِ تخیل محاسن ظاہری کے اعتبار سے بالکل بے عیب ہے اور ہم اس امر کا اعتراف بھی دلی مسرت کے ساتھ کرتے ہیں کہ محاسن باطنی بھی ظاہری خوبیوں سے کم نہیں۔ حضرت ارشد ایک نغز گو اور روشن خیال شاعر ہیں اور اُن نوجوانوں میں جنکی ادبی خدمات پر اُردو لٹریچر کی نجات منحصر سمجھی جاتی ہے نمایاں منزلت رکھتے ہیں، اور اس مجموعہ میں اُن کی جس قدر نظمیں شامل ہیں اُن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انھیں اپنے خیالات و جذبات کے اظہار پر کافی قابو حاصل ہے اور طرز بیان و اسلوب کلام کی سلاست و نزاکت زبان کی صفائی و شستگی کے ساتھ اُن کے ایک ایک شعر کو پُر لطف اور کیفیت خیز بنا دیتی ہے۔

حسنِ تخیل میں ۲۷ مستقل نظمیں ہیں اور آخر میں چند غزلیں بھی شامل کر دی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا مذاق تغزل بھی سلامت روی اور اعتدال پسندی کے اعتبار سے سنجیدہ اور شستہ ہے۔ شروع کتاب میں حضرت شاکر میرٹھی (ایڈیٹر ادیب) کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ ہے جس کے آغاز میں نفسِ شاعری کے متعلق کار آمد خیالات ظاہر کئے گئے ہیں اور آخر میں حضرت ارشد کے چند اشعار پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔

اس مجموعہ کی ہر ایک نظم اپنی اپنی جگہ قابل قدر ہے۔ بعض نظموں میں ایک خوبی البتہ مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور اُسے تسلسلِ بیان کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا ہر شعر کا تعلق دوسرے سے ایسا ہے کہ اُسے وہاں سے ہٹا نہیں سکتے۔ ایک اور خوبی حضرت ارشد کے کلام کی یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے عنوان کے لحاظ سے لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً "افسردہ خاموش" کے عنوان سے کس قدر برجستگی سے کہتے ہیں ؎

کدھر سے ہائیں یہ تری حالت کو کیا ہوا ارشد! شگفتگیِ طبیعت کو کیا ہوا

تعلیم نسواں اور پردے کے عنوان سے ایک علمی مسئلہ کو نہایت خوبی سے نظم کر دیا ہے۔ "سانجی" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ارشد کو مناظرِ قدرت کے تاثرات کے احساس اور اُن کے اظہار میں پورا دخل ہے۔

زبان کے اعتبار سے بھی "حسنِ تخیل" کا ہر ایک شعر تعریف کا مستحق ہے۔ تعقید و تاخیر یا حشو و زواید خال خال پائے جاتے ہیں لیکن یہ لغزشیں بڑے بڑے اُستادوں کے کلام میں بھی ہوتی ہیں۔ کثرتِ مشق کے ساتھ یہ عیوب خود بخود کم ہوتے جاتے ہیں اور ہم بھی ایڈیٹر صاحب ادیب کے ہمنوا ہو کر امید کرتے ہیں کہ ایسی فروگذاشتیں چند روز بعد خود رو بہ اصلاح

دسہرہ

دسہرہ آتے ہی یاد آئی داستانِ کہن یہ دل ہوا کہ لکھیں معجزات رام و لچھمن
پتا کے حکم سے دونوں ہوئے تھے بن باسی پرائے کام کو پھرتے تھے آہ! بن بن
بچایا جا کے رشی اور منی کو دشمنوں سے انھیں پناہ ملی جو کہ آئے ان کے شرن
تمام عمر گئو برہمن کی رکشا کی کئے انھوں نے تہ تیغ راکشش رہزن
ہمارے واسطے آنے خوشی سے غربت میں یہ سمجھے شام غریباں کو اپنی صبح وطن

پیادہ پا تھیں جنک نندنی بھی ساتھ ان کے کہاں وہ ناز نیں نازک بدن کہاں وہ بن
یہی ہیں وہ کہ جنھوں نے مصیبتیں جھیلیں پتی کا ہاتھ سے چھوڑا انھیں مگر دامن
یہی وہ دیوی ہیں عفت مآب باعصمت کہ داغ معصیت سے پاک جنکا تھا دامن
تمام ہند میں ہوتی تھی آپ کی پوجا اور اپسرائیں لگاتی تھیں ماتھے پر چندن

تمام ہند میں ڈنکا بجا یا نصرت کا جدھر گئے انھیں رگھو ناتھ جی کے سب نے چرن
خدا کی شان نظر آئی شکل و صورت میں زیارت ان کی سمجھتے تھے لوگ ہر درشن
لئے تھے یوگ فقط نام کو تھے مہاراجہ یہ بیٹھے تخت شہی پر بھی مار کے آسن
بسی ہے دل میں سری رامچندر کی مورت ہوا ہے دل کے شوالے میں اسکا استھاپن
زبان ان کی تھی گویا زبانِ پرمیشور خدا کا قول سمجھتے تھے لوگ ان کے بچن

انھیں کے ذکر میں کاٹو تمام عمر اپنی
جو مکت چاہو کرو رام نام کا سمرن

انھیں کے ہاتھ سے ماری گئی تھی راکششنی انھیں نے صاف کیا خوفناک تاڑوکا بن
انھیں کے فیض قدم سے اہلیا بھی تری انھیں سے زیر ہوا تھا سباہو سا دشمن
جب ان کے سامنے ماریچ آیا لڑنے کو تو ایک استر میں پہنچا وہ سیکڑوں جوجن
دہنش کو توڑ کے سری رامچندر جی ہی نے تمام ہند میں نام اپنا کر دیا روشن
یہی ہیں وہ جو سفر میں کبھی نہ تھکتے تھے انھیں نے بھوک کا اور پیاس کا کیا سادھن
تمام جانور جنگل کے ان کے کام آئے یہ انکا ادنیٰ سا اعجاز تھا جناب من
یہی ہیں وہ جو رہے چترکوٹ میں آکر انھیں نے پنچ بٹی میں بنایا پھر مسکن
انھیں کے دم سے تھا جنگل حدیقۂ عشرت انھیں کے فیض سے صحرا بھی ہو گیا گلشن
یہیں انھوں نے سپنکھا کی ناک کاٹی تھی یہیں انھوں نے کئے زیر سیکڑوں دشمن
انھیں نے بان سے اپنے براَدھ کو مارا انھیں سے قتل ہوئے ترسرا و کھر دوشن
بچھڑ گئیں تھیں اسی بن میں جانکی ماتا یہیں یہ ہو گیا دھوکے میں آہ! سیتا ہرن
یہی ہیں وہ کہ جو پہنچے تھے جا کے کشکندھا کیا انھیں نے تہ تیغ بالی سا پرفن
یہی ہیں وہ کہ جو سگریو کی مدد پر تھے فتح بھی کی تھی انھوں نے یہ غیر کے کارن ق
فقیر دل تھے انھیں مال کی نہ تھی پروا اسی کو بخش دیا تھا وہاں کا راج اور دھن
بیاں کیسے ہوں بھگوان کے تمام اوصاف [۲] کہاں ہم اور کہاں رامچندر کا برنن

یہی ہیں وہ کہ جو لنکا گئے تھے لڑنے کو زمیں یہ جسکی برستا تھا ان دنوں کنچن
یہی ہیں وہ کہ جو پل باندھ کر سمندر پہ اتار لے گئے لنکا کو فوج، کر کے جتن
نہ آئے عقل میں جو وہ طلسم اس میں تھا تھی سرزمین یہ کل دیو دیت کا مسکن
بہت بلند تھا محفوظ قلعہ راون کا کہ جس میں کوئی پہنچتا نہ تھا کبھی دشمن
انھیں کا کام تھا جو پا گئے فتح اس پہ کہ بے شمار تھے خونخوار دیو روئیں تن
انھیں کے ہاتھ سے مارے گئے وہاں کے دیت انھیں سے قتل ہوئے میگھناد کمبھ کرن
غرضکہ رام سے برسوں لڑائیاں ہو کر ہلاک ہو گیا گمراہ راکشش راون
پھرے وطن کو یہ لنکا سے لے کے سیتا کو دیا وہاں کا بھبھیکھن کو راج اور سب دھن
انھیں کا حکم چلا ہر دشا میں بھارت کے رہا نہ ہند میں پھر رام کا کوئی دشمن
اسی فتح کی خوشی کرتے ہیں دسہرہ میں گلے سے ملتے ہیں سب لوگ آج ہو کے مگن
دسو دشا میں نظر آئی جس میں سرسبزی وہ آج نیک تھی ساعت وہ آج شبھ تھی لگن
تمام ہند میں پھیلی تھی امن و آسایش نہ کوئی دشٹ تھا باقی نہ تھا کوئی رہزن
جو مکت چاہو تو رگھو بنشیوں کا گن گاؤ یہ دن ہیں پڑھنے کے رگھو بنش یا کہ رامائن
تمام ہند میں چلتا ہے جام عشرت کا خوشی مناتے ہیں بھارت کے آج مرد و زن

فاتح پورٹ آرتھر جنرل نوگی

زبانِ حال سے کہتا ہے آ کے سالانہ　　وسہرہ دیتا ہے ہمکو سبق یہ مشفقِ من
کہ اس خوشی میں تمھیں قوم کا نہیں کچھ غم　　خبر نہیں یہ کہ پامال ہو گئی ہے تن
تمھیں تھے وہ کبھی، جنکے یہ کارنامے ہیں　　اُٹھا کے دیکھو تو رگھوبنش اور راماین
تمھیں تھے وہ کہ جو جاتے تھے شیر کے منہ پر[1]　　گرو کے حکم پہ دیتے تھے اپنا تن من دھن
تمھیں وہ تھے کہ جنھیں سترِ ہندنی تھی کبھی[2]　　تمھیں گئے تھے کبھی چھیننے کو اندراسن
تمھیں تھے وہ کہ جنھوں نے کیا تھا شوجیت یدن　　تمھیں سے زیر تھے ہندوستان کے دشمن
تمھیں تھے وہ کہ جو اس طرح دان کرتے تھے　　کہ گھر میں بچتے تھے مشکل سے مٹی کے برتن
تمھیں تھے جنسے کہ پہلے کبیر ڈرتا تھا　　خود آ کے دیتا تھا تمکو وہ اپنا مال او دھن
تمھیں تھے جنکا کہ رتھ ہر جگہ پہنچتا تھا　　زمین ہو کہ سمندر ہو، یا ہو چرخِ کہن
تمھیں تھے وہ کہ جدھر بان مار دیتے تھے[3]　　اُدھر نہ رہتے تھے ہوش و حواس پہ دشمن
تمھیں وہ تھے کہ جنھیں لوگ بیر کہتے تھے　　تمھیں کو جنگ کے ہتیار کرتے تھے وندن[4]
تمھیں تھے وہ کہ تھا جنکا شعار پر اُپکار　　پرائے جی کو لگاتے تھے اپنا تن من دھن
تمھیں تھے وہ کہ جو مرتے تھے دوسروں کیلئے　　خدا کی راہ میں دیتے تھے اپنا سر گردن
تمھیں تھے وہ کبھی جنکا وِمان چلتا تھا　　تم اب ہو خاک نشیں پہلے تھے فلک مسکن
تمھیں تھے وہ کہ جو دیووں سے بھی نہ دبکے رہے　　کیا تھا پار سمندر تمھیں نے کر کے جتن
تمھیں وہ تھے کہ جہاں میں تھی جنسے ہند کی دھوم　　تمھیں تھے جانِ وطن اور تمھیں تھے شانِ وطن
تمھیں وہ تھے کہ تھی بھارت میں جنسے سرسبزی　　تمہارے دم سے تھی ساری بہارِ باغِ وطن
تمھیں وہ دیوتا سیرت تھے آدمی صورت　　کہ آسمان سے اُترا تھا جنکا سنگھاسن
گرائے بیٹھے ہو کیوں دل کو کیا ہوا تم کو　　نہ اب وہ جوش ہی باقی نہ اب وہ ذہن
یہ بات کیا ہے جواب دل بجھائے بیٹھے ہو　　جلاؤ دل کو تو روشن ہو پھر چراغِ وطن
وہ کچھ کرو کہ ہو پہلے کی بات پھر حاصل　　بڑھاؤ اپنی طبیعت سدھارو چال چلن
ستم تو یہ ہے کہ تم کھو کے بھی نہیں سیکھے　　گیا کہاں سے کہاں سب تمہارا راج اور دھن

کچھ ایسے پست ہیں اب سب کے حوصلے ہمت
کہ تم پہ ہوتے ہیں باہر کے لوگ خندہ زن

رباعیاتِ شوکت

سُن اہلِ ہوا کا نہ کبھی جوش و خروش　　غنچے کی طرح ہمیشہ رہ پنبہ بگوش
چکر سے نکل نہ ورطۂ حیرت کے　　رہ آئینہ بن کے[ع۱] بزمِ صورت میں خموش

داغِ دلِ عاشق پہ ہو گلشن قرباں　　اس زندہ دلی پہ روح اور تن قرباں
اُس بُت کے حضور جبہ فرسا ہوں میں　　اک سجدہ پہ جس کے لاکھ گردن قرباں

دشمن ہے ہوس سلسلۂ جنگ نہ توڑ　　نازک ہے یہ آبگینۂ ننگ - نہ توڑ
ہے زردیِ رُخ تری بہار اے بلبل　　نادان! یہ سرخروئیِ رنگ نہ توڑ

دیں چین، یہ عادتیں زمانے کی نہیں　　رسم اس کی ستم سے باز آنے کی نہیں
کیا ناخنِ فکر سے ہو حل عقدۂ دل　　فرصت ہمیں سر کے بھی کھجانے کی نہیں

رہتا ہے ذلیل و خوار رندِ میخوار　　ہے اسکا شغب برنگِ گوسالہ[ع۲] خوار
اس کے لئے مرغِ روح کو کر نہ حلال　　ہے دخترِ رز حرام زادی مُردار

(مندرجۂ ذیل رباعیوں کا ثواب حضرت داغ مرحوم کو)

گر گرم کرے ساقیِ نکیتا بازار　　رندوں کے لئے ہو پھر تو سستا بازار
توبہ کا اگر ہو ریزہ ریزہ شیشہ　　لگ جائے درِ شیخ پہ مینا بازار

صہبا کی ہے یہ جلوہ گری شیشے میں　　یا آتشِ سیال بھری شیشے میں
کچھ کم نہیں آفتاب سے اس کی جھلک　　پردے سے ہے یہ پری بری شیشے میں

---

[1] رگھو نشٹ میں دلیپ مہاراج سے مراد ہے [2] رگھو مہاراج [3] اج مہاراج [4] سری رامچندر جی کی طرف اشارہ ہے -

[ع۱] آئینہ اور ورطۂ حیرت - سبحان اللہ! (ایڈیٹر) [ع۲] بمعنی بچھڑے کا ممیانا - ۱۲

ہے غزہ عبث اے بتِ پُرفن تیرا　　سرسبز ہے چند روز گلشن تیرا
کھا نیم کے تنکے سے کبھی ناک میں دم　　اب نوک کی سینے لگا جوبن تیرا

رندوں کے بغیر دیر آباد نہیں　　بے ان کے کبھی پیرِ مغاں شاد نہیں
کیوں دخترِ رز سے روکتا ہے ہم کو　　ہم رند ہیں شیخ، تیرے داماد نہیں

شوکت میرٹھی

رباعیاتِ کوثر

دل کو ناوک جگر کو پیکان عزیز　　ہم نے اُن سے کبھی نہ کی جان عزیز
نشاء میں رہا حرمتِ ساقی کا خیال　　ہوتا ہے کبھی کو دین و ایمان عزیز

ہوتے ہیں رقیب کے وہ مہمان افسوس　　میرے مرنے کے ہیں یہ سامان افسوس
کیا تم آئے تھے ذبح کرنے کو مجھے　　او خون ہوئے حسرت و ارمان افسوس

گھر کو جاتے ہیں شب کے مہماں افسوس　　یہ موت کے آنے کے ہیں ساماں افسوس
سر پیٹتی دل کی آرزوئیں نکلیں　　دم بھر میں بھرا گھر ہوا ویراں افسوس

اے شکّریں لب ترا ہے کیا نام لذیذ　　ہیں ذوقِ حلاوت سے لبِ کام لذیذ
تاثیرِ حلاوتِ لبِ شیریں سے　　ہیں شہد و نبات سے بھی دُشنام لذیذ

صد حیف کہ خواہشِ سنا ہی نہ گئی　　دنیا طلبی و حرصِ شاہی نہ گئی
پیری نے سفید کر دیئے موئے سیاہ　　رونے کی جگہ ہے روسیاہی نہ گئی

ہے حرص و ہوس کا دل میں قبضا ابتک　　اللہ کے گھر میں ہے اندھیرا ابتک
کعبہ میں گئے تھے بت شکن بننے کو　　**کوثر** بتِ پندار نہ ٹوٹا اب تک

ہے ماہ رُخوں کا لب پہ چرچا ابتک　　سر پہ ہے پریزادوں کا سایا ابتک
ہے دل میں خیالِ زلف و عارض **کوثر**　　اصنام کا کعبہ میں ہے قبضا ابتک

کوثر خیرآبادی

رباعیاتِ شاکر

اس دارِ فنا سے کر کرانہ شاکر　　ہو حق کا نشاں، ہو نشانہ شاکر
بیگانہ ہو گا ماسوا سے جب تک　　ہو گا نہ یگانے کا یگانہ شاکر

اُلفت کا ہے شعلہ زن فسانہ شاکر　　یہ تیری زباں ہے یا زبانہ شاکر
قربان ہو عشقِ روح پر روح مری　　ہو نزع میں اب پہ یہ ترانہ شاکر

ہے زہر ہوائے آب و گِل میرے لئے　　چھاتی پہ رہے گی کیا یہ سِل میرے لئے
پہلو میں رہے کہ پہلوِ دلبر میں　　مَیں دل کے لئے ہوں اور دل میرے لئے

وہ نخل حیات سے برومند رہے　　مثلِ گلِ شمع جو شکر خند رہے
ہو قربتِ حق کا دست پرور شاکر　　شہباز کی طرح چشمِ دل بند رہے

ہستی سے برنگِ نکہت اُڑا جاتا ہوں　　مَیں خاک تھا، خاک میں مِلا جاتا ہوں
آئے دمِ مرگ ابھی، ابھی جاتے ہو　　بیٹھو، کہ مَیں دنیا سے اُٹھا جاتا ہوں

دُنیا سے سفر عدم کا کرنا ہے تجھے　　ہستی کے منازل سے گزرنا ہی تجھے
ہے مشتِ غبار جسمِ خاکی تیرا　　اس خاک سے مُنہ لحد کا بھرنا ہی تجھے

مرقد میں ہے کس درجہ صفا گسترِ خاک　　دیکھو تو دکھا رہی ہے کیا جوہرِ خاک
ہے خسروِ ملکِ خاکساری **شاکر**　　اورنگ جو ہے خاک تو ہے افسرِ خاک

تاجِ تمکنت

اک تاج میرے سر پہ تفاخر کا سبب تھا — اُس تاج سے ہر بزم میں مَیں اہلِ طرب تھا

جب اس سے معرّا تھا۔ مراد رجہ یہ کب تھا — ہاں فخر کا معیار اگر تھا تو میں اب تھا

اب مجھ میں فضولی تھی نہ اب لہو و لعب تھا — اب مجھ میں شرارت تھی نہ غصہ نہ غضب تھا

کہتا تھا وہ۔ اللہ کا بندہ مجھے سچّا — اس دیر خرابات میں جو عاشقِ رب تھا

ہوتا تھا لڑکپن میں بزرگوں سا وقار — میں طفلی ہی میں پیر تھا یہ بخت عجب تھا

اس سے مجھے اعزاز مُیسّر تھا ہر طور — اس سے مجھے تمکین و مباہات کا ڈھب تھا

اخلاق مجسّم تھی میرے واسطے دنیا — تھا شِل وطن مجھکو تُجھ تھا کہ عرب تھا

زر تھا نہ مرے پاس نہ زیور تھے مرے پاس — بے گہنے کا تھا چاند۔ مگر نورِ غضب تھا

عہدہ نہ حکومت نہ ریاست نہ سیاست — تھا مرتبہ اعلیٰ نہ بڑا حسب و نسب تھا

محتاج۔ مگر تاج کی برکت سے غنی ہیں — سوکھے ہوئے تالاب میں بھی ترِ لب تھا!

راحت کی قبا میرے لئے روز دل افروز — رحمت کی ردا میرے لئے دامنِ شب تھا

ہوتا تھا اگر میرا عدو ہر لب خاموش — میری ہی لیاقت کا اُدھر شور و شغب تھا

عالم میرا مدّاح۔ زمانہ میرا حامی — جو تھا مرا غمخوار مرا خیر طلب تھا

تھا کچھ نہ مرے پاس مگر پھر بھی زہے بخت — یہ تھا تو مرے واسطے کونین میں سب تھا

دارین کے اوصاف نظر آتے تھے مجھ میں — تھا دل مرا آئینہ مرا سینہ حلب تھا

پوچھا جو بہ اصرار رفیقوں نے۔ وہ کیا تھا

طالب نے کہا دوستو۔ وہ تاجِ ادب تھا

طالب بنارسی

ہنسی کی صدا

سکھی! میں مست ہوں ہنسی کی دُھن سے — کہوں گی جو مجھے کہنا ہے اُن سے

تجھے میں کیا بتاؤں۔ جی کہاں ہے — تو ہی مجھکو بتا دے پی کہاں ہے

برہ کی آگ سے میں جل رہی ہوں — تڑپتی ہوں، کلیجہ مل رہی ہوں

نگاہِ ناز سے بسمل ہوئی ہوں — فقط بسمل نہیں، بیدل ہوئی ہوں

میرے چت چور کو کوئی بلا دے — سُنا دے، پھر مجھے ہنسی سُنا دے

مری آنکھوں میں وہ رنگیں ادا ہے — مرے کانوں میں ہنسی کی صدا ہے

کسی کا مدھ بھری گوری میں دم ہے — مرا اُس بانس کی پوری میں دم ہے

اسی غمّاز نے مارا ہے مجھکو — اسی آواز نے مارا ہے مجھکو

مروں گی، جان دوں گی سر دھنوں گی — سُنوں گی پھر وہی ہنسی سُنوں گی

وہی ہنسی رسیلی ہے سُریلی — وہی ہنسی رنگیلی ہے چھبیلی

وہی ہنسی، بھرا ہے سوز جس میں — نئی آواز ہے ہر رو جس میں

وہی ہنسی، جو بےجاں بولتی ہے — مگر رازِ حقیقت کھولتی ہے

وہی ہنسی، بڑی تقدیر جسکی — مری نظروں میں ہے تصویر جسکی

وہی ہنسی! مجھے دُکھ دے رہی ہے — لبِ جاناں کے بوسے لے رہی ہے

وہی ہنسی! کٹی جو بانس ہوکر — کھٹکتی ہے جگر میں پھانس ہوکر

وہی ہنسی! خیالوں میں بسی ہے — وہی عاشق کے نالوں میں بسی ہے

اُسی ہنسی میں جادو بھر رہا ہے — اُسی ہنسی نے میرا من ہرا ہے

مروں گی جان دوں گی، سر دھنوں گی — سُنوں گی پھر وہی ہنسی سُنوں گی

وہی ہنسی! ترے نغمے غضب ہیں — ترانے زینتِ بزمِ طرب ہیں

ترے لہرے سے دریا تھم گیا ہے — سری جمنا کا پانی جم گیا ہے

درختوں کو ہوئے سُن سُن کے سکتے — پرندے رہ گئے تکتے کے تکتے

ہرن بھی چوکڑی بھولے ہوئے ہیں — تری آواز سے پھولے ہوئے ہیں

عنادل کو کیا بیخود چمن میں — ہوئیں مدہوشیاں شیروں کو بن میں

مدھر سُر بانسری کے راگ سنکر — پھنوں کو پیٹتے ہیں ناگ سنکر

خلیقِ زار دیوانہ ہوا ہے — جگر افگار پروانہ ہوا ہے

سکھی سُدھ بُدھ میری جاتی رہی ہے — موہن کی بانسری جب سے سُنی ہے

مروں گی، جان دوں گی، سر دھنوں گی

سنوں گی، پھر وہی ہنسی سُنوں گی

[illegible]

نیرنگیِ فلک

یہ مثل سچ ہے نہیں ظالم کو ملتا ہے قرار
اے فلک گردش تجھے بھی ایک بیحالت میں ہے

اس پہ بھی جور و جفا سے باز تو آتا نہیں
آہ ظالم ظلم کرنا کچھ تری خلقت میں ہے

حکمراں تو عرصۂ گیتی کے ہر گوشے پہ ہے
دبدبے میں دبدبہ صولت تری صولت میں ہے

دامنِ دولت میں تیرے گو نہیں ہے کچھ کمی
بخل قاروں کی طرح لیکن تری خصلت میں ہے

یہ نہیں کہتے کہ رکھا عمر بھر تو نے خراب
آج عزت جسکو دی تو نے وہ کل ذلت میں ہے

اس تلون سے ترے گھبرا گئے ہیں سب کے سب
تو نہ اب ہم وہاں جائیں جہاں نیت میں ہے

عہد تیرا ایک بھی ہم نے نہ پایا استوار
سر چڑھا کر پھر گرا دینا تری طینت میں ہے

تجھ میں سب انداز ہیں بد عہدیِ معشوق کے
جھوٹ تو ظالم ہمیشہ سے تری قسمت میں ہے

ظلم جا ہے جس قدر کر لے تجھے ہے اختیار
جان تو جاں آفریں کے قبضۂ قدرت میں ہے

چھنگلے افشاں تو تاروں کی نکلتا ہے تو کیا
سب یہ کہتے ہیں کہ یہ صورت کسی صورت میں ہے

دن کو ہے خورشید سے شب کو مخاطب چاند سے
اک نیا معشوق تیرے پاس ہر خلوت میں ہے

لیکن ان دونوں سے بھی اچھے نہیں تیرے سلوک
اک اگر غربت میں ہے تو دوسرا ذلت میں ہے

پھر بھلا کس بات سے تیری زمانہ خوش رہے
اک ستم گاری کا شیوا تیری ہر عادت میں ہے

ایک دن وہ تھا کہ یوسف پہ زلیخا تھی فدا
ایکدن وہ ہے کہ مسکیں قید کی حالت میں ہے

تیری اک گردش میں عالم کا بدل جاتا ہے رخ
کوہ کو اک کاہ کر دینا تری عادت میں ہے

اول اول تو نے دارا سے کئے کیسے سلوک
آخر آخر جاہ اسکندر کی وہ ہیبت میں ہے

قصرِ کسریٰ ہے نہ وہ جمشید کا ہے جامِ جم
ذکر جنکا آج تک ہر ایک کی صحبت میں ہے

یاد ہے ہمکو کہ ہندوستاں کبھی سرسبز تھا
آج ہر فرد و بشر جس کا بہت نکبت میں ہے

کیا ہوئے دہلی کے وہ مشہور شاہانِ سلف
نام جنکا آج تک عزت میں ہے شوکت میں ہے

خاک میں تو نے ملایا آہ کس کس نام کو
آج ہم دہلی کو روئیں یا قصورِ شام کو

عشرت لکھنوی

کیفِ جام

دیکھے ہیں ہم نے کیف میں انوارِ کیفِ جام
مدِ نظر بنے ہیں یہ اسرارِ کیفِ جام

کتنی ہوئی ہے گرمیِ بازارِ کیفِ جام
پیمانہ نوش سب ہیں خریدارِ کیفِ جام

مستِ الست پیرِ مغاں نے بنا دیا
ہم کو دیا ہے ساغرِ سرشارِ کیفِ جام

صاحبِ نظر ہیں محوِ تماشائے آئینہ
آئینے میں ہے آئینۂ رخسارِ کیفِ جام

سالک حضورِ قلب ہو نورِ صفا بھی ہو
مفت نظر نہیں ہے یہ دیدارِ کیفِ جام

ہم شوق مست اسکے زلیخا نے دیدہ ہیں
پھرتا ہے دل میں یوسفِ بازارِ کیفِ جام

تمکیں ہے رنگ سازِ صہبائے عشق کا
مدہوش کیوں ہوا ہے سبکسارِ کیفِ جام

اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی
برہم ہوا وہ مطلعِ انوارِ کیفِ جام

سرخوش مے مغانہ کے ہیں رندِ میگسار
یہ دل سے ہوگئے ہیں پرستارِ کیفِ جام

کیا کیف رنگ جذبہ ہوا ہے کرشمہ خیز
زاہد بھی ہوگئے ہیں طلبگارِ کیفِ جام

مستِ مے جمال ہیں محوِ خیال ہیں
یہ اہلِ وجد و حال ہیں سرشارِ کیفِ جام

رنگِ فروغِ جلوہ صفائے دلوں سے ہے
نیرنگیِ خیال ہیں آثارِ کیفِ جام

مستو مست ہیں یہ کوئی عجب نہیں
مدہوش کس طریق ہوں ہشیارِ کیفِ جام

ہم کو سعید طالعِ بیدار نے کیا
حاصل ہوئی ہے دولتِ بیدارِ کیفِ جام

وہ نقش کالحجر جو ہوا سرِ من لدن
طالب ہیں تیرے محرمِ اسرارِ کیفِ جام

مستانِ شوق نالۂ موزوں ہیں ذوفنون
جذبِ سلوک رنگ میں اشعارِ کیفِ جام

پیتے ہی ایک جرعۂ مے مست ہوگئے
ساقی ہوئے ہیں سالکِ سرشارِ کیفِ جام

محوی

اسیرِ قفس

فصلِ گل تمکو مبارک اے جوانانِ چمن
ہیں شگفتہ لالہ و نسرین و ریحانِ چمن

مجھکو قسمت کھینچ لائی خانۂ صیاد میں
کیا سناؤں دردِ دل اے نوجوانانِ چمن

لوٹتا رہتا تھا ہر دم لالہ و گل کی بہار
عیش و عشرت سے رہا کرتا تھا مہمانِ چمن

دیکھتی تھی پیار سے نرگس مجھے آنکھوں بھر
دل میں سمجھی تھی مجھے روحِ چمن جانِ چمن

شاخِ گل پر آشیاں میں تھا بصد راحت مقیم
اُڑتا تھا میں بہارِ نو عروسانِ چمن

عیش و عشرت میں بسر ہوتی تھی میری زندگی
پہلوئے گل میں تھا حاصل ساز و سامانِ چمن

غنچۂ دل میرا کھل جاتا تھا کلیوں کی طرح
دیکھتا تھا جب بہارِ صبحِ خندانِ چمن

وہ نسیمِ صبح وہ دلکش ہوائے خوشگوار
ہر طرف نکھرے ہوئے وہ نونہالانِ چمن

ہائے اب صیاد کے ہاتھوں پڑا ہوں قید میں
آہ مجھ سے چھٹ گئے سب میرے یارانِ چمن

یاد آتے ہیں جو ایامِ گذشتہ کے مزے
خوں کر جاتے ہیں میرے دل کا ارمانِ چمن

میرے دل میں ہر گھڑی ہے دیدِ چمن کی آرزو
جیسے غربت میں مسافر کو وطن کی آرزو

ہم صفیرو ہو گیا کیا انقلابِ آسماں
اوجھل آنکھوں سے ہوا اب دور میرا آشیاں

پنجۂ صیاد سے اب چھوٹنا دشوار ہے
آہ میں کنجِ قفس میں ہو گیا ہوں نیم جاں

بال و پر میں طاقتِ پرواز ہی باقی نہیں
ہے عبث گر چھوڑ دے صیاد ہو کر مہرباں

حسرت و اندوہ و کلفت سے یہ حالِ زار ہے
ہو گیا ہے مثلِ برگِ کاہ جسمِ ناتواں

ظلم ڈھا کر خوب دل کے حوصلے پورے کئے
ہائے تجھکو اب بھی رحم آتا نہیں اے آسماں

آہ ننھے ننھے بچوں پر نہ آیا تجھکو رحم
کیا خبر کس حال میں ہوں گے بے وہ خستہ جاں

ظلم سے صیاد کے کنجِ قفس میں ہوں اسیر
ہم صفیروں کو مبارک ہو بہارِ بوستاں

میں بھی تھا اک وقت میں پروردۂ ناز و نعم
نغمہ سنجی کا مرے غل تھا میانِ گلستاں

آہ میں عیشِ گذشتہ کا کہاں تک غم کروں
چرخِ ظالم کی غضب ہیں تفرقہ پردازیاں

موسمِ گل میں پھنسا یا خانۂ صیاد میں
کیا کہوں اے اوجؔ میں پُر درد اپنی داستاں

عندلیبِ نو گرفتارم چمن گم کردہ ام
چوں اسیرِ غم تمہ راہِ وطن گم کردہ ام

اوجؔ گیاوی

بلبل کی فریاد

صیاد نے چھڑایا جس دن سے آشیانا
پہلو میں دل کے بدلے غم نے کیا ٹھکانا

گلزار سے نکالا، قیدِ قفس میں ڈالا
بیدرد کچھ نہ سمجھا، ظالم نے کچھ نہ جانا

آزاد تھا کبھی میں، دلشاد تھا کبھی میں
تھے وہ بھی دن الٰہی! تھا وہ بھی اک زمانا

روتا ہوں خون کے آنسو آتا ہے یاد جس دم
غنچوں کا مسکرانا! پھولوں کا کھلکھلانا

موجِ صبا کا چلنا تھم تھم روش روش پر
شاخوں کا جھوم جانا! سبزے کا لہلہانا

وہ جاں فزا ہوائیں وہ دلکشا گھٹائیں
مرغانِ ہمنوا کا ساون کے گیت گانا

بارش کی وہ پھواریں! برسات کی بہاریں
پتلی سی ٹہنیوں پر وہ جھولنا جھلانا

صحنِ چمن میں پھرنا وہ شب کو چاندنی میں
دل میں سرور آنا! آنکھوں میں نور آنا

وہ شام کے نظارے! جگنو وہ پیارے پیارے
وہ صبح کے ستارے! ان کا وہ جھلملانا

اس قید بیکسی کا کب تھا خیال مجھکو
مل جائیں کاش اپنے وہ ماہ و سال مجھکو

ایام کے ستم کی گھڑیاں اٹھا رہا ہوں
بیداد سہ رہا ہوں! دکھ درد پا رہا ہوں

مجھ بے زباں کی بولی کوئی نہیں سمجھتا
ہر چند چیخ کر میں دکھڑا سنا رہا ہوں

قسمت کو رو رہا ہوں میں اور یہ ستمگر
دل میں سمجھ رہا ہے خوش ہو کے گا رہا ہوں

اک آگ سی لگی ہے یادِ وطن کی دل میں
رو رو کے آنسوؤں سے اسکو بجھا رہا ہوں

سب ہم صفیر میرے خوشیاں منا رہے ہیں
تن تن کے اڑ رہے ہیں اُڑ اُڑ کے گا رہے ہیں

میرا نصیب مجھ سے گر سازگار ہوتا
میں بھی ترانہ سنجِ فصلِ بہار ہوتا

پھولوں کی انجمن سے ہوتی اگر نہ دوری
یہ دل مرا نہ ہرگز یوں داغدار ہوتا

شبنم کے وہ نظارے نظروں سے گر نہ چھپتے
کیوں زار زار روتا کیوں اشکبار ہوتا

اس قید سے رہائی ممکن اگر نہیں ہے
میرا بھی کچھ تو چارا پروردگار ہوتا

شاخِ نہال پر یا پنجرا مرا لٹکتا
پنجرے میں یا ہجومِ سرو و چنار ہوتا

پنجرے کا آب و دانہ یارب ہے زہر مجھکو
کھانا عذابِ جاں ہے پینا ہے قہر مجھکو

اے کاش پائے بلبل پھر کنجِ دلنشیں پھر
گاتا پھروں ترانے گلشن کی اس زمیں میں

سوزِ نہاں بجھاؤں جو کے چمن پہ جا کر
پھر جا ملوں میں اپنے یارانِ دانہ چیں میں

یہ تیلیاں قفس کی اے کاش پھونک ڈالوں
اتنا اثر تو یارب ہو آہِ آتشیں میں

اجڑا ہوا نشیمن پھر جا بساؤں اپنا
اب کے جو تھا بنایا گلہائے یاسمیں میں

کب ہو مجھے رہائی! کب آشیاں میں پہنچوں!
اپنے وطن کو جاؤں! اپنے مکاں میں پہنچوں

[illegible]

سننے کی باتیں

نہیں دوستوں کے دلوں میں صفائی　　خدا جانے یہ کیا قیامت ہے آئی

جسے دوست سمجھا - عدو اُس کو پایا　　کہیں کیا، کہ ہے بخت کی نارسائی

یہی دیکھتے ہیں جہاں دیکھتے ہیں　　کسی نے لگائی کسی نے بجھائی

اگر بات سچّی زباں سے نکالی　　تو پلّہ بندھی اور گویا لڑائی

زمانہ کی رنگت پلٹ سی گئی ہے　　کروگے بھلائی ملے گی بُرائی

سدا جمع کرتے رہے مال و دولت　　کوئی چیز دیکھی نہ اپنی پرائی

ہوئے منہمک کارِ دُنیا میں ایسے　　نظر کچھ نہ آیا - کنوؤاں ہو کہ کھائی

نہ حاصل ہوا کچھ بجز رنج و حرماں　　بہت خاک میں جان اپنی ملائی

ہزاروں سہی نام کے دوست، لیکن　　نہیں ہے کوئی قابلِ آشنائی

بِلا ہو اگر چین دنیا میں صاحب　　تو کہدو، تمہاری بھی یہ عمر آئی

کیا آج اک کام کل اُس کو چھوڑا　　یونہی روز ہوتی رہی جگ ہنسائی

نہ نکلا کوئی کام اب تک کسی کا　　عبث عمر باتوں میں ساری گنوائی

وہ چاہیں گے اوروں سے تعریف اپنی　　جو کرتے نہیں آپ اپنی بڑائی

بُرائی تو آخر بُری چیز ٹھیری　　بھلائی میں کیا تم نے دیکھی بُرائی

اُلجھنا اٹکنا جھگڑنا بُرا ہے　　مُناسب نہیں ہے کسی سے لڑائی

کسی سے بڑھاؤ نہ اتنی محبت　　کہ دیتا رہے رنجِ دردِ جُدائی

زبردست تحریک جب تک نہ ہوگی　　نہ نکلے گی جو بات دل میں سمائی

کوئی بات اپنی نہ غیروں سے کہنا　　زباں سے نکلتے ہی ہوگی پرائی

برابر ہیں انسان سارے　　نہیں چاہیئے کرنی اپنی بڑائی

زباں سے نہو آشنا حرفِ ناحق　　بلا سے جو پھر جائے ساری خُدائی

پڑے ہیں جہالت کے پردے ہزاروں　　حقیقت کسی شے کی کھلنے نہ پائی

مٹائے سے مٹجائیں دل کی اُمنگیں　　کسی نے نہیں بات اتنک بتائی

چھپائی عزیزوں نے سو سو طرح سے　　جو خوبی کوئی اشک میں دیکھ پائی

اشک بلندشہری

"ادیب"

اللہ اللہ شان تیری اے ادیب　　آج عالم میں ترا جوہر کھلا

دیدۂ مشتاق میں تیرا جمال　　یا ہے اک بُت خانۂ آزر کھلا

تو بیاضِ صُبح کی تفسیر ہے　　تجھ سے رازِ خسروِ خاور کھلا

تو نظامِ شمس کا ہے روشناس　　تجھ سے نیرنگِ مہ و اختر کھلا

دیکھکر تیرے مضامیں کا فروغ　　کہتے ہیں - گنجینۂ گوہر کھلا

تشنگانِ آبِ اُردو کے لئے　　تیرے لب سے چشمۂ کوثر کھلا

تیرا افسوں ردِّ سحرِ سامری　　تیرا مضموں ایک جادوگر کھلا

ہر ورق رنگِ عروسِ نوبہار　　یا کسی معشوق پر زیور کھلا

تو نے ڈالی قالبِ اُردو میں جاں　　فیض روح القدس کا تجھ پر کھلا

سجعہ سجعہ نظم کا سحرِ حلال　　فقرہ فقرہ نثر کا نشتر کھلا

تُو لٹاتا ہے مضامیں کے گہر　　بن رہا ہے آج، گنجِ زر کھلا

تجھ سے زندہ ہوگئی اُردو زباں　　ہند پر احساں ہے سرتاسر کھلا

فلسفہ کا خُلق کا آداب کا　　تیرا صفحہ ہے کہ اک دفتر کھلا

نقشِ علمِ ظاہر و رنگِ بُطون　　جو کھلا، موزوں کھلا بہتر کھلا

عشق کا نکتہ جو تو نے کہدیا　　اک معمّا تھا، کہ دنیا پر کھلا

حُسن کا نکتہ جو تو نے لکھ دیا　　جلوۂ روئے پری پیکر کھلا

آج ہے اُردو زباں کو تجھ پہ ناز　　جس کا تیرے دور میں جوہر کھلا

اہلِ فن پاتے ہیں تجھ سے فیضِ عام　　اہلِ بینش پر ہے تیرا در کھلا

وصف تیرا لکھ سکے کلکِ شہیر

ہے یہ دعویٰ، اک ستم تجھ پر کھلا

تازہ غزلیں

مہاراجہ بہادر سرکشن پرشاد صاحب باقابہم

دردِ دل ہو وہی دلبر ہے وہی دل ہو وہی
وہی لیلیٰ ہو وہی قیس ہے محمل ہے وہی

کہتے ہیں دل سے لگا نکلے تو قابل ہے وہی
جس کو پامال کیا تھا بخدا دل ہے وہی

جسکو دعویٰ تھا نہیں ہے کوئی ثانی اپنا
آج آئینہ میں دیکھا تو مقابل ہے وہی

کہتے ہیں دل کا لگانا کوئی آسان نہیں
سختیاں جسمیں ہزاروں ہیں یہ مشکل ہو وہی

غیر کوئی مری نظروں میں سماتا ہی نہیں
جسکا دیوانہ ہوں آنکھوں کے مقابل ہو وہی

گوشۂ چشم سے ناقص کو بنا دے کامل
وہی انسان ہے اور مرشدِ کامل ہے وہی

اپنی پہچان ہوئی مجھکو تو ثابت یہ ہوا
جسکو میں غیر سمجھتا تھا مقابل ہے وہی

گردشِ چشم سے جسکی ہوئے لاکھوں مدہوش
وہی ساقی ہو وہی دور ہے محفل ہے وہی

یہ نہ کعبہ ہے نہ ہے دیر مرا دل ہے شاد
گھر خدا کا جسے کہتے ہیں یہ منزل ہے وہی

حافظ جلیل حسن صاحب جلیلؔ (جانشین امیرؔ مینائی)

کچھ نظر اُن کو نہیں اپنے پریشانوں پر
بال زلفوں کے پڑے لوٹتے ہیں شانوں پر

منتظر موسمِ گلُ کے ہیں ترے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

جوشِ وحشت میں ہے کیا ذکر لباسِ تن کا
بار ہے جامۂ ہستی ترے دیوانوں پر

شمع کو فرقتِ عشاق گوارا نہ ہوئی
خود بھی جل بجھکے ستی ہو گئی پروانوں پر

دستِ وحشت نے کیا اُن کا بھی دامن صدچاک
گلُ جو ہنستے تھے ترے چاک گریبانوں پر

قیس و فرہاد بھلا جامہ دری کیا جانیں
ہو گیا قطع یہ جامہ ترے دیوانوں پر

اپنے قاتل سے دمِ مرگ ہم آغوش رہے
رشک آیا مجھے جلتے ہوئے پروانوں پر

شیخ کو بھیس بدلنے کی ضرورت کیا ہے
کوئی جو کی نہیں ہے اہنیں میخانوں پر

ابتو زاہد کو بھی پینے سے نہ ہوگا انکار
اُٹھکے قبلہ سے گھٹا چھا گئی میخانوں پر

روکے عشاق نے فرقت میں لہو کے آنسو
ٹکڑے یاقوت کے ٹانکے ہیں گریبانوں پر

یوں ہی انسان پہ نیرا دتمیں کہتے تھے
اور پر لگ گئے زلفیں جو چھٹیں شانوں پر

اے جلیل اشک گنہگار کے اک قطرے کو
ہو فضیلت تری تسبیح کے سو دانوں پر

سید ریاض احمد صاحب ریاضؔ خیرآبادی

پھول ہے لالۂ صحرائی کا
یا کلیجہ ترے سودائی کا

مثل گیسو ہیں پریشاں شبِ وصل
تھا جنھیں شوق خودآرائی کا

پنکھڑی پھول کے محرم نہ بنے
قطعہ جامہ نہ ہو رعنائی کا

بیٹھکر چوری سے پینا پسِ خم
راز ہے گوشۂ تنہائی کا

دے خدا عقل تو دیوانہ بنے
کہ جنوں کام ہے دانائی کا

خم قد ہے خمِ مینا سوئے جام
موجِ مے ہاتھ ہے انگڑائی کا

لیکے پہلو سے ذرا دامن میں
رنگ دیکھو دلِ شیدائی کا

اس میں ہوں نخلِ سرِ طور کے پھول
دامنِ دل ہے تماشائی کا

جائے بھی میرے سیہ خانے سے
منہ ہو کالا شبِ تنہائی کا

مستِ مینا ہوں پیا ہے میں نے
جام امیر احمد مینائی کا

بزمِ ساحر میں ہوں خاموش ریاض
ناطقہ بند ہے گویائی کا

سید الشعراء حضرت صمیم بلندشہری

قیامت کا بھرا ہے جوش میری چشمِ گریاں میں
زمینِ حشر کے ٹکڑے اُڑینگے موجِ طوفاں میں

گھٹا آتے ہی اے ساقی کھلے زاہد کی نیت بھی
کوئی تو جوڑ ایسا چاہیئے رحمت کے دلاں میں

کسی کی آنکھ ایسی موہنی تو ہو نہیں سکتی
کوئی جادو کی پُتلی ہے تمہاری چشمِ فتاں میں

ہزاروں رنگ اُڑانے ہیں تری نازک کلائی نے
شگوفہ اور کیا پھوٹے گا کوئی شاخ مرجاں میں

محبت کا اثر دل جانتا ہے آپ کیا جانیں
کوئی یوسف سے پوچھے خواب کی تعبیر زنداں میں

بتوں کا کفر توڑا ادا خواہ ہو نکی دُہائی نے
خدا کے سامنے سر ہیں ندامت سے گریباں میں

الٰہی خیر کچھ بے طور ہیں صیاد کے تیور
بچھایا چاہتا ہے جال پھولوں کا گلستاں میں

مزہ زخموں کا میرے چٹکیوں ہی میں اُڑاتے ہو
ہنسی تو آپکی ہے جان ہے میری نمکداں میں

تمھیں کیا کام کیونکر دن مصیبت کے گذرتے ہیں
مزے لوٹو رہو باغوں میں کھل کھیلو شبستاں میں

صمیم اُٹھ جائے اُس عیّار کا ہم کفر توڑینگے
قدم پر سر بھی ہوگا ہاتھ ابھی تو ہے زنخداں میں

تمنا بند ہے گیسو میں دل ہے قید مژگاں میں
اندھیری رات اکیلی جان ہے اور دو پیکاں میں

کھلے عقدہ تو آخر شام غم کا روز ہجراں میں
گرہ وہ میرے دل کی ہاتھ آئی گیسوئے پیچاں میں

اُڑینگے پھول ابھی داغ جگر کے تیغ قاتل سے
یہ جوگن ہو رنگیلی رنگ کھیلے گی گلستاں میں

یہ ممکن ہی نہیں قابو میں ہوں انسان کے پریاں
کسی کے جذب دل کا نقش تھا مہر سلیماں میں

لب جاں بخش کا بوسہ نہ دیتے گالیاں دیکر
یہی تو زہر کا چھینٹا ہے مجھکو آب حیواں میں

کیا ہے صید قید زلف میں اس شوخ کافر نے
رہونگا حشر تک اب میں اسی تاریک زنداں میں

کیا رسوا محبت نے کھلا پردہ زلیخا کا
تمنا ہاتھ ملتی رہ گئی یوسف کے داماں میں

تم اپنے خال لب کی قدر پوچھو مصحف رخ سے
یہی نقطہ تو ہے اک نکتۂ تفسیر قرآں میں

ابھی تو حشر میں پلے سے پلہ ہم نے باندھا ہے
ابھی کیا ہے ابھی تو ہاتھ بھی ہوگا گریباں میں

بہار آئے مزے لیں زخم ذوق دست قاتل سے
نمک سبزے کی شبنم کا ہو پھولوں کے نمکداں میں

کوئی ہو نوجواں ایسے کا واعظ تذکرہ چھیڑو
پرانا ہو چکا ہے حور کا مذکور قرآں میں

تمھیں بھی عشق ہو تو قدر ہو تمکو محبت کی
تمھیں بھی تو مزہ آئے کسی کے عہد و پیماں میں

بتوں کا کفر توڑیگا خدا کے سامنے اکدن
غرور ان کی خودی میں ہے خودی ہے ان کے ایماں میں

محبت نے ابھارا روپ قیس و کوہکن سے
نہ شیریں ہے تو ان میں تھی نہ لیلیٰ تھی بیاباں میں

تمہارے دست نازک پر یہ کس نے مہندیاں باندھیں
بنایا پنجۂ مریم نکالی شاخ مرجاں میں

صمیم خوش بیاں کا دل حسینوں کا کھلونا ہے
پریزادوں کا جمگھٹ چاہیئے بزم سخنداں میں

مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی

بیتابی دل دیکھ کے تڑپا ہے جگر بھی
او تیر فگن ہاں کوئی ناوک تو ادھر بھی

تم دیکھ لو چھپ کر مجھے ہوگی نہ خبر بھی
وہ زخم ہے دل میں جو ادھر بھی ہے ادھر بھی

دل ہو گیا مجروح کماں اب نہ اٹھاؤ
تھم جاؤ اسی تیر پہ مرتا ہے جگر بھی

بس نالۂ دل بس مجھے امید نہیں ہے
منہ دیکھنے والوں میں ہے ظالم کے اثر بھی

کیا تم سے شکایت مجھے قسمت سے گلا ہے
پھرتا ہے مقدر تو پلٹتی ہے نظر بھی

روداد ہے کیا شہر خموشاں کی الٰہی
اس باب میں خاموش سے ہیں اہل خبر بھی

اے آتش غم تو نے کسی کو نہیں چھوڑا
اک داغ لئے آتی ہے عالم میں سحر بھی

یارب یہ سکت دل کی صدا کو نہیں کہاں تھی
نالوں میں کچھ آواز ملاتا ہے جگر بھی

صیاد سے باتیں کروں یا فکر نشیمن
شق ہو نہ کہیں دل کہ ادھر بھی ہے ادھر بھی

سر حادثۂ دہر کی ٹوٹی نہ اجل سے
جاتی نہیں ان تک مرے مرنے کی خبر بھی

تنہائی فرقت میں کوئی پاس نہ ٹھہرا
رخصت ہوا آخر کو دعاؤں سے اثر بھی

اندیشۂ فرقت سے پریشان ہوا دل
دو چار گھڑی جھیل نکل جائے گا ڈر بھی

چپ دیکھ کے خوش دل نہ سمجھ اہل جہاں کو
ظالم ترے کردار سے دیتی ہے خبر بھی

برباد نہ کر شوق میں آبادی غم کو
جی جائے تمنا ترے مرنے سے تو مر بھی

اٹھکر بھی وہی بیٹھ رہے پہلو میں غموں کی
دل کھوئے میں سمجھا کہ کوئی شے ہے جگر بھی

میری شب غم کیوں ہے زمانے سے نرالی
دنیا ہے یہاں شام بھی ہوتی ہے سحر بھی

اے جان بتا جھگڑا کروں کس کے حوالے
تلوار بھی گردن پہ ہے قاتل کی نظر بھی

گلشن کی طرف منہ کئے بیٹھا ہوں قفس میں
شاید کوئی دمساز نکل آئے ادھر بھی

تنہا ہے دعا شب وہ ڈرانی ہے کہ توبہ
بیٹھا ہے کسی امن کے گوشے میں اثر بھی

چین اب کسی کروٹ مجھے آتا نہیں اے دل
لے آگیا ظالم تری باتوں میں جگر بھی

اپنوں کی تباہی کا قلق ہوتا ہے ثاقب
روتا ہے مرے دل کی مصیبت پہ جگر بھی

مولوی سید حسن عسکری صاحب ایم - اے

فرقت میں شب کو لطف وصال نگار تھا
آنکھیں تھیں بند محو تماشائے یار تھا

کل شب میں سوز دل سے بہت بیقرار تھا
آہیں تھیں گریہ نالہ بے اختیار تھا

کس درجہ جاں گداز غم ہجر یار تھا
شب بھر جگر کو چین نہ دل کو قرار تھا

پہلو میں جب مرے وہ بت گلعذار تھا
صدقے کبھی جگر تو کبھی دل نثار تھا

جب محو جلوۂ رخ گیسوئے یار تھا
کیا انبساط دل مجھے لیل و نہار تھا

نوک مژہ سے پرسش پنہاں بھی اب نہیں
وہ دن گئے کہ جب کرم آشکار تھا

صیاد قید ہونے کا کچھ اور غم نہیں
اک انتظار آمد فصل بہار تھا

پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب "کیفی" دہلوی

انڈین پریس الہ آباد

کیا جانتے تھے دل مجھے یہ دن دکھائیگا
یوں ظاہرا یہی تو مرا دوستدار تھا

گھائل کیا جو دل کو تو اسکی خوشی ہے کیا
جاتا کہاں یہ تیر کے ستم کا شکار تھا

خود میں نے کیا دیا کیا یہ بس میں تھا آپکے
کہنے کو صرف دل پہ مرا اختیار تھا

یوں پھیر لی نظر کہ کبھی آشنا نہ تھے
اب کیا بتاؤں مجھسے جو تم سے قرار تھا

میں جانتا تھا آپ کے پیمان و عہد کو
اس پر بھی دل کو تا بہ سحر انتظار تھا

مایوس ہو چلا تھا میں کچھ آج اے اجل
ورنہ تمام عمر ترا انتظار تھا

کیا پوچھتے ہو قصۂ سرگشتۂ جنوں
جنگل کبھی مقر تو کبھی کوہسار تھا

بیجاں ہوا مگر نہ سر مو قدم ڈگے
مجنوں طریق عشق میں کیا استوار تھا

کیونکر ہو یاد مجھکو سب احوال بزم یار
بیخود کبھی رہا تو کبھی ہوشیار تھا

بھولیگا تا بہ عمر نہ رنج زمان ہجر
کیا زندگی تھی موت کو بھی مجھسے عار تھا

گرمی سے جسکی آج بھی دوزخ کباب ہے
وہ میرے دود آہ کا ادنی شرار تھا

غیروں کی سمت تیز نظر آج کیوں چلے
دیکھا تو ہوتا پاس کوئی دلفگار تھا

رہتا ہوں اب میں تیرے تصور سے ہم بغل
وہ دن بھی تھے کہ تجھسے کبھی ہم کنار تھا

تزئین جسم میں رہے معروف عمر بھر
سوچے نہ یہ کہ خانۂ تن مستعار تھا

ساقی وہ مست ناز جو آتا بصد خرام
پھر دیکھتے کہ کون یہاں ہوشیار تھا

کیا دل کا حال ہو گیا صبح شب فراق
دیکھا تو پیرہن کی طرح تار تار تھا

پھیری نظر کہ رشتۂ جاں قطع کر دیا
میری تو زندگی کا اسی پر مدار تھا

جسوقت عسکری میں ہوا یار سے جدا
اپنے سوا بھی میری طرح اشکبار تھا

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

کھلے تھے جیقدر رنگین پھول اس صحن گلشن میں
زمیں گو رنگ بیاں کی لے رہی اپنے دامن میں

یہ کہکر لے لیا دل میرے سینے سے ستمگر نے
تعجب ہے کیا تھا اسکو زندہ دفن مدفن میں

وہ قطرہ خون دل کا آپ کی مد نظر جو تھا
وہی اب برق بنکر دوڑتا ہے ہر رگ تن میں

دکھائی ہے دو رنگی کیا نگاہ گرم نے انکی
کف موسی میں چھپا اور تجلی دشت ایمن میں

تغیر کی ہوائے تند اس کو بھی اڑا دینا
ہمارے دل کے کچھ ذرے ابھی باقی ہیں مدفن میں

خداوندا یہ کس نے آنکھ بھر کر اسکو دیکھا تھا
یہ کیسا زہر چھٹکا ہے مریض عشق کے تن میں

مجسم ذوق عبرت ہوں مرا ہر داغ ہستی ہو
مفصل دیکھ لو تاریخ دنیا کی مرے تن میں

بتائے نماق ارض و سما کس کام آئے گی
مری ہستی کہ اک دھبا سا ہے دنیا کے دامن میں

ثبوت بت پرستی مل گیا قانون فطرت سے
رگیں ابھری ہیں یا ہے رشتۂ زنار گردن میں

اٹھا کے گیا نظر وہ میں رشتۂ نظم عالم کا
بسر کی زندگی کی آخری شب ایسی الجھن میں

عزیز رنگوں دیکھی زمانہ یاد ہے تجھکو
پڑی تھیں چاندی باہیں کبھی تیری گردن میں

پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی

تری حالت سے آنسو ڈبڈبائیں چشم سوزن میں
اگر دلمیں بھی ہو رفو چاک جو ڈالے ہیں دامن میں

جو ہوگا عشق صادق جذب کامل جلوہ گر ہوگا
ضرورت کیا نکلکر گھر سے جائیں دشت ایمن میں

نہ کیوں پہنچے نوا بلبل کی گوش نازک گل تک
مرا یا ہوگا از دل بھر اگر اس کے شیون میں

سمایا ہو جو دل میں یار پھر تعبد مکانی کیا
منو بر دوار کا میں جا بر اجیں یا دکھاون میں

ادھر آؤ سناؤں تمکو حسن و عشق کا قصہ
نجا ذ باغ میں رکھا ہے کیا نسرین و سوسن میں

گلستاں میں جو گل ہے آ اسکو سنکر جا کیدامان ہو
بھری ہے غنچے کی دلبستگی بلبل کے شیون میں

ہے خالق عشق کی یکتائے حسن جہاں آرا
ہے بیٹری سرو کی جو طوق ہے قمری کی گردن میں

نہیں تمیز بزم عشق میں صدر اور پائیں کی
ذرا دیکھو تو سبزہ کس طرح رہتا ہے گلشن میں

محبت نے نہ جیلے دلمیں چھوڑی ہی موجگہ باقی
نہیں وہ فرق کر سکتا ذرا بھی دوست دشمن میں

سکون قلب حاصل خاک ہو دنیا کے لوگوں کو
تلون ہے بڑھاپے میں وہی جو تھا لڑکپن میں

نہ اس میں دل کے ٹکڑے ہیں نہ ہیں لخت جگر اس میں
یہ لے آساں طلب تیر کوئی دامن ہے دامن میں

ہوں مشکل در در ہی پھونکر کیا پاؤں کے چھالے
جو ٹوٹا کوئی کانٹا زیر پا صحرا کے دامن میں

اگر پابند ہو آداب رسم و شرع و ملت کے
تعلق بھائیوں میں وہ ہو جو تھا رام لچھمن میں

لگی باغ جہاں میں آگ کیا جنس محبت کو
جلے گل شاخ پر بلبل غرے سے ہو نشیمن میں

گلے کا بنگیا ہے ہار یہ تار نفس میرا
اٹھی اک ذرا سا دم اس آہ شعلہ افگن میں

نہ تھی منظور شاید ابتری تدوین عالم کی
اثر پاتے نہیں ہیں ہم ابھی برق خرمن میں

تماشے ہیں حرم اور دیر کے دیکھے ہوئے سارے
کریں گے جا کے کیا ہم مجلس شیخ و برہمن میں

یہی طرز غزل خوانی رہی کیفی اگر تیری
عجب کیا شعر بیجا ہیں ترے دلی سے لندن میں

ایڈیٹوریل

مادری زبان میں تعلیم کا اثر | جس وقت ڈاکٹر لائٹنر صاحب آنجہانی نے پنجاب یونیورسٹی کی اسکیم گورنمنٹ عالیہ میں پیش کی تھی تو بڑے مدلل اور معقول دلائل سے ثابت کیا تھا کہ پنجاب کی ملکی، قومی، اور ہر قسم کی ترقی کو مدنظر رکھنے والوں کو چاہیئے کہ وہ اس امر کو تسلیم کریں کہ یہاں والوں کو اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہ کیا جائے جو یورپ وامریکہ کے مہذب ممالک میں عام ہورہا ہے۔ یونیورسٹی کے ساتھ ایک ایسا صیغہ تصنیف وتالیف قایم کرنا بھی ضروری ہے جو علوم متداولہ کو اپنی ملکی زبان کا لباس پہنائے جب اس قسم کا ایک خاص ذخیرہ موجود ہوجائیگا تو اہل ملک کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہوگی۔ شروع شروع میں ڈاکٹر لائٹنر کی اس اسکیم کی بہت مخالفت کی گئی تھی، جس میں سب سے زیادہ اخبار ٹریبیون نے حصہ لیا تھا، اور اس مخالفت کا نتیجہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ اہل پنجاب کی خاص تعلیم ملکی زبان میں ہوتی، اس کے حصول کے لئے غیر ملکی زبان سیکھنی پڑی۔ مگر آج کل کے عام خیالات کا اندازہ ان الفاظ سے لگانا چاہیئے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا موجودہ طریق جس میں انگریزی ذریعۂ تعلیم بن رہی ہے، قانون قدرت کے سراسر خلاف ہے۔ موجودہ طرز عمل کچھ ایسا ہے جسکے روسے چند ایک ابتدائی جماعتوں کے کورس رٹنے کے بعد "مادری زبان" سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔ اگر ڈاکٹر لائٹنر کی اسکیم چل نکلتی، تو اس وقت نہ صرف یورپ کے تمام علوم وفنون کی کتابیں ہماری مادری زبان میں موجود ہوتیں، بلکہ تعلیم یافتہ دماغوں کی محنت اور کوشش سے ہماری زبان بھی "علمی زبان" بن جاتی۔ انگریزی تعلیم کو ذریعۂ ترقی خیال کرنے کے متعلق ۱۹۱۱ء میں ہندوستان ریویو میں کلکتہ کے ایک یورپین پادری صاحب نے ہندوستانی طلباء کی بابت تحریر کیا تھا کہ

مجھے اس میں شک ہے کہ کوئی شخص جو ایک زبان میں فہم وتفہیم کا مادہ نہ رکھتا ہو، اُس کا تعلیم یافتہ بھی ہوسکتا ہو۔ بہت سے ہندوستانی طلباء انگریزی زبان نہیں سمجھتے، اور اسلئے استعجاباً یہ کہنا پڑتا ہے کہ آیا انھیں اصلی تعلیم دی جاتی ہے کہ نہیں ؟

حال میں ماڈرن ریویو میں ایک مضمون چھپا ہے جس میں مضمون مذکورہ کا جواب دیا گیا ہے، مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں کہ

میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہونا چاہیئے۔ یہ شک نہیں بلکہ حق الیقین ہے کہ ہندوستانی طلباء کو اصل تعلیم نہیں دی جاتی۔ ہر قسم کی ترقی کے خیال سے انھیں انگریزی زبان میں غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں اُن کے لئے دیسی زبان ہی کیا کم ہے۔ لہذا مناسب ہے کہ انھیں مادری زبان ہی میں تعلیم دی جائے، اور انگریزی زبان کی تعلیم وتلقین اسی حیثیت سے ہو جیسے فرنچ یا جرمن زبانوں کی ہوتی ہے۔

اگر اُن مدارس میں جو قیصرہ وکٹوریہ خلد آشیانی کے عہد میمنت مہد میں ہندوستان میں قایم ہوئے تھے ڈاکٹر لائٹنر صاحب کے خیال کے مطابق مغربی سائنس کی تعلیم ہندستانی زبان کے ذریعہ سے دی جاتی تو ناممکن تھا کہ ہندوستان بھی جاپان کی طرح ہر قسم کی ترقی نہ کرتا۔ بہر حال اگر اب بھی ہمارے اہل ملک سمجھ جائیں کہ مادری زبان ہی ہر قسم کی ترقی کا ذریعہ ہے تو اُس نقصان سے ضرور ہی بچے رہیں گے جو آیندہ ہونیوالا ہے۔

حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ | گذشتہ اکتوبر میں جب ہم نے حضور نظام کی زمانۂ ولیعہدی کی ایک تصویر مع مختصر حالات ادیب میں شایع کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ کسی آیندہ موقع پر آپ کی تازہ تصویر پیش کریں گے تو اُس وقت ہم نے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ

آپ اپنے نامور اولوالعزم، اور محترم باپ کے قابل فخر جانشین ثابت ہوں، اور آپ کا عہد دکن اور کل ہندوستان کے حق میں اُمید اور توقع سے بڑھکر روشن اور بابرکت ہو، اور یہ "عثمانیہ دور" امور خیر اور علم وفضل کی اشاعت ومعاونت میں "محبوبیہ دور" سے بڑھ چڑھکر رہے۔

اس ایک سال کے عرصہ میں دکن میں جو کچھ اصلاحیں اور ترقیاں ہوئی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا عہد حکومت بھی ممتاز اور رعایا کیلئے

سراپا موجب رحمت و برکت ثابت ہوا ہے، اور جو تمنا اُس وقت ظاہر کی گئی تھی خدا کا شکر ہے کہ وہ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ جس روشن خیالی اور جس دلچسپی سے آپ جملہ انتظامات ریاست کی طرف توجہ مبذول فرما رہے ہیں اُس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ اپنی ریاست کو ترقی اور تہذیب کے اعلیٰ زینہ پر ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند ہز ہائینس کو اپنا محسن لیڈر اور حقیقی وطن دوست سمجھتے ہیں۔ آپ نے مسلم یونیورسٹی فنڈ کی امداد میں اپنی جس روشن ضمیرانہ فیاضی کا اظہار فرمایا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ اُس کو نظر انداز کر دیا جائے اور یہ خبر بھی مسلمانوں میں انتہائے مسرت کے ساتھ پڑھی گئی ہے کہ انگریزی ترجمۂ قرآن کی تحریک بھی حضور نظام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کئے بغیر نہیں رہی۔ حال ہی میں بیشگاہِ سرکارِ عالی سے نواب عماد الملک بہادر کو اس کام میں مدد دینے کے لئے ایک معاون دو سو روپیہ ماہوار کا مقرر کیا گیا ہے۔ نواب عماد الملک ایک ضعیف العمر اور کثیر الاشغال بزرگ ہیں، اور جو عظیم الشان کام انھوں نے اپنے ذمہ لیا ہے اس کی اہمیت اس امر کی مقتضی تھی کہ انھیں ایک عمدہ و مستعد و لایق اسٹاف مہیا کیا جائے جس کو گورنمنٹ نظام نے وقت پر محسوس کر کے گویا ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔

حال میں جو دربار آپ نے تہنیت مسند نشینی کا منعقد فرمایا تھا، اور جو تقریر اُس میں آپ نے اپنی رعایا کے ایڈریس کے جواب میں فرمائی تھی، اُس کا حرف حرف ہز ہائینس کی روشن خیالی اور اعلیٰ تدبر کی شہادت دیتا ہے۔ ہز ہائینس کے الفاظ یہ تھے

اے میرے عزیز رعایائے وفادار و عہدہ داران جان نثار!

تم نے میری مسند نشینی کی تہنیت جس خلوص و عقیدت سے اپنے ایڈریس میں ادا کی ہے اُسی قدر جوشِ محبت نے میرے دل کو اسوقت مسرت و انبساط سے مملو کر دیا ہے۔ میں تمہارا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے اپنے نیک خیالات کا اظہار میری ذات کے ساتھ اُسی پیرایہ میں کیا ہے جیسا کہ تم نے میرے والد مرحوم کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ کیا تھا۔ جو عقیدت و محبت تمکو اُن سے تھی اُسی کا کچھ ایسا روحانی اثر مترتب ہوا ہے کہ جب سے میں اُنکا جانشین ہوا ہوں تمہاری محبت و عقیدت میرے دل میں اُسی طور پر جا گزیں ہے جیسا کہ حضرت مرحوم کے دل صفا منزل میں متمکن تھی۔ جس ہمدردی کا تم نے اپنے ایڈریس میں ذکر کیا ہے انشاء اللہ تعالیٰ مجھے اُمید قوی ہے کہ نہ صرف اسی موقع پر بلکہ دوسرے مواقع پر بھی تم خود بچشم خود اس کو دوسرے لباس میں جلوہ گر دیکھو گے۔

تمھیں خوب معلوم ہے کہ میرے والد مرحوم کے زمانہ میں سرکارین میں اتحاد و یکجہتی و یکدلی کس درجہ رہی ہے۔ پس مجھے یقین ہے کہ میری گورنمنٹ و برٹش گورنمنٹ میں باہمی تعلقات جیسا کہ زمانۂ سابق میں مستحکم رہے ہیں ان میں آیندہ روز افزوں ترقی ہوتی جائے گی۔

آخر میں میں اپنی اس تقریر کو اس جملہ پر ختم کرتا ہوں کہ تمہارے میرے باہمی جذبات قلبی و کشش مقناطیسی نے مجھے ہمیشہ کے لئے آمادہ کر دیا ہے کہ میں اپنی عزیز رعایا کے فلاح و بہبودی و آسایش و رضاجوئی میں ہمہ تن مصروف و سرگرم رہوں اور تمکو یقین دلاؤں کہ میں نے بھی مثل اپنے والد مرحوم کے اپنی ہستی مستعار کو اسی شعر پر وقف کر دیا ہے کہ

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ　　گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

اب صرف حاکم حقیقی سے میری التجا اسی قدر ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے مجھکو اپنے اس ارادہ میں کامیاب فرمائے، اور میری سعی کو بارور کرے کہ میں تم سب کو ہر وقت و ہر آن ہر طرح سے آسایش و آسودگی میں دیکھکر اپنے کو عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور گردانوں۔

نہ صرف ہماری بلکہ تمام وابستگان و بہی خواہانِ دولت آصفیہ کی یہ دلی دعا ہے کہ خداوند کریم ہز ہائینس کے ارادوں میں کامیابی بخشے اور آپ کی سعی مشکور ہو۔ آمین

جنرل نوگی | صدہا ایسے جنرل گزر چکے ہیں جنہوں نے اپنے زمانہ میں خوب خوب دادِ شجاعت دی، اور جن کی ہمت و استقلال کے سکے لوگوں کے دل پر بیٹھ بیٹھ گئے۔ مگر زمانۂ حال میں جو شہرت و ناموری جنرل نوگی نے حاصل کی تھی

وہ عدیم المثال تھی۔ اس نے حقیقی معنوں میں ملکی خدمات انجام دی تھیں ہاں! یہی وہ سچی خدمات تھیں جنکو رقم کرتے ہوئے وقایع نگار کہہ اُٹھتا ہے کہ "میں جاپان! تیرا ہو کے آگے بھی تیری شہادتوں کا تذکرہ کروں گا" یہ شخص نوگی ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوا ستسوما کی بغاوت میں شریک رہا۔ دو دفعہ بہادری کے زندہ تمغے بھی پائے یعنی سخت زخمی ہوا۔ روس کی جنگ میں تیسری فوج کا کمانڈر تھا۔ ۱۹۰۵ء میں کونٹ بنا۔ پورٹ آرتھر پر روسیوں نے جس قسم کی قلعہ بندی کی تھی وہ آپ اپنی نظیر تھی۔ سب اُن کی قلعہ بندیوں کا لوہا مان چکے تھے، اور چونکہ معرکہ ۱۸۹۴ء میں خوب خوب اُنھوں نے جوہر دکھائے تھے، اسلئے عام خیال تھا کہ اس معرکہ میں بھی جاپان کو نیچا دیکھنا پڑے گا۔ مگر بہادر نوگی نے ناممکنات کو ممکن کر کے دکھا دیا، حتی کہ روسی جنرل سٹوسل کو ہزاروں توپوں اور لاکھوں کی تعداد میں فوج کے ہوتے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ جنرل نوگی نے جب سُنا کہ اُسکا اکلوتا بیٹا میدانِ کارزار میں کام آیا ہے تو ایک مسرت بھرے لہجہ میں کہا۔ آج میں اپنی مُراد کو پہنچا۔ شکر ہے کہ میرا بیٹا اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کی خدمت میں کام آیا۔

معرکہ پورٹ آرتھر کے بعد، جنرل نوگی ملکی خدمات سے سبکدوش ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ حال میں جب "میکاڈو" کا انتقال ہوا تو اپنی بیوی سے کہا کہ جب ہمارے قدردان ہی نہیں رہے، تو ہماری زندگی بھی فضول ہے۔ بیوی بھی سمجھ گئی کہ میاں کا کیا مطلب ہے۔ اسکے بعد جنرل نوگی نے ایک وصیت نامہ لکھا جسکا یہ مفہوم تھا کہ "میرے بعد میری تمام جائداد میرے دوستوں میں اور رفاہ عام کے کاموں میں تقسیم کر دی جائے۔ لاش میڈیکل کالج کو دیدی جائے تاکہ طلباء کو اپنے تجربات میں مدد مل سکے۔ صرف ناخن، بال، اور دانت دفن کر دیئے جائیں" آخر جب ۱۳ ستمبر کو توپ دغی کہ اب میکاڈو کا جنازہ اُٹھتا ہے، تو جنرل نوگی نے ملکی لباس پہنکر، اُن پیالوں میں جو شہنشاہ جاپان نے کسی وقت مرحمت کئے تھے ساکی (شراب) نوش کی اور ایک تیز خنجر سے اپنا کام تمام کیا۔ اُسکی بیوی نے بھی اسکا ساتھ دیا اور ایک خنجر اپنے شکم میں بھونک لیا۔ ایک طالب علم جنرل نوگی کے مکان میں رہتا تھا، اتفاقاً جب وہ ان کے کمرہ میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ دونوں میاں بیوی شہنشاہ جاپان کی تصویر کے سامنے دم توڑ رہے ہیں۔ غرض آناً فاناً میں یہ خبر تمام دارالخلافت میں پھیل گئی۔

ہندوستان میں کسی زمانہ میں عورتیں اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہوا کرتی تھیں۔ مگر اب قانوناً یہ رسم بند کر دی گئی ہے۔ اس قسم کے "ایثار" کو بھی خودکشی کا لقب دیا جاتا ہے اور جیو ہتیا کرنے والے نرک کا کندا سمجھے جاتے ہیں مگر اہل جاپان کے نزدیک ایسا شخص حقیقی ایثارِ نفس کا پورا نمونہ ہے۔ اُن کے خیال میں یہ کوئی نئی رسم نہیں بلکہ جنرل نوگی کی خودکشی سے وہی پُرانی رسم "کوہاری گاری" تازہ ہو گئی ہے جسکا یہ مطلب ہے کہ جنرل نوگی نے اپنی جان اپنے مرحوم بادشاہ کے لئے قربان کر دی۔

تصریحِ تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویر انڈین پریس ہی کے ایک مصور کی صناعی کا نمونہ ہے۔ اس میں وقتہ دکھایا گیا ہے جبکہ بھیشم جی اس بات کا عہد و پیمان کرتے ہیں کہ میں عمر بھر برہم چریہ قایم رکھونگا اور ہرگز شادی نہ کرونگا۔ نہ میں شادی کرونگا اور نہ میری اولاد ہوگی جس سے ستیہ وتی کی اولاد کو سلطنت نہ ملنے کا خوف رہے۔ اس مشکل عہد و پیمان کرنے کی وجہ سے آپکا نام "بھیشم" مشہور ہوا۔ بھیشم کے پاس ہی انکا وزیر کھڑا ہے۔ وزیر کے بائیں جانب کمار کھڑا ہے۔ مکان کے دروازہ پر کمار کی بیوی اور دو بچوں کے علاوہ ستیہ وتی دریچہ پر کھڑی ہے۔

ڈاکٹر اے ایچ ایونگ کی وفات سے اس صوبہ کا ایک مشہور ایجوکیشنلسٹ جاتا رہا ہے۔ آپ تعلیمی معاملات میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور سنڈیکیٹ کے سرگرم ممبر تھے۔ کچھ عرصہ تک آپنے رجسٹرار کی خدمات بھی انجام دیں۔ الہ آباد کرسچن کالج کے آپ بانی تھے، اور جو کچھ اس کالج نے ترقی و شہرت حاصل کی ہے، وہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ آپ ۱۸۷۹ء میں ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ شروع شروع میں آپ پنجاب میں تعینات ہوئے، مگر ۱۹۰۱ء میں الہ آباد بھیجے گئے تھے، اور اس دس برس کی قلیل مدت میں آپنے وہ وہ کام کئے جسکے لئے مدتیں درکار ہوتی ہیں آپ کی ہردلعزیزی اور تعلیمی شغف کا ثبوت اسی بات سے مل سکتا ہے کہ اس صوبہ کے تمام کالج اور اسکول آپ کے ماتم میں ایک دن بند رہے۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی ہمارے قدیمی مہربان اور ادیب کے قلمی معاون ہیں گذشتہ دربار دہلی کے موقعہ پر بادشاہی سیلہ میں سب سے عمدہ قصیدہ پیش کرنیکے صلہ میں ہز آنر سر لوئی ڈین صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر پنجاب نے پنڈت صاحب موصوف کو ایک تمغہ اور سند عطا فرمائی تھی یہ قصیدہ ادیب کے دربار نمبر میں درج ہو چکا ہے۔ آپ کی تصنیفات سے "توزک قیصری" بہت مشہور ہے جسکو ہندوستان کی منظوم تاریخ کہنا چاہیئے۔ اس میں زمانہ قدیم سے لیکر دہلی کے شاہی دربار تک تاریخ ہند کے تمام واقعات دلچسپ پیرایہ میں نظم کئے گئے ہیں۔ انجمن ہوسار پنجاب نے اس کے صلہ میں آپ کو ایک طلائی تمغہ عطا کیا ہے۔

(پیدائش ۱۸ - اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ع - وفات ۱۳ - ستمبر سنہ ۱۹۱۲ع)

دانتی اور عالم خواب

انڈین پریس الہ آباد
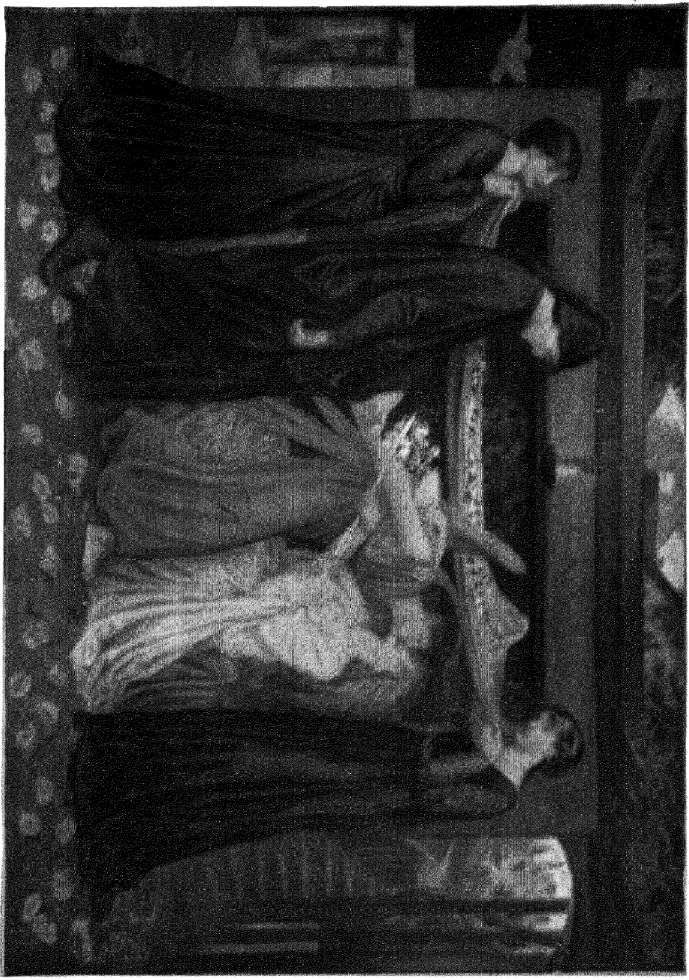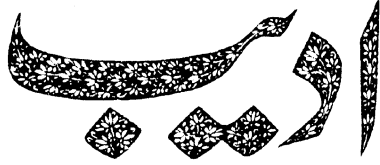
سائنس

عام خیال

اگر یہ کہا جائے کہ جہالت تمام غلط فہمیوں اور جھگڑوں کی بانی ہے تو راستی او حق سے بعید نہ ہوگا۔ الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم کی جہالت سے معرکتہ الآرا مسائل اور علوم کے حقیقی مفہوم و معنی کی نسبت عوام میں انواع و اقسام کے غلط خیالات رائج ہوجاتے ہیں۔ انگریزی علوم و فنون کے رواج اور انگریزی لغات کے اردو میں تسلط و اشاعت پذیر ہوجانے سے جتنی غلط فہمیاں بعض اصطلاحات اور الفاظ کی نسبت مروج ہوگئی ہیں ان میں سے ایک لفظ سائنس بھی ہے جس کے اصلی معانی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے معمولی پڑھے لکھوں میں مضحکہ خیز خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کسی اسکول کے لڑکے سے پوچھو کہ تم نے کیا کیا مضامین لئے ہیں؟ تو انگریزی، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ کا نام لینے کے بعد بڑے فخر کے ساتھ سائنس کو بھی اپنے نصاب میں شامل بتائیگا۔ بازار میں دینی بحث مباحثہ میں بھی بیچارے سائنس کی شہادت پیش کی جاتی ہے "سائنس معجزے اور خرق عادت کا مخالف ہے"۔ معمولی بول چال میں مڈل انٹرنس کے پڑھے ہوئے بات بات میں بدنصیب سائنس کو دھر گھسیٹتے ہیں۔ اشیائے خوردنی و نوشیدنی کے مفید و مضر ہونے کے لئے بھی سائنس ہی کی گواہی پیش کی جاتی ہے۔ مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی کے چند واقعات یاد ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ دلی میں دو لڑکوں نے ایک سکھ لڑکے سے کہا کہ لمبے بال سر پر رکھنا وحشت کی یادگار ہے۔ اس پہ اس لڑکے نے بگڑ کر کہا "سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ لمبے بال رکھنا صحت کے لئے نہایت مفید ہے"۔ چند برس کا ذکر ہے کہ میرے تبدیل مذہب پر میرے دوست آشناؤں نے جو ایف، اے اور بی، اے میں پڑھتے تھے بڑے جوش سے کہا "جس مذہب کو تم نے اختیار کیا ہے سائنس کے رو سے وہ سراسر جھوٹا ہے۔ تمہاری دینی کتاب کے شروع میں لکھا ہے "خدا نے زمین و آسمان کو چھ روز میں بنایا"۔ "سائنس کہتا ہے یہ بالکل لغو اور بے بنیاد ہے"۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی سائنس کا طالب علم نہ تھا میں یہ واقعات اور نظائر محض لفظ سائنس کے عامیانہ استعمال کو واضح کرنے کے لئے بیان کر رہا ہوں کہ کس طرح ایک لفظ اور اسکے حقیقی مفہوم کی غلط فہمی نے ہمارے جملہ تعلقات پر کتنا اثر و تصرف حاصل کر رکھا ہے۔ مڈل اسکول کے

طلبا کو طبعیات کی چند موٹی موٹی باتیں بتائی جاتی ہیں اور وہ اسی کو سائنس تصور کرتے ہیں۔ انٹرنس میں طبعیات اور کیمسٹری کی اُصولی باتیں سکھائی جاتی ہیں اور ان کی کائنات سائنس انہی دو ننھی کتابوں تک محدود ہے جنھیں آپ پتلون کی جیب میں ڈال کر جہاں چاہیں لیجا سکتے ہیں علیٰ ہذا کہاں تک بیان کیا جائے۔

سائنس کی تشریح

اب سائنس کے مفہوم حقیقی پر غور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسکا اصل مقصد کیا ہے؟ اس لفظ کا صحیح اطلاق کیا ہے؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟ اہل تحقیق اور ارباب تدقیق اسکی بابت کیا سمجھتے ہیں؟ اگلی بحثوں میں اس کے مسائل اور اسکے جملہ شعبوں سے بحث ہوگی۔ لفظ سائنس لاطینی لفظ "سائنشیہ" (Scientia) سے مشتق ہے جسکے معنی "علم" کے ہیں اور "سائنشیہ" کا ماخذ لفظ "سائیو" (Scio) ہے۔ جسکے معنی "جاننا" ہے۔ سنسکرت میں اسے "انوشاسن" کہنا بجا ہوگا اور عربی اصطلاح میں علوم تجربیہ قرار دینا غیر انسب نہوگا۔ سائنس ہر قسم کے علم پر حاوی ہے جو مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ فی زمانہ اس کے مفہوم نے ایک خوفناک وسعت اختیار کر لی ہے مگر کچھ عرصہ پیشتر اسکا اطلاق علوم طبعیہ پر ہوتا تھا۔ اسکولوں اور کالجوں میں اسکے معانی طبعیات کیمسٹری وغیرہ دو چار علوم تک محدود ہیں لیکن عالموں اور محققوں اور فلاسفروں کے نزدیک سائنس زمین و آسمان کے باقاعدہ اور یقینی حالات پر حاوی ہے جو انسان نے اپنی تحقیق و تجسس سے معلوم کئے ہیں اور یہاں تک اسے وسعت دی ہے کہ اپنے جسم اور دل اپنی عقل اپنی کردار، اپنی طرز معاشرت، اور اپنے جملہ تعلقات کو اس کے تابع کر دیا ہے۔ سائنس بحر علم ہے جس کے کنارے اور عمق کی حد نہیں ہے۔ ساکنین خلا، اجرام فلکی، اراکین نظام شمسی، تارے، چاند، وغیرہ سب ہستیاں اسکے اندر مقید ہو گئی ہیں۔

محققوں اور عالموں کے خیالات

اس زمانہ کے بڑے بڑے عالم اور سائنس داں سائنس کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ یہاں پر بہت اختصار کے ساتھ چند آرا کا اقتباس دیا جاتا ہے جس سے ناظرین اسکی نسبت صحیح خیالات قائم کر کے غلط فہمیوں سے اپنے دل و دماغ کو صاف کر سکتے ہیں۔

(۱) ہربرٹ اسپنسر: زمانۂ حال کے افلاطون اور سب سے بڑے فلاسفر ہربرٹ اسپنسر کا قول ناطق سمجھا جاتا ہے اسلئے سب سے پہلے اسی کے خیالات دیئے جاتے ہیں۔

سائنس کیا ہے؟ سائنس علم عامہ کے ارتقائے اعلیٰ کا نام ہے۔ اگر اس سے انحراف کیا جائے تو اسکے ساتھ ہر قسم کے علم سے انکار کرنا لازم آتا ہے۔ ... علوم روزانہ زندگی کے تجربوں سے پیدا ہوتے ہیں اور جیسے وہ نامعلوم طور پر بڑھتے ہیں اسی طرح وہ زیادہ دور افتادہ اور پیچیدہ تجربوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ... کوئی خط کھینچ کر یہ کہنا محال ہے کہ سائنس یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جیسے معمولی مشاہدہ سے کردار کی ہدایت کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح سائنس کے نتائج مجردہ عمیق کا کام زندگی کی رہنمائی کرنا ہے۔ ... سائنس دور بینی ہے۔ اور دور بینی کا مقصد کم و بیش اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا اور زیاں کاری سے بچنا ہے۔ ... یا تو ہمیں وسیع ترین علم حاصل کرنا چاہیئے جو ہمارے قواء عقلیہ حاصل کر سکتی ہیں یا اگر اسکی پروا نہ کی جائے تو اس عامیانہ اور محدود علم سے بھی انکار کرنا چاہیئے جس سے ہر کس و ناکس بہرہ یاب ہے۔ ... سائنس حقایق کا نظام منضبط ہے جو ہمیشہ وسعت اختیار کرتا اور ہمیشہ اغلاط سے پاک ہوتا رہتا ہے۔[1]

جب ہم مظاہرہ موجودات کی اندرونی ترتیب و باقاعدگی کے علم معینہ کو سائنس کے نام سے پکارتے ہیں تو یہ لازم آتا ہے کہ کسی قاعدہ اور

[1] منقول از فرسٹ پرنسپلز (اصول اولیہ) صفحہ ۱۳-۱۴-۱۵

ترتیب کے انکشاف سے اس فاسد خیال کو صدمہ پہنچے جو عدم ترتیب کی بابت عوام کے دلوں میں سُنی سُنائی باتوں سے قایم ہو جاتا ہے جب تجربہ سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ فلاں اسباب سے فلاں نتایج پیدا ہوتے ہیں تو دل سے ان اشخاص کے توسط کا وہم دور ہو جاتا ہے جو ان کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔[1]

فلسفی حقایق کو اعلیٰ ترین سائنسی سچائیوں سے وہی نسبت ہے جو سائنس کی ادنیٰ حقیقتوں کو ایک دوسرے سے ہے - جیسے سائنس کا عظیم ترین کلیہ ادنیٰ کلیات پر حاوی ہے اور انھیں استحکام بخشتا ہے اسیطرح فلسفے کے کلیات سائنس کے عظیم ترین کلیات پر حکمران اور ان کی تقویت کے موجب ہوتے ہیں . . . . یا بالفاظ دیگر یہ کہنا مناسب ہے کہ ادنیٰ ترین درجہ کا علم غیر متحدہ وغیر منضبط ہے - سائنس ایک حد خاص تک علم منضبط ہے، اور فلسفہ پورا پورا علم منضبط ہے -[2]

یہ ہے سائنس کی فلسفیانہ اور عالمانہ تشریح، جس میں اسکا مفہوم حقیقی اور اسکا مقصد اصلی اور اسکا حلقۂ وسعت بیان کیا گیا ہے - اس سے بہتر توضیح ملنا محال ہے - اس سے ظاہر ہے کہ سائنس وہ علم ہے جو قاعدہ اور قانون کے تابع ہے، جسکے تمام شعبے اور مطالب معقول ضوابط کے مطیع رہتے ہیں - اس میں اور عامیانہ علم میں یعنی ایک معمولی آدمی اور ایک محقق عالم کے علم یعنی علومات میں اتنا فرق ہے کہ اول الذکر کے خیالات اور معلومات پھوہڑ عورت کے گھر کی مانند ہیں جو ہر قسم کے قرینہ اور سلیقہ سے بیگانہ ہے - برعکس اسکے موخر الذکر کا علم بنئے کی دوکان کی طرح ہے جہاں ہر ایک شے قرینہ کے ساتھ دھری رہتی ہے جب کوئی گاہک آتا ہے تو وہ فوراً اسکی خاص ضرورت کی چیز کو اٹھا کر دے دیتا ہے - ہم روزمرہ کی زندگی میں ہر قسم کے واقعات اور حالات سے دوچار رہتے ہیں - اہل نظر اور صاحب فکر انھیں غور سے دیکھتا بھالتا ہے - ہزار دو ہزار واقعات کو دیر تک مشاہدہ کر کے استخراج نتایج کرتا ہے، اور ان سے مستفید ہوتا ہے - یہ علم اور یہ نتایج اسکے ذہن میں مستقل صورت متمکنہ اختیار کر لیتے ہیں اور علم کی حیثیت قبول کرتے ہیں - یہ سائنس ہے -

[1] منقول از فرسٹ پرنسپلز (اصول اولیہ) صفحہ ۶۰
[2] منقول از فرسٹ پرنسپلز (اصول اولیہ) صفحہ ۱۰۴

(۲) ہکسلے | پروفیسر ہنری ٹامس ہکسلے ایک نہایت مشہور جید عالم تھے جنکی مساعی حسنہ سے ڈارون کے مسائل اور خیالات کو انگلستان میں اس قدر شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی تھی - وہ کہتے ہیں:

میری رائے میں سائنس صرف تربیت یافتہ اور منضبط عقل کا نام ہے - تربیت یافتہ اور معمولی عقل میں وہی فرق ہے جو ایک قواعد دان و آزمودہ کار سپاہی اور نوآموز رنگروٹ میں ہوتا ہے - ان دونوں کے طریق عمل میں بھی وہی اختلاف ہے جو ایک مہذب شمشیرزن اور وحشی کی جنگ آرائی میں ہوتا ہے -[3]

(۳) ڈیوک آف آرگائل | جارج ڈگلس ڈیوک آف آرگائل ایک نہایت مشہور عالم تھے - آپ فرماتے ہیں:-

ایک سے زیادہ اشیاء کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ ہماری قوتوں سے انکا کیا علاقہ ہے - یہ سائنس یا علم ہے یعنی موجودات کے باہمی تعلقات اور نیز ان کے اور ہمارے درمیانی تعلقات کا نام سائنس ہے - ہمارا علم محدود ہے، اور سائنس اشیاء کے چند باہمی تعلقات اور نیز ان کے نظام عالم کے علاقہ تک محدود ہے - مشابہت میں اختلاف اور اختلاف کے درمیان مشابہت معلوم کرنا بجائے خود ایک قسم کا ادراک اور موجودات کے حقیقی تعلقات کا علم ہے، اور یہ عقلی عمل سائنس سے متعلق ہے -[4]

ایک اور عالم جو علوم کی دنیا میں بہت معزز نہیں سمجھا جاتا کہتا ہے "سائنس دو ..."

[3] منقول از "سائنس اینڈ ایجوکیشن" صفحہ ۴۵
[4] منقول از ڈواٹ سائنس از "سائنس کیا ہے" صفحہ ۱۱

موجودات کی ابتدا اور ہستی کے نظریہ کا نام ہے"[۱] مشہور عالم جارج لوئیس کہتا ہے "خصوصیات کے وسیلہ سے جو مختلف کلیات حاصل کئے جاتے ہیں انھیں کسی ضابطہ یا نظام کے تابع کرنا سائینس ہے۔ مظاہر کے قاعدہ کے علم کو کسی قانون کی صورت دینا سائینس کا کام ہے۔ اسکے وسیلہ سے معمولی علم اور واقعات ایک علم کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ مظاہر کے قانون کی توجیہ بھی اسی کے ذریعہ سے ہوتی ہے کیونکہ وہ انھیں تعاصر اور تسلسل کے قواعد کے تابع کرتا ہے اور خاص حقایق و واقعات کے عام تصورات کی جماعت بندی کرتا ہے۔ الغرض سائینس علم اور معلومات بہم پہنچاتا ہے"[۲] سائینس ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم قواء طبعی کے تصادم سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں، اور دوسری طرف ہم ان سے مدد لیکر کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں چنانچہ قوا، قدرتی کے علم اور ان کے قاعدوں سے واقفیت پیدا کر کے انسان نے ان سے اپنے حسب منشا کام لینا شروع کر دیا ہے۔ برقی اور مقناطیسی قوتوں سے کیسے حیرت انگیز کام ہو رہے ہیں۔ یا نی انسان کی مصروفیتوں کے کتنے شعبوں پر حاوی ہے یہ سب سائینس کے ظہورات ہیں۔ سائینس نظام عالم کے متعلق تصورات اور خیالات بہم پہنچاتا ہے۔ موجودات کے تمام تغیرات اور تبدلات اسکے زیر فرمان رہتے ہیں۔ اسکی مملکت صرف عالم مرئی تک ہے۔ اس سے آگے بڑھنا اسکے امکان سے باہر ہے۔

(۴) دیگر علماء کے خیالات | فزیالوجی کے مشہور استاد پروفیسر گوچ صاحب کہتے ہیں "مظاہر و موجودات کے انتظام کو باعتبار اسباب انتظام دینے کا نام سائینس ہے"[۳] بالفاظ دیگر اسباب و نتایج کے سلسلہ کی تحقیق و تجسس کا نام سائینس ہے۔ کائنات کے اندر مختلف قسم کے تغیرات کیوں ہوتے ہیں؟ ان کی توجیہہ اور تشریح اور ان کے اسباب کی تلاش کی کوشش عقلیہ علم ہے۔ ڈاکٹر مرس کہتے ہیں "سائینس سے مراد مظاہر کے اسباب و نتایج کی جو مکان و زمان میں ظاہر ہوتے ہیں تحقیق و تلاش ہے"[۴] پروفیسر ٹامسن صاحب نے نہایت مختصر طور پر سائینس کی تشریح یوں کی ہے کہ "جو واقعات و حقایق تجربہ میں آتے ہیں ان کے تفصیلی، صحیح اور علمی بیان کا نام سائینس ہے" یعنی مشاہدہ میں جو باتیں آتی ہیں انھیں ایسے ڈھنگ سے بیان کرنا کہ ان کی حقیقی شکل و صورت آنکھوں کے سامنے آئے۔ چاہے وہ درخت ہوں یا جانور، پہاڑ ہوں یا دریا، چٹان ہوں یا ہڈیاں۔ یہاں موجودات اور اشیا کے عمیق اور صحیح مشاہدہ پر زور دیا گیا ہے۔ پروفیسر ممدوح کہتے ہیں کہ اس خیال اور توضیح کے ساتھ یورپ کے دیگر مشہور محقق مثلاً روسی عالم کرشوف، جرمن عالم ماخ، اور کارل پیٹرسن اور انگریز محقق وارڈ، وغیرہم بھی متفق ہیں۔

پروفیسر وے تم سائینس کی تشریح یوں کرتے ہیں:—

لفظ سائینس اُس باقاعدہ اور منضبط علم کا نام ہے جو ہم مظاہر موجودات کی بابت مشاہدہ سے حاصل کرتے ہیں۔ نیز اسکا اطلاق تعلقات کے اُس علم پر بھی ہوتا ہے جو موجودات اور تغیرات کے درمیان ظاہر ہوتا ہے۔[۵] (دوسری جگہہ پروفیسر صاحب کہتے ہیں) سائینس ہر قسم کے علم کے وسیع ذخیرہ پر حاوی ہے۔

ہارمس ورتھ کی انسائیکلوپیڈیا میں ایک عالم سائینس کی بابت یوں لکھتا ہے:—

عامیانہ استعمال اور معنی میں سائینس کا اطلاق علوم طبعیہ پر ہوتا ہے مگر یہ تغیرادنی اسکا اطلاق اور قسم کی تحقیقات اور علوم پر بھی ہوتا ہے

---

[۱] "نیولائٹ ان اولڈ پرابلمز" مصنفہ جان ولسن صفحہ ۱۰ [۲] از "سائینس اینڈ اسپکیولیشن" صفحہ ۵ [۳] منقول از "انٹروڈکشن ٹو سائینس" صفحہ ۴۳ مصنفہ پروفیسر آرتھر جے۔ ٹامسن جنوری ۱۹۱۲ء۔

[۴] از "ہسٹری آف یوروپین تھاٹ ان نائنٹینتھ سنچری" بحوالہ [۵] از "فونڈیشن آف سائینس" یہ کتاب گذشتہ جون کی چھپی ہوئی ہے۔

جیسے "مارل سائینس" "پولٹیکل سائینس" وغیرہ ہے۔ مگر اس سائینس کے درمیان جو حقایق عامہ سے بحث کرتا ہے اور اس تحقیقات کے درمیان جس کا مقصد خاص قسم کے واقعات تلاش کرنا ہے امتیاز ہو سکتا ہے، اور یہ امتیاز سائینس کے تحت میں آتا ہے ۔۔۔۔ الغرض سائینس ہر قسم کے علم پر حاوی ہے جس میں ترتیب اور قاعدہ پایا جائے اور جو خاص علمی و تحقیقی طریقہ سے حاصل کیا جائے - پس ظاہر ہوا کہ سائینس ہر قسم کے منضبط اور باقاعدہ علم کا نام ہے[1] -

پروفیسر ہکسلے ایک اور جگہہ پر سائینس کی تشریح یوں کرتے ہیں "سائینس قوانین قدرت کے اُس علم کا نام ہے جو مشاہدہ، تجربہ، اور استدلال (استقرائی، واستخراجی و تمثیلی) سے حاصل کیا جاتا ہے"[2] ایسی واضح، جامع، اور عام فہم، تشریح ملنا دشوار ہے - وہی عالم پھر آگے چلکر کہتا ہے "ہر قسم کے صحیح اور واضح علم کا نام سائینس ہے" یعنی علم چاہے کسی قسم کا ہو اگر اسکے اصول اور ضوابط نہایت معقولیت سے قایم کئے گئے ہوں تو وہ سائینس کی ذیل میں شمار ہو سکتا ہے -

ڈاکٹر الگزنڈر ہل نے سائینس کی یوں تشریح کی ہے "سائینس اس علم کا نام ہے جو ضابطہ کے تابع ہو اور نظام میں مقید ہو"[3] علم کیا ہے، علم اُس صورت متمکنہ کا نام ہے جو ہم اشیا اور موجودات کی بابت قایم کرتے ہیں - اس میں ایک طرف تو عالم اور دوسری طرف معلوم (جانی ہوئی شے) ہوتا ہے - ان دونوں کے درمیان جو تعلق پایا جاتا ہے وہ علم ہے - ایک سادہ لوح آدمی سورج کی نسبت یہ خیال رکھتا ہے کہ ایک بڑا گولا ہے جو صبح کو مشرق سے نکلتا ہے، اسے روشنی اور گرمی پہنچاتا ہے، اور شام کو مغرب میں پہاڑوں ٹیلوں یا درختوں کے جھنڈوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے - مگر صاحب فکر اور مشتاق علم اسے دیکھکر بیسوں سوالات پوچھتا ہے - سورج کیا ہے اس سے روشنی اور حرارت کس طرح پیدا ہوتی ہے ؟ کیا یہ بذات خود کرۂ نار و نور ہے ؟ یہ کس چیز سے بنا ہے ؟ وغیرہ اور پھر وہ ان سوالات کا جواب باصواب بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے - وہ ان اشیا اور سورج کے درمیان مماثلت اور مشابہت قایم کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اسکے دیکھنے میں آتی ہیں - مگر وہ ایک قاعدہ اور کسی معیار کو مدِ نظر رکھتا ہو جس سے اپنے قیاس کی صحت اور عدم صحت کا اندازہ کرتا ہے اس طریقہ سے جو علم وہ آفتاب کی نسبت حاصل کرتا ہے وہ باقاعدہ یعنی معقول علم ہوگا کیونکہ اسکے حصول میں اس نے مقررہ قاعدہ سے کام لیا ہے اور اس قسم کے علم کو سائینس کے نام سے پکارا جاتا ہے -

سائینس علم کا مترادف اور ہم معنی ہے، اور اسکے بغیر گذارہ نہیں کیونکہ اس سے علم کی حقیقی قدر و قیمت لازم ٹھہرتی ہے - اسکے وسیلہ سے نہ صرف موجودات و ظہورات ہی سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ ان کے درمیان جو اختلاف یا اتفاق یا مشابہت پائی جاتی ہے وہ بھی ظاہر ہوتی ہے - اس سے یہہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ حقایق کے درمیان کیا علاقہ ہے اور ان دونوں کا کیا تناسب ہے - سائینس علم مشاہدہ ہے یعنی یہہ وہ علم ہے جو ہمیں روزمرہ کے مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے - اس میں ماضی کے واقعات اور حالات کا علم بھی شامل ہے - یہہ محض واقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہے جو ذہن کے سامنے بیکایک آتا ہے بلکہ واقعات کا انجام بھی معلوم کیا جاتا ہے - اس سے ظاہر ہوا کہ سائینس محض واقعات ہی کا علم نہیں بہم پہنچاتا بلکہ ان سے استخراج نتایج بھی کیا جاتا ہے - مشاہدہ کنندہ معلومات اور واقعات کے درمیانی تعلقات کو بھی معلوم کر سکتا ہے اور ان سے مفید نتایج اور خیالات اور ضوابط اخذ کرتا ہے -

سائینس کے مفہوم سے جو علم واضح ہوتا ہے وہ حال ہی سے

---

[1] جلد ہفتم صفحہ ۷۰۸ ۔ [2] از "انٹروڈکٹری سائینس پرائمر" صفحہ ۱۶ -
[3] از "این انٹروڈکشن ٹو سائینس" -

متعلق نہیں ہوتا بلکہ ماضی سے بھی علاقہ رکھتا ہے جو عالموں نے گذشتہ صدیوں میں اپنی کوششوں سے بہم پہنچایا ہے - اور یہہ کہ آیندہ بھی اسکی توسیع ہوگی مگر اسکی کوئی حد نہیں محقق حاصل کئے ہوئے علم کو لیکر تحقیق و جستجو کا کام شروع کرتا ہے - وہ زیادہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے - سیاحت کے دوران میں جو نئے جانور اسکے دیکھنے میں آتے ہیں وہ ان کی صورت و شکل اور رنگت کا حال بیان کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ سوال کرتا ہے - اسکی شکل ایسی کیوں ہے ؟ اور قسم کی کیوں نہیں ہے ؟ کن وجوہ سے یہہ تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں وغیرہ - سائنس ماضی کے واقعات علمیہ کی بنا پر آگے بڑھتا ہے - دریافت کرتا اور سیکھتا چلا جاتا ہے - اسکے علم و تحقیقات کی کوئی حد نہیں

سائنس ان تمام عقلی کوششوں پر حاوی ہے جو انسان اپنے اردگرد کے حالات، اشیاء وغیرہ کی نسبت اپنے معلومات بڑھانے کے واسطے کرتا ہے اور چند معقول و مقررہ قاعدوں سے ہی اپنی تمام کوششوں کی ہدایت کرتا ہے - اسکے رو سے مظاہر طبعی کو مشاہدہ کیا جاتا ہے اور ان قوانین کو دریافت کیا جاتا ہے جنکے سبب سے وہ معرض وجود میں آتے ہیں - الغرض سائنس مظاہر فطری کا مشاہدہ اور پھر اس مشاہدہ سے جو نتایج برآمد ہوں انھیں مختلف گروہوں میں تقسیم کرنا اور ان کے اسباب معلوم کرکے ان سے خاص قوانین وضع کرنا جنکے تابع مظاہر رہتے ہیں اور جنکے مطابق وہ وجود پذیر ہوتے ہیں

سائنس کا کیا مقصد ہے

سائنس کے مفہوم و معانی پر بحث کرنے کے بعد اب اسکے مقصد اولی کی طرف رجوع ہونا مناسب ہے - ارسطا طالیس کہتا ہے "آرٹ (سائنس) تجربات کی وسیع تعداد سے شروع ہوتا ہے - ایک وسیع تصور قایم کیا جاتا ہے جو اسی قسم کے واقعات پر حاوی ہو جاتا ہے" پروفیسر کارل پیرسن لکھتے ہیں "حقایق کی تقسیم و ترتیب لگانا اور ان کے سلسلہ اور نسبتی اہمیت کو پہچاننا سائنس کا خاص کام ہے اور ان واقعات کی بنا پر اپنے ذاتی تعصبات و خیالات کو بالائے طاق رکھکر رائے قایم کرنا تجسس پسند عقل کا خاصہ ہے"[1] "سائنس کا اصلی مقصد یہہ ہے کہ عالم کا جس کا ادراک عقل انسانی کے لئے ممکن ہے واضح اور معقول حال بیان کرے"[2] پروفیسر ٹامسن صاحب اپنی کتاب میں کسی دوسری جگہہ لکھتے ہیں "سائنس کا مقصد تجربہ کے غیر شخصی واقعات کو قابل تصدیق الفاظ میں حتی الوسع نہایت عام فہم پیرایہ، اور حتی الامکان نہایت مکمل و مفصل طریقہ اور وضاحت و صراحت سے بیان کرنا ہے یہ عقلی ترکیب اور دنیا کا عملی نمونۂ خیال ہے - یہ عالم کے حالات کو ایسے ڈھنگ سے بیان کرتا ہے کہ تجربہ سے ان کی تائید ہو سکتی ہے" سائنس عالم کے قابل فہم حقایق سے بحث کرتا ہے - روحانی اور طبعی ہر دو عملوں سے اسکا واسطہ ہے یعنی انسان اور کائنات، دونوں کے حالات سائنس تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے - الغرض کوئی ایسی شے اسکے حلقۂ وسعت سے بعید نہیں رہ سکتی جو اس کے طریقۂ تحقیق کی زد میں آسکتی ہے -

سائنس کا نفس مضمون وہ حقایق و واقعات ہیں جو تجربے میں آتے ہیں اور جنکی تصدیق و تائید ہو سکتی ہے - اس میں تین امور ہیں

(۱) سب سے پہلے اصلی واقعات اور فرضی حالات میں خوب ہوشیاری سے امتیاز کرنا لازم آتا ہے - اسکے بعد سائنس کا طریقۂ عمل ممکن ہوتا ہے

(۲) سائنس اصلی واقعات سے سروکار رکھتا ہے - اس سے یہ مراد ہے کہ واقعات جو ہمیں کائنات کے اندر اپنی طبعی صورت میں نظر آتے ہیں

(۳) سائنس نے اپنے واسطے یہ قاعدہ مقرر کر لیا ہے کہ وہ صرف ایسے واقعات سے سروکار رکھتا ہے جنکی تشریح و تائید ممکن ہے جن امور کو بخوبی بیان نہ کیا جا سکے، یا جنکی اصلیت کی تصدیق نہ ہو سکے،

---

[1] از "گرامر آف سائنس" [2] از انٹروڈکشن ٹو سائنس (مقدمہ سائنس) صفحہ ۲۶

سائنس انھیں نظرانداز کرتا ہے۔ مثلاً بعض تجربوں سے صرف ایک ہی شخص دوچار ہوا ہے دوسرے لوگ ان کی ماہیت اور اصلیت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ جیسے مظاہر روحانی: ارواح کو دیکھنا یا ان سے گفتگو کرنا، زندہ اشخاص کو خاص موقعوں پر اپنے مکان سے بہت دور رکھنا وغیرہ۔ یا کسی سیاح کا یہ بیان کرنا کہ اس نے آسٹریلیا کے وسطی جنگلوں میں ایک گوری پستہ قد وحشی قوم کو دیکھا ہے۔ سائنس اسے تسلیم نہ کریگا جب تک اس کی تصدیق دیگر معتبر وسائل سے نہ ہو سکے۔

سائنس کا کام موجودات کے اسباب معلوم کرنا بھی ہے۔ سلسلہ اسباب و نتائج، علت العلل کی ماہیت کا کھوج، مبداء عالم، اور نیز یہ کہ موجودات عالم، اور مختلف انواع کا ایک ہی آغاز ہے یا ایک سے زیادہ، ان سب معاملات پر بحث کرنا بھی سائنس کا کام ہے۔

الغرض سائنس کا مقصد کائنات اور مافیہا کا علم حاصل کرنا ہے۔ قدرت کے اندر ہزارہا قسم کی اشیا ہیں ان کے تعلقات باہمی اور وہ قوانین جن سے جملہ تعلقات اور تغیرات عمل میں آتے ہیں، نیز مختلف ہستیوں کی اصلیت معلوم کرنا بھی اس کا کام ہے۔ الغرض بے جان اشیاء، معدنیات، نباتات، حیوانات، اور نوع انسان سب کے سب سائنس کی مملکت کے باشندے ہیں۔

سائنس کے طریقے

سائنس کا طریقہ تحقیق یعنی کسی ہستی کے صحیح و واضح علم حاصل کرنے کا ڈھنگ نیا نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو صدیوں سے علمی دنیا میں رائج چلا آتا ہے۔ ارسطاطالیس کے زمانہ میں تین طرح سے استدلال کر کے استخراج نتایج کیا جاتا تھا۔ یعنی کسی امر کی سچائی یا کذب دریافت کرنے کے حسب ذیل ڈھنگ مروج تھے (۱) خاص امر سے خاص امر کی طرف استدلال کر کے خاص نتیجہ اخذ کرنا۔ جسے استدلال تمثیلی یعنی Analogical Reasoning کہتے ہیں (۲) خصوصیات سے کلیات کی طرف استدلال کرنا جسے استدلال استقرائی (Inductive Reasoning) کہتے ہیں (۳) کلیات سے خصوصیات کی طرف دلیل کرنا۔ اسے دلیل استخراجی (Deductive Reasoning) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان کی مثالیں دینا ضروری ہے۔ بعض فلکی عالم کہتے ہیں کہ مریخ آباد ہے۔ وہاں جا کر کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ مگر استدلال تمثیلی کی بنا پر منگل میں آبادی اور شکر میں روئیدگی تسلیم کی جاتی ہے۔ آبادی کے واسطے جن شرائط اور حالات کا ہونا اس زمین پر لازم ہے وہ مریخ میں بھی پائی جاتی ہیں "سب چھوٹی لڑکیاں گڑیا کی بے حد شایق ہوتی ہیں" یہ قاعدہ کلیہ ہزار پانچسو لڑکیوں کی کیفیت اور شوق کو مشاہدہ کرنے کے بعد قایم کیا گیا ہے اور یہ استدلال استقرائی کا نتیجہ ہے۔ "چونکہ سب چھوٹی لڑکیاں گڑیا کی شایق ہوتی ہیں اسلئے پاربتی بھی جو ایک چھوٹی لڑکی ہے گڑیا کی شایق ہوگی" یہ نتیجہ استدلال استخراجی سے اخذ ہوا ہے۔

تحقیقات کے طریقۂ استقرا کا بانی بیکن تھا۔ اس نے پہلے پہل اس امر پر زور دیا تھا کہ قدرت کے خاص حالات کو مشاہدہ کرنے کے بعد قاعدۂ کلیہ یا اصول قایم ہونا چاہیئے۔ زمانۂ حال کے سائنس دان اسی اصول کے پابند ہیں۔ نیوٹن نے اسی قاعدہ پر عمل پیرا ہو کر کشش کا قانون معلوم کیا تھا اور قرار دیا تھا کہ یہ عالمگیر ہے اور جملہ اجسام ایک دوسرے کی کشش قبول کرتے ہیں۔ ڈارون نے اسی کو ملحوظ خاطر رکھ کر قاعدہ انتخاب طبعی (Natural Selection)، جہد الحیوۃ (Struggle for Existence)، بقائے بہترین (Survival of the Fittest) وغیرہ قوانین دریافت کئے تھے۔ استقرار قوت (Persistence of Force) تحویل قوت (Conservation of Energy) بقاء حرکت اور عدم فنائے مادہ کے مسائل بھی اسی طریقہ تحقیق سے وضع ہوئے تھے۔ استدلال

استخراج کے وسیلے سے ارباب سائنس ماضی اور مستقبل کے واقعات پر عبور حاصل کرتے ہیں۔فلکیات کے محققوں نے اس طریقہ استدلال سے کام لیکر سیارہ نپ چون کے وجود کا پتہ لگایا تھا۔گو اصل میں وہ کچھ مدت بعد دریافت ہوا تھا۔اسی طرح اگر کسی دُمدار ستارے کو تین مرتبہ مشاہدہ کیا جائے تو بعد ازاں استخراج سے کام لے کر اس کے نمودار ہونے کی پیش گوئی ہوسکتی ہے۔مگر استخراج سے مغالطہ کا بھی امکان ہے۔مثلاً ارسطاطالیس نے جو قدیم زمانہ کا سب سے بڑا فلاسفر اور محقق تھا ایک مرتبہ اس طرح استدلال کرکے غلط نتیجہ نکالا تھا۔"ستارے قدیم ہیں ان کی حرکت بھی قدیم ہونا چاہیئے، اور حرکت استمراری گول ہونا چاہیئے۔اس وجہ سے یہ ظاہر ہے کہ ستارے زمین کے گرد حلقوں میں گھومتے ہیں۔"

یہاں سائنس کے جملہ طریقوں پر جو تحقیقات میں مدنظر رکھے جاتے ہیں بحث کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔جیسے ریاضی طریقہ استدلال (Mathematical)، تجربی (Empirical)، تمثیلی (Explanatory) اور تحقیقی (Verificatory) طریقے ہیں جن کا ابل نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔مگر دو باتوں کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ایک تو یہ ہے کہ بعض وقت اہم نتیجہ آپ سے آپ ذہن کے اندر موجود ہو جاتا ہے اور آدمی کو استدلال یا تحقیق کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔دوسرے یہ کہ عملاً استقرا اور استخراج ایک دوسرے سے نہایت پیچیدہ طور پر ملے ہوتے ہیں۔جب آدمی مشاہدہ کرکے واقعات جمع کرتا اور ان سے کوئی خاص نتیجہ نکالنا چاہتا ہے تو ان دونوں طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔عقل کبھی آگے جاتی ہے اور کبھی پیچھے لوٹتی ہے۔

سائنس کے اکتشافات بڑے بڑے اہل دماغ اور غیر معمولی ذہین آدمیوں کی فوری اُپج سے عمل میں آئے ہیں۔مگر زیادہ تر نظر غائر اور اشتیاق تجسس سے بہت سا مفید کام ہوا ہے۔چیزوں کو خوب ہوشیاری سے دیکھنے کا شوق اور نئی نئی باتیں معلوم کرنے کی تمنا سائنس کی دریافتوں کے لئے لازم ہے۔اسکے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔اگر کسی مسئلہ کو سائنسی طریقہ سے حل کرنا چاہو تو سب سے پہلے اسکے متعلق معلومات یا واقعات بہم پہنچاؤ۔یعنی بڑی احتیاط، درستی، بے تعصبی اور قابلیت کے ساتھ مشاہدہ کرو اور اس میں خوردبین، دوربین، فوٹوگرافی، وغیرہ آلات سے بھی مدد لی جاتی ہے۔دوسروں کی باتوں کو من وعن باور مت کرو۔اشیاء کا عرض وطول، عمق وارتفاع بھی بڑی صحت کے ساتھ ناپنا ضروری ہے۔الغرض اپنے تجربہ اور مشاہدہ میں چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز مت کرو۔جب معلومات بہم پہنچ جائیں تو پھر انکی تقسیم و ترتیب لگاؤ۔یعنی یہہ دیکھو کہ ان میں کتنا اختلاف اور کتنی مطابقت پائی جاتی ہے۔ایک قسم کی باتوں کو الگ کرو، یعنی درمیانی تعلقات معلوم کرنے کی کوشش کرو۔اور یہہ کام بھی بڑی ہوشیاری اور خوبی سے کرنا چاہیئے ورنہ مغالطے کا اندیشہ ہے۔جہاں ضرورت ہے، نشتر کیمیائی سے کام لینا چاہیئے۔بعض وقت محقق کے دل میں از خود ایک خیال پیدا ہوجاتا ہے۔وہ نظریہ قایم کرکے اسکے متعلق ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔اسلئے تجربہ سے کام لیتا ہے۔مثلاً برقی صدمہ کا پودوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔آلہ کی مدد سے برق پیدا کرکے پودوں پر ڈالو اور اسکا اثر مشاہدہ کرکے رائے قایم کرلو۔نظریہ یا خیال تو جب چاہو قایم کرلو، مگر اسکی صحت وتائید واقعات سے ہونا چاہیئے۔جب یہ ہوجائے تو پھر اس نظریہ کو اصول یا قاعدہ کی صورت میں نہایت عام فہم مگر جامع طریقہ سے بیان کیا جاتا ہے۔یعنی نئے حقایق کو کسی پرانے قاعدہ کے تابع کر دیا جاتا ہے، اور وہ سائنس کے قاعدوں میں شمار ہوتے ہیں

سائنسی طریقہ تحقیق واستدلال کے لئے یہ ضروری ہے کہ مشاہدہ سے کام لیا جائے۔مشاہدہ غور اور احتیاط سے ہونا چاہیئے۔تجربہ بھی

لابدی ہے۔ بہت سے مختلف واقعات کو یکجا جمع کرکے انھیں تقسیم کرو
اور پھر ان سے نتایج اخذ کرو۔ جب اُس کی تصدیق و تصحیح ہو جائے
تو پھر اسے ضابطہ یا قاعدہ یا اُصول کی صورت دو۔ سائنس میں
یہ بھی ضروری ہے کہ انسان بچّے کی طرح سچے دل سے حق کا
متلاشی رہے، اور واقعات و معلومات کی بنا پر نتیجہ نکالے
اور تب اپنی رائے قایم کرے۔ تعصب اور طرفداری کو ذرا دخل
نہ دے۔ صرف راستی اور حق کو ملحوظ خاطر رکھے۔

جے۔ آر۔ رائے

فلسفۂ سیاست (۴)

بنی نوع انسان کی تقسیم

یہ بیان کرنے کے بعد کہ حکومت[۱] آدمیوں کا مجموعہ ہے جو کسی حصۂ
ملک پر بصورت حاکم و محکوم قابض ہوں اور ایک نامی اور اخلاقی
نظام کی شکل میں نظر آتے ہوں، بنی نوع انسان کی مختلف شاخوں پر
سرسری نظر ڈالنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

مشرق و مغرب کا فرق | مذہبی خیالات اور قیاسات کی بنا پر کہا
جا سکتا ہے کہ اقوام عالم ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ علم
انسان سے اس بیان کی ایک حد تک تصدیق بھی ہوتی ہے مثلاً
ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کا ایک برہمن جو کوہ سوالک کی کھوہ میں
بیٹھکر یاد خدا میں محو رہتا ہے سوائے ایک کپڑے کے کچھ نہیں پہنتا
اور صرف رشتۂ حیات قایم رکھنے کے خیال سے کچھ تھوڑا بہت کھا لیتا ہے،
اُسی نسل سے پیدا ہوا ہے جس سے کہ زمانۂ موجودہ کا ایک فلسفی اور
سائنس داں انگریز، جو دنیوی ترقی اور کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل
منشا سمجھتا ہے۔ اگرچہ اُسکا بھائی برہمن سعدی شیرازی کی زبان میں
خورد و نوش کی بابت یہ خیال رکھتا ہے کہ

خوردن برائے زیستن و شکر کردن است

لیکن یہ اس دنیا پرست انگریز کے کھانے پینے کے انتظام اور سامان کو
دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ سعدی کے دوسرے مصرع

تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

کا معترف ہے۔ دونوں کے خیالات و طرز ماند و بود میں زمین آسمان کا فرق
ہے لیکن پیدا ایک ہی نسل سے ہوئے ہیں اور دونوں 'ایرین' ہیں۔
مہذب سے مہذب اور وحشی سے وحشی اقوام میں بعض خصوصیات
مشترک پائی جاتی ہیں اس سے یقین ہوتا ہے کہ

ع۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

لیکن باوجود اس خلقی تعلق کے، حکومت اور معاشری قانون کے لحاظ
سے اقوام عالم کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ضروری امر ہے۔
کیونکہ کسی حکومت کے لئے آدمیوں کا قاعدہ و قانون کا پابند ہونا لازم
آتا ہے اور اگر اختلاف نہ ہوتا تو نہ کسی قانون کی ضرورت ہوتی نہ انتظام کی۔

سائنس کی تحقیقات | اقوام عالم کی پیدائش اور اُن کی ابتدائی تاریخ
معلوم کرنے میں سائنس ابتک کامیاب نہیں ہوئی۔ اگر مذہبی روایات
اور اعتقادات سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو سائنس ہمیشہ ٹھیک نہیں
بتاتی کہ مختلف اقوام علیٰحدہ علیٰحدہ اور وقتاً فوقتاً پیدا ہوئیں یا ایک ہی
قوم سے انسان علیٰحدہ ہوکر مختلف اقوام کی صورت میں نظر آنے
لگے۔ اگرچہ بعض سائنس داں یہ کہتے ہیں کہ ہر خطۂ زمین میں مینڈکوں اور
بندروں کی طرح انسان پیدا ہوئے اور رہبر اعظم کا باوا آدم نرالا تھا

---

[۱] سلسلہ کے لئے دیکھو ادیب فروری ۱۹۱۲ء

سائنس سے اس بات کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ اقوام عالم کی تفریق
اور اختلاف کے کیا اسباب ہوئے۔

اقوام عالم کی تقسیم | لیکن جب سے تاریخی زمانہ کی ابتدا ہوئی ہم مختلف
اقوام کی وضع قطع دماغی اور روحانی قابلیتوں یہانتک کہ رنگ روپ
میں بھی فرق دیکھتے آتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فی زماننا کوئی قوم بھی اپنے
اصلی پیدائشی نجابت کا دعویٰ نہیں کرسکتی اور مختلف اسباب کے
اثرات سے وضع وضع کی قومیں پیدا ہوگئی ہیں تقسیم اقوام کی نسبت
علماء نے مختلف معیار مقرر کئے ہیں۔ کوئی زبان کے لحاظ سے کوئی کاسۂ سر
اور جبڑے کی ہڈی۔ کوئی بالوں کے لحاظ سے اقوام عالم کو تقسیم کرتا ہے
رنگت کے لحاظ سے جو تقسیم کی گئی ہے سب میں بہترین نظر آتی ہے۔ اور
ہم اسے کسی قدر وضاحت کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ گو اس زمانہ
میں جبکہ رنگ کا اختلاف اعلیٰ و ادنیٰ قوم کا مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے
اور گورے اور کالے کا سوال اور زرد خطرہ کا بھوت فضاء عالم پر
چھایا ہوا ہے رنگت کے لحاظ سے اقوام عالم کی تفریق دکھانا شاید
نامناسب خیال کیا جائے۔

رنگت کے لحاظ سے بنی نوع انسان کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔ اسود
احمر، اصفر، ابیض۔

(۱) اسود | گمان کیا جاتا ہے کہ سیاہ اقوام، افریقہ کے علاوہ جو انکا
مولد و مسکن ہے، کسی زمانہ میں جنوبی یورپ اور ایشیا میں بھی پھیلی ہوئی
تھیں ممکن ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے اسی قوم نے جنم لیا ہو [اگر یہ بات
پایۂ ثبوت کو پہنچ سکے تو یورپ کے سفید چہرے والی قوموں کے
غرور و نخوت کے شیشہ کو صدمۂ عظیم پہنچے گا!] لیکن کسی ملک اور کسی زمانہ
میں اس قوم نے کبھی کسی قسم کی پولیٹکل (سیاسی) یا سوشل (معاشرتی)
ترقی کبھی نہیں کی۔ اس قوم کی گویا کوئی تاریخ ہی نہیں ہے۔ کالی
قومیں اقوام ابیض یا گوریوں کے مقابلہ میں ہمیشہ پسپا ہوئی ہیں اور
سیاسی اور ذہنی ہر دو لحاظ سے ابیض اقوام کی حلقہ بگوش رہی ہیں۔
اُن کا تخیل مثل خود رو نباتات کے ہوتا ہے۔ اُن کی طبیعت کا آتش گیر
مادّہ ذرا سی بات میں مشتعل ہوجاتا ہے۔ دل اور دماغ کمزور ہوتا ہے۔
ناقص عقلی اور قوت ارادی کی کمزوری کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے سے
بہتر اقوام کی محکوم ہیں۔ ہندوستان کے اصلی باشندے بھی اسی قوم میں سے
تھے لیکن جب ایرین قوم نے وسط ایشیا سے اُٹھکر ہندوستان کا رُخ
کیا تو کالے باشندے کسی معرکہ میں بھی فتحیاب نہ ہوئے اور پسپا ہوتے
ہوتے وسطی اور جنوبی ہندوستان کے پہاڑوں اور جنگلوں میں جا چھپے
ایک کثیر حصہ فاتح قوم کی غلامی میں آیا اور آجتک شودر کے نام سے
پکارا جاتا ہے۔ مصر میں بھی حبشی مدت مدید سے سیاطیقی اقوام کے
محکوم رہے ہیں۔ ہندوستان میں کالی قوم نے کبھی کوئی اخلاقی، معاشرتی
یا سیاسی ترقی نہیں کی۔ کسی زمانہ میں اُن کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ضرور
قایم ہوئیں لیکن کسی نے زمانۂ حال کے مفہوم کے مطابق کوئی باضابطہ
حکومت نہیں کی۔ راقم نے وسط ہند میں دریاء نربدا کے کنارے
ریاست بھوپال کے پہاڑی حصہ میں ایک گونڈ راجہ کے محل کے آثار دیکھے
ہیں لیکن اس سے گونڈ باشندوں کی صناعی اور کاریگری کا بہت بڑا
اثر دل پر پڑتا ہے۔ افریقہ میں جو پرانی حبشی ریاستیں باقی ہیں وہ بھی
پراگندہ اور پریشان گروہ انسانی کی صورت میں پائی جاتی ہیں فاتح
قوموں نے کبھی اپنے کالے مفتوحین کی حالت درست کرنے میں کوئی
کوشش نہیں کی ہے اور نہ خود کالی قوموں میں اپنے فاتح کے اعلیٰ تر
تمدن سے فائدہ اُٹھانے کی اہلیت ہوئی ہے۔ مگر بقول پروفیسر
بلنٹ کے یہ فخر صرف اسلام ہی کو حاصل ہے، جسکے مذہب اور تمدن
نے اقوام اسود[1] پر بھی اپنا گہرا اثر کیا جس کی بدولت ان مردہ اقوام
میں جان پڑی۔ خصوصاً شمالی افریقہ اور سوڈان میں، حبشیوں نے

[1] اسوقت افریقہ میں کالی قوم کی صرف ایک ریاست، ابی سینیا باقی ہے جس نے
یورپ کی ایک سفید قوم کو چند برس ہوئے ایسی شکست دی کہ ذوواکا بدنما دھبہ

اسلام کی برکت سے معتد بہ ترقی حاصل کی۔

(۲) احمر ۔ سُرخ رنگ کی قومیں امریکہ میں آباد ہیں۔ یہ قومیں بہ نسبت حبشیوں کے تنک مزاجی اور تنگ خیالی میں کسی قدر کم ہیں لیکن پولیٹیکل قابلیت ان میں بھی نہیں ہے۔ اہلِ یورپ کے ورود سے پہلے امریکہ میں حکومتوں اور اُن کے ساتھ ایک خاص معاشرت اور تمدن کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن ان سلطنتوں کے بانی، جیسا کہ پیرو اور میکسیکو کی بابت خیال ہے، غالباً مشرقی اور جنوبی ایشیا کے مہاجرین تھے۔ مسٹر ہربلاس سارڈا نے اپنی عجیب وغریب اور دلچسپ کتاب فوقیت اہلِ ہند یعنی **Hindu Superiority** میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات کو ثابت کیا ہے۔ وسطی اور جنوبی امریکہ میں جابجا ہندوستانی طرز کی عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اُن کی پرستش کے طریقے، لباس، اور روایات سے بخوبی پایا جاتا ہے کہ سری رام چندر جی کے بعد سے اہلِ ہند نے امریکہ میں نوآبادیاں قایم کی ہیں۔ پیرو میں جو بڑا قومی میلہ ہوتا ہے، اُسکا نام راماستوا ہے۔ امریکہ میں اب بھی ایک بُت کی پرستش کی جاتی ہے جو بالکل ہندوستان کے گنیش جی سے مشابہت رکھتا ہے۔ مہابھارت[۱] میں صاف تحریر ہے کہ ارجن نے پتال دیس کو فتح کیا اور اُس مُلک کے بادشاہ کی بیٹی مسماۃ الوپی سے شادی کی۔

امریکہ کے سُرخ باشندے گورے رنگ کے آدمیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور انھیں "سورج کی اولاد" کہتے ہیں۔ اس سے بھی پایا جاتا ہے کہ وہ آفتاب پرست آریہ قوم کے محکوم رہ چکے ہیں۔ ان کی قدیم ریاستوں میں حکمران جلد جلد بدلتے رہتے ہیں اور قانون وقاعدے سے چنداں سروکار نہیں ہے۔ وہ حکومتیں نہیں کہلائی جاسکتیں بلکہ شکاریوں کے گروہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اقوام ابیض کے مقابلہ میں سُرخ قوم نے کسی قسم کی قوت، اور اتحاد کا اظہار نہیں کیا ہے سفید قوم ہر معرکہ میں فتحمند ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ قوم احمر کو نہ صرف اپنا غلام بنا رہی ہے بلکہ صفحہ ہستی سے مٹا رہی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے سفید فاتحین مثل دیگر جنگلی اور وحشی جانوروں کے سُرخ آدمیوں کا شکار کھیلتے ہیں۔

(۳) اصفر ۔ زرد قوم میں سیاسی اور تمدنی خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔ اُن کا مولد ومسکن زمانہ قدیم سے ایشیا ہے۔ اس قوم کے دو حصے ہوگئے ہیں۔ بھورے رنگ والے مالائی (Malayas) اور ان سے کسی قدر ہلکے رنگ والے ہن اور مغل کہلاتے ہیں۔ مغلوں میں عظیم الشان مدبر، حکمران اور فاتح پیدا ہوئے اور اُنھوں نے پُرعظمت وشوکت سلطنتیں اقصائے عالم میں قایم کی ہیں۔ ہندوستان میں جس شان وشوکت اور دبدبہ کے ساتھ سلطنت کی اُسکے آثار آج بھی قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ مغربی ممالک میں بھی اس قوم نے اپنے عروج کے زمانہ میں اپنی فتحمندی کا جھنڈا آسٹریا کے پایۂ تخت ویانا تک پہنچایا ہے، اور اپنے جبلی شجاعانہ اور سپاہانہ قوتوں کا سکہ بٹھایا ہے۔ ترکوں کی سلطنت گو اس وقت معرضِ خطر میں ہے مگر اس بیان کی زندہ مثال آج بھی موجود ہے۔ اقوام اصفر کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے اقوام ابیض کے ساتھ سلسلۂ ازدواج قایم رکھا ہے۔ چینیوں اور جاپانیوں نے ہنس اور ترکوں سے بھی زیادہ ترقی کی ہے۔ فلسفیانہ خیالات، نیکی بدی کا امتیاز، ذاتی قابلیت کی آبائی مشیخت پر ترجیح کا خیال اہلِ چین میں اُسوقت سے ہے جبکہ یورپ کی ایرین قومیں جہالت اور وحشت کی گھٹاٹوپ میں چھپی ہوئی تھیں چینی صناعی اور مصوری کی قدامت کی شہادت تاریخ سے بخوبی ملتی ہے۔ چینی اور جاپانی قوموں نے تجارت، صنعت تعلیم اور ریاست کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن اُن کے قانون کی بنیاد زیادہ تر اخلاقی

ہمیشہ اٹلی کے ماتھے پر رہے گا۔ یہ ریاست خودمختار رہے اسکی بقاء کی وجہ ہمارے عزیز دوست مسٹر ظفر علیخاں (اڈیٹر زمیندار) یہ بتاتے ہیں کہ اس ریاست نے بانی اسلام اور اسکے صحابی کو ایسے وقت میں پناہ دیتی تھی جب خود عرب کا بچہ بچہ انکا دشمن تھا۔ اسی کی برکت ہو کہ یہ ریاست آجتک قایم ہے۔ مسلمانوں نے تو ہمیشہ اس بادشاہت کو احترام و وقار کی نظر سے دیکھا لیکن یہ عجیب بات ہو کہ یہ ابھی تک یورپ کے چنگل سے بچی ہوئی ہے۔

[۱] دیکھو قومیت ہنود صفحہ ۱۹۰

نصائح کے ساتھ منسلک ہے۔ اور خانگی زندگی کی قیود و آداب سے محدود ہے۔ اُن کی حکومت شخصی رہی ہے۔ پروفیسر بلنٹ شلے کہتے ہیں کہ ذاتی عزت اور قومی آزادی کا مادہ اس میں بہ نسبت اقوام یورپ کے کم پایا جاتا ہے لیکن اگر پروفیسر موصوف اپنے خیالات جنگ روس جاپان و انقلاب چین کے بعد ظاہر فرماتے تو غالباً صورت دگرگوں ہوتی۔

(۴) ابیض | دنیا کی تاریخ زیادہ تر سفید قوم کے کارناموں سے مملو ہے۔ انسانی ترقی کا بہترین سرمایہ مذہب ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے اور خالق و مخلوق کے رشتہ کو قایم کرتا اور انسان کی ذہنی و اخلاقی ترقی کی بنیاد رکھتا ہے۔ تمام مذاہب کے بانی اسی قوم میں پیدا ہوئے اور دنیا کے بڑے بڑے ادیاں کی نشو نما اس قوم کے ہاتھوں ہوئی۔ دنیا کا تمام فلسفہ اور فنون ظریفہ اسی قوم کی دماغی قابلیتوں کا نتیجہ ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں پر اقوام ابیض کی برتری ہر لحاظ سے ثابت ہے۔ دوسری قومیں ان کے حملوں کے سامنے پسپا ہی نظر آتی ہیں۔ تمام پولیٹکل ترقیوں کا سہرا بھی اقوام ابیض کے سر پر ہے غرضکہ فطرت انسانی کے کمالات کے جتنے شعبے ہیں سب انھیں کی محنتوں اور جگر سوزیوں کے نتائج ہیں۔

اقوام ابیض دو بڑے حصوں میں منقسم ہیں (۱) سیماطیقی یا سامی (۲) ایرین یا یافثی۔ اول الذکر قوم کو زیادہ تر مذہب سے تعلق رہا ہے۔ مذہب موسوی، مسیحیت اور اسلام کا ظہور اوّل اس قوم میں ہوا۔ اور اس نے پھر تمام دنیا میں پھیلایا۔ لیکن امور سیاست کے لحاظ سے ایرین قوم کا پلہ بھاری ہے۔ ہر قسم کی سیاسی اور تمدنی ترقی کا انجلا ایرین قوم میں ہوا اگرچہ سنگ بنیاد ی ساتین نے رکھا ایرین اقوام میں علم ادب، تاریخ، فلسفہ نے درجۂ کمال حاصل کیا ان اقوام کی ملکی ترقی کا معراج یورپ میں پہنچکر ہوا ہے چنانچہ آج تمام دنیا پر یہی مسلط ہیں، اور دیگر اقوام کی رہنمائی اور فارغ البالی کے بھی ذمہ دار ہیں۔

نتیجہ | اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا مختلف النسل ہونا بموجب قانون قدرت واقع ہوا ہے۔ اس اختلاف کا باعث قدرتی واقعات ہوئے ہیں اور انسانی تاریخ کو اس اختلاف میں چنداں دخل نہیں ہے۔ لیکن مختلف اقوام عالم جو ایک دوسرے کے میل جول اور مرز بوم کی تبدیلی کے اثر سے مرتب ہوئی ہیں وہ تاریخ انسانی کی بدولت وجود میں آئی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ زمانہ تاریخ سے پہلے بھی دنیا میں انسان آباد تھے لیکن اُن کے کارنامے اور سیاسی ترقی کرنے کے مفصل حالات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اسلئے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی نسل ہمارے مختلف اقوام میں منقسم ہوں گے امتداد زمانہ کے ساتھ تاریخی واقعات نے اقوام کو علیحدہ علیحدہ کرکے اکثر نئی قومیں پیدا کی ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم مختلف اقوام کے افراد کے ظاہری شکل و شباہت، جسمانی ساخت میں اس قدر فرق نہیں پاتے جتنا کہ اُن کے عادات، طریقہ ماند و بود، سیاسی ترقی، خیالات محسوسات، زبان و قانون میں دیکھتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے لیے خود ہمارے ملک میں اس اختلاف کا بہترین نمونہ دیسی اور فرنگیوں میں پایا جاتا ہے۔ اُن کے رنگ و بو میں اس قدر فرق ہے کہ کوئی شخص تاریخ پر عبور کئے بغیر نہیں کہہ سکتا کہ دونوں ایک ہی درخت کے پھل ہیں۔

ظفر عمر (علیگ)

اس ماہ کی رنگین تصویر اٹلی کے مشہور و معروف مصور رسیٹی کی صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ ڈیڑھ سو برس ہوئے کہ یہ تصویر کھینچی گئی تھی۔ اٹلی میں ڈانٹی نام ایک مشہور شاعر ہو گذرا ہے جس نے اپنے زور تخیل کو ایک فرضی خواب کے بیان میں صرف کیا ہے اُسنے ایک حسین عورت (بیٹرس) کو اپنا دل نذر کردیا تھا وہ کھڑا ہوا دیکھ رہا ہے کہ اسکی معشوقہ دم واپسیں کی حالت میں ہے۔ دو سہیلیاں کفن لئے ہوئے کھڑی ہیں۔ بیٹرس اس درجہ حسین تھی کہ ڈانٹی اس حالت میں بھی اُسکے لب کا بوسہ لے رہا ہے۔ اس حالت کے اظہار میں شاعر اور مصور دونوں نے بیٹرس کی خوبصورتی کی صورت کھینچ دی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ مصور نے کس خوبصورتی سے ڈانٹی کے چہرہ پر نا اُمیدی کی جھلک دکھائی ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ یہ تصویر رسیٹی کے کئی سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔

دربار نواب میر نظام علی خاں بہادر آصفجاہ ثانی

یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارت کا آغاز

کسی معتبر شہادت کی عدم موجودگی میں ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں جہازرانی صرف دریاؤں تک ہی محدود تھی۔ جو ممالک آج بیسویں صدی میں دنیا کی نظروں میں ممتاز اور عظیم الشان نظر آتے ہیں وہ اُن دنوں وحشیوں کا ملجا و ماوا تھے۔ صرف مصر، مسوپوطامیہ اور اُن کے ملحقہ علاقوں کی تاریخیں پائی جاتی ہیں، اُس وقت کے صحیح حالات مؤرخ ہیروڈوٹس سے ملتے ہیں جس کا مشاہدہ ایسا صاف اور راست تھا کہ اُس کی تصدیق کئی باتوں میں موجودہ زمانہ تجسس و تدقیق نے بھی کی ہے۔ ہیروڈوٹس ۴۸۴ء قبل مسیح یعنی جنگ سلامس کے چار برس بعد پیدا ہوا۔ اُس وقت تک یونانی ریاستیں بحری کاروبار کے لئے مشہور ہو چلی تھیں۔ اُن سے پہلے اہل فنشیا کا جو سب سے پُرانی بحری قوم ہیں بحیرۂ روم پر تسلط تھا اور اُن کا صدر مقام مشہور بندرگاہ کارتھیج تھا۔ قدیم مصر کی بابت جو سب سے پُرانا ملک ہے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے کبھی بحری تجارت یا بحری جنگ کی طرف توجہ کی یا نہیں۔ اہل عرب کے ساتھ غالباً اُس کی تجارت برّی ہوگی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بحر قلزم اور خلیج فارس میں بحری تجارت کا کچھ رواج ہو اور بحیرہ روم اور مشرق کی بادبانی کشتیاں اُس وقت ایجاد ہوئی ہوں۔ قدیم یونانی اپنے جنگی جہازوں میں مربع بادبان استعمال کرتے تھے اور ہر مستول پر دو بادبان آویزاں کئے جاتے تھے جیسے آج کل دو مستول والے جہازوں (Brigs) میں کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اہل روماسہ گوشہ بادبان استعمال کرتے تھے۔ اہل فنشیا کا ذکر قدیم تواریخ میں پایا جاتا ہے جنھوں نے سمندر کو تجارت کا ذریعہ قرار دیا تھا اس امر کی شہادت بھی موجود ہے کہ افریقہ کے مغربی ساحل پر اُن کی بستیاں تھیں وہ کارنوال سے ٹین لایا کرتے تھے اور اِن ہر دو اغراض کے لئے انھیں بحر اوقیانوس سے عبور کرنا پڑتا تھا۔ یہ خیال کہ زمانۂ قدیم میں یورپ اور ہندوستان کے درمیان مختلف تجارتی راستے تھے سوائے ایک یا دو مستثنات کے غالباً ایک فسانہ ہے۔ مثلاً یہ باور کرنا مشکل ہے کہ واسکوڈی گاما کے راس امید دریافت کرنے سے دو ہزار برس پیشتر بحر قلزم سے راس کماری کے گرد ہو کر خلیج بنگال کو راستہ آتا ہو، برخلاف اسکے یہ قرین قیاس ہے کہ بحر قلزم کی اشیاے تجارت عرب اور فارس کے ساحلوں سے ہو کر ہندوستان کے مغربی بندرگاہوں کو آتی تھیں اور یہی ممکنات سے بھی ہے کہ خلیج فارس کے سب سے چھوٹے بحری راستے سے کام لیا جاتا ہو۔

مغرب اور مشرق کے درمیان تجارت

اب ہم اُس وقت کا ذکر کرینگے جبکہ مغرب اور مشرق کے درمیان بحری تجارت کی تائید میں تواریخی ثبوت ملتا ہے اب ہمارے پیش نظر کاٹھیاواڑ اور مغربی ساحل کے دیگر بندرگاہ ہیں ہم مقدونیہ کے شاہ سکندر کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر نہیں کہ وہ اتنی دور جنوب میں آیا ہو۔ اُس کی فوج کا کچھ حصہ ہندوستان سے سندھ کے راستے اُن کشتیوں میں روانہ ہوا تھا جو انھوں نے خود اس مُلک میں بنائی تھیں اور غالباً وہ خلیج فارس تک انھی کشتیوں میں گئے۔ میگستھنیز (۳۰۲ء قبل مسیح) جو چندر گپت کے دربار میں سلوکس نکیتر کا سفیر تھا شمالی ہندوستان پر چار کتابیں تحریر کی ہیں۔ ناظرین ادیب کو غالباً معلوم ہوگا کہ یہ سلوکس نکیتر سکندر کا سب سے مشہور جرنیل اور بابل کا فرمانروا اور سیریا کا حکمران تھا۔ میگستھنیز کی تصانیف سے مؤرخ سٹرابو، پلائنی اور ایرین نے بعد میں بہت سا کام لیا اور منجملہ ۱۳ راجپوت فرقوں کے جو دریائے سندھ کے نزدیک آباد تھے آرسٹری کا بھی ذکر کیا ہے جس سے سوتترا مراد ہے، جو کاٹھیاواڑ کا قدیم

نام ہے۔ مورخ سٹرابو لکھتا ہے کہ ٹولیمی فلاڈلفس (۲۸۵ قبل مسیح تا ۲۴۷) مصر نے ہندوستان کو ایک نیا راستہ نکالا۔ سکندریہ سے کاپٹوس تک اسباب تجارت سمندر کے راستے جاتا تھا اور کاپٹوس سے برنس تک اونٹوں پر۔ برنس بحر قلزم پر ایک بندرگاہ ہے جس کا نام شاہ مصر نے اپنی ماں کے نام پر رکھا تھا۔ برنس سے مال تجارت جہازوں میں سیدھا ہندوستان پہنچایا جاتا تھا۔ یہ جہاز مالابار گجرات اور کاٹھیاواڑ کے بندرگاہوں میں آتے تھے۔

مورخ سٹرابو یہ بھی لکھتا ہے کہ بختری یونانی بادشاہ خصوصاً مندراس (۱۱۰ قبل مسیح) نے اپنی فتوحات سرشاس (سارسترا) تک پہنچائیں۔ پیری پلس (۲۵ء) کا مصنف راوی ہے کہ اُس کے وقت میں اس بادشاہ کے سکے براگیا میں رائج تھے۔ یہ براگیا زمانہ حال کا بھڑوچ ہے اور اُن دنوں غالباً ساحل پر واقعہ تھا۔ سٹرابو یہ بھی روایت کرتا ہے کہ ایک یونانی بنام یوڈوکاکس ساکن سیزکس نے جو غالباً کوئی سوداگر تھا (۱۱۷ قبل مسیح) ایک ہندوستانی کی رفاقت میں جو مصری ساحل پر جہاز ٹوٹ جانے کے باعث آگرا تھا دو دفعہ ہندوستان کا سفر کیا۔ اس زمانہ میں غالباً برنس کا سیدھا راستہ عام رہ گذر تھا۔ مورخ موصوف ایک سفارت کا بھی دلچسپ حال لکھتا ہے جو شاہ پورس کی طرف سے اگستس کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ یہ سفیر بھڑوچ کے سوداگر تھے انھوں نے خلیج فارس اور انطاکیہ کے رستہ سفر کیا تھا۔ یہ اپنے ہمراہ منجملہ اور اسباب کے ایک ٹنڈا آدمی، ایک بڑی قمری، اور ایک بڑا چکور لائے تھے۔

بحیرہ قلزم کے جہاز

مورخ سٹرابو کے وقت میں (۶۳ قبل مسیح تا ۲۳ عیسوی) بحیرہ قلزم کے راستے مشرق اور مغرب کی تجارت بہت بڑھ گئی تھی حتیٰ کہ ایک سال میں بیس جہاز اس راہ سے گذرے! ایک اور مورخ لکھتا ہے کہ اُس کے زمانہ میں ۱۲۰ کشتیوں کا بیڑا ہندوستان میں آیا۔ مصری سوداگر مقام میجیرس میں جو غالباً جنجیرہ کا دوسرا نام تھا آئے۔ پلائنی کلاں (۲۳ء تا ۷۹ء) کی تواریخ سے پتہ ملتا ہے کہ ہندوستان آنے کا راستہ ابھی تک برنس کی طرف سے تھا۔ مورخ موصوف راوی ہے کہ سوداگر موسم سرما کے وسط میں روانہ ہوکر دسمبر یا جنوری میں واپس آیا کرتے تھے۔ اس واقعہ سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان لوگوں کو موسمی ہواؤں کا جو جون جولائی کے مہینہ میں ہندوستان کے سمندروں میں آتی ہیں علم تھا۔ پلائنی رقمطراز ہے کہ مانسون (موسمی سمندری ہوا) کا مقامی نام ہپالس تھا ہپالس ایک یونانی رہبر جہاز کا نام تھا جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اُس نے مانسون (Monsoon) کو دریافت کیا۔ لیکن یہ امر شک سے خالی نہیں۔ بہرکیف پلائنی کسی خاص شخص سے موسمی بحری ہوا کی دریافت منسوب نہیں کرتا اور چونکہ اُس کے وقت میں ہندوستان کا سفر کم و بیش عام ہوگیا تھا اسلئے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس وقت یونانی ملاحوں کو دریافت ہوچکا تھا کہ بحر ہند میں کب اور کس قسم کی ہوائیں چلتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کا جغرافیہ

کلاڈیس ٹولی میوس ساکن سکندریہ (۱۶۱ء تا ۱۸۰ء) نے پلائنی اور دوسرے مورخوں کی طرح میگستھینز کی تحریروں پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اُس نے سوداگروں اور تجاروں سے خود بہت سے معلومات حاصل کئے۔ ہندوستان کے جغرافیہ کا حال لکھتے وقت اُس کو کچھ کا کوئی علم نہیں اگرچہ اسکورن سے آگاہی ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ اسوقت سے دریائے سندھ نے اپنا راستہ بدل لیا ہے جیسا کہ اُس سے پیشتر ہی ایک سے زیادہ بار یہ دریا اپنا رُخ بدل چکا ہے۔ یہ مورخ کاٹھیاواڑ کے مفصلہ ذیل بندرگاہوں کا ذکر کرتا ہے:-

(۱) باراکے یعنی موجودہ دوارکا جو ایک بڑی جاترا کی جگہ ہے۔

(۲) بارڈالسماں غالباً موجودہ پوربندر جس کے عقب میں باردا کی پہاڑیاں ہیں۔

(۳) مونوگلوسم موجودہ منگرول -

(۴) سرسترہ غالباً مریا اول

(۵) رسٹکپڑا موجودہ ہتپ جو خلیج کیبے میں واقعہ ہے - دریائے ماہی کو یہ مؤرخ موفس کا نام دیتا ہے اور راس ملآیو سے غالباً اُسکی مراد راس گوپی ناتھ سے ہے جو بھڑوچ کے بالمقابل واقع ہے اور اُسکے متصل دلدلوں کا نام ابھی تک کنارِ ملاّتی ہے -

اسباب تجارت

ایک کتاب بنام The Periplus of the Erythoræan Sea غالباً ۸۰ء میں لکھی گئی تھی - اسکا مصنف لکھتا ہے کہ اسکے وقت میں وہ جہاز جو مال تجارت ہندوستان میں لیجاتے تھے برنس (واقع بحر قلزم) سے روانہ ہوکر براہ عدن بحر عرب کے ایک بندرگاہ کانے نامی میں جایا کرتے تھے - وہاں سے کچھ جہاز دریائے سندھ کو روانہ ہوا کرتے تھے اور وہاں سے برگیازا (بھڑوچ) کو اور کچھ سیدھے مالابار کو - تیسرا راستہ گارڈافوی سے تھا - ان تینوں راستوں میں موسمی بحری ہوا سے کام لیا جاتا تھا - سندھ کا نام اُسوقت سائیتھیا تھا اور اشیاء ذیل کی درآمد ہوتی تھی - سلے ہوئے کپڑے، چھینٹیں، ٹنگ، مونگا، شیشے کے برتن، چاندی کے تھال، سونا چاندی، شراب اور تجارت برآمد حسب ذیل تھی - گوند، زرد رنگ، زمرد، ہیرے، پشم، سوتی کپڑا، ریشمی تاگا اور نیل

مؤرخ موصوف خلیج رن کا پورا پورا حال لکھتا ہے جس کو وہ ایرنون کے نام سے موسوم کرتا ہے، اور اُن خطروں کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے جنکا سامنا یہاں جہاز رانوں کو کرنا پڑتا ہے اور ملاحوں کو آگاہی دیتا ہے کہ بروک (دوارکا) کے ساحل پر بڑے بڑے بحری سانپ ہوتے ہیں - بھڑوچ کی نسبت لکھتا ہے کہ یہ مویشی، غلہ، اور روئی کی منڈی ہے - اُس نے خلیج کیبے کا جو دریائے میس (موجودہ ماہی) کی طرف بڑھی ہوئی ہے ٹھیک ٹھیک حال دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کاٹھیاواڑ کے جنوب سے جو جہاز بھڑوچ کی طرف جانا چاہیں ان کو لازم ہے کہ جزیرہ بئوس (پیرم) کے شمال کی طرف سے گذر کر دریائے نمنڈیاس (نربدا) کے دہانہ سے مشرق کی طرف جائیں - اس امر کا بھی ذکر پایا جاتا ہے کہ جہاز رانی کی مشکلات کی وجہ سے بھڑوچ سے رہبر جہاز بھیجے جاتے تھے کہ آنے والے جہازوں کو حفاظت سے بندرگاہ میں لے آئیں - دریائے نربدا کے جزر و مد کا بھی بہت مفصل بیان اُس نے درج کیا ہے - مؤرخ موصوف راوی ہے کہ مصری تجارت کے علاوہ بھڑوچ کا تجارتی تعلق عرب اور افریقہ کے مشرقی ساحل اور ان شہروں سے تھا جو خلیج فارس پر واقع ہیں علاوہ دیگر مال کے بادشاہ کے لئے موسیقی باجے اور اعلیٰ قسم کی شرابیں لائی جاتی تھیں بھڑوچ کے جنوب میں جن بندرگاہوں کا ذکر کیا گیا ہو وہ غالباً مفصلہ ذیل بندرگاہیں ہیں سوپارہ (متصل بسین)، چاول، جنجرا، اور چین گوا غالباً وہی بندرگاہ ہے جسکو پیری پلس میں چرسونیس کا نام دیا گیا ہے

جہاز رانی کی مشکلات

مندرجۂ بالا حالات سے ظاہر ہے کہ پیری پلس کے مصنف نے مصر اور ہندوستان کی باہمی تجارت کا نہایت مفصل اور گرانقدر حال لکھا ہے تاہم یہ جائے تاسف ہے کہ اُس نے اس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ اُن جہازوں کی ضخامت کیا تھی اور وہ کس طرح سے قابل سفر بنائے جاتے تھے اور اپنا راستہ کس طرح نکالتے تھے - یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مسیح سے دو ہزار برس پیشتر اہل چین کو علم تھا کہ مقناطیس کی خصوصیت یہ ہے کہ قطب کی طرف رُخ کرتی ہے - لیکن مارکو پولو کو ۱۲۶۰ء تک اسکا علم نہ تھا جس کے ذریعہ کمپاس تیار ہو سکے - تواریخ شاہد ہے کہ اہل فنشیا قدیم قوموں میں سب سے اوّل تھے جو ستاروں کے علم سے جہاز رانی کرتے تھے - رات کے وقت وہ اپنے جہاز Synosur کی رہنمائی سے جو عرسہ صغرا میں سب سے آخری ستارہ ہے چلایا کرتے تھے - یہ بھی ممکن ہے کہ ان قدیم لوگوں کو جو علم ہوا تھا وہ رفتہ رفتہ بحیرۂ روم اور متصلہ سمندروں میں عام ہو گیا ہوتا

ہم مصر کے اُن یونانی سوداگروں کی عزت میں سر تسلیم خم کرتے ہیں جنہوں نے بحر قلزم سے ہندوستان تک سیدھے رستہ سے آنیکا ارادہ کیا۔ قدیمی مصنفوں میں سے سب سے آخری شخص جس نے ہندوستان کی بابت کچھ لکھا ایک شخص کاسمس انڈیکو پلیٹس تھا۔ یہ شخص نیم ملاح تھا۔ اُس نے قریب سنہ ۵۴۰ء میں ایک کتاب بنام حالات دین عیسوی تحریر کی۔ وہ راقم ہے کہ ہندوستان بندرگاہ سندھ سے شروع ہوتا ہے اُسکے جنوب میں ”وہ اور ہوتھا (موجودہ بیرا ول بررد سورشترہ) ”کلیانا (کلیان) ایک مشہور بندرگاہ ہے جو پیپل اور شیشم کی لکڑی وغیرہ کیلئے مشہور ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ان بندرگاہوں کی سیلون کے ساتھ بڑی تجارت تھی اور وہاں ریشم، ایلوا، لونگ، اور صندل لیجاتے تھے۔ سیلون کا نام وہ تیروبین لکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان سنہ ۳۰ قبل مسیح سے بحری تجارت جاری ہے۔ اس سے پیشتر کی کوئی مستند کتاب ہمارے پاس نہیں ہے سنہ ۵۴۰ء سے سنہ ۶۴۱ء تک جب اہل عرب نے مصر کو فتح کیا اور ہندوستان کے ساتھ بحری تجارت کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو یورپ کی نظروں سے ہندوستان اوجھل ہوگیا۔

ایم - ایل - رلیارام

آلاتِ پرواز

زمانۂ موجودہ کے ہوا باز جن کلوں کی مدد سے ہوائی سفر اختیار کرتے ہیں ان پر کسی مفصل مضمون کو تحریر میں لانے سے پیشتر میں اس بات کا فیصلہ کر لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کلوں کے لئے اُردو میں کونسا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جولائی سنہ ۱۹۱۱ء کے رسالہ ادیب میں ”قدیم ہندوستان میں فن ہوا بازی“ کے عنوان سے میرا ایک مضمون نکلا تھا جس کے دوران میں میں نے لکھا تھا کہ

انگریزی زبان میں ہوا میں اُڑنے کی کل کے لئے ایک جامع لفظ ایروپلین (Aeroplane) موجود ہے لیکن اُردو میں ابھی تک اس کا مرادف کوئی خاص لفظ قایم نہیں کیا گیا۔ اخبارات میں عام طور پر اس کے لئے آلۂ پرواز، ہوائی گاڑی، ہوا میں اُڑنے کی کل، یا ہوائی جہاز وغیرہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ”ہوائی جہاز“ غلط اور ”ہوا میں اُڑنے کی کل“ غیر موزوں ہے۔ کوئی لفظ اگر موزوں کہلا سکتا ہے تو وہ ”آلۂ پرواز“ ہی ہے۔

چنانچہ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر میں نے اپنے مضمون کا عنوان ”آلاتِ پرواز“ قایم کرنا مناسب سمجھا ہے۔

ماہرینِ فن نے آلاتِ پرواز کی دو خاص قسمیں قایم کی ہیں ایک تو وہ جو ہوا سے بھاری اور دوسرے جو اس سے ہلکے ہوتے ہیں۔ قسم اوّل میں ہوائی اُڑان کی وہ تمام کلیں شامل ہیں جن کو ہوا میں بلند ہونے کے لئے گیس یا گرم ہوا کی ضرورت نہیں پڑتی، اور مؤخر الذکر میں تمام بیلون داخل ہیں خواہ وہ موٹر کی طاقت سے یا اس کے بغیر چڑھتے ہوں انگریزی میں آجکل (Flying Machines) (اُڑنے کی کلیں) کا جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ صرف ان مشینوں کے لئے برتا جاتا ہے جو ہوا سے بھاری ہوتی ہیں مسٹر چارلس ٹرنر جن کی رائے اس بارہ میں مستند تسلیم کی جاتی ہے بیان کرتے ہیں کہ

مصنوعی پرواز کے سائینس کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے خیال پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ مستقبل کی اُڑنے کی کلیں ایروپلین ہی ہونگی یعنی وہ مشینیں جن میں ایک یا زیادہ چپٹے یا کسی قدر خمدار ”پلین“ یا بازو ہوا میں ایک چھوٹے زاویہ التقا پر متحرک کئے جاتے ہیں۔

هوائی جہازوں کے مختلف نمونے

(۱) مونوپلین (فرنچ) جسپر سوار ہوکر بلیریٹ نے رودبار انگلستان کو عبور کیا تھا (۲) مسٹر لیتھم کا انٹائنٹ مونوپلین (فرنچ) (۳) فارمن بائی پلین (فرنچ) جسکو ۱۴۴ میل کا فاصلہ طے کرنے کے لئے انعام ملا تھا (۴) مسٹر کوڈی کا بائی پلین ساختہ انگلستان (۵) رائٹ بائی پلین (امریکہ کا سب سے پہلا ہوائی جہاز) (۶) ہوائی جہاز کا ایک ابتدائی نمونہ -

اگر دیکھا جائے تو زمانہ موجودہ میں زیادہ ترقی ایروپلینوں ہی میں ہو رہی ہے جن کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً Monoplanes یعنی ایک بازو والے آلات پرواز جن میں سے ایک میں ۲۵ جولائی ۱۹۰۹ء کو بلیریٹ نے رود بار انگلستان کو عبور کیا تھا۔ Biplanes دو بازو والے آلات پرواز اور Quadruplanes یعنی چار بازو والے یا Multiplanes (زیادہ بازو والے) اور علیٰ ہذا القیاس۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ موجودہ حالت میں صرف پہلی دو قسموں کو ترقی حاصل ہو رہی ہے۔

مسٹر ٹرنر فرماتے ہیں:-

مونوپلین کو بازو پھیلا کر اڑنے والے پرندہ سے جو مشابہت حاصل ہے وہ ظاہر ہے اور حقیقت میں اس مشین کی اڑان کا دارومدار انھیں اصولوں پر ہے جن پر کہ پرندے اڑتے ہیں۔ دونوں میں فرق صرف بقدر ہے کہ ایک طرف تو مصنوعی طاقت اور اس طاقت سے کام لینے والے کی ذہانت ہوتی ہے اور دوسری طرف پرندہ کے عضلات اور اس کی عقل حیوانی۔ مونوپلین زیادہ تر ایک قسم کی پتنگ سے مشابہ ہوتا ہے جو کسی قدر جھکے ہوئے زاویہ پر اڑ رہی ہو اور جسے ڈور نے ہوا کے اندر تھام رکھا ہو۔ فرق یہ ہے کہ مونوپلین میں تھامنے والی ڈور کے بجائے چلانے والا پیچ Propeller Screw ہوتا ہے۔

آلہ ہائے پرواز میں سب سے زیادہ قابل لحاظ امر ان کی بوجھ اٹھانے کی طاقت ہے" اور اس بارے میں اس وقت تک بہت سے تجربات کئے جا چکے ہیں۔ پانچ سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ سر ہیرم میکسم نے قصر بلوریں میں ایک بارہ انچ چوڑے آلہ پرواز سے جو نہایت پتلا اور ہموار بنا ہوا تھا اور جسے سطح زمین سے ½ درجہ متوازی خط میں قایم کرکے آٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلایا گیا تھا اس قسم کا تجربہ کرکے یہ بات دریافت کی تھی کہ وہ اس بوجھ سے ایک سو گنا وزنی شے کو اٹھا سکتا ہے جس کی نسبت اب سے ۲۵ سال اس طرف کے بہترین ریاضی دانوں کا قیاس اغلب ہو سکتا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بلیریٹ کے مونوپلین نے جولائی ۱۹۰۹ء میں رود بار انگلستان کے اوپر سے گذرا تھا ۵ پونڈ فی مربع فٹ کے حساب سے بوجھ اٹھایا تھا۔ بحالیکہ پروفیسر سینگلے کا خیال یہ تھا کہ اس سے نصف وزن ہی اٹھنا ممکن ہے۔

کچھ عرصہ سے مونوپلین اور بائی پلین قسم کے آلہ ہائے پرواز کے موئیدوں میں ایک قسم کا اختلاف رائے چلا آ رہا ہے۔ ان میں سے ایک فریق مونوپلین یعنی ایک بازو والے آلہ پرواز کو بہتر قرار دیتا ہے اور دوسرا فریق بائی پلین یعنی دو بازو والے آلہ کو افضل سمجھتا ہے۔ سردست اس بارے میں کوئی قطعی رائے دینا محال ہے اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ زمانہ ہی کے ہاتھوں طے ہوگا لیکن باہمہ واقعات پر نظر رکھتے ہوئے یہ امر قرین قیاس نظر آتا ہے کہ آخر کار بازی بائی پلین ہی کے ہاتھ رہے گی کیونکہ اس قسم کے آلہ پرواز کی مدد سے ہوا بازوں نے نہ صرف بڑے بڑے لمبے فاصلے طے کئے ہیں بلکہ بلندی پرواز کے معاملہ میں بھی خوب ہی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کی بعض مثالیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) ۱۹۰۹ء میں فارمین نے اس قسم کے آلہ پرواز کی مدد سے ۱۴۴ میل کا فاصلہ طے کیا۔

(۲) اسی سال پالمن نے مقام بوائے پر اپنے آلہ کو ۱۰۰۰ فٹ کی بلندی تک پہنچا دیا۔

(۳) کونٹ ڈی لیمبرٹ نے "رائٹ" قسم کے بائی پلین پر سوار ہو کر ایفل ٹاور کی چوٹی تک پرواز کی اور اسے اس کے گرد اڑایا۔

(۴) لندن سے مانچسٹر تک کی ہوائی پرواز میں جس پر اخبار ڈیلی میل نے دس ہزار پونڈ کا انعام مشتہر کیا تھا مسٹر گراہام وہائٹ اور موسیو پالمن نے فارمین قسم کے بائی پلین ہی استعمال کئے تھے۔

اسی ضمن میں یہ بیان کر دینا بھی غیر موزوں نہ ہوگا کہ آلاتِ پرواز کی مختلف قسمیں بعض مخصوص خوبیاں رکھتی ہیں اور اس اعتبار سے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں اچھی قسم کون ہے اور ناقص کون -

(۱) اینٹائنیٹ قسم کا آلہ پرواز مضبوط اور مستقل ہوتا ہے - اسکی پائداری کی بھی تعریف کی جاتی ہے -

(۲) رائٹ قسم کا آلہ پرواز بہت جلد مڑ سکتا ہے -

(۳) بلیریٹ قسم کے آلہ پرواز کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے -

(۴) کرٹس قسم کا آلہ پرواز بھی سرعت کے لئے مشہور ہے - و علیٰ ہذا القیاس -

دو قسم کے مونوپلین بہتر اور قابل ترجیح گنے جاتے ہیں ایک تو بلیریٹ اور دوسرے لیتھم - اینٹائنیٹ آلہ ہائے پرواز - بلیریٹ نمبر ۱۱ کے آلہ پرواز میں جو نمبر ۱۲ سے بہت چھوٹا ہوتا ہے بازوؤں کا پھیلاؤ ایک سے دوسرے پہلو تک ½ ۲۵ فٹ اور سطح ۱۵۰ مربع فٹ ہوتی ہے - مشین کے عقبی حصہ میں ایک قسم کی دُم سی لگی ہوتی ہے جسکی چوڑائی ۶ فٹ ہوتی ہے اور جس کی سطح ۱۸ مربع فٹ سے کم نہیں ہوتی - اس قسم کے آلہ پرواز کا مجموعی وزن ۷۰۶ پونڈ (جس میں چلانے والے کا وزن بھی داخل ہے) ہوتا ہے - اسے چلانے کا کام ایک تین سلنڈر کے انزانی قسم کے موٹر سے لیا جاتا ہے -

لیتھم کے اینٹائنیٹ مونوپلین کے بازوؤں کا پھیلاؤ ۴۲ فٹ اور سطح ۳۸۷ مربع فٹ ہے - اسکی لمبائی ۴۱ فٹ سے کم نہیں دیکھی جاتی - ۸ سلنڈر کا ایک سو گھوڑوں کی طاقت کا موٹر حرکت پیدا کرنے کے کام میں لایا جاتا ہے جو ایک ۷ فٹ سے زیادہ کے قطر کے پیچ کو ۱۲۰۰ فی لمحہ کے حساب سے گردش دیتا ہے - اس کا مجموعی وزن ۱۲۰۵ پونڈ ہوتا ہے -

مونوپلین قسم کے آلہ ہائے پرواز کی یہی دو قابل ذکر قسمیں ہیں - ایک قسم کا مونوپلین وہ ہے جسے اسٹاٹ پیلبڑی کہتے ہیں - اس میں فولاد کا فریم بنا ہوا ہوتا ہے - ایک قسم جو سینٹوس ڈوموئیٹ کہلاتی ہے بہت چھوٹی اور ہلکی ہوتی ہے - اس میں صرف ۳۰ گھوڑے کی طاقت کا ڈرک موٹر لگا ہوتا ہے جس کا وزن ۴۰۰ پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتا - مسٹر ولیس نے ایک جدید قسم کے مونوپلین تیار کئے ہیں یعنی ان میں دُم موجود نہیں ہوتی - قریب قریب تمام مونوپلین قسم کے آلہ ہائے پرواز میں صرف ایک ہی Propeller (آگے کو حرکت دینے والا آلہ) لگا ہوا ہوتا ہے لیکن ولیس قسم کے آلات میں دو ہوتے ہیں -

بائی پلینوں میں سب سے مشہور اور قابل ذکر رائٹ، کوڈی، اور فارمین ہیں جن کی تفصیلی کیفیت ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

(۱) رائٹ بائی پلین کی ساری سطح ۵۳۸ مربع فٹ اور پھیلاؤ ۴۱ فٹ ۳ انچ ہوتا ہے - اس میں دو پروپیلر لگے ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا قطر ½ ۸ فٹ ہوتا ہے - اس مشین کا وزن مع اس کو چلانے والے کے وزن کے ۹۰۸ پونڈ ہوتا ہے - اس کے ذریعہ سے آجتک سب سے بڑا کام جو انجام دیا گیا ہے وہ ایفل برج کی چوٹی تک پہنچنا اور اس کے گرد گھومتے ہوئے پرواز کرنا ہے -

(ب) کوڈی قسم کے آلہ پرواز کی شہرت اس وجہ سے ہے کہ ۸ ستمبر ۱۹۰۹ء کو مقام آلڈرشاٹ پر ۶۳ منٹ کے عرصہ میں ۴۰ میل سے زیادہ فاصلہ اس کی پرواز کے ذریعہ طے کیا گیا تھا - اس قسم میں دم نہیں ہوتی اور بازوؤں کا پھیلاؤ ۵۲ فٹ ۲ انچ ہوتا ہے - اس مشین کی قابل ذکر خصوصیت اس کے پلینوں کا خمدار ہونا ہے - اس کا وزن کم وبیش ایک ٹن ہوتا ہے اور اس میں دو عمودی پتواریں لگی ہوتی ہیں ایک آگے کی طرف اور دوسری پیچھے کی طرف -

(ج) موجودہ حالت میں سب سے مشہور آلہ پرواز بائی پلین قسم کی مشینوں میں سے فارمین ہے جس نے اگست ۱۹۰۹ء میں مقام ریمز پر ۱۸۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا اور جسے ۲۷ - اپریل ۱۹۱۰ء کو لندن سے

مانچسٹر تک کی پرواز میں کام میں لایا گیا تھا۔ مسٹر فارمین کا تعلق کسی وقت میں والین فریرز نامی آلہ ہائے پرواز بنانے کی کمپنی سے تھا مگر انھوں نے بعد میں اس کمپنی سے علیحدہ ہو کر بعض اصلاحات کے بعد یہ آلہ تیار کیا جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت تک وہ طویل فاصلوں کے لئے سب سے زیادہ طمانیت بخش مشین پائی گئی ہے۔

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند لفظوں میں کواڈروپلین (Quadruplane) یعنی چار بازوؤں والے آلہ ہائے پرواز کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ عام لوگوں کی توجہ ابھی ان آلات پر نہیں پڑی اور نہ پبلک کا رجحان اس طرف ہے البتہ بارکنگ واقع ایسکس میں مسٹر ڈیورال سال اور میجر ہیڈن پاول ان کے متعلق تجربات کر رہے ہیں۔ مسٹر سال نے اپنے آلہ کی مدد سے تھوڑا بہت فاصلہ طے بھی کیا ہے لیکن ابھی تک ان مشینوں میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

آلات پرواز کے متعلق کوئی مضمون اس وقت مکمل نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس قسم کا جسے اصطلاح میں Dirigible (ڈی رجی بل) کہتے ہیں کسی قدر ذکر نہ کیا جائے کیونکہ اڑنے کی کلوں کی یہی وہ قسم ہے جسکے متعلق مسٹر ٹالبٹ فرماتے ہیں کہ

زمانہ مستقبل کا آلہ پرواز ڈی رجی بل ہی ہے۔ اس وقت تک سوائے اضلاع متحدہ امریکہ کی گورنمنٹ کے باقی کسی سلطنت نے ایروپلین کو سامان حرب میں شمار نہیں کیا ہر چند کہ فرانس کے ہوا بازوں نے ایروپلین کی اڑان میں بہت سی نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں تاہم اسوقت تک وہاں کی گورنمنٹ نے اسے اس قابل نہیں سمجھا کہ جنگ کے موقعہ پر اس سے کام لیا جا سکے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ ایروپلین صرف اس وقت تک قابو میں رہ سکتا ہے جب تک کہ اسے تیزی کے ساتھ اڑایا جاتا رہے۔ کسی خاص مقام پر ہوا میں اسے کھڑا نہیں رکھا جا سکتا۔

"ڈی رجی بل" بیلونوں کی تین مختلف قسمیں ہیں (۱) سخت (۲) نیم سخت اور (۳) وہ جو سخت نہیں ہوتے۔ ان میں سب سے اول سخت بیلون کا ذکر کیا جاتا ہے (۱) سخت قسم کے ڈی رجی بل بیلونوں میں زیپلین کا غبارہ بہت مشہور ہے۔ اس قسم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حصہ جس میں گیس بھری رہتی ہے خواہ اسکا ایک ہی خانہ ہو یا کئی ہوں کسی سخت چیز مثلاً لکڑی یا دھات کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اس وجہ سے رکھی گئی ہے کہ اگر بیلون کی گیس کسی قدر خارج ہو جائے تو اس حالت میں بھی اسکی دیواریں سخت رہتی ہیں اور باوجود گیس کا کچھ حصہ خارج ہو جانے کے اسے چلایا جا سکتا ہے۔ بخلاف اسکے اگر دیواریں نرم ہوں تو گیس خارج ہونے پر پچک جاتی ہیں اور اس حالت میں غبارہ کو ہوا میں چلانا قطعی طور پر ناممکن ہو جاتا ہے سخت قسم کے ڈی رجی بل میں اگر کوئی نقص ہے تو صرف یہ ہے کہ اسکا وزن بہت بھاری ہوتا ہے اور اس میں کسی بوجھ کو اٹھانے کی طاقت پیدا کرنے کے لئے بہت بڑا بیلون مہیا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ڈی رجی بل اور معمولی ہوا میں اڑنے والے بیلونوں میں بہت فرق ہوتا ہے کیونکہ بیلون تو اپنی مرضی پر جہاں چاہے اڑ سکتا ہے مگر ڈی رجی بل کے معنی اس چیز کے ہیں جسے خود حسب منشا چلایا جا سکے۔ اسلئے اسے اپنی مرضی کے مطابق جدھر چاہیں لے جا سکتے ہیں۔

سخت قسم کے ڈی رجی بل غباروں میں قابل ذکر نام زیپلین ثانی کا ہے جو ۴۵۰ فٹ لمبا اور ۴۲ فٹ قطر میں ہوتا ہے۔ اس میں گیس بھرنے کے ۱۷ خانے ہوتے ہیں جن میں سے ایک کا دوسرے سے کچھ تعلق نہیں ہوتا اور ان کے اوپر ایلومینیم دھات کا خول چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اسکی صورت بیلن کی سی اور سرے مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس میں ۵۲۰۰۰۰ مکعب فٹ گیس سما سکتی ہے اور اس کے اندر ۳۵۰۰۰ پونڈ بوجھ اٹھانے کی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے نیچے دو کشتی نما گاڑیاں بیس بیس فٹ لمبی اور چھ چھ فٹ چوڑی لگی ہوئی ہوتی ہیں اور دونوں کے درمیان ۱۰۰ فٹ کا

فاصلہ ہوتا ہے۔ یہ گاڑیاں مرکب الومینیم کی بنی ہوتی ہیں۔ اس میں ۱۱۰ گھوڑوں کی طاقت کا موٹر لگا ہوتا ہے۔ ہر گاڑی کے آگے دھات کے بنے ہوئے دوہرے پھل کے "پروپیلر" لگے ہوتے ہیں جنکا اوسط قطر ۱۵ فٹ ہوتا ہے۔

(۲) نیم سخت قسم کی بہترین مثال فرانس کے جنگی ہوائی جہاز لاری پبلک میں دیکھی گئی تھی جو ۲۵ ستمبر ۱۹۰۹ء کو ہوا میں تباہ ہو گیا تھا۔ اس غبارہ میں ۱۲،۱۰۰ مکعب فٹ گیس سماتی تھی اور کپتان کے علاوہ اس کے نائب اور دو ہوابازوں کو اڑا کر لے جا سکتا تھا۔ اس میں ۵۰ گھوڑوں کی طاقت کا موٹر لگا ہوا تھا اور دو پروپیلر تھے جن کے دوہرے پھل لگے ہوئے تھے، جن میں سے ہر ایک کا قطر ½ ۸ فٹ تھا۔

(۳) ولی ڈی پاری نامی ڈی رجی بل غبارہ اس قسم سے ہے جو بالکل سخت نہیں ہوتی۔ اس کا گیس کا خانہ ۲۰۰ فٹ لمبا ہے اور اس کا زیادہ سے زیادہ قطر ½ ۴۳ فٹ سے کم نہیں۔ اس خانہ میں ۲،۱۱۹۲ مکعب فٹ گیس سماتی ہے۔ اسکی گاڑی ٹکٹکی کی صورت کی لکڑی اور الومینیم کی بنی ہوئی ہے۔ غبارہ کی لمبائی ۱۱۷ فٹ اور اونچائی ۷ فٹ ہے اور اس میں ۷۰ گھوڑوں کی طاقت کا موٹر لگا ہوا ہے۔

برطانیہ کلاں کا وہ فوجی ہوائی جہاز جس کا نام ڈی رجی بل نمبر ۲ ہے ایک عجیب خصوصیت رکھتا ہے، جو یہ ہے کہ اس کے گرد وہ جھلی منڈھی ہوئی ہے جس کے اندر رکھکر ورق کوٹے جاتے ہیں۔ اس جھلی کی ۸ تہ چڑھی ہوئی ہیں اور ان کے اوپر کینوس لگی ہوئی ہے۔

ڈی رجی بل قسم کے بیلون اور آلہ پرواز (ایروپلین) کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو جنگی استعمال کے لحاظ سے اول الذکر قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسے جب تک چاہیں کسی خاص مقام کے اوپر کھڑا رکھ سکتے ہیں۔ یہ بیان کرنا شاید غیر ضروری ہوگا کہ کسی نہ کسی قسم کے آلہ ہائے پرواز کو جنگ کے موقعوں پر کام میں لانے کا رجحان دول یورپ میں ترقی پر ہے۔ چنانچہ اس رجحان کو دیکھ کر انگلستان کے مشہور لبرل اخبار "ڈیلی نیوز اینڈ لیڈر" نے پچھلے دنوں دول یورپ سے حسب ذیل درخواست کی تھی۔

ہم دول عالم سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ وہ آپس میں مشورہ کر کے اس آفت مہلکہ (جنگ میں ہوائی جہازوں اور آلات پرواز کے استعمال) کو جو موجودہ طریق جنگ کی نسبت زیادہ خطرناک ہے روک دیں۔ کہا جاتا ہے کہ تمدن کا اقتضا ہے کہ صلح و امن قایم ہو اور استعمال اسلحہ کی کوئی خاص حد مقرر کی جائے مگر یہ ایک منافقانہ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہوائی جہاز جن کو اس زمانہ کی متمدن دنیا کے قابل فخر اختراعات سے بتایا جاتا ہے، خود ایک تباہی لانے والی چیز ہے۔

اسی ضمن میں ہندوستان کے ایک موقر ہمعصر کے خیالات بھی قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں۔ لکھا ہے:۔

حال میں بعض مصنوعی جنگوں میں ہوائی جہاز کے متعلق واقف کاران جنگ نے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ بعض نے لندن میں ایروپلین قسم کے آلہ ہائے پرواز کی خرابی پر اظہار نفرت کیا اور کہا کہ ایروپلین اس وقت تک اس قابل نہیں ہو سکے کہ ۱۲ ہزار کے پورے ڈویزن کا پتہ لگا سکیں۔ ان کی رفتار ہنوز بے اختیاری کی حالت میں ہے اور کوئی ہواباز ماہر فن کی حیثیت سے ان پر اتنا قابو نہیں رکھتا کہ جس جگہ چاہے انھیں روک سکے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں جہاں کہیں ہوائی جہاز کا لفظ آیا ہے اس سے مراد صریحاً ڈی رجی بل بیلونوں سے ہے کیونکہ فوجی حکام انھیں ایروپلینوں پر قابل ترجیح خیال کرتے ہیں۔

آلہ ہائے پرواز کی ترقی روز افزوں نظر آ رہی ہے اور ہر چند کہ ان کی اڑان اس وقت تک نہایت خطرناک ثابت ہو چکی ہے تاہم سر ہیرم میکسیم کا یہ قول بالکل سچ ثابت ہو رہا ہے کہ

موجودہ حالت میں ایک ہزار سے زاید نہایت ہوشیار اور ماہر انجنیئر اور جر ثقیل کے واقف کار لوگ فن ہوابازی کے ہر پہلو کا بڑے غور سے مطالعہ

پوجا

(الموڑہ کي ایک حسینہ پوجا کرنے کے لئے مندر میں داخل ہو رہي ہے)

انڈین پریس الہ آباد

کر رہے ہیں اور ہر چند کہ گذشتہ عرصہ قلیل میں بعض نہایت اہم نتایج حاصل ہو چکے ہیں تاہم معلوم ہوتا ہے کہ سنہ آیندہ میں اس سے بھی عجیب تر نتایج ظہور میں آنے والے ہیں۔

جس استقلال اور ہمت کے ساتھ اہل مغرب اس کام میں مصروف ہیں اسکا اندازہ ذیل کی عبارت سے ہو سکے گا جو میں اُردو زبان کے ایک قابل ذکر اخبار کے لیڈنگ کالموں سے اخذ کرتا ہوں۔

شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گذرتا ہو گا جس میں دو ایک ہوائی جہاز ران (ہوا باز) گر کر فنا نہ ہوتے ہوں۔ اب تک جتنے آدمی گر چکے ہیں ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے مگر باشندگان یورپ ان حوادث سے متاثر نہیں ہوتے ہوا بازی کی تعلیم کے لئے ممالک یورپ میں اسکول قایم ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں.... یہ لوگ ہر ایک کام کو انتہا درجہ پر پہنچائے بغیر نہیں رہتے باوجودیکہ ہوائی جہاز جنازہ رواں کی حالت اختیار کئے ہوئے ہے مگر ذرا بھی خوف نہیں کیا جاتا.... ہوائی جہازوں کی پرواز اگر قابو میں نہ لائی گئی تو یہ صنعت کا ایک ایسا سخت نقصان ہو گا جس پر جہاں تک افسوس کیا جائے کم ہے۔ ہوا باز بالکل بے قابو نظر آتے ہیں اور آلہ پرواز مثل اس زخم خوردہ یا سہمگیں کبوتر کے جو بہری یا باز سے بدحواس ہو گیا ہو غیر معین جگہ پر گر پڑتا ہے.... معلوم نہیں ایسے ہوائی آلات کب تک قابل اطمینان طریقہ سے پرواز کر سکیں گے ؟

اگر تحقیق اور تجربہ کا سلسلہ اسی طرح قایم رہا تو یقیناً وہ دن دور نہیں !

تیرتھ رام

دھوکے کی ٹٹی

(۱)

لال مرچ دیکھنے میں کیسی خوبصورت ہوتی ہے، مگر کھانے میں کیسی کڑوی! سرنیدرو کی بھی یہی کیفیت تھی۔ دیکھنے میں بہت خوش وضع، خوش لباس، زبان کا بہت میٹھا، دوستوں میں بہت ہر دلعزیز۔ مگر بلا کا نفس پرور، بداخلاق، شریر۔ مدرسہ کی انٹرنس جماعت میں پڑھتا تھا۔ سِن سولہ سال سے زیادہ نہ تھا مگر مزاج میں ابھی سے آوارگی کا دخل ہو چلا تھا۔ شراب کی لذتوں سے زبان مانوس ہو چکی تھی، اور گھر سے صندوق کھولکر روپے چرا لینا تو ایک معمولی سی بات تھی۔ والدین سمجھا بجھا کر ہار گئے۔ سکول ماسٹروں نے مار پیٹ، جرمانہ سب کچھ آزما دیکھا، مگر سرنیدرو نے جو روش اختیار کی تھی اُس سے ذرا بھی نہ مڑا۔ شہر میں کہیں برات آئے، کہیں ناچ ہو، کہیں عیش و طرب کی محفل سجے، سرنیدرو کا وہاں پہنچنا ایک شرطی امر تھا۔ اُسے کبھی کسی نے کتاب پڑھتے نہیں دیکھا، مگر تعجب یہ تھا کہ وہ ہر سال امتحان میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اسکا راز بجز اُسکے خاص دوستوں کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ ہاں امتحان کے دنوں میں وہ ہیڈ ماسٹر اور دیگر ماسٹروں کے ملازموں سے زیادہ ربط ضبط کر لیتا۔ عام والدین اُسوقت تک لڑکوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوتے جب تک وہ ایک ہی درجہ میں بار بار فیل نہوں۔ سرنیدرو یہ نوبت نہیں آنے دیتا تھا، اور اس لئے اُسکے والد جو ایک بہت متین آدمی تھے اُس سے زیادہ باز پرس نہ کرتے۔ سرنیدرو میں ایک بڑا وصف یہ تھا کہ اُسکی نگاہ انسان کے کمزور حصہ پر بہت جلد جا پہنچتی تھی؛ اور اس وصف سے اُسکا بڑا کام نکلتا۔ کوئی سکول ماسٹر ایسا نہ تھا جسکے داغ اور دھبے اُس پر روشن نہوں، اس گر نے اُسے انٹرنس تک نباہا یہاں تک کہ انٹرنس کا سالانہ امتحان آیا۔ سرنیدرو نے اس موقع کے لئے بڑے اہتمام کئے تھے۔ سب سکول ماسٹر اُسکے خیراندیش بن گئے تھے۔ کامیابی کی سب صورتیں اُسکے موافق تھیں،

مگر عین اُسوقت جبکہ اُسکی دُزدیدہ نگاہیں دوڑ دوڑ کر برسوں کا کام لمحوں میں پورا کئے دیتی تھیں ایک گرجتی ہوئی آواز اُسکے کان میں آئی "سُرِندرو! قلم رکھدو! انہیں اب لکھنے کی اجازت نہیں ہے" سُرِندرو نے ماتھا پیٹ لیا۔ یہہ ہیڈ ماسٹر صاحب تھے۔ اشتہاری مجرم گرفتار ہوگیا، اور اُسکا نام اسکول سے خارج کر دیا گیا۔

(۲)

سُرِندرو کے لئے اب بجز اسکے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ کہیں اور تعلیم کا سلسلہ قایم کرے، مگر اس حادثہ نے اُسکے دل پر کوئی اصلاح بخش اثر نہیں پیدا کیا۔ اس نے تو منہ مانگی مُراد پائی۔ اُسے اب نئی دنیا دیکھنے کا نئی دلچسپیوں کے لطف اُٹھانے کا، نئے دوستوں کی صحبت کا موقعہ ہاتھ آیا۔ کسی دوسری صورت میں یہہ آرزوئیں مشکل سے پوری ہوتیں، اب وہ خود بخود اُسکے روبرو دست بستہ کھڑی تھیں۔ وہ جس وقت مدرسہ سے چلا اُسکا چہرہ کچھ تمتمایا ہوا تھا، مگر یہ غصہ بہت جلد ٹھنڈا ہوگیا۔ اُس کے دل نے خوش ہوکر کہا مُلک خدا تنگ نیست، لیکن اب کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ غیر ممکن تھا، اور الہ آباد یونیورسٹی میں کوئی صورت نہ نکلی۔ اسلئے سیدھا لاہور جا پہنچا اور وہاں ایک مدرسہ میں شریک ہوگیا۔ کرکیٹ کا زبردست کھلاڑی، فٹ بال میں مشاق، شکل و صورت کا جنٹلمین، فراخدل، بلند حوصلہ، ایسا طالب علم جہاں جائے اُسے دوستوں کی کمی نہ رہے گی۔ لاہور میں بہت جلد دوستوں کی کافی تعداد ہوگئی، اور پھر وہی چہچہے اور قہقہے اُڑنے لگے۔ مگر ذرا احتیاط کے ساتھ، شرم کا پردہ رکھے ہوئے۔ صبح کو باغوں کی سیر، شام کو کرکیٹ اور فٹ بال، رات کو رِندی اور مے نوشی، پھر ترنم پردازیوں کے مشغلے۔ کبھی کبھی تھیں ایں اشغال میں راتیں گذر جاتیں، مگر یہہ سب آزادیاں اور مستیاں چند برگزیدہ معتمد احباب تک محدود تھیں، ورنہ عام طور پر یہہ حضرت بہت فرشتہ صفت، منکسار، حلیم و سلیم مشہور تھے۔ یہانتک کہ کالج کے پرنسپل مسٹر کاشن جب لڑکیوں کے مدرسہ کا معائنہ کرنے جاتے تو کبھی کبھی سُرِندرو کو اپنی امداد کے لئے ساتھ لے جاتے۔ مبارک ہوتا وہ دن جب بانکا، سجیلا سُرِندرو لڑکیوں کے مدرسہ میں داخل ہوتا۔ ہیڈ مسٹرس مس گپتا کا مسکرا کر اُس سے ہاتھ ملانا! آہ اُس کف بلورین کا اُسکے ہاتھ میں آنا آنکھوں میں نشہ کے ایک طوفان کا آنا تھا۔ اُسکا دل اُمنگ سے پھول اُٹھتا، اور دل کی فرحت اور شگفتگی اُسکی صورتِ زیبا کا رنگ اور بھی چوکھا کر دیتی۔ پھر یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مس گپتا کو اُس کی ہونے والے بیوی پر رشک آتا۔

ایک دن سُرِندرو کالج سے آرہا تھا کہ کلکتہ کے ایک پُرانے رفیق سے آنکھیں چار ہوئیں۔ یہ بابو ہری موہن تھے۔ اُنھیں دیکھتے ہی سُرِندرو کا خون سرد ہوگیا۔ ہری موہن اُسکی ناہمواریوں کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ بہت گھبرایا، مگر تپاک سے بڑھکر سلام کیا اور خیر و عافیت پوچھی۔ ہری موہن نے اُسے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ خاکہ وہی تھا، مگر رنگ نیا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، جب علیحدہ ہونے لگے تو سُرِندرو نے بہت منت آمیز لہجہ میں کہا "بھائی صاحب! جسے خدا نے خراب بنایا ہے وہ کبھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ نیکبخت بن جاؤں، مگر نہ بن سکا۔ ہاں نیکبختی کی شہرت حاصل کرلی۔ یہاں بجز آپ کے کوئی دوسرا میرے حالات سے واقف نہیں ہے۔ اسلئے مجھ غریب پر نظرِ عنایت رکھئے گا۔ آپ چاہیں تو بات کی بات میں میرا رنگ پھیکا کرسکتے ہیں۔ میں بالکل آپ کے بس میں ہوں۔ مگر مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ آپ کو میں ہمیشہ اپنا بزرگ اور خیراندیش سمجھتا رہا ہوں"

سُرِندرو کی باریک نگاہیں ہری موہن کے کمزور حصہ پر جا پہنچیں اُن کے چہرہ پر ہمدردانہ مُسکراہٹ نظر آئی۔ بولے "مجھے تم ہمیشہ اپنا دوست سمجھنا"

(۳)

سرنیدرو نے لاہور میں ایک بڑا کام سرانجام دیا۔ اُس نے ایک "ینگ مینس یونین" قایم کرلی، اور خود اسکا سکرٹری بن بیٹھا۔ اس یونین کے مقاصد بہت اعلیٰ تھے۔ نوجوانوں کے آداب و اخلاق کی تہذیب، عملی اور علمی ترقی، اتفاق باہمی کی اشاعت، وغیرہ۔ ممبروں کو کچھ ماہواری چندہ دینا پڑتا اور ازروئے حلف اقرار کرنا پڑتا کہ میں اس یونین کے کسی ممبر کو کسی آفت میں دیکھوں گا تو ہر ممکن صورت سے اُس کی مدد کرونگا۔ چندہ کی رقم سے چند اخبار آتے، اور جو کچھ بچتا وہ کار خیر میں صرف ہوتا۔ اس کام میں سرنیدرو کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک ماہ کے اندر یونین میں ۵۰ سے زیادہ ممبر ہوگئے، پچیس روپیہ ماہوار چندہ آنے لگا پانچ یتیموں اور کئی بیواؤں کی پرورش ہونے لگی۔ اس کامیابی کا سہرا مسٹر سکرٹری کے سر تھا، جس کی شہرت دن دُونی اور رات چوگنی ہوتی جاتی تھی۔ پرنسپل کاٹن اُسے پہلے ہی سے مانتے تھے، اب مرید ہوگئے۔ شہر میں بھی یونین کا چرچا ہونے لگا، مگر یہ شاندار نام کا یونین بجز شہدوں کی ایک جماعت کے اور کچھ نہیں تھا۔ مختلف کالجوں کے جتنے اوباش، آوارہ مزاج، بدوضع، بدقماش، سیلانی طلبا تھے وہ سب اسکے ممبر تھے۔ یونین کا کمرہ اُن کی دلبستگیوں کا اکھاڑا تھا۔ یہاں وہ گاتے بجاتے، اور یہاں ہی اُن کی رندانہ مجلسیں آراستہ ہوتیں کیونکہ فن موسیقی کی اشاعت بھی یونین کے پروگرام میں داخل تھی۔ یونین کے سارے ممبر سرنیدرو کو اپنا رہبر اور پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ اُس نے ہر ایک کے دل میں یہ بات جما دی تھی کہ اگر تم بلا محنت اور مشقت کے امتحان پاس کرنا چاہتے ہو تو بجز اسکے اور کوئی علاج نہیں کہ یونین کے رکن بن جاؤ۔ سرنیدرو کو امتحانی پرچوں کی سُراغ رسانی میں یدطولیٰ تھا، اور یہی اُسکے اثر اور دباؤ کا راز تھا۔ کالج میں سرنیدرو کی وہی عزت تھی جو کسی پروفیسر کی۔ شہر میں اُسکے آگے اچھے اچھوں کے سر جھک جاتے کیونکہ کئی بار اُسے اس مقولے کے عملی ثبوت دینے کا موقعہ مل چکا تھا کہ "اتفاق ایک زبردست طاقت ہے"۔

یونین کے ممبروں کی زندگی واقعی قابل رشک تھی۔ امتحان کے دن سر پر آگئے تھے۔ عام طلبا پر خواب و خور حرام ہوگیا تھا۔ رات کی رات اور دن کے دن مشق اور مطالعہ کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ورزش کا میدان، کلب، لائبریری سب ویران پڑے ہوئے تھے۔ ہر اُمیدوار کسی سنیاسی کی طرح مراقبہ میں بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جسے دیکھئے اپنی کوٹھری میں سمادھی لگائے بیٹھا ہے۔ اس شبانہ روز کی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی نے دردسر، درد چشم، ثقل ہضم، بخار، اور دیگر عوارض کا ایک طوفان برپا کردیا ہے۔ آنکھیں پھوڑے کی طرح دُکھ رہی ہیں مگر کتاب ہاتھ میں ہے۔ مارے درد کے سر پھٹا جاتا ہے مگر پنسل ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ بخار سے بدن توا ہو رہا ہے مگر زبان ورد میں مصروف ہے۔ ادھر تو یہ آفتیں تھیں، اُدھر یونین کے ممبر چین کی بانسری بجاتے تھے۔ کبھی گانا ہو رہا ہے کبھی چاء پارٹی، کبھی پک نک۔ جسے دیکھئے بے غم اور بے فکر، گلچھرے اُڑاتا نظر آتا ہے کسی کو امتحان کی ذرہ برابر فکر نہیں۔ یہاں تک کہ امتحان کے دن آئے اور یونین کے بھاگ جاگ گئے۔ کالج کے عام طلبا بمشکل ۲۰ فیصدی کامیاب ہوئے۔ یونین کے ایک سو ممبروں میں صرف پچیس فیل تھے۔ لوگوں کو اچنبھا ہوگیا۔ مگر اصل راز کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ سرنیدرو جس نے خواب میں بھی کتاب کی صورت نہ دیکھی اوّل درجہ میں پاس ہوا۔

(۴)

اسی اثنا میں مس گپتا کا تبادلہ ہوا، اور مس روہنی سرکار کلکتہ سے اُنکی جگہ پر مقرر ہوکر آئیں۔ روہنی حسن و ادا میں مس گپتا کی نعم البدل تھی۔ طرہ یہ کہ دوشیزہ! سرنیدرو نے پہلے ہی نگاہ میں اپنے شکار کو تاڑ لیا، اور روہنی بھی پہلی ہی ملاقات میں اُسکی مردانہ وضع، شریفانہ بشرہ، اور دلنواز بے تکلفی سے حد درجہ متاثر ہوئی۔ مس گپتا نے اُس سے سرنیدرو کی

بے انتہا تعریفیں کی تھیں - اور اس تذکرہ نے اُسکے دل میں سریندر و سے ایک لگاؤ سا پیدا کر دیا تھا - اُس نے اُسے اُن تمام اوصاف و کمالات سے آراستہ پایا جنکا اپنے شوہر میں موجود رہنا وہ ضروری سمجھتی تھی - سرو نما قد، چھریرا بدن، مسکراتا ہوا چہرہ، خوش اخلاق، خوش بیان گو ایک یا دو ملاقاتیں ایک ایسے اہم معاملہ میں تصفیہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں، مگر سریندر و نے استنے دنوں بھاڑ نہیں جھونکی تھی جب سے ہوش سنبھالا اس نے اسی کوچہ کی خاک چھانی، اسی بحر کی غواصی کی - اسنے دیکھ لیا کہ مچھلی چارہ کُترنے لگی، اب پھنسنے میں دیر نہیں ہے - روہنی دن بھر سریندر و کی تعریفیں سُنتی - یونین کے ایکسو ممبروں میں سے ہر ایک شخص موقع و محل دیکھکر سریندر و کا ذکر خیر اُس سے کر جاتا - اُن کی بیویاں، بہنیں آتیں اور اُسکا بکھان کرتیں - غرض صبح سے شام تک اسی طرح کی باتیں اُسکے کان میں پڑتی رہتیں - یہانتک کہ ان عملیات نے اُس سادہ، بے لوث لڑکی کو محبت سے دیوانہ بنا دیا - یہ لمبی کران منتر اپنا کام کر گیا - اب روہنی کو درد تنہائی کی کسک محسوس ہونے لگی - ہر وقت اکیلے پن کا خیال دل کو ستانے لگا - مکان اور باغ اور سیر گاہیں سونی معلوم ہونے لگیں - غرض آنکھیں آٹھوں پہر سریندر و کے انتظار میں رہنے لگیں - ایک بھولا بھالا دل نمایشات کے نذر ہو گیا - جب یہ منزل دشوار طے ہو گئی تو منگنی اور بیاہ میں کیا دیر لگتی - یہ دونوں مراسم بہت سادگی اور متانت کے ساتھ ادا کئے گئے - جسوقت اچاریہ رسم نکاح ادا کر رہے تھے سریندر و ایسا متین اور مرعوب نظر آتا تھا گویا وہ اس نئی زندگی کی ذمہ داریوں کے خیال سے دبا جاتا ہے - جب دعاء نکاح ختم ہوئی تو سارے مجمع نے آمین کہا - صرف ہرّی موہن کی زبان سے یہ دعا نہ نکلی - یونین کے ممبروں نے شادی کی خوشی میں ایک زبردست اور پُر شور محفل سجائی - رات بھر ہُو حق ہوا کی - شراب کے خُم کے خُم خالی ہو گئے - خوش قسمتی سے سریندر و اسی سال بی - اے میں کامیاب ہو گیا - یونین کی حیرت انگیز کامیابی نے سب کو حیرت میں ڈالدیا - ایک ممبر بھی فیل نہوا -

(۵)

شادی ہو گئی - دوستوں نے خوب دل کھول کر مبارکبادیں دیں - بالخصوص مس گپتا تو پھولی نہ سمائیں - وہ دہلی سے اس تقریب میں شریک ہونے کے لئے آئیں - ہفتہ بھر تک جشن ہوتے رہے - اسکے بعد میاں بیوی شملہ کی سیر کو روانہ ہوئے - یونین کے ممبر گرلس اسکول کا اسٹاف اور دیگر احباب رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک آئے - ان میں بابو ہرّی موہن بھی تھے - جب سب لوگ رخصت ہو گئے، اور انجن نے چیخ کر گاڑی کھینچی تو ہرّی موہن نے بھی وداعی مصافحہ کیا - اُن کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں افسوسناک خیالات بھرے ہوئے تھے - وہ وہاں خاموش گاڑی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیر تک کھڑے رہے - یہانتک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی - اُن کا دل کہتا تھا کہ "یہ مسرت کا سفر نہیں، رنج و غم کا سفر ہے"

مہینہ بھر تک روہنی اور سریندر و شملہ میں رہے اور اس مہینہ بھر میں انھیں ایک دوسرے کی خُو بُو کا پورا تجربہ ہو گیا - شروع میں روہنی نے مس گپتا کو جو خطوط لکھے وہ عشق اور محبت کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے - مس گپتا ان خطوط کو بار بار پڑھتی اور سیر نہوتی مگر رفتہ رفتہ ان خطوط کا رنگ اندوہ و حسرت کی طرف مائل ہونے لگا - یہاں تک کہ آخری خط جس میں لکھا تھا کہ آج ہملوگ یہاں سے لاہور روانہ ہو رہے ہیں بہت دلشکن تھا - اُسکے آخری الفاظ یہ تھے "پیاری بہن! مجھے اب خوف ہوتا ہے کہ اس خواب مسرت سے بہت جلد بیدار ہونا پڑیگا جس چیز کو میں نے خالص سونا سمجھا وہ محض چمکتا ہوا پیتل نکلا - افسوس میں نے اپنی محبت کی دیوار بالو پر کھڑی کی تھی - خدا کرے میرے شبہے غلط ہوں - خدا نہ کرے کہ میرے یہ وسوسے صحیح ہوں - مگر پیاری بہن میرا دل بار بار کہتا ہے، اور قرائن اُسکی تصدیق کرتے ہیں، کہ ہستی کا سرمایہ

ختم ہو گیا۔ اب بقیہ زندگی رونے میں کٹے گی"۔ مس گپتا اس پُردرد خط کو پڑھکر بہت روئیں۔

لاہور میں جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ واپس آ رہے ہیں تو لوگوں کو تعجب ہوا۔ دو مہینے کا سامان کرکے چلے تھے۔ اور قیاس یہ کہتا تھا کہ شاید وہاں کی دلفریبیوں سے اتنی جلد طبیعت آسودہ نہو۔ مگر اسکے برعکس یہ لوگ ایک ہی ماہ میں اُکتا گئے۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ آخر مقررہ وقت آیا۔ احباب اُن کا خیر مقدم کرنے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے۔ گاڑی آئی، اور میاں بیوی اُس میں سے اُتر پڑے۔ نہ کپڑوں کا بکس تھا، نہ ٹرنک، نہ بستر۔ سُرنیدرو کی آنکھیں شراب سے سُرخ ہو رہی تھیں اور روہنی! آہ وہ نوشگفتہ پھول اب مُرجھا کر زرد ہو گیا تھا۔ چہرہ ایسا پژمردہ اور افسردہ تھا گویا حسرت و یاس کی تصویر ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سارا اسباب شراب کے نذر ہوا، اور زیور جوئے کے۔ کان کے آویزے تک نہ بچے!

(۶)

لاہور میں آ کر روہنی تو اپنے درس و تعلیم میں مصروف ہوئی اور سُرنیدرو میکشی میں۔ یونین کا شیرازہ اب بکھر گیا تھا۔ اسلئے بجز شراب کے دلبستگی کا اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ اگر کبھی روہنی سمجھانے کی کوشش کرتی تو سُرنیدرو کے تیور بدل جاتے۔ پرنسپل کاٹن نے یہ سمجھکر کہ بیکاری نے اسکی یہ گت بنا رکھی ہے اُسے اکونٹنٹ کے دفتر میں ایک بہت معقول جگہہ دلا دی۔ مگر جس شخص کی تحصیل کا زمانہ خرمستیوں میں گذرا ہو وہ صبح سے شام تک دفتر میں خشک کاغذوں اور روح فرسا اعداد کے ساتھ کیونکر سر مارتا۔ ایک دن ہیڈ کلرک نے اُسے چند اعداد کا میزان مرتب کرنے کا حکم دیا۔ میزان لاکھوں تک پہنچتا تھا۔ سُرنیدرو اعداد کی نامتناہی قطار دیکھکر ایسا گھبرایا کہ دفتر سے بے تحاشا بگٹٹ بھاگا کہ گھر پر آ کر دم لیا۔ اسکے بعد کئی ماہ تک وہ مختلف دفاتر کی خاک چھانتا رہا مگر تلون اور وحشت نے کہیں قدم نہ جمنے دیا۔ یہانتک کہ پرنسپل صاحب مایوس اور جملہ دفاتر کے دروازے اُسکے لئے بند ہو گئے۔

غریب بیکس روہنی اب اپنے کئے پر پچھتاتی تھی۔ مگر دل پر جو کچھ گذرتا خاموشی کے ساتھ جھیلتی۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتی۔ جب اُس نے دیکھا کہ سُرنیدرو کو سمجھانے بجھانے کی کوشش ہمیشہ سخت کلامیوں کا باعث ہوتی ہے تو قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ رہی۔ قسمت مایوسوں کی آڑ اور بدنصیبوں کا سہارا ہے۔ اخراجات کے باعث ملازموں کو جواب دینا پڑا۔ بیچاری بیزبان عورت دن بھر لڑکیوں کو پڑھاتی اور گھر کا سارا کام کرتی۔ ان مصیبتوں نے اس کی صورت کو یہاں تک مسخ کر دیا تھا کہ بابو ہری موہن جب مدراس سے سال بھر کے بعد لوٹے تو اُسے مشکل سے پہچان سکے۔

اس کے بعد معلوم نہیں اُن بدنصیبوں پر کیا گذری۔ پرنسپل کاٹن نے آئے دن کی حجت و تکرار سے تنگ آ کر روہنی سے استعفا لے لیا اور خدا جانے کس کس دیس کی خاک چھانتے ہوئے بالآخر وہ کشمیر پہنچے۔ وہاں سے روہنی نے مس گپتا کو جو خط لکھا وہ نہایت دردناک اور جگر دوز تھا:—

بہن! میرا کیا حال پوچھتی ہو! اب زندگی سے جی بھر گیا۔ مجھے اپنی کچھ فکر نہیں ہے۔ مگر تمہارے بہنوئی صاحب کی حالت نہایت خراب ہے۔ خدا گواہ ہے میں اب بھی ان کی پرستش کرتی ہوں۔ میں نے اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر دیا۔ مگر ہائے شراب! تیرا استیاناس ہو۔ ہائے جُوا! تیرا بُرا ہو۔ یہ دو مرض اُن کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔ بس اور زیادہ نہ کہوں گی۔ تم سے کہتے شرم آتی ہے، اور شرم کی تو اتنی پروا نہیں۔ کیونکہ مدت ہوئے اسے رخصت کر چکی مگر تمہیں سُنکر رنج ہوگا۔ بس یہی سمجھ لو کہ تمہاری بھولی بھالی روہنی اب اپنے کئے پر پچھتاتی اور خون کے آنسو روتی ہے۔

نواب رائے

تنقیدِ کتب

یورپ وامریکہ کے اخبارات ورسائل میں تنقیدِ کتب کا خاص صیغہ ہوتا ہے جو اپنے وقت کے کسی قابل اہل قلم کے چارج میں رہتا ہے۔ ہندوستانی پرچوں میں بھی اسکی نقل کیجاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات نقل مطابقِ اصل ہوتی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یورپ وامریکہ اور ہندوستان کی حالت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ جو علمی چرچا وہاں ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ وہاں ہفتوں کے اندر ایسی ایسی اور اتنی اتنی کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں جنکی ہمارے یہاں سالہا سال میں بھی امید نہیں کیجا سکتی۔ ہمارے یہاں اہل تصنیف جو کچھ اپنا زورِ دماغ صرف کرتے ہیں اسکے نتائج زیادہ تر ناولوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور وہ بھی بہ حیثیت مجموعی اس قابل نہیں ہوتے کہ ملکی لٹریچر کی فہرست میں ان کے لئے گنجایش نکل سکے الا ماشاءاللہ لیکن ممالک متمدنہ میں جہاں کے لوگ علم کے اور علم کے ساتھ کتابوں کے قدردان ہیں ایک خاص طبقہ کی دماغی محنت اس ملک کے علم ادب کے لئے وقف رہتی ہے اور آئے دن نئی نئی کتابیں ہر فن کی اور ہر سبجکٹ پر نکلتی ہیں۔ ہندوستان میں دربار اکبری اور الفاروق کی قسم کی شاندار کتابیں تو شاید مدتِ حیات میں ایک ہی دفعہ دیکھنے میں آتی ہیں لیکن متوسط درجہ کی کتب بھی اس سست رفتاری سے نکلتی ہیں کہ ان کی اشاعت اپنے مخصوص حلقے سے باہر نہیں ہوتی اور بہتوں کو ان کے وجود کا بھی علم نہیں ہوتا۔ ان تمام نقایص کے اسباب پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کے لئے مبسوط مضمون کی ضرورت ہوگی، لیکن مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہی ہے کہ ہم میں علی العموم علمی شوق مفقود ہے اور یہی فقدان بسا اوقات ہمارے ملک کے قابل آدمیوں میں بھی اپنے دماغی فیضان سے اہل وطن کو مستفید کرنے کی اسپرٹ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اس دشواری کو مد نظر رکھکر جب ہماری نگاہ ان محدود لیکن کارآمد لوگوں پر پڑتی ہے جو اپنی ناچیز کوششوں سے ملک کی ادبی خدمت خاموشی سے کئے جاتے ہیں کہ ع نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا تو دل سے بے ساختہ صدائے مرحبا نکلتی ہے، اور دعا دینے کو جی چاہتا ہے کہ ان کی مساعی حسنہ بارور ہوں۔

حال میں انھیں عند اللہ ماجور وعند الناس مشکور "خادمانِ ادب" کی جانب سے دفتر ادیب میں چند نو مطبوعہ کتابیں بصیغۂ ریویو موصول ہوئی ہیں جن پر ہم ذیل میں نمبروار اپنی تنقیدی رائے کے اظہار کے لئے اجازت طلب ہیں۔

عربی آمدنامہ | یہ مختصر سا رسالہ جو چھوٹی تقطیع کے تقریباً پانچ جزو پر ختم ہوا ہے فارسی کی مشہور درسی کتاب صفوۃ المصادر کے نمونہ پر مولانا حکیم حافظ قاری محمد عبدالجبار صاحب شیخپوری بہاری نے ترتیب دیا ہے اور ہماری ناچیز رائے میں اسکا مطالعہ عربی کے مبتدیوں کے لئے ازبس مفید ہوگا۔" دو برس سے بمنظوری جناب انسپکٹر اسکول سرکل بھاگلپور، بھاگلپور کے سرکاری اسکولوں میں داخل کورس ہے اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کی بعض جماعت میں داخل درس ہے۔" اچھا ہو اگر اور مکاتب ومدارس اسلامیہ اپنی ابتدائی عربی جماعتوں میں اس رسالے کو شریک نصاب کریں۔

صدآیاتِ حکمت نمبر ۱ | یہ رسالہ بھی مولانا عبدالجبار صاحب شیخپوری کی موقع شناسی اور نکتہ رسی کے ثبوت کے طور پر عالم وجود میں آیا ہے۔ مولانا موصوف نے نہایت عرقریزی سے کلام پاک کی چند ایسی آیتیں جمع کرکے اس رسالہ میں ترتیب دی ہیں جو معاشرت واخلاق وغیرہ کے متعلق ہیں۔ اس رسالے کا پہلا نمبر ہے امید ہے کہ مولانا اس سلسلے میں آیندہ بھی اضافہ کریں گے جسکے مستقل نفع سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی کتابیں ہر شخص کے لئے بلا امتیاز مذہب یکساں طور پر کارآمد ہوتی ہیں اور اس زمانے میں جبکہ ہماری اخلاقی حالتیں بہت گری ہوئی ہیں ان کی اشد ضرورت ہے۔ مولف نے یہ خوب کیا کہ ہر آیت کا معنوی ترجمہ اسکے بالمقابل لکھدیا ہے۔ مندرجۂ بالا

دونوں رسالے مولانائے ممدوح سے بہ قیمت علی الترتیب ۷ر و ۱ر اور دو کلکتہ ہریسن روڈ نمبر ۹۰۱ دفتر قاضی" کے پتہ سے شایقین کو دستیاب ہو سکتے ہیں۔

شاعرانہ خیالات | چھوٹی تقطیع کے ۷۶ صفحات کا یہ مجموعہ اپنی اشاعت کے لئے منشی محمد یحیی صاحب تنہا بی۔اے۔ کی حسن سعی کا منت کش ہے۔ حضرت تنہا کی یہ کوشش قدر کی مستحق ہے کہ آپ نے اپنے ملک کے شعرا کی مدد کے لئے کئی مشہور انگریزی شاعروں کی مشہور نظموں کا نثر میں ترجمہ کرکے اُسے ایک کتاب کی صورت میں نکالا ہے۔ شروع میں ایک دلچسپ دیباچہ کے بعد انگریزی شاعری کا حال بہت خوبی سے قلمبند کیا گیا ہے۔ اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چل سکتا ہے کہ اس شاعری نے کب اور کس کے عہد میں کیا کیا رنگ و روپ بدلے ہیں اور آج جو اسکا دلفریب مرقع ادیبوں کی نظر میں جنت کی دلکشائیوں کو مات کر رہا ہے اُس میں کن کن قابل ہاتھوں نے رنگ کاری کی ہے۔ اس مجموعہ میں مشاہیر شعرائے انگلستان مثلاً کیمبل، لارڈ ٹنی سن، ورڈسورتھ، لارڈ بائرن، شیکسپیر، کاؤپر، ملٹن اور اسی قبیل کے اور نامور شاعروں کے کلام کا ترجمہ شامل ہے۔ بعض نظمیں انتخابی ہیں ترجمہ خوب اور سلیس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب سے ہمارے وہ شعرا، فایدہ اُٹھا سکتے ہیں جو مغربی جذبات کو اپنی زبان کا لباس پہنانا چاہتے ہیں لیکن ناواقفیت اور عدم مہارت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوتے۔ البتہ ہمارا خیال ہے کہ حضرت تنہا جو شاعر ہونے کے ساتھ ہی انگریزی کے گریجوایٹ بھی ہیں اگر چاہتے تو نثر کی جگہ منظوم ترجمہ بہت خوش اسلوبی سے کر سکتے تھے اور اس صورت میں کتاب زیادہ مفید ہو جاتی (مترجم صاحب سے ۸ر میں گزری بازار میرٹھ، کے پتہ پر مل سکتی ہے)

براہمہ دھرم کی کتابیں | شردھے پرکاش دیوجی پرچارک براہمہ دھرم کا نام علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ حضرت پیغمبر اسلام صلعم کی سوانح عمری جس غیر متعصبانہ اور منصفانہ اسپرٹ میں آپکے قلم سے نکلی ہے اُس نے آپکو صلح پسند اور بلند خیال مصنف کی حیثیت سے اُردو دنیا میں بخوبی روشناس کر دیا ہے۔ اب آپ ہی کی کوشش سے تین کتابیں اُردو علم ادب میں اور

(۱) گیان اور دھرم کی ترقی - قیمت ۴ر
(۲) مہاپرشوں کی بانی - قیمت ۴ر
(۳) بھرت ملاپ - قیمت ۴ر

اضافہ ہوئی ہیں۔ پہلی کتاب مہرشی دیویندر ناتھ ٹھاکر کے آخری وقت کے اُپدیش کا اُردو ترجمہ ہے جو بنگالی زبان سے کیا گیا ہے۔ اس میں مہرشی موصوف نے زمین، جمادات وغیرہ، دھرم کا بکاش، ایشور کا حاصل کرنا اور اسی قسم کے اور عنوان سے بہت خوبی کے ساتھ مذہب و اخلاق کی اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں اور تصوف و معرفت کے اسرار ظاہر کئے ہیں۔ بعض مسایل جو خاص برہمو سماجی عقیدہ کے نقطہ خیال سے لکھے گئے ہیں اُن سے قطع نظر اکثر نصایح سبق آموز ہیں اور ہر ایک مذہب و ملت کے آدمی کے لئے کارآمد اور منفعت بخش ہیں

مہاپرشوں کی بانی بھی بنگالی کا ترجمہ ہے جو شردھے پرکاش دیوجی نے اُردو میں کیا ہے۔ اس کتاب میں مذہب بودھ، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات پر عالمانہ بحث کرنے کے بعد دکھایا گیا ہے کہ یہ سب حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں۔ جابجا ان مذاہب کے رہنما اور پیغمبروں کی اخلاقی سرگذشت نہایت موثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ **بھرت ملاپ** کا ترجمہ بھی بنگالی زبان سے کیا گیا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں رامچندر جی کے بن باس ہونے کے بعد اُن کے سوتیلے بھائی بھرت کی ملاقات کا واقعہ قلمبند کیا گیا ہے جو راماین سے ماخوذ ہے۔ رام کے بن باس ہونے کے بعد راجہ دشرتھ کے انتقال، بھرت کے اجودھیا آنے، اور پھر رامچندر جی سے ملاقات کے لئے روانہ ہونے کا حال نہایت موثر الفاظ میں لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں رامچندر جی کی سعادتمندانہ روش اور طبعی عزم و استقلال کا ثبوت ملتا ہے وہاں لچھمن جی اور سیتا جی کی وفاداری اور بھرت کی اُلوالعزمی بھی پڑھنے والے کی طبیعت پر ایک گہرا نقش ڈالتی ہے۔ بھرت کے جنگل میں پہنچنے اور رام سے ملاقات کرنے کی کیفیت نہایت پُر اثر ہے اور بعض مقامات پر خواہ مخواہ رقت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اور ناظرین بھی

اسے دلچسپ اور معنی خیز پائیں گے۔

ان تینوں کتابوں کے متعلق ترجمہ کے اعتبار سے البتہ ہمیں قابل مترجم سے شکایت ہے کہ ہندی و سنسکرت کے ضروری و غیر ضروری الفاظ کی بھتات سے بہت کچھ ثقالت پیدا ہو گئی ہے۔ جب ترجمہ اردو خواں طبقے کے لئے کیا گیا تھا تو اس دخل در معقولات کی چنداں ضرورت نہ تھی ہم اردو میں ہندی یا سنسکرت الفاظ کے مناسب استعمال کے مخالف نہیں لیکن اعتدال کے ساتھ ہر ایک چیز پسند کی جاتی ہے۔ اسکے ماسوا افراط پسندی سے کتاب کی اصلی غرض و غایت پوری نہیں ہونے پاتی کیونکہ جن لوگوں کے لئے وہ لکھی جاتی ہے وہ اُسے دلچسپی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے بلکہ بسا اوقات اس قسم کا مطالعہ طبیعت کو اور منغص کر دیتا ہے۔ اُمید ہے کہ آیندہ اڈیشن میں اس باب میں کافی غور سے کام لیا جائے گا۔ ان کتابوں کے ملنے کا پتہ حضرت مترجم کا نام اور لاہور کافی ہے۔

کلامِ فلک لالہ لالچند فلک کا نام اخباری دنیا کے لئے کوئی نیا نہیں۔ اُن کی نظمیں اور مضامین نثر اب بھی اکثر ماہواری رسالوں میں قدر کے ہاتھوں جگہ پاتے ہیں۔ حال میں ان کی نظموں کا جن میں سے کئی وقتاً فوقتاً مختلف پرچوں میں شایع ہو چکی ہیں مجموعہ شایع ہوا ہے۔ اس میں ہر قسم کی نظمیں شامل ہیں ملکی، قومی، مذہبی اور اخلاقی غرض ہر نوع کے عنوان سے مفید خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ دیکھنا بہت اطمینان بخش ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا میں شاعری کا وہ اعلیٰ مذاق پیدا ہو رہا ہے جسکے بغیر اس فن کی عزت ارباب بصیرت کی نگاہ میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ ہم اُن لوگوں سے جو ہٹ دھرمی یا عدم واقفیت کی بناء پر یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندو اردو شاعری کے فرایض شناسی کا مادہ نہیں رکھتے خاص طور پر ملتجی ہیں کہ وہ حضرت فلک کا کلام دیکھیں اور انصاف کریں کہ اُس میں دلفریبی اور صحیح المذاقی کا کیسا کچھ سامان موجود ہے۔

حسنِ معنوی کے ساتھ کتاب میں محاسن ظاہری کی بھی کمی نہیں، کاغذ، کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور یہ دیکھکر بہت خوشی ہوتی ہے کہ اُردو کتابوں کی چھپائی میں بھی اب اچھا التزام کیا جاتا ہے۔ "کلامِ فلک" کی ایک جدت آفرین خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُس میں موقع موقع سے کئی نفیس ہاف ٹون تصاویر بھی شامل کر دی گئی ہیں جنمیں گرو نانک، حضور نظام مرحوم، حضور ملک معظم، اور خود مصنف کی تصویریں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں اگرچہ بقول ہمعصر "زمیندار" کے یہ امر کسی قدر تعجب خیز ہے کہ مولانا حالی جن کے نام نامی پر یہ کتاب معنون کی گئی ہے اُن کی نہ کوئی تصویر شامل کی گئی ہے نہ اُن کے متعلق کوئی نظم موجود ہے حالانکہ اس خیال سے کہ آپ کی "نیچرل اور قومی نظموں نے اُردو داں ہندوستانیوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً ایک تازہ روح پھونکنے میں بہت کچھ مدد دی" مولانائے ممدوح کے ساتھ کم از کم اس قدر اعتنا تو ضروری تھا۔ "کلام فلک" کی قیمت ایک روپیہ ہے جو اپنی خوبیوں کے لحاظ سے کم ہے اور ویاس پستکالہ چھوٹی لاہور سے یہ مجموعہ مل سکتا ہے۔

جنگِ طرابلس اس کا دوسرا نام خونِ ناحق ہے اور اٹلی کے حملہ کی نوعیت اور نتایج کے لحاظ سے اس میں یقیناً ایک معنوی لطافت موجود ہے۔

"جنگ اٹلی و ٹرکی" نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو دلچسپی اور جوش و خروش پیدا کر دیا ہے وہ کسی خاص مذہب، فرقہ، یا ملک تک محدود نہیں ہے" اور جب یورپین ممالک میں ہمدردی اور انصاف پسندی کا یہ زور و شور دیکھتے ہیں جو انھیں موخر الذکر کے ساتھ ہے تو مسلمانانِ ہند کی ہمدردانہ تحریکوں پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس جنگ نے اہلِ اسلام کے دلوں پر غیر معمولی اثر ڈالا ہے اور اسکے ثبوت آئے دن ملتے رہتے ہیں۔ اس شغف کے ساتھ جو انھیں اس جنگ سے پیدا ہو گیا ہے ہر ایک شخص میدان جنگ کے حالات اور واردات کے معلوم کرنیکا شایق پایا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر اُردو میں کئی کتابیں جنگ طرابلس کے متعلق نکل چکی ہیں اور کچھ زیر اشاعت ہیں۔ لیکن یہ ساری کتابیں جو شایع

دلائي لامه

انڈین پریس الہ آباد

ہو چکی ہیں یا اب ہونگی فی نفسہٖ طرابلس اور وہاں کی جنگ سے خصوصیت رکھتی ہیں، ہاں کتاب زیر تنقید کی حیثیت جداگانہ ہے۔ اس میں جنگ کے حالات مسلسل نہیں بلکہ اُن مضامین نظم و نثر کو جمع کر دیا گیا ہے جو اس لڑائی کے آغاز سے اختتام ۱۹۱۱ء تک اُردو کے نامور اسلامی اخباروں میں شایع ہو چکے ہیں۔ نثر مضامین زیادہ تر بلکہ تمامتر وکیل اور زمیندار اور تمدن سے اقتباس کئے گئے ہیں۔ قریب قریب یہی حال نظموں کا بھی ہے۔ شروع میں ایک موثر اور شاندار دیباچہ ہے جسکا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں اگرچہ یہ کتاب متفرق اور غیر مسلسل مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اس میں بعض مضامین اس قسم کے بھی ہیں جو توسیع معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں جا بجا کرؔ تاریخی واقعات امتیازی دلبستگی کی چیزیں ہیں جو قدیم اسلامی حملوں سے تعلق رکھتے ہیں

نظمیں سب کی سب اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اُن کا طرز بیان، لب و لہجہ اور اسلوب کلام حد درجہ موثر، پُر جوش اور دلپسند ہے۔ اس حصّہ میں حضرت اکبر، مولوی ظفر علیخاں، ڈاکٹر اقبال، حضرت اسمٰعیل، اور وجاہت جھنجانوی کو نمایاں جگہہ ملی ہے۔ اور بھی کئی اشخاص کا کلام موجود ہے جو اپنی جگہہ پر قابل تعریف ہے لیکن "کارزار ہستی" کے عنوان سے جو نظم "مرزا غلام محی الدین صاحب لاہور" کے نام سے شایع ہوئی ہے اُسے دیکھکر ہمیں انتہائی استعجاب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جب یہ نظم اسی حیثیت سے اخبار زمیندار میں شایع ہوئی تھی اُسوقت بھی ہمیں مصنف کی دیدہ دلیری پر حیرت ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی عنوان پر ایک نظم غالباً ۱۹۰۸ء میں حضرت سرور جہان آبادی کی زمانہ میں نکلی تھی اور اُسکے کچھ مقامات ذہن نشین تھے۔ اسی لئے جب اُنھیں الفاظ اور اُنھیں خیالات کا اعادہ مرزا صاحب کی طرف سے ہُوا تو قدرتی طور پر تعجب ہونا چاہیئے تھا۔ اب ہم نے دونوں نظموں کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ لفظی اختلاف کے سوا دونوں بجنسہٖ ایک چیز ہیں۔ اسے کوئی واقف کار توارد نہیں کہہ سکتا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔ سرور کہتے ہیں ؎

ارض و سما ہیں نور کے سانچے میں ڈھل گئے　　سوکر اُٹھو کہ غیر ہیں آگے نکل گئے
چار آئینہ حریف پہنکر سنبھل گئے　　شیروں کے رزمگاہ میں تیور بدل گئے
تم بھی دکھاؤ جوہر پیکار رزم میں
مردانہ وار بڑھ کے کرو وار رزم میں

مرزا صاحب کا ارشاد ہے ؎

ارض و سما ہیں نور کے سانچے میں ڈھل گئے　　بیدار ہو کے غیر ہیں آگے نکل گئے
چار آئینے پہنکے مخالف سنبھل گئے　　شیروں کے رزمگاہ میں تیور بدل گئے
تم بھی دکھاؤ جوہر پیکار رزم میں
مردانہ وار بڑھ کے کرو وار رزم میں

یہی حال اور بندوں کا ہے۔

مرزا صاحب نے اس سے زیادہ نہیں کیا کہ کہیں کہیں لفظ کا تغیر و تبدل کر دیا ہے اور صرف اتنا سا کام کر کے سرور کی نظم کے حقدار بن گئے ہیں۔ ہم مرزا صاحب سے بادب دریافت کرتے ہیں کہ اُن کا یہ فعل اٹلی کے حملہ طرابلس سے کس قدر مشابہ ہے؛ اٹلی بھی تو دوسرے کے مُلک کو اسی طرح ہڑپ کرنا چاہتی ہے جیسے آپ نے دن دہاڑے غریب سرور کی دماغی ملکیت پر، دنیا کی آنکھ میں دھول ڈال کر، قبضہ کرنا چاہا ہے۔

اس قسم کی شرمناک حرکت کا منشا، شہرت پسندی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر مرزا صاحب واقعی شاعر کی حیثیت سے بزم عالم میں رونق افروز ہونا چاہتے ہیں تو اُنھیں کسی غیر معروف شاعر کا قلمی دیوان لاہور کے کباڑیوں کے ہاں تلاش کرنا چاہیئے۔ سرور ایسے شہرت پذیر سخنگو کا کلام وہ کبھی اپنا نہیں بنا سکتے آخر میں ہم "زمیندار" کے "کشمکش برزخی" کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرائینگے جو کچھ عرصہ پیشتر "حضرت فیروز طغرائی" کی ایک بےمثل نظم کی ظالمانہ قطع و برید کا واقعہ حسرتناک الفاظ میں بیان کر چکے ہیں۔ اگر "کشمکش برزخی" کی طبیعت میں انصاف پسندی کا جوہر موجود ہے تو ہمیں اُمید کرنا چاہیئے کہ زمیندار کے صفحوں میں مرزا غلام محی الدین کی غیر معمولی طبّاعی کی بھی داد دی جائے گی۔

"جنگ طرابلس" جسکی ترتیب کا سہرا جناب شیخ محمد احسان الحق صاحب حنفی قادری عمری کے سر ہے اور جسکی کتابت و اشاعت میں غیر معمولی اہتمام

کیا گیا ہے" جناب محمد انوار صاحب ہاشمی، مدیر مکتبۂ قادریہ - لال کورتی کیمپ میرٹھ" سے دستیاب ہو سکتی ہے - قیمت ایک روپیہ -

عروجِ سخن | "سید الشعرا" حضرت ضمیم بلند شہری کا یہ دیوان ہمارے پاس بغرض ریویو آیا ہے - حضرت ضمیم ایک مشہور شاعر ہیں - کچھ عرصہ پیشتر دربار ریاست مالیر کوٹلہ سے تعلق رکھتے تھے - پھر آب و دانہ رامپور لایا اور یہاں بھی وہ نمایاں عزت و توقیر کے مستحق ثابت ہوئے - چونکہ اُن کا یہ پہلا دیوان ہے اور اس لحاظ سے اُن کے معرفین کے لئے قدر کی چیز ہے - حضرت ضمیم کا کلام اس بات کا شاہد ہے کہ وہ ایک نغز گو اور پختہ مغز شاعر ہیں اور جو قدرتی باتیں ایک سچے شاعر کے لئے لازمی سمجھی جا سکتی ہیں اُن میں موجود ہیں - تلمذ بھی اُنھیں حضرت بیان ویزدانی میرٹھی ایسے جید اُستاد سے ہے جو مجموعی حیثیت سے اپنے وقت کے خسرو تھے -

حضرت ضمیم کا کلام زبان اور لطف بیان کی خوبیوں کا مجموعہ ہے - طرز ادا میں وہ بعض اوقات اپنے اُستاد کے قدم بہ قدم چلتے ہیں - مثلاً حضرت بیان کا ایک مشہور مطلع ہے ؎

سرِ شوریدہ پائے دشت پیما شامِ ہجراں تھا
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

ضمیم کہتے ہیں ؎

خیالِ روز و شب نیرنگ زلف و روئے جاناں تھا	طلسمِ صبح نقشِ حسرتِ شامِ غریباں تھا
مآلِ چشمِ وحشت دیدہ غولِ بیاباں تھا	فروغِ داغِ مہجوری چراغِ شامِ ہجراں تھا

اسی غزل کا یہ شعر دیکھئے - دوسرے مصرعہ میں اُستاد کی سی اُلٹ پھیر دکھائی ہے ؎

عجب نیرنگ چشمِ زار لا یا رنگ برسوں تک
کبھی طوفاں میں کشتی تھی کبھی کشتی میں طوفاں تھا

لیکن بعض غزلیں سلاست کلام کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں مثلاً ؎

رہنے بھی دو جو مجھ پہ کرم ہو کے رہگیا	یہ کیا ستم ہوا کہ ستم ہو کے رہگیا
کیا کچھ کہا نہ غیر نے اُس بُت کے سامنے	خاموش میں خدا کی قسم ہو کے رہگیا
اُڑتی ہوئی خبر ترے کوچے کی مل گئی	کچھ شوق سیرِ باغِ ارم ہو کے رہگیا

یہ اشعار بھی کتنے اچھے کہے گئے ہیں ؎

بات کیا دو دوپہر ہوتی نہیں	سیدھی چتون بھی ادھر ہوتی نہیں
کون پڑتا ہے کسی کی آگ میں	اُن کے دل کو کیا خبر ہوتی نہیں
تم ہو کوٹھے پر فلک پر چاند ہے	اب نظر اپنی اُدھر ہوتی نہیں
کون روتا ہے کسی کی یاد میں	تم کو اتنی بھی خبر ہوتی نہیں

"گھایل ہے، قاتل ہے" کی زمین میں حضرت بیان کی غزلیں بہت مشہور ہیں اور اب بھی اُن کے بہت سے شعر اربابِ نشاط کی زبان پر ہیں ضمیم نے بھی اس میں سہ غزلہ کہا ہے اور زورِ طبیعت خوب خوب دکھایا ہے - نمونے کے لئے ذیل کا انتخاب کافی ہے ؎

ٹھہر اے توسنِ عمرِ رواں ایوانِ قاتل ہے	اُترتے ہیں جہاں سر عاشقوں کے یہ وہ منزل ہے
قیامت کیا اُٹھائے گی ہمیں ہم اُٹھ نہیں سکتے	کہ دم اپنا یہاں نذرِ دمِ اعجازِ قاتل ہے
مے عشقِ مجازی سے حقیقت کھُل گئی مجھ پر	دو عالم کا مزہ اک بیخودی میں مجھکو حاصل ہے
خدا کے گھر سے نکلے بت خدا کے گھر میں پھر آئے	مگر ہاں فرق ہے اتنا اُدھر کعبہ اِدھر دل ہے
تمھیں کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے چھیڑتے کیوں ہو	خدا جانے طبیعت کس طرف ہے اور کہاں دل ہے

مندرجۂ ذیل شعر شاعر کی طباعی کا ثبوت ہے ؎

جو وفاداروں میں تھے وہ آشنا چھوٹے ہوئے	بحرِ ہستی سے ملے موتی، مگر ٹوٹے ہوئے

کہیں کہیں مشکل زمینوں میں بہت اچھا کہہ گئے ہیں ؎

سوزِ دل و جگر نے آخر سینہ جوڑ ڈالے	اُس بُت کو کیا رُلا یا پتھر نچوڑ ڈالے
سجدہ کی آرزو کو دیر و حرم ہی کیا ہے	نقشِ قدم پہ تیرے کیوں سر نہ پھوڑ ڈالے
میں شکوہ سنج حسرت وہ آئینے سے برہم	سنگِ طلسمِ دل ہی لے کاش توڑ ڈالے
شیرازۂ اجل ہے ناکامیِ تمنا	آزردگی نہ میری اُمید توڑ ڈالے

غزلیات کے بعد رباعیاں اور تخمیسیں ہیں - پھر دو تین متفرق عاشقانہ نظمیں، تصویرِ حسن سراپائے تصویر معشوق وغیرہ کے عنوان سے ہیں جو مستقل دلچسپی سے خالی ہیں - آخر میں تاریخیں ہیں جنہیں حضور ویسرائے کی تشریف آوری

مالیر کوٹلہ کے تقریب پر جو قطعہ کہا ہے وہ مطول بھی ہے اور دلپسند بھی۔ بہ حیثیت مجموعی یہ دیوان اُن لوگوں کی قدر دانی کا مستحق ہے جو ایشیائی شاعری کی موجودہ حالت کا من وعن نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ قیمت عہر ہے۔ حضرت مصنف سے بلند شہر بالائے قلعہ کے پتہ پر درخواست کرنے پر ملے گا۔

منتخبات العالم
تنویر الاشعار

یہ دونوں دیوان منیر شکوہ آبادی کے ہیں جو رامپور کی ایک علم دوست جماعت کی حُسن سعی سے صاحبزادہ مصطفےٰ علی خاں شرر ہوم سکرٹری کی سرپرستی میں شایع ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے صاحبزادہ صاحب موصوف کے اُس علمی شغف کا اعتراف کرنا چاہیئے جس کی بدولت آج تک کئی نادر اور بیش قیمت کتابیں ذخیرہ اُردو میں شامل ہو چکی ہیں۔ یہ ذوق وشوق جتنا مفید اور کارآمد ہے اُتنا ہی ہمارے اُمراء کے طبقے سے خارج ہے۔ اس لحاظ سے حضرت شرر غیر معمولی صفات کے آدمی معلوم ہوتے ہیں اور ہماری آرزو ہے کہ اُن کا یہ شوق وانہماک روزافزوں رہے اور مُلک کو اُسکے نتائج سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملے۔ مطبع سعیدی کے پُرجوش کارکنوں کی مساعی جمیلہ بھی دادطلب ہیں جنھوں نے منیر کے کلام کی اشاعت سے نہایت قیمتی ادبی خدمت انجام دی ہے ورنہ احتمال تھا کہ ایک ایسے جیّد شاعر کا کلام کس مپرسی اور ناقدری سے ہمیشہ کے لئے نیست ونابود ہو جاتا۔

منیر مرحوم اُردو کے ایک سرمایۂ ناز شاعر گذرے ہیں۔ وہ متاخرین شعرا میں شمار ہونے کے مستحق ہیں اور اُن کا کلام بھی زبان وتخیل کے اعتبار سے اُس زمانہ کی شاعری کا زندہ نمونہ ہے۔ ان کا نام سید اسمٰعیل حسین تھا۔ ان کے والد سید احمد حسن بھی شاعر تھے اور شاد تخلص کرتے تھے۔ منیر کو مبدء فیاض سے ایک نکتہ رس اور دقیقہ سنج طبیعت ملی تھی، اور قسمت سے اُستاد بھی انھیں ناسخ اور رشک ایسے ملے جنھیں سے اوّل الذکر اپنے وقت کے امام فن تھے۔ منیر کو بھی اُن کی شاگردی پر ناز تھا۔ اسکا اظہار اُن کے اشعار میں بھی فخریہ ہوا ہے ؎

حضرت ناسخ کی اصلاح اس غزل پر ہے منیر
آج رتبہ تیری فکرِ پست کا بالا ہوا

وہ اُنھیں اس درجہ مانتے تھے کہ ذیل کے شعر میں شاعرانہ انداز کے ساتھ اُن کے تصرفاتِ روحانی کو بھی تسلیم کر لیا ہے ؎

بعدِ فنا بھی فیضِ سخن ہے جہان میں
صدقے منیر حضرتِ ناسخ کی گور پر

عقیدت ونیازمندی کی یہی حالت میر علی اوسط رشک کے ساتھ بھی جسکا ثبوت اُن کے شعروں میں موجود ہے لیکن بخیالِ طوالت ہم قلم انداز کرتے ہیں

منتخبات العالم کا فارسی دیباچہ خود منیر کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے اُن کے حالاتِ زندگی پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے کہ پہلے رسل ورسایل کے ذریعہ حضرت ناسخ مغفور سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ پھر کانپور میں ان سے ذاتی طور پر شرف ملاقات حاصل ہوا، اور اُنھیں کے مشورہ سے وہ بعد میں رشک کو اپنا کلام دکھانے لگے۔

اُستاد کی خدمت میں حاضر رہنے کی تمنا اُنھیں بیچین تھی اور شاید وہ خود لکھنؤ سے باہر رہنے کے خواہشمند نہ تھے لیکن پھر بھی اُنھیں کئی مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا جیسے کلکتہ، مرشدآباد، الہ آباد وغیرہ، لیکن ہر پھر کر جو لکھنؤ پہنچے تو پھر سالہا سال تک یہاں سے جنبش نہ کی۔

لکھنؤ اُسوقت واقعی لکھنؤ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ منیر مرحوم کے دل پر وہاں کی دلچسپیاں نقش تھیں۔ یہ کہیں ہوتے مگر خیال لکھنؤ کا بندھا رہتا۔ کلکتہ گئے تو وہاں بھی لکھنؤ کے لئے بیقرار تھے۔ نواب معین الدولہ کے نام پر دیوان میں ایک مدحیہ قطعہ ہے جس کی دعا کو اپنی اس آرزو پر ختم کیا ہے کہ مجھے لکھنؤ جانے کی اجازت عطا ہو جائے ؎

مجھکو دیتا ہوں قسم یارب نبیؐ پاک کی — صدقہ اُس مذبوح کا جو فخر یحیٰی ہو گیا
واسطہ اُسکا کہ جو مخدومہ کونین ہے — جسکا دامن حورِ جنت کو مُصلا ہو گیا
کعبے میں پیدا ہوا جو اُس ولی کا واسطہ — صدقہ اُسکا جو شہیدِ زہرِ اعدا ہو گیا

عمر و دولت یہ بڑھے ممدوح کی جو سب کہیں — رشک اسکندر ہو اشل مسیحا ہو گیا
لکھنؤ کی مجھکو رخصت ہو عنایت آج کل — دھوم ہو یہ مدعا میرا پذیرا ہو گیا

معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کے انتقال کے بعد بھی وہ لکھنؤ سال میں ایک دفعہ ضرور ہو آتے تھے چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

منیر اس سال عزم لکھنؤ کس واسطے چھوڑا
نہ دیکھی چل کے قبر ناسخ مغفور کیا باعث

لکھنؤ کے قیام میں اُن کی شہرت ترقی پذیر تھی اور خود وہیں اُن کے بہت سے قدرداں پیدا ہو گئے تھے اور پھر نواب تجمل حسین خاں والی فرخ آباد نے انھیں اپنے یہاں بُلا لیا اور نواب کی حین حیات تک انھیں بہت فراغت حاصل تھی۔ اُن کے انتقال پر کچھ دنوں تکلیف اُٹھائی لیکن بہت جلد سرکار باندہ میں ان کی طلبی ہوئی اور نواب علی بہادر رئیس باندہ کے اصلاح سخن کی خدمت بھی ان کے سپرد کی گئی۔ افسوس ہے کہ دیوان کے ساتھ کارکنان مطبع کے جانب سے کوئی مبسوط مقدمہ ایزاد نہیں کیا گیا ورنہ دلچسپی کچھ اور بڑھ جاتی۔ اسکی ضرورت تھی کہ کسی واقف کار سے منیر کے سوانحی حالات مسلسل و مفصل قلمبند کرا کے اوّل دیوان کے شروع میں شامل کر دئے جاتے یقیناً اُن کی زندگی کے اکثر واقعات خاص تذکرے کی چیز ہیں اور اُن میں سے سب سے اہم واقعہ اُن کی قید کا ہے۔ خود اُنھیں کے ان شعروں سے اُن کے جُرم کی کچھ ماہیت معلوم ہوتی ہے۔

فرخ آباد اور یاران شفیق — چھٹ گئے سب خوبی تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے ہم — سو طرح کی ذلّت و تحقیر سے
مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں — کجروی میں بڑھکے چرخ پیر سے
کر کے خون ناحق نواب جان — مجھکو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

مختصر یہ ہے کہ انھیں عبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی جہاں سے رہائی پانے کے بعد یہ طویل قطعہ کہا تھا اور تاریخ نکالی تھی

صاف نکلے خانۂ زنجیر سے
۱۲۷۷ھ

تخیل کے اعتبار سے منیر ناسخ کے قدم بقدم ہیں گویا وہ اُسی مذاق کے پیرو تھے جو لکھنؤ میں عام پسند رہ چکا ہے لیکن یہ رنگ اُن کا غزلیات کے دائرے تک محدود ہے کیونکہ اُن کے قطعات صاف بیانی اور سلاست کے دلفریب محاسن میں بے نظیر ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں نہایت خوبی سے کہتے ہیں گویا باتیں کر رہے ہیں۔ کاش یہی رنگ غزل میں قایم رکھتے تو ہم منیر کی ذات میں میر کو جلوہ گر پاتے۔ پھر بھی بہ حیثیت مجموعی دوسرے دیوان میں اُنکا یہ انداز مرکز اعتدال سے آگے نہیں بڑھنے پایا۔ ہماری رائے میں اُصول غزل گوئی کے لحاظ سے دوسرا دیوان پہلے سے کہیں ممتاز و مغز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جا بجا اس میں بھی تشبیہات و استعارات کی گلکاریاں نظر آتی ہیں جیسے ؎

پوچھا جو میں نے چوٹیوں کا حال کر گئے — اک بات کے بتانے پہ اتنے کڑے ہوئے
تیل بھرتا تری زلفوں کے لئے آنکھوں میں — چشم خاقاں کوئی چینی کی پیالی ہوتی
کاغذ کے گھوڑے دوڑتے ہیں راہ عشق میں — لکھ بھیجتے ہیں حال مجھے ترکتاز کا
کھائے جاتے ہیں تنائے لب شیریں شکر — میٹھی باتوں سے مجھے آپ نے حلوا جانا

لیکن مجموعی حیثیت سے تنویر الاشعار کا ایک معقول حصہ صفائی کلام اور تاثیر بیان کی خوبیوں سے مالا مال ہے مثلاً یہ قطعہ بند غزل ؎

ہیں کہاں وہ لوگ اگلا کارخانہ کیا ہوا — اس نئی دنیا میں پوچھو وہ زمانہ کیا ہوا
سجدے کرتے تھے جہاں وہ آستانہ کیا ہوا — ہر طرف ہے بائینتی یارب سرہانہ کیا ہوا
کس طرف گُم ہو گیا عہد جوانی اے فلک — ہم تلاشی تیری لیں گے وہ زمانہ کیا ہوا
اہل غفلت کہتے تھے یونہی رہیگا دور عیش — جسکے ضامن بست تھے وہ کارخانہ کیا ہوا
یوں اشاروں سے سمند عمر چلنے کا نہیں — سب میں چوٹی کا جو تھا وہ تازیانہ کیا ہوا
کعبۂ مقصود کہتے تھے جسے اہل جہاں — قبلۂ حاجات اب وہ آستانہ کیا ہوا
ہم نے مانا صحبتیں اگلی فسانہ ہو گئیں — اے فلک یہ تو بتا دے وہ فسانہ کیا ہوا

اسی طرح یہ غزل:-

راز توحید زمانے نے ترا کیا جانا — کچھ نہ جانا جو تجھے بیکس و تنہا جانا

کیا کہا کس کے تڑپنے کو تماشا جانا لو خبردار سنبھل جاؤ نہ گھبرا جانا

اُن کی ہر بات میں اک بات ہے ماشاءاللہ چھیڑنا آپ ہی اور آپ ہی شرما جانا

کعبہ و بتکدہ کی سیر سے کچھ کام نہیں تم نے جو راہ بتائی وہی رستا جانا

پرگوئی کے لحاظ سے منیر مرحوم فرد فرید ہیں - ان کی نظیر شاید وزیر اور صبا میں کسی قدر مل سکتی ہے ورنہ ان کی ایک ایک غزل اوروں کی چار چار غزلوں کے برابر ہے۔ لطف یہ ہے کہ نری بھرتی نہیں بلکہ ہر ایک شعر بجائے خود معنوی لطافتوں کا مجموعہ ہے -

غزلیات کے علاوہ دونوں دیوان میں قصاید کا بھی حصہ ہے کئی قصیدے ذوق کی زمینوں میں لکھے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ اس میدان کے وہ مرد ثابت نہیں ہوئے اور جو شان اُن کی غزلوں کی ہے وہ قصیدوں میں ناپید ہے۔ اسکے باوجود اُن کے قصیدے اپنی جگہہ پر بہت خوب ہیں اگرچہ سودا اور ذوق سے ان کا مقابلہ نہیں ہو سکتا لیکن اکثر شعراء سے وہ اس صنف میں بھی بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں -

کئی منظوم قطعے اور تاریخیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک چیز مستقل قدر و قیمت کی مستحق ہے - بہی خواہان ادب اُردو کو یہ دونوں دیوان اپنی لائبریری کے لئے قدر دانی کے ہاتھوں لینا چاہیئے اور سر آنکھوں پر رکھنا چاہیئے (ملنے کا پتہ :- مطبع سعیدی - ریاست رامپور)

انقلاب عظیم | علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ یورپ میں اکثر اہل فہم بلکہ محدود طبقوں میں عالمگیر اتحاد کا خیال پیدا ہو چلا ہے جسطرح انفرادی ترقی آخرکار مجموعی ترقی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اسی طرح جب تمام قومیں اپنی اپنی جگہہ پر ترقی یافتہ ہو جائیں گی تو اسکا قدرتی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی جائیں گی اور رفتہ رفتہ اسکی اُمید ہو سکتی ہے کہ قومیت اور مذہب کا کوئی امتیاز قایم نہ رہے - مسٹر شیر علیخاں سرخوش لاہوری کی نومطبوعہ کتاب مندرجہ عنوان اسی بحث پر ہے - اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ عالمگیر اتحاد جس کے خواب یورپ میں آجکل دیکھے جا رہے ہیں سنہ ۲۰۰۰ء میں درجۂ تکمیل کو پہنچ جائیگا - مسٹر سرخوش اس لحاظ سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایک ایسے دقیق مسئلہ پر جس کی باریکیاں بہت سی معاملہ فہم طبایع کو بھی چکر میں ڈالدیتی ہیں قلم اُٹھایا ہے اور کسی حد تک اپنے منشاء کے اظہار میں کامیاب بھی ہوئے ہیں گو اس میں کلام ہے کہ اُنھوں نے منطق و استدلال کے زور سے اپنے دعاوی کے ثابت کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی -

ظاہر ہے کہ اس قسم کے نازک مسائل پر رائے زنی کرنے کے لئے عالمانہ طرز بیان اختیار کرنا پڑتا ہے اور شمار و اعداد اور قابل وقعت آرا سے اپنے مطالب کو پُرزور بنایا جاتا ہے لیکن یہ صفت "انقلاب عظیم" میں معدوم ہے - اکثر نہایت سطحی معلومات سے اہم نتایج کا استنباط کیا گیا ہے جو ہرگز قابل تسلیم نہیں - اخباروں میں بہت سی باتیں ایسی درج کر دی جاتی ہیں جو صرف ناظرین کے تفنن طبع کا کام دیتی ہیں اُن سے سائنٹفک مسایل کی تائید و تردید کا کام لینا یقیناً ایک اُصولی لغزش ہے - اسی طرح جن حوصلہ افزا آثار کا ذکر کیا گیا ہے اُن کے متعلق شروع سے آخر تک یک طرفہ رائے زنی کی گئی ہے اور انواع و اقسام کے واقعات و آرا کو بھی موم کی ناک کی طرح جدھر چاہا ہے توڑ مروڑ دیا ہے -

سائنس کے پُرمفاد تاثرات سے کسی کو مجال انکار نہیں لیکن ابھی یہ رائے تسلیم کرنے میں ہم متامل ہیں کہ اس نے مشرق و مغرب یا کالے گورے کی تفریق اُٹھا کر دور اُفتادہ اقوام کے میل جول میں بھی حصہ لیا ہے - جو کشاکش آجکل مختلف ممالک اور وہاں کی قوموں کے درمیان پائی جاتی ہے اُس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان میں ہمدردانہ خیالات کا "آغاز" نہیں ہوا بلکہ اُن کا خاتمہ ہونے والا ہے - مذہب نے ہمدردی، ایثار، اور اخوت کے جو سبق پڑھائے تھے اُنھیں سائنس خود غرضی، خود کامی، اور نفرت و حقارت سے بدل رہا ہے - یہی کیفیت جنگ و جدال کی ہے کہ خلق اللہ کی جانیں اُسی طرح تیر و تفنگ کے نذر ہو رہی ہیں جیسے پچھلے زمانے میں ہوتی

تھیں - فرق اتنا ہے کہ اُسوقت مذہب کے نام سے یہ خونریز کھیل کھیلا جاتا تھا اور اب تہذیب و اصلاح کی ٹٹی شکار کے لئے تیار کر لی گئی ہے -

سیاق کلام کی ضروریات کی تکمیل میں بعض جگہ مسٹر سرخوش کے قلم سے ایسے الفاظ بھی نکل گئے ہیں جو اگر اُن کے دماغ میں محفوظ رہتے تو بہتر ہوتا مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں :-

> ایک ایسی جدید روشنی کی اشاعت مدِ نظر رکھکر ہم روس و انگلستان کا تصرف ایران پر جرمنی و فرانس کا مراکو پر روس کا تاتار پر اور انگلینڈ فرانس جرمنی پرتگال یا اٹلی و امریکہ وغیرہ کا افریقہ پر قبضہ کر لینا بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ فاتح جن جن پاک نیتوں سے ان ملکوں کے مالک بنتے جاتے ہیں وہ اُمیدیں تمام بنی نوع انسان کی آسودہ حالی اور آخر ایک عالمگیر اخوت کا باعث ہونگی -

انگلستان کا ذکر اس جگہ غیر ضروری ہے کیونکہ اُس نے آجتک ایران پر متصرف ہونے کا کبھی عندیہ تک ظاہر نہیں کیا بلکہ اگر اسکا خیال ہوتا تو روس کب کا اُسے ہڑپ کر چکا ہوتا - یوں بھی برٹش حکومت نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ وہ مفتوحہ اقوام کو ذہنی و دماغی تربیت دیکر انھیں اقران و اماثل میں ممتاز بنانے کی خواہشمند ہے جسکا ثبوت ہند اور مصر کے واقعات سے ملتا ہے' اس لحاظ سے ہم اس حسنِ ظن کے لئے اپنی گورنمنٹ کی طرف سے مسٹر سرخوش کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں البتہ اُنھوں نے اور دوسرے یورپ خصوصاً روس و اٹلی کے متعلق جو کچھ فراخ حوصلگی دکھائی ہے وہ قابل لحاظ ہے' اور اس کے لئے وہ ان سلطنتوں کے جانب سے مبارکباد کے مستحق ہیں - کاش انقلابِ عظیم کی کوئی جلد جنرل کمینو یا زار روس کے پاس پہنچ جائے کہ وہ دنیا کو دکھا سکیں کہ جہاں خود یورپ کے لاکھوں اور کروڑوں دردمند دل اُن کی کارروائیوں کو ناانصافی اور بے ایمانی پر مبنی سمجھتے ہیں وہاں خود مسلمانوں میں ایک حق پسند ایسا بھی موجود ہے جو اُن کی نیت کو "پاک" غداری اور لوٹ مار کو مستحسن اور رانڈوں' یتیموں اور بوڑھوں کا خون اور ایک امام کے مدفن کا انہدام مباح سمجھتا ہے حیف! ان الفاظ کے ذریعہ بےحمیتی و بےغیرتی کے مرقع میں جو حیاسوز تصویر دکھائی گئی ہے وہ صاحب کتاب کی نظر میں دلفریب ضرور ہوگی لیکن اگر اسی ناروا ظلم و ستم کے ہاتھوں عالمگیر اتحاد کا قایم کرانا مقصود ہے تو اسکو ہمارا دُور ہی سے سلام ہے -

اگر بخیال خویش دوسروں کی فلاح و بہبود کا راستہ تلوار کے زور سے کھولنا جایز اور "پاک نیتی" پر مبنی ہے تو مسٹر شیر علی خاں کس مُنہ سے قدیم زمانے کی لڑائیوں کو بُرا کہتے ہیں جو مذہب کی طرف سے ہُوا کی ہیں اُنکا منشا بھی اسی کے قریب قریب تھا اور مذہب والوں نے تو جو کچھ کر دکھایا ہے وہ اخلاق و معاشرت کے صیغہ میں سائنس سے آجتک بھی نہیں ہو سکا -

اس موقع پر حضرت سرخوش کو دلایل و براہین سے استدلال کر کے دکھانا تھا کہ روس یا فرانس نے تاتار یا ٹیونس و الجیریا کی علمی' اقتصادی' معاشرتی یا تمدنی حالتوں میں کیا خوشگوار اضافہ کیا ہے - عام تجربہ تو یہی کہہ رہا ہے کہ سوائے ہندوستان و مصر کے اور تمام مشرقی اقوام جو یورپین سلطنتوں کے زیر نگیں ہیں انحطاط و تنزل کے قعر میں روز بروز گرتی جاتی ہیں اور اُن کی زندگی تک معرض خطر میں پڑی ہوئی ہے -

اسی طرح ہمدردانہ خیالات کی توفیر کے بھی ہم قایل نہیں - کشورکشائی یا ذاتی مفاد کے لئے جو کچھ جایز و ناجایز کوششیں ہوتی رہتی ہیں وہ سب خود غرضانہ ہیں - ہیگ کانفرنس کا وجود بھی عضوِ معطل سے زیادہ نہیں - پیرو میں ربڑ جمع کرنے والوں پر امریکہ کے کارخانہ داروں کے ہاتھ سے جو مظالم ہو رہے ہیں وہ پوشیدہ نہیں اور یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ عالمگیر اتحاد کے لئے ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے اور تمام اسباب کی تکمیل کے لئے کم و بیش سو سال کا زمانہ کسی طرح کافی نہیں -

اس کتاب کے آغاز میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ۲۰۱۲ء میں دُنیا کی حالت کس قدر ترقی یافتہ ہو جائے گی - بعض باتیں بلاشبہ قرین قیاس

ہیں لیکن بہت سی بے سروپا معلومات سے بھی صفحے بھر دیئے گئے ہیں جنکی وقعت بقول مسٹر سرخوش "کم از کم" اور ہماری رائے میں زیادہ سے زیادہ "سائنسانہ گپون" کے برابر ہوسکتی ہے اور اسی لحاظ سے ہم اس کتاب کو کسی علمی امتیاز کا مستحق نہیں سمجھتے۔ ہاں جو ناظرین اس بحث سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اپنے ایک ہموطن کی نئی اُپج کی داد دینا چاہتے ہوں وہ اس کتاب کو ضرور منگا کر دیکھیں قیمت ۶۰۰ر۔ زبدۃ الحکما، حکیم احمد علیخاں متصل چوک کوتوالی، لاہور سے ملے گی۔

سید القلم

اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام

ہندوستان کے اُن چند نامور مصنفین میں جن کی تصانیف اپنی قوم اور اپنے ملک کے باہر بھی غیر معمولی وقعت کی نظر سے دیکھی گئیں نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم کا نام نامی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ مولوی چراغ علی کی تصانیف کا موضوع اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ اسلام انسان کی دنیاوی ترقی کا بہت بڑا ممد و معاون ہے۔ اسلام کی حمایت میں نواب محسن الملک مولوی مہدی علی مغفور کی طرح مولوی چراغ علی مرحوم بھی سر سید علیہ الرحمۃ کے دست و بازو تھے۔ نواب محسن الملک اگر سر سید کی تائید میں خود مسلمانوں کی جہالت، نافہمی و تعصب کے دفعیہ اور ان کے شکوک و اعتراضات کی تردید کی کوشش کرتے تھے تو مولوی چراغ علی نے بعض مسیحی مصنفین کے اعتراضوں کو دور کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ اس اہم خدمت کی بجا آوری میں مولوی چراغ علی مرحوم کو جو کامیابی ہوئی اس کی گواہ اُن کی وہ معرکۃ الآرا تصانیف ہیں جو مخالفین سے بھی مقبولیت کی سند حاصل کرکے رہیں ان قابل دید تصانیف میں جو زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں -

(۱) الجہاد -

(۲) ریفارمز انڈر مسلم رول -

(۳) محمد دی ٹرو پرافٹ -

خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ کتابیں گو مسیحیوں کے اعتراضات کی تردید اور نکتہ چینیوں کے جواب میں تصنیف ہوئیں لیکن ان کے مضامین و مطالب، واقعات کی تنقید و تنقیح، نتائج کا استخراج، استدلال کے طریقے وغیرہ ایسے ہیں کہ ان سے ہر مسلمان کو واقف ہونا چاہیئے۔ خصوصاً آجکل کے نوجوان مسلمانوں کے لئے توان کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ ملک کو مولوی عبداللہ خاں کی ہمت و کوشش کا مشکور ہونا چاہیئے کہ وہ اس بڑی ضرورت کو محسوس کرکے اس بات پر آمادہ ہوئے ہیں کہ ان بیش بہا علمی خزانوں سے اُردو داں شائقین کو بھی مستفید کرنے کا سامان مہیا کریں چنانچہ وہ اپنی کوشش میں اس حد تک کامیاب ہوئے ہیں کہ "ریفارمز انڈر مسلم رول" کا نہایت اعلیٰ درجہ کا اُردو ترجمہ انھوں نے مندرجہ عنوان نام سے شایع کردیا ہے۔ خوش قسمتی سے اُن مبارک ہاتھوں نے اس معرکۃ الآرا کتاب کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے جن پر آج اُردو انشاپردازی بجا طور پر فخر و ناز کرتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے (علیگ) سے بہتر کوئی شخص اس کام کے لئے موزوں نہ تھا۔ علامہ مصنف کے دقیق مطالب اور عالمانہ و مجتہدانہ خیالات کا جس سلاست، نفاست اور بے ساختگی کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو ترجمہ کیا ہے اس کی قدر وہی خوب جان سکتے ہیں جن کو انگریزی کتاب کے مطالعہ کا موقع ملا ہے -

مولوی چراغ علی مرحوم نے یہ کتاب سنہ ۱۸۸۲ء میں تصنیف کی تھی۔

اس کی وجہ تصنیف خود اُن کے الفاظ میں یہ ہے :۔

ان اوراق کے لکھنے کا باعث یہ ہوا تھا کہ ریورینڈ مسٹر ملکم میکال نے رسالہ "کنٹم پوریری ریویو" آگسٹ ۱۸۸۱ء میں ایک آرٹیکل اس مضمون پر لکھا تھا کہ آیا مسلمانوں کی حکومت میں اصلاحیں ممکن ہیں و اُسی سال کی آخر سہ ماہی میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اور اب اُن اہلِ یورپ اور انگریزی مصنفوں کے لئے جو مجھے افسوس ہے کہ اس دھوکے میں ہیں کہ اسلام میں کسی طرح کی سیاسی، قانونی، یا معاشرت کے متعلق اصلاحیں عمل میں آنا ممکن نہیں ہیں یہ کتاب مشتہر کی جاتی ہے۔

اگرچہ ریورنڈ ملکم میکال کے محولہ مضمون ہی کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی لیکن اس میں ضمناً تمام بڑے بڑے یورپین مصنفین مثلاً سر ولیم میور، ڈاکٹر ہنٹر، باسورتھ اسمتھ، لین، سیل، اسٹیون، مارکس ڈاڈ، آس برن وغیرہ کے اکثر و بیشتر اعتراضوں اور نکتہ چینیوں کے جواب بھی آگئے ہیں اور ان پر نہایت شرح و بسط اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ بحث ہوئی ہے۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے میں تو "سیاسی و قانونی اصلاحوں" کا بیان ہے اور دوسرے میں "تمدنی اصلاحات" کا ذکر ہے۔ علامہ مصنف نے کتاب کے شروع میں ایک بہت بڑا عالمانہ اور محققانہ مقدمہ بھی لکھا ہے جو بجائے خود ایک مکمل تصنیف کی شان رکھتا ہے۔ مقدمہ میں اسلامی قوانین کی جمہوریت، مختلف فقہی مذاہب، اُصول فقہ، مذاہب اربعہ، کی کیفیت اور فقہ کے چاروں ماخذ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس پر بہت تحقیق اور جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ ریورنڈ ملکم میکال اور ان کے بہت سے ہم خیال معترضین کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کو نہایت مدلّل طریقہ سے واقعات اور براہین کے ساتھ رفع کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیاوی معاملات میں اسلام نے رائے کی کامل آزادی عطا فرمائی ہے۔ کتاب کے پہلے حصہ میں جو سیاسی و قانونی اصلاحات پر مشتمل ہے کمال تحقیق کے ساتھ پادری ملکم میکال کے ایک ایک اعتراض کا جواب اسلام کے سیاسی اور قانونی ضوابط کے متعلق ادا کیا ہے۔ پادری صاحب کے اعتراضات کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ اسلامی سلطنتیں الٰہی سلطنتیں فرض کی جاتی ہیں۔ جو قوانین و ضوابط ان میں رائج ہیں ان کو منجانب اللہ تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا پر ان کا اتباع لازمی ہے ان میں قیامت تک کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی قانون کی رو سے غیر مسلم رعایا کے لئے حقوق کی مساوات بالکل ممنوع ہے۔ غیر مسلموں کے لئے یہ حکم ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا غلامی یا موت۔ غیر مسلموں کے ساتھ جو وعدہ کیا جائے اس کی پابندی ضروری نہیں۔ ان کے ساتھ معاہدہ کرکے اُس کو توڑا جا سکتا ہے۔ قانون اسلام نے مذہبی آزادی کی قطعی ممانعت کر دی ہے۔ قرآن نے دنیا کو "دارالاسلام" اور "دارالحرب" میں تقسیم کیا ہے یعنی اسلام کا ملک اور دشمن کا ملک۔ اسلامی سردار کا یہ فرض ہے کہ وہ دارالحرب یعنی تمام غیر مسلم دنیا کو بزورِ شمشیر اسلام قبول کرنے پر مجبور کرے۔

مولوی چراغ علی مرحوم نے نہایت شرح و بسط اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان تمام مسائل پر تنقید کی ہے اور بڑی خوبی سے ثابت کیا ہے کہ مقدس اسلام ان تمام الزامات سے بالکل بری ہے۔ اسلامی سلطنتوں کا طرزِ حکومت ہرگز "الٰہی الاصل" نہیں خیال کیا جاتا۔ اس قسم کا کوئی عقیدہ مسلمانوں میں کہیں بھی رائج نہیں بلکہ اسلام کے ابتدائی زمانہ کی طرزِ حکومت "جمہوری الاصل" تھی۔ اسلامی فقہ الہامی نہیں ہے بلکہ وہ چند عام و خاص رسوم اور چند مذہبی اور مخصوص قوانین کا مجموعہ ہے اور صرف قرآن ہی ایک ایسا قانون ہے جو مبرا عن الخطا ہے۔ اسلامی فقہ کو اسلام کے ملہم قانون یعنی احکام قرآنی سے مخلوط نہیں کرنا چاہیئے۔ اسلامی فقہ ایک غیر تحریری قانون ہے جو قرآن پر مبنی نہیں بلکہ جس کے اکثر مسائل کی بنیاد ملک کے رسم و رواج پر رکھی گئی ہے۔ اس کو نہ خود حضرت پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے مدون کیا اور نہ آپ نے اپنے زمانہ میں اس کے مرتب کرنے کا حکم دیا۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ عام طور پر خود مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب مرحوم

انڈین پریس الہ آباد

اپنے زمانہ کے مناسب اور ملکی و تمدنی تغیرات کے مطابق سیاست و حکومت کے آئین و قوانین وضع کر لیں۔ اسلام نے غیر مسلموں کو اپنے مذہب میں کامل آزادی عطا کی ہے اور ان کے ساتھ رواداری و مسالمت کا برتاؤ کرنے کی تاکید کی ہے۔ قرآن مجید میں بار بار اس بات کی تلقین ہے کہ دیگر اقوام و مذاہب کی آزادی اور حقوق برابر قایم رکھے جائیں۔ اسلام میں مسلمان اور غیر مسلمان کے حقوق میں کوئی فرق نہیں۔ غیر اقوام اور مخالف مذاہب کے مساوات حقوق کی سخت تاکید ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے حقوق توطن پیدایش پر منحصر ہیں، مذہب کے قبول کرنے پر موقوف نہیں۔ اسلامی ممالک میں پیغمبر عرب کی تعلیم و تلقین کے مطابق غیر مسلم رعایا کو وہی رعیتی حقوق حاصل ہیں جو خود مسلمان رعایا کو حاصل ہیں۔ وہ مسلمانوں کی طرح پورے آزاد اور اپنے تمام حقوق رعیتی کے پورے مالک ہیں۔ اُن پر کسی قسم کی جبر و تعدی، ظلم و زیادتی کی سخت ممانعت ہے۔ مسلمان اُن کی طرف سے اُن کی حمایت میں لڑنے اور اُن کی پوری طور پر حفاظت کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کو ان کے مذہبی عبادت خانوں کی تعمیر میں یا کسی دوسرے مذہبی امر میں مدد کی ضرورت ہو تو مسلمانوں کو ہر طرح ان کی اعانت کرنی چاہیئے۔ جنگ کے وقت یا اُس زمانہ میں جبکہ مسلمان اپنے دشمنوں سے برسرپیکار ہوں اُس قوم کے اُن آدمیوں کے ساتھ جو مسلمانوں میں رہتے ہیں اس کی بنا، پر نفرت یا عداوت نہیں رکھنا چاہیئے۔ غرض مختلف مذاہب کی غیر مسلم رعایا اور خود مسلمان رعایا دونوں کو اسلام نے قانونی حقوق بالکل مساوی دیئے ہیں۔ غیروں کے ساتھ ایفاء وعدہ میں غفلت کرنے کا مسلمانوں کو کہیں حکم نہیں دیا گیا ہے۔ قرآن جو ایک مسلمان کے لئے اصل اصول ہے وہ تمام مسلمانوں کو تاکید کے ساتھ تلقین کرتا ہے کہ تمام معاہدے جو وہ مسلم یا غیر مسلم قوموں کے ساتھ کریں نہایت سختی کے ساتھ اُن کی پاسداری اور پابندی کریں۔ بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ جب کوئی معاہدہ یا شرط کریں تو اُس پر قایم رہیں اور اپنے قول اور فعل کو مطابق کر کے دکھلائیں۔ قرآن میں دنیا کو "دارالاسلام" اور "دارالحرب" میں تقسیم کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں۔ نہ کسی جگہ اس بات کا حکم ہے کہ اسلامی سردار غیر مسلم دنیا کو بزور شمشیر اسلام قبول کرنے پر مجبور کرے۔ اسلامی فقہ میں "دارالحرب" اور "دارالاسلام" محض حدود و اراضی کا ایک مسئلہ ہے اور صرف فصل مقدمات تک محدود ہے۔ اسی ضمن میں فاضل مصنف نے حقوق ذمیان، رقیق و مملوک، شہادت غیر مسلم، تعمیر گرجا، جزیہ، ارتداد، وغیرہ پر بڑی جامعیت کے ساتھ نہایت مدلل بحثیں کی ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ تمدنی اصلاحات سے متعلق ہے۔ اس میں جن مسائل پر علامہ مصنف نے بحث کی ہے اور پادری ملکم میکال اور ان کے بہت سے ہم نوا مصنفین کے جن اعتراضات کی تردید اور جن غلط بیانیوں کی اصلاح کی ہے ان میں زیادہ اہم اسلام میں عورتوں کی حالت، تعدد زوجات، طلاق، غلامی اور تسری ہیں۔ ان تمام امور پر مولوی چراغ علی مرحوم نے اپنی عادت کے مطابق نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔ ہر مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ کی کمال خوبی سے تنقید کی ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اور نیز بڑے بڑے مستند مغربی مصنفین کی رایوں کو پیش کر کے شدومد کے ساتھ ثابت کیا کہ اسلام نے ساری تمدنی خرابیوں کی اصلاح کی اور ایسے اخلاقی و تمدنی نظام کی بنیاد ڈالی جو نہ صرف عرب کے لئے بلکہ تمام عالم کے لئے باعث برکت و رحمت ہے۔ فاضل مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کس طرح اسلام سے پہلے عرب میں عورتوں کی بری حالت تھی۔ آنحضرت صلعم نے عورتوں کی حالت کو کتنی ترقی دی۔ آپ کی تعلیم سے عورتوں کی حالت اس درجہ بہتر ہو گئی کہ آپ سے قبل کے تمام معلمین اور انبیاء نہ کر سکے تھے۔ قرآن مجید نے تمام قانونی تمدنی اور روحانی حیثیتوں سے مرد اور عورت میں کامل مساوات کی تلقین کی ہے۔ قرآن کے تاکیدی احکام کی بدولت عورتوں کو انتہا درجہ کی ذلت و خواری اور مصیبت سے

نجات ملی - شریعت عورتوں کے ہاتھ منہ کھلے رہنے چاہئیں کیونکہ جسم کے یہ حصے "عورۃ" نہیں کہلاتے سوا ہاتھ اور منہ کے (اور بعض کے نزدیک پاؤں بھی)، باقی تمام جسم "عورۃ" کہلاتا ہے اور اچھی طرح ڈھکا رہنا چاہیئے آنحضرت صلعم نے عورتوں کو پردہ میں رہنے کی نہ اجازت دی اور نہ تاکید کی - آپ نے اپنے الہامی احکام میں عورتوں کی عزت و منزلت اور اُن کے حقوق اور اُن کی آزادی کی تاکید کے ساتھ تعلیم دی - عرب میں کثرت ازدواج کا بے انتہا رواج تھا - اسلام نے اس عالمگیر رسم کو نہایت معقول پیرایہ میں قلع و قمع کیا - اوّل اس کو چار تک محدود کرکے پھر اس امر کا اظہار کردیا کہ وقت واحد میں ایک سے زیادہ بی بی نہ کی جائے آنحضرت نے کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں وہ لونڈیاں بنا کر گھر میں ڈال لی جائیں - اہل عرب میں طلاق کی سہولت غیر محدود تھی - اسلام نے کثرت طلاق کو روکنے کے لئے بہترین ممکن تدابیر تجویز کئے - غلامی جو تمام عالم میں رائج تھی اس کو سب سے پہلے اسلام ہی نے موقوف کیا - جنگ کے قیدیوں کو قتل کردینے یا غلام بنالینے کی وحشیانہ رسم کی صاف وصریح احکام میں قطعاً بیخ کنی کردی - تسرّی کا رواج جو عرب کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا اس کو حضرت پیغمبر اسلام نے ناجائز قرار دیا اور اس کی ممانعت فرمائی غرض فاضل مصنف نے نہایت وسیع النظری کے ساتھ بہت محققانہ طور پر ان تمام مسائل پر بحث کی ہے اور معترضین کے اعتراضات بڑے زور شور سے رد کرکے کمال خوبی سے ثابت کیا ہے کہ مذہب اسلام انسانی ترقی کے راستہ میں ہرگز حائل نہیں بلکہ اس میں ترقی کی بہت بڑی صلاحیت موجود ہے - دنیا کی موجودہ ترقی اور تمدن کی بنیاد اسلام ہی نے ڈالی ہے - زمانہ کی ضروریات، نئی تحقیقات، اور جدید اکتشافات، کی موافقت اور عقل حکمت و آزادی کی مطابقت کے زندہ اصول مذہب اسلام میں موجود ہیں - قرآن یا پیغمبر اسلام کی تعلیم ہرگز مسلمانوں کی روحانی ترقی اور آزادی خیالات کی مانع نہیں اور نہ وہ دائرہ حیات میں کسی سیاسی، تمدنی، دماغی یا اخلاقی جدت کو روکنے والی ہے -

کتاب کی خوبی سچ تو یہ ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے - مولوی عبدالحق صاحب نے جن جامع اور مانع الفاظ میں اس کی تعریف کی ہے اُن کا اعادہ کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا وھو ھذا -

اگرچہ یہ مسائل اس قسم کے ہیں کہ ان پر سالہا سال سے بحث ہوتی چلی آتی ہے اور مخالفین کو بارہا معقول اور مدلل جواب دیئے جا چکے ہیں لیکن فاضل مصنف سے پہلے کسی عالم نے ان مسائل پر عالمانہ اور محققانہ بحث نہیں کی تھی مصنف کا استدلال صرف قرآن پاک سے ہوتا ہے - اس چھوٹی سی کتاب کے پڑھ لینے کے بعد پھر کسی بڑی سے بڑی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی - پڑھنے والے کو اسلام کی اصل حقیقت اور اس کی خوبیوں اور نکتوں پر اس قدر عبور ہو جاتا ہے کہ سیکڑوں کتابوں کے پڑھنے سے بھی نہیں ہو سکتا - ساری کتاب علمی معلومات سے لبریز ہے اور ایک سطر بیکار نہیں - اس کتاب پر ریویو کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ مصنف کے حق میں ظلم کرنا ہے - غلامی پر اس سے پیشتر سرسید احمد خاں مرحوم ایک بیش بہا اور بے مثل کتاب لکھ چکے تھے لیکن جس انداز سے مصنف نے اس مضمون پر بحث کی ہے ناظرین اسے دیکھ کر بے اختیار مصنف کی قابلیت اور محنت کی داد دیں گے - غرضکہ فاضل مصنف نے ایسا بڑا کام کیا ہے کہ اس کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے اس کتاب کے متعلق (جو انگریزی میں ۲۰۸ صفحہ پر ہے) یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے -

اس بے نظیر کتاب کا ترجمہ دو حصوں میں الگ الگ شایع کیا گیا ہے فاضل مترجم نے ترجمہ کے ساتھ ایک بہت دلچسپ عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے جو ۸۸ صفحوں میں ختم ہوا ہے - اس مقدمہ کے تین حصے ہیں - پہلے حصہ میں مصنف کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں جو بجائے خود خاص اہمیت رکھتے ہیں - ان حالات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی چراغ علی

کیا تھے۔ ان کی بعض طبعی خصوصیات ایسی تھیں جو بہت کم کسی ایک فرد میں جمع ہو سکتی ہیں۔ وہ اس بات کا ایک مکمل نمونہ تھے کہ کس طرح انسان اپنی محنت و مشقت سے جاہ و ثروت اور لیاقت و فضیلت حاصل کر کے اعلیٰ رتبہ پر پہنچ سکتا ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب نے بڑی محنت اور جستجو سے یہ حالات جمع کئے ہیں اور ان کو مرتب کر کے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ حالات اس قدر دلچسپ اور ایسے سبق آموز ہیں کہ ان کو ایک الگ کتاب کی صورت میں شایع کرنا کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ مقدمہ کا یہ پہلا حصہ ۴۲ صفحوں میں ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد ۲۹ صفحوں میں مقدمہ کے دوسرے حصہ کو جگہ دی گئی ہے جس میں مولوی چراغ علی مرحوم کی مذہبی تصانیف پر فاضل مترجم نے نہایت عمدہ تنقید کی ہے۔ مقدمہ کے تیسرے حصہ میں جو ۲۰ صفحوں پر ہے "ریفارمز انڈر مسلم رول" کے متعلق بعض نامور علماے یورپ نے جو دلچسپ خطوط مصنف مرحوم کو لکھے تھے ان کا ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ اس طرح فاضل مترجم نے ۸۸ صفحہ کے نہایت مفید مقدمہ کا اضافہ کر کے کتاب کی دلچسپی اور بھی بڑھا دی ہے۔

اس مقدمہ کو کتاب کے دوسرے حصہ کے شروع میں شامل کرنے کے عوض اگر پہلے حصہ کے ساتھ شریک کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ اس مقدمہ کے ساتھ علامہ مصنف کی کوئی تصویر بھی شایع ہونی چاہیئے تھی۔ ان حالات کو پڑھنے کے بعد آنکھیں اس مستقل مزاج، راست باز، کم سخن، خاموش طبع، بے تعصب، عالی خیال، وسیع النظر، کوہ وقار، تحقیق پسند، خلاصۂ صفت، شخص کی صورت دیکھنے کی بڑی ہی مشتاق و متمنی ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ باتیں ایسی ہیں جن کی دوسرے ایڈیشن میں تلافی ہو سکتی ہے۔

اُمید ہے کہ اہلِ ملک مولوی چراغ علی مرحوم کی ایک بیش بہا تصنیف کے اس بے نظیر و قابل دید ترجمہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ کتاب جس کے صفحات کی تعداد سوا تین سو سے زیادہ ہے تین روپیہ (سے) میں مولوی عبد اللہ خان صاحب پبلشر سے حیدر آباد دکن، کتب خانہ آصفیہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

سیّد خورشید علی

ہوائی جہاز

گلہاے رنگارنگ کا یہ دلکش گلدستہ جو آج ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ایک خاص تحریک کا نتیجہ ہے۔ ہمارے ایک معزز یورپین دوست نے تحریر کیا تھا کہ ہوائی جہاز پر کوئی نظم ادیب میں درج کی جائے۔ اس درخواست کو ہم نے اپنے بعض قلمی معاونین تک پہنچا دیا جس کے جواب میں مندرجۂ ذیل نظمیں موصول ہوئیں۔ سب نظمیں اپنی اپنی جگہ قابل داد ہیں۔ ترتیب بلحاظ تاریخ وصولیابی رکھی گئی ہے۔

۱

بندہ نواز ہے وہ خداوند کارساز جس نے کیا ہے خاک کے پتلے کو سرفراز
حیوان نے بھی پائی ہے گو عقل فطرتی لیکن بشر ہی کو ہے خدائی کا امتیاز
کھولا ہے اپنے ناخنِ دانش سے انس نے اکثر جناب خالق اکبر کا عقدۂ راز
کوئی تو باندھتا ہے ہوا کا قلعہ کہیں کوئی ہوا کے گھوڑے پہ ہوتا ہے ترکتاز
کاغذ کی ناؤ کوئی چلاتا ہے موج میں کوئی ہے آب یاریٔ شہرت کا آب باز
لیکن جہاں میں کام کا ہوتا ہے کام وہ جس سے رفاہِ ملک پہ ہو آدمی کو ناز
انجان کے طریق دکھاتا ہے جو بشر انزازِ ریاض کا ہوتا ہے وہ طراز
یکساں کبھی نہ ہونگے ہنرمند و بے ہنر موتی کے بھاؤ بک نہیں سکتی کبھی پیاز
اُس ملک کو ہو مال سے آسودگی نہ کیوں جس ملک کو ہے صنعت و حرفت کی حرص و آز

ڈورے وہ ڈالے چشمِ کمالِ فرنگ نے — کٹ جائیں جبکو دیکھ کے دیسی پتنگ باز

اس طرح اُن کے دل کو ہے اُلفت کمال سے — جس طرح دل نواز تھا محمود کا ایاز

پانی کے نیچے کشتی ! ہوا پر جہازِ آب — اللہ رے نشیب - زہے رفعتِ فراز

بے پر کی جو اُڑاتے ہیں وہ اپنی آنکھ سے — خود دیکھ لیں جہازِ ہوائی کا امتیاز

پروازِ عقل دیکھئے بالا نصیب کی — پانی سے اب ہوا پہ چلانے لگے جہاز

ہم میں بھی پہلے قوتِ ایجاد و صنع تھی — ہیں بیشتر کتاب قدیمی رقم طراز

قصہ اُڑن کھٹولے کا سُنتے ہیں آجتک — جس سے ہوا پہ ہندی بھی کرتے تھے اہتزاز

پُشپک بمان لایا تھا جو رامچندر کو — لنکا سے ایک دن میں اجودھیا وہ یکہ تاز

جب علم اور ہنر میں نکلتے ہوئے تھے ہم — ایجاد و اختراع کا ہم میں بھی تھا جواز

پاسہ ہمارے بختِ رسا کا پلٹ گیا — پلٹی جو کھا گیا قدم حسن حقیقہ باز

جب اختراعِ ہند کی دیوار گر گئی — ہم بھی درِ زوال پہ جا کر ہوئے دراز

عالم میں آج نام ہمارا بلند ہو — ہم میں نہ ہو جو پستیِ ہمت کا احتراز

رکھیں گے ڈوب جانے کا دل میں اگر خطر — ہرگز ندی میں تیر سکیں گے نہ آب باز

کوئی شکار دام میں آنے نہ آئے پر — شہباز صیدِ طیہ سے آتا نہیں ہے باز

طالب ہو جو ترقی کا دکھلائے کچھ ہنر — ہر ایک جوہر اپنا دکھلانے کا ہے مجاز

جو لوگ رکھیں یاد ہوائی جہاز کو

وہ کیوں چلائیں باد ہوائی جہاز کو !

طالب بنارسی

۲

اے پرندِ مغربی ہوتا ہے جب تو پرفشاں — تنگ ہو جاتا ہے میدانِ فضائے آسماں

دیکھتے ہیں ٹکٹکی باندھے تجھے اہلِ جہاں

اے ہوا میں اُڑنے والے بے پری پیکر جہاز — اے فضا کے طائرِ بے بال خوش منظر جہاز

ہاں دکھا دے آج چل کے مجکو سیرِ آسماں

ذہن کو سکتا ہے تیری قوتِ پرواز پر — عقل کو حیرت ہے تیری طاقتِ پرواز پر

بے پر و بال اور اس حد کی سُبک پروازیاں

مائلِ اوجِ ترقی ہے ترا پیکِ خیال — تونے آساں کر کے دکھلایا ہے اک کارِ محال

کونسی قوت، بتادے تیرے دل میں ہے نہاں

گو کہ ہیں پستی کے ساکن آج ہیں رفعت نصیب — عالمِ بالا کے منظر ہوتے جاتے ہیں قریب

جا رہے ہیں چین سے بیٹھے سرِ تختِ رواں

جز فضا ملتا نہیں ہے اب کسی شے کا اثر — آسماں جس کو سمجھتے تھے وہ ہے حدِ نظر

تو ہی تو ہے صرف مابینِ زمین و آسماں

یوں اُڑیں گے وہم بھی ہوتا نہ تھا اس بات پر — بچپنے میں ہاں اُڑا کرتے تھے ہم بھی خواب میں

آج دکھلایا ہے بیداری میں تونے یہ سماں

کوئی قوت روک لے تجھکو بہت دشوار ہے — دل ہوا کا تونے برمایا ہے وہ رفتار ہے

اُس کی قدرت ہے یہ نظارے کہاں او ہم کہاں

تجھ سے ظاہر ہو گئی اس عصر کی دانشوری — قوتِ سائنس تیرے پرزے پرزے میں بھری

عقل کا اصلی مرقع علم کا اصلی نشاں

ایرشپ! یہ تو ہے یا یورپ کا علمِ معتبر — یہ زمانہ اُڑ رہا ہے تیری صورت میں مگر

طائرِ عقلِ رسا کا تجھ پہ ہوتا ہے گماں

جا رہا ہے تو بلندی پر غبارے کی طرح — چڑھ رہا ہے موسمِ گرما کے پارے کی طرح

قابلِ نظارہ ہے تیری ترقی کا سماں

عزیز لکھنوی

۳

حضرتِ انساں بظاہر گو ہیں بے بال و پری — ان میں اک عقلِ رسا کی ہے مگر جادوگری

رشک آیا اُڑتے مرغانِ چمن کو دیکھکر — یعنی ہم بھی کیوں نہیں کرتے ہیں ان کی ہمسری

طائرِ فکرِ رسا چشم زدن میں اُڑ گیا — عالمِ بالا کی دم میں دیکھ لی سب سیر کی

اک غبارہ کر کے تیار اُڑ گئے افلاک پر — ہم سخن ہونے لگے مریخ و زہرہ مشتری

لیجئے اب طاقتِ پرواز سے دنیا کے کام — بن گیا مرکب ہوائی قاف قدرت کی پری

یہ ہوا پر اُڑتا ہے تختِ سلیماں کی طرح — ایک گردش میں ابھی طے کر لے چرخِ چنبری

عقل گم ہوتی ہے اس حیرت زدہ ایجاد پر — آنکھوں سے دیکھا وہ سُنتے تھے جو سحر سامری

کھا کے قسمیں دیکھکر کہتے ہیں اسکو دیوزاد[ط] — دیکھ لے اُڑتے ہوئے دیکھی نہو جس نے پری

[ط] پیرس میں ایک بڑا ہوائی جہاز بنا تھا جسکا نام دیوزاد تھا -

کیل کانٹے پر نثار اس کے جواہر بیشمار   دیدۂ حق بیں اگر ہو تو پرکھ لے جوہری
اسکے آگے بحر و بر کی فوج سب بیکار ہے   رومی و شامی حجازی بربری و نادری
دیکھکر رفتار گردش میں ہوئے ہفت آسماں   پڑگئی خورشیدِ خاور کے بدن میں تھرتھری
کشتیِ عمرِ رواں سے بھی زیادہ تیز ہے   کیا عجب ہے گر خضر کو یہ سکھائے رہبری
ڈوریاں ہیں اسکی یا بکھرے ہوئے گیسوئے حُور   بال کھولے اُڑ رہی ہے یا پرستاں میں پری
اُس نے کی روئے زمیں کی سیر اس نے عرش کی   اس کے موجد کو ملا ہے طالعِ اسکندری
چادرِ مہتاب بھی میلی نظر آنے لگی   چار عالم میں تری ایسی ہوئی خوش‌گستری
عرش پر جانے سے شان اسکی دو بالا دیکھنا   ہو گئی معراج اس کو مل گئی پیغمبری

پیرس و انگلستاں کیونکر نہ ہوں اس پر فدا
"قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"

ماد عظیم آبادی

۴

مایۂ ناز ہے تو ہم کو ہوا والے جہاز   تیرے دم سے ہیں حاصل ہے عروجِ پرواز
ہیں عجب تیری کلیں، طرفہ ہیں تیرے سب سنا   اور عناصر میں ترے ایک مناسب انداز
طائرِ عرش کہیں جس کو وہ پردار ہے تو   جو کہ ہے دوش ہوا پر وہ ہوادار ہے تو
تو نہیں، یہ جو ہوا پر ہمیں دکھلاتا ہے   تخت پریوں کا مگر کوئی اُڑا جاتا ہے
"رتھ" ہیں بیٹھا ہوا یا اندر ہوا کھاتا ہے   رام کا یا کہ فلک سیر "دُومان" آتا ہے
ہند میں تھا فقط اک نام کا تختِ طاؤس   تو ہے یورپ کا مگر کام کا تختِ طاؤس
باعثِ اوج ہے تو ہم کو ہماری تدبیر   تو وہ افسوں ہے ہوئی جس سے ہوائی تسخیر
تیرے ایجاد کی عالم میں ہوئی جب تشہیر   عقلِ انسان کی شہرت بھی ہوئی عالمگیر
اُڑ کے دنیا سے نیا عالمِ بالا تو نے   آدمی زاد کا بھی نام اُچھالا تو نے
جو نہیں بند ہوا پر بھی وہ آزاد ہے تو   فخر جس پر کہ ہے موجد کو وہ ایجاد ہے تو
آدمی جس میں ہیں آباد وہ برباد ہے تو   بس میں انسان کے ہے جو وہ پریزاد ہے تو
سیلئے اُڑ جاتا ہے تو اوج ہوا پر ہمکو   سیر دکھلاتا ہے تو موج ہوا پر ہمکو
اے فلک سیر وہ طرفہ تری جولانی ہے   دیکھکر جس کو زمیں والوں کو حیرانی ہے
یا پری تو ہے کہ خلقت تری دیوانی ہے   دوشِ جنات پہ یا تختِ سلیمانی ہے
ڈھنگ وہ کچھ ہیں ترے آسماں پیمائی کے   دیکھکر جن کو اُڑیں ہوش تماشائی کے
نقشِ نیرنگ فسوں جو ہے وہ تصویر ہے تو   چل گئی جو کہ ہوا پر بھی وہ تسخیر ہے تو
جس سے انسان کو ہے معراج وہ تدبیر ہے تو   جو کہ دم بھر میں ہوا ہو وہ ہواگیر ہے تو
آشیاں عرش ہے جسکا وہ پرندہ تو ہے   جو فلک سیر ہے وہ تختِ روندہ تو ہے
خاک سے خاک کے پتلوں کو اُٹھایا تو نے   آسماں پر زمیں والوں کو چڑھایا تو نے
رنگ پرواز ہوا پر جو جمایا تو نے   ڈھنگ پریوں کا کہاں سے یہ اُڑایا تو نے
گرد رہتا ہے ترے دیکھنے والوں کا ہجوم   تیرے ایجاد کی ہے عالمِ ایجاد میں دھوم
تیرا گلزار ہے اے مرغِ سلیماں یورپ   تو پریزاد ہے اور تیرا پرستاں یورپ
تو وہ پردار ہے جس پر کہ ہے نازاں یورپ   ہے گلستاں ترا اے نازشِ بستاں یورپ
لائے یورپ سے تجھے ہند فدائی تیرے   تجھکو ساتھ اپنے اُڑا لائے ہوائی تیرے
ہم نے دیکھا تھا نمائش میں اُڑانا تیرا   آسماں پر زمیں والوں کا چڑھانا تیرا
حیرت انگیز بلندی پہ چڑھا جانا تیرا   قابلِ دید تھا جھٹ سے ہلکا اُتر آنا تیرا
گیس میں تیرے تھا اعجازِ دمِ عیسیٰ کا   اور یہودی تجھے کہتے تھے عصا موسیٰ کا

حفظ الاکرام حفیظ

۵

کرشمہ ہے کمالِ فطرتی کا عقلِ انسانی   ہے اسکی روشنی اک جلوۂ انوارِ سبحانی
یہی بیشک ہے شمہ ایک روحِ پاک یزداں کا   ملی انساں کو رب سے یا کسی سے شکلِ جسمانی
کمی بھنڈار میں داتا کے جیسے آ نہیں سکتی   یونہی ہر جگہ میں ہم پاتے ہیں اسکی بھی فراوانی
مرکب اس کو نسیاں او خطا سے جو سمجھتے ہیں   انھوں نے اسکی حد جانی نہ اسکی تھاہ پہچانی
نظامِ دہر ابتر ہو نہ یہہ گر کارفرما ہو   جو سچ پوچھو تو دنیا میں اسی کی ہے جہانبانی
سمندر نے کئے موتی نچھاور اسکے قدموں پر   جگا بیچر کا اسکے رعب و طاقت سے ہوا پانی
زمیں کے کوہ اور ہاموں ہیں اسکے سامنے ہیچ   سمندر کی ہے پانی پانی اسکے آگے طغیانی
ملائک اور جن کیا ہیں عناصر اسکے قبضے میں   یہ ہے سچی جہانبانی یہ ہے اصلی سلیمانی
لئے وہ کام خاک و آب و آتش سے کہ حیرت ہے   ہوا پر گھوڑے دوڑانے کو اب ہے عقل انسانی
زمیں کے کام کر کے ٹھیک سارے عقل و دانش سے   ہے اب پرداختِ افلاک کی انساں نے ٹھانی
جہازانِ ہوائی اب مکمل ہونے والے ہیں   رجوع اب جانبِ گردوں ہوئی ہے عقل انسانی

زمیں پر توڑ کر لائیں گے تارے آسمانوں کے — بنا دیں گے وہ اس خاکی کرہ کو شکل نورانی

لگائی عالمِ بالا میں تھگلی عقلِ انساں نے — ملائک کو بھی اب اسکے کرشموں سے ہے حیرانی

ہے ما فسانۂ اندر اور دیو کو اپنی عافیت کا اب — توجہ کی ہے اب انساں نے ان کی جانب ارزانی

عجب کیا اپسراؤں کی جو اب سج دھج بدل جائے — ہوائی لیڈیوں کی دیکھکر یہ وضع جاپانی

تعجب کیا ہنی موں اب ہوں لندن و پیرس سے — شوسۂ باغ ارم یا جا کے اندر اسن تابانی

عجب کیا ہو جو پریوں کو پسند اب سایہ ہیں کا — زمیں پر جنکا سایہ تھا کبھی وجہ پریشانی

کوئی دن میں بہشت اترا ہوا اس خاک پر ہوگا — یہاں آیا کریں گی سیر کو حوران عدنانی

علم گاڑے گی اب دل پر مہ و مریخ کے جا کر — تعین اور تفقد سے پرے ہے عقل انسانی

یہ سب کچھ ہر اگ گا کبھی نہ تو نے اپنی دھن چھوڑی
کبھی **کیفی** نہ کوئی بات تو نے عقل کی مانی

کیفی دہلوی

۶

ہوائی جہاز اے ہوائی جہاز — فضائے جہاں میں ہے تو سرفراز

تری مملکت میں ہے ساری زمیں — کہاں پر ترا دور دورہ نہیں

اُڑا اور نظروں سے غائب ہوا — بجا ہے اگر تجھکو کہئے ہما

نیا تو ہے اور تیری دنیا نئی — سراسر تری شکل زیبا نئی

خراباتِ عالم میں مستانہ وار — روش ہے تری مثل ابرِ بہار

قیامت کی ہے تجھ میں صنعت گری — بظاہر اری شپ بباطن پری

اگر آسے تیزیِ رفتار پر — ترا سایہ پاسے نہ مرغِ نظر

سنے یہ طلسماتِ پرواز ہیں — دلِ اہلِ فرقت کے انداز ہیں

سوئے چرخ جانے میں مانند آہ — سُبک سیر دلبر کی جیسے نگاہ

صدی آئی عالم میں اُنیسویں — لئے ساتھ اپنے تجھ ایسی مشین

ترقی کی تاریخ میں تجھکو ہم — جلی حرفوں میں کیوں نہ کر دیں رقم

وطن تیرا امریکہ رشکِ جناں — تری سیر گہ سارا دورِ جہاں

تری ساخت ہے وہ طلسمِ عجیب — کرے فہم کو جو کہ کارِ طبیب

یہ محشر نگارا تجھے دیکھکر — اسے کہتے ہیں زورِ عقل و ہنر

برقِ جمال

اے برقِ جمال مہر افروز — اے خطِ طلائے نسخۂ روز

اے غازۂ حُسنِ مہ جبیناں — اے نیرِ بختِ نازنیناں

تیرا ہی ظہور تھا ازل میں — تو جان ہے زندگی کی کل میں

مومن کے دلوں میں حُسنِ ایماں — کافر کے جگر میں سوزِ پنہاں

فرعون کو نیل جلوہ تیرا — کعبہ میں خلیل جلوہ تیرا

آنکھیں ترے نور سے ہیں روشن — پتلی ترا کر رہی ہے درشن

عیسیٰ نفسی کی دھوم کیا ہے — وہ بھی ترے باغ کی ہوا ہے

تیرا ہی شرر چنار میں ہے — تیری ہی چمک شرار میں ہے

ارماں بھرا دل ہے باغ تجھ سے — اور عرشِ علیٰ دماغ تجھ سے

بیرنگ ہر ایک رنگ میں ہو — تیرا ہی شرار سنگ میں ہے

تیری ہی نمود صبح طلعت — تو جلوۂ خندۂ مسرت

تو مرہمِ زخمِ دل کا کافور — تو مصحفِ گل کا سورۂ نور

چشمِ نرگس میں تو ممیرا — پھولوں میں ہے رنگ روپ تیرا

ضو تیری فروغِ انجمن ہے — تیری ہی فضا چمن چمن ہے

دلدادۂ حُسن مہ جبیں ہیں — گلچیں ترے باغ کے یہیں ہیں

اللہ رے شوقِ خود نمائی — طالب کو عجب ادا دکھائی

پردے سے سُنایا راگ تُو نے — خرمن میں لگائی آگ تو نے

جبر کے دلِ مضطر لئے کھائے — موسیٰ سرِ طور غش میں آئے

گل کھا کے بڑھا وقارِ گلچیں — خورشید نے دست بوسیاں کیں

نظروں پہ چڑھا دیا گرا کر — سرمہ کیا طور کو جلا کر

طالب کو دی حُسن کی نشانی — اے جلوہ فروشِ لن ترانی

کھلتا نہیں ہے عجب ترا راز — مانند نوائے پردۂ ساز

ہم آج اسی کو چھیڑتے ہیں — جو کچھ گذرے نبیڑتے ہیں

موسیٰ کی طرح ہو حال اپنا پردے سے دکھا جمال اپنا

سینہ روشن ہو طور بنکر

دل چمکے حبابِ نور بنکر

سلام حیدرآبادی

سوزِ بیوگی

(سرگذشت مسز ابو رضا صاحبہ)

نہو حاصل اُسے کچھ دلبریِ روئے انور سے کیا ہو موت نے جسکو جُدا آغوشِ شوہر سے

لباسِ ریشمی و جامہ زیبی کی ضرورت کیا؟ طلائی زیور اور بے چوڑیوں کی اُسکو حاجت کیا؟

ہوا خواہِ گل و گوہر ہوں سر کے بال پھر کیونکر؟ چنیں کس کے لئے کلیاں چنبیلی کی سر بستر؟

وہ آئینہ کہ جس میں حُسن شان کتخدائی تھا نہ کیوں اب پھینک دیں اُسکو، نہیں اُسکی ضرورت کیا؟

وہ دستِ ناز جنکا غازہ رنگِ خونِ حسرت ہو کریں کیا خواہشِ رنگِ حنا کافی یہ رنگت ہو

مسی آلودہ کیا وہ لب ہوں جن پر آہ رہتی ہو لگائیں سرمہ کیا آنکھوں سے سیلِ اشک بہتی ہے

چلو اب پھوڑ دو حاجت نہیں شفاف چوڑیوں کی ملیں آرائشیں مٹی میں اُجڑی دل کی جب بستی

گسستہ اسکو کردو تخمِ رنج و غم کے بوئے ہیں مقدس رشتہ کے جس تار میں موتی پروئے ہیں

نہیں ممکن کہ رنج و غم میں بھی کچھ دلفریبی ہو نکالو ان طلائی بیڑیوں کو پاؤں سے پھینکو

ہٹادو منہ سے مقنع - اُڑ گیا رنگِ رخِ انور اُٹھا دو آج اک چادر کفن کی حُسنِ زندہ پر

غرض کیا اس سے حاصل - ہم تو دیکھتے نہیں تسکیں بہت ڈھونڈا نظر آتی نہیں ہمکو کہیں تسکیں

بجا ہے دل جو اس حیرت کدہ میں نقشِ حیرت ہے اُمیدیں خود گریزاں اور نا قایم مسرت ہے

ہجومِ رنج سے دل میں تو اک محشر بپا ہوگا تمناؤں کا میٹھا درد کیا کیا چھیڑتا ہوگا

شبِ تاریکِ تنہائی بسر ہوگی تو مشکل سے کہ جب گھبرا اُٹھیگی وہ لپٹ جائیگی خود دل سے

ٹپکے ہیں آج سیلِ اشک جو آنکھیں بہانے میں

بتا دیتے ہیں اُسکی عمرِ خامی کا زمانے میں

(ترجمہ نظم مسز سروجنی نایڈو صاحبہ) **محمد سیف الدین شباب**

تقدیر

(ماخوذ از نظم مصنفہ مسز سروجنی نایڈو)

نارسائی سے تری بخت سیہ کیا ہوگا مجھکو تجھسے نہ کبھی شکوہ بیجا ہوگا

میں نہونگا کبھی امداد کا خواہاں تجھسے تیرا اے بخت نہ احسان گوارا ہوگا

بنگیا ہے تو مری جان کا دشمن لیکن سر جدا ہو نہ جدا سر سے یہ سودا ہوگا

ٹوٹ بھی جائیں اگر میری اُمیدوں کے طلسم کم نہ ہرگز ہے مرا ذوقِ تماشا ہوگا

مٹ گئے پیشِ نظر تھے جو مرقع دلکش تیرے بس میں نہ مگر دیدۂ بینا ہوگا

ملگئی خاک میں گو سلطنتِ وہم و خیال اس خرابے میں گرانمایہ خزانا ہوگا

کردے بیگانہ مجھے نغمۂ شادی سے مگر یادِ ایام کا دلچسپ فسانا ہوگا

زمزمے آکے سنائیگی نسیمِ اشراق طبعِ مواج میں اک شور سا پیدا ہوگا

اگ موجوں کا سنونگا صفتِ تارِ رباب بیچ میں حلقۂ گرداب ترانا ہوگا

لاکھ تو لذتِ گفتار سے کردے محروم لب پہ لیکن نہ کبھی حرفِ تمنا ہوگا

گنگ ہو جائے اگر میری زبانِ گویا دلِ نالاں صفتِ بلبلِ شیدا ہوگا

باغ میں نغمہ پرِ شورِ عنادل ہوں ہزار نالۂ دل کا مگر رنگ نرالا ہوگا

گو تپِ غم سے ہو طاقتِ رفتار مجھے فکرِ رنگیں سے زمانہ تہ و بالا ہوگا

بڑھکے ہے بادِ صبا سے یہ مرا توسنِ فکر گرمِ جولان روشِ آہوئے صحرا ہوگا

آسماں رس فرسِ فکرِ رسا ہے میرا خاک سے اڑکے رواں تا بہ ثریا ہوگا

آرزوئے دلِ ناکام ہے خود مثلِ حباب ٹوٹ کر قطرہ مگر شاملِ دریا ہوگا

نقش بر آب ہے ساری ہوسِ نام و نمود فکر کیا میرا مخالف جو ستارا ہوگا

قطرۂ غم کو ڈبو دوں میں تہِ لطفِ عمیم

نذرِ تسلیم ہمیشہ دلِ دانا ہوگا

مسٹر حامد علیخاں بیرسٹرایٹ لا لکھنو کی سب سے پہلی رباعی

دن زیست کے کیا جانئے کیسے کاٹے یہ بھی نہ کھلا زندہ ہیں ایسے کاٹے

مر مر کے بسر عمر ہوئی یوں **حامد** کچھ دیر نزع میں کوئی جیسے کاٹے

نالۂ دل

تمہارے عشق میں گو آج داغ داغ ہوں میں
مگر یہ ناز ہے رشکِ بہارِ باغ ہوں میں

فروغِ داغوں سے مجھکو ہی باغ باغ ہوں میں
ہے جس سے مہرِ فلک ماند وہ چراغ ہوں میں

شرابِ عشق سے جو پُر ہے وہ ایاغ ہوں میں

مرے ہی دم سے ہی بازار گرم الفت کا
عروج مجھسے ہے واللہ محبت کا

فلک پہ دیکھئے جھنڈا گڑا ہے شہرت کا
ہے شور بحر میں موزونیِ طبیعت کا

میں خوش ہوں اس سے سراپا جو داغ داغ ہوں میں

تمہارے عارضِ پرنور کا ہوں دیوانہ
کیا ہے شمعِ محبت نے مجھکو پروانہ

بنا ہے خانۂ پرآرزو بھی ویرانہ
نگاہِ رحم کا محتاج ہے سیہ خانہ

قدم تمہارا اگر آئے تو باغ باغ ہوں میں

بہار آئے جو تم جلوہ گر ہو گلشن میں
چراغِ حسن عیاں ہو گلوں کے جوبن میں

چُھپے نہ کیوں گلِ مقصد ہر ایک دامن میں
ہے رنگِ گلشنِ وحدت تمہاری چتون میں

بجا ہی اب جو محبت میں داغ داغ ہوں میں

ستا رہی ہے کئی دن سے بے بسی میری
قرار لینے نہیں دیتی بیکسی میری

نسیمِ عیش ادھر بھی سے کھلے کلی میری
بس آج کل سے مبدل ہو بیکلی میری

طریقِ الفتِ جاوید کا سُراغ ہوں میں

جمائے رنگ زمانے میں کیوں نہ تیرا کلام
رجوع تیری **بلاغت** نہ کیوں ہوں خاص و عام

ہر اک زبان پہ جاری نہ کیوں ہو تیرا نام
ہیں سرپرست دکن میں ترے جناب سلام

بجا ہے تجھکو ہو دعویٰ اگر چراغ ہوں میں

بلاغت امروہوی

خیالاتِ پریشاں

دیکھنا اے ناخدائے بحرِ الفت دیکھنا
کشتیِ دل سنگِ عصیاں سے کہیں ٹکرا نہ جائے

کیا غضب ہے، ہوں تو آنکھیں دیکھنے کے واسطے
اور ہم چاہیں کہ کچھ دیکھیں، مگر دیکھا نہ جائے

پھونک ڈالا سوزِ غم نے جسم و جاں کیسے شرر
یہ قیامت ہو کہ ہم روئیں مگر رویا نہ جائے

کھینچتی ہے اُن کو ہر دل کی کشش اپنی طرف
اپنے گھر سے وہ جو نکلیں بھی تو اب نکلا نہ جائے

کر دیا ہے کام میرا ختم جب فریاد نے
آسماں تک اب نہیں جاتی تو خیر اچھا نہ جائے

اُف ری کمزوریِ دل! اللہ رے زخمِ تیرِ دوست
اپنا ہی چاکِ جگر دیکھیں ہم اور دیکھا نہ جائے

پھونک دے جسم و جگر کیا یہ بھی امکاں میں نہیں
آسماں تک آہِ سوزاں ہم نے یہ مانا نہ جائے

آہ کرکے کر نہ دے ظاہر کہیں رازِ نہاں
ڈر رہا ہوں میں دلِ وحشی کہیں گھبرا نہ جائے

ایک ہی دریائے بے پایاں کے قطرہ ہم ہیں سب
حیف ہو گر ہم میں کوئی جانبِ دریا نہ جائے

آنکھیں کھُل جائینگی اس کم مایگی کو دیکھکر
خیر اسی میں ہے کہ قطرہ جانبِ دریا نہ جائے

اُف رے آزارِ فراق اُف ری امیدِ وصلِ دوست
قالبِ خاکی کو ہم چھوڑیں مگر چھوڑا نہ جائے

اپنی قسمت ہے وگرنہ لے دلِ وحشت شرت
اپنے گھر میں وہ بلائیں ہم کو اور جایا نہ جائے

ضعف کا تو جب مزا ہے لے خیالِ روئے دوست
لاکھ ہم چاہیں کہ کچھ بولیں مگر بولا نہ جائے

منزلِ راہِ عدم میں جا بجا لکھا ہے یہ
لوٹنا ہو جس کو وہ اس راہ سے اصلا نہ جائے

اب نفس کے ساتھ ساتھ آنے لگے ہیں لختِ دل
حال بتر ہے مریضِ غم کا کچھ پوچھا نہ جائے

رنج و راحت کا نہ امکاں ہو تو پھر قربت ہے کیا
مثلِ شمعِ بزم گلچیں جائے۔ یا پروانہ جائے

رواں

تازہ غزلیں

سید الشعرا حضرت صمیم بلند شہری

ہوش اُڑے جاتے ہیں بند آنکھیں ہیں نشہ سر میں ہے
یہ رنگیلی چیز کیا ساقی ترے ساغر میں ہے

دل میں اُترا ہے مرے نقشہ تمہاری آنکھ کا
یہ وہ کافر ہے کہ جسکا گھر خدا کے گھر میں ہے

اب خدا کے سامنے پلہ سے پلہ باندھ لو
اب ہمارا اور تمہارا فیصلہ محشر میں ہے

جاں نثاروں میں کچھ کے دو نہ مجھکو بار بار
مُہر میرے نام کی بھی قتل کے محضر میں ہے

چشمِ بد دور آپ کی آنکھوں نے بیخود کر دیا
یہ مزے یہ کیف یہ رنگت کہاں ساغر میں ہے

خیر گذری غیر سے جھنتی ذرا سی بات پر
پھر نہ مانے پھر وہی رنگت تمہارے تیور میں ہے

زندگانی کے مزے اب اور کیا ہوں گے تجمیم
ہاتھ میں ساغر ہو آنکھوں میں تو دل برہم ہے

جنبشِ مژگاں میں دل جاں غمزۂ نشتر میں ہے
یہ تو فقرہ ہے تمہارا دم ترے خنجر میں ہے

پھر بڑھے گیسو چڑھے تیور تنی پلکوں کی صف
پھر اُدھر تنہا مرا دل کفر کے لشکر میں ہے

بُت بنے بیٹھے ہیں وہ نقشہ تو اُنکا دیکھئے
بولتی تصویر بھی تصویر کے پیکر میں ہے

اُس نگاہِ ناز کی بجلی میں ہیں حشر کئے بپا
یہ بھی اک ٹکڑہ قیامت کا صفِ محشر میں ہے

منزلِ مقصود میں تھم تھم کے اُٹھتے ہیں قدم
دل کسی کا کیا غبارِ دامنِ رہبر میں ہے

زلف کا کوچہ ہے کچھ ظلمات کی گلیاں نہیں
یہاں اندھیرا حشر کا ہے خضر کس چکر میں ہے

ابر کے چھینٹوں میں ہے ساقی کی رحمت کا نچوڑ
حضرتِ زاہد کی نیت بھی تو اب ساغر میں ہے

دو طرف کیوں ٹھوکریں کھاتے ہیں قیس و کوہکن
نجد میں لیلیٰ کہاں شیریں کہاں پتھر میں ہے

منہ چھپانے سے چمن میں کھل گیا سارا فریب
جال پھولوں کا کوئی صیاد کی چادر میں ہے

دے دُعا ساقی۔ کوئی ٹوٹا ہی پیمانہ سہی
غیر کی جھوٹی تو مجھکو زہر جامِ زر میں ہے

پھر تپنچہ کل پہ چڑھتا ہے نگاہِ ناز کا
پھر اُدھر بانکے سپاہی کی ادا تیور میں ہے

تم تو متوالے ہو دشمن کے تمہاری تاب کیا
ہوش کی لو یہ وہی نشہ تمہارے سر میں ہے

دم کھنچا جاتا ہے اُس تیغِ نگاہِ ناز پر
باڑھ کا ڈورا یہ کس کے بازوؤں کے پر میں ہے

دخترِ رز سے عقد واعظ نے کیا تو کیا کیا
چھن رہی ہے بے طرح جھگڑا زن و شوہر میں ہے

دل مرا تم نے چھپایا ہے گلوں کے ہار میں
ہو نہ ہو یہ پھول تو پھولوں ہی کے زیور میں ہے

آنکھ میں پتلی ہے یا جادو کا پُتلا ہے کوئی
جسکا دیوانہ یہ دل ہے وہ پری منظر میں ہے

رکھدیا ہو دل پریزادوں کے جگھٹ میں ضمیم
یہ حسینوں کا کھلونا حسن کے جھومر میں ہے

مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی

تیرا سرمہ پھیل کر پھر کیوں مٹ کر رہ گیا
اے شبِ وصلت یہ کیسا داغ دل پر رہ گیا

خون کا دھبہ سرِ لوحِ مقدر رہ گیا
کھینچ کر خطِ شہادت اُنکا خنجر رہ گیا

حسرتوں کا خون پھر تقدیر کے سر رہ گیا
پھر رگِ جاں سے اُلجھکر اُن کا خنجر رہ گیا

عشق کی دو ایک راہیں ہیں تو دل کو ڈھونڈلو
مجھکو کیا معلوم کس کوچے میں مر کر رہ گیا

رات بھر نقش و نگارِ خونِ دل میں تھی نمود
صبح کے ہوتے ہی سادہ ہو کے دفتر رہ گیا

موت ہی اچھی کہ آئی تو مُرادِ اہلِ صبر
میری شہ رگ سے لپٹ کر تیرا خنجر رہ گیا

مرنے والوں کو نہ پوچھ اے کشتۂ نیرنگِ دہر
بس اسی کی زندگی ہے جو تڑپ کر رہ گیا

اس سیہ خانہ پہ تھی یارب یہ کیسی روک ٹوک
جتنا مجھ ساتھ تھا تربت کے باہر رہ گیا

بن کے عبرت کی زباں کہتا رہے گا کچھ نہ کچھ
صحنِ گلشن میں اگر میرا کوئی پر رہ گیا

ایک دم میں ہاتھ سے جاتا رہا میں منزلوں
عالمِ محسوس میں چل پھر کے خنجر رہ گیا

مرنے والوں نے بڑی مدت میں کھولی تھی زباں
سامنے تیرے کہاں وہ شورِ محشر رہ گیا

میں نہیں۔ لیکن مرا افسانہ اُن کے دل میں ہے
جانتا ہوں میں کہ کس رگ میں یہ نشتر رہ گیا

آج خنجر سے بجھالی تم نے برسوں کی لگی
خون کی ٹھنڈک ذرا دیکھو کہ جم کر رہ گیا

پھینک اسکو توڑ کر میری لحد پر بعدِ قتل
رات دن رُلوئیگا مجھکو جو خنجر رہ گیا

اُن کی بزمِ ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی
نالۂ کش برسوں کا اک تصویر بنکر رہ گیا

اک لحد پر لوحِ حسرت نصب ہے او ظلم کیش
ہے یہ منزل اُس مسافر کی جو تھک کر رہ گیا

خوب سنبھلا میں نگاہِ مستِ ساقی کے حضور
کانپتے ہاتھوں سے گرتے گرتے ساغر رہ گیا

امتحاں گاہِ جہاں میں انتخاب اتنا ہوا
اک مرا سر ایک قاتل ایک خنجر رہ گیا

صبر کی سل رکھ کے دل پر پھر کوئی اٹھا نہیں
لوحِ تربت بن کے سینے پر یہ پتھر رہ گیا

ایک رگ باقی ہے اُس پر بھی ہے قاتل کی نگاہ
عمرِ ہمدم اور تیرا ساتھ دم بھر رہ گیا

مٹ گیا دنیا سے ہر نقشِ وفا ثاقب مگر
یہ تعجب ہے کہ میرا نام کیونکر رہ گیا

منشی عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی

تیری پلکیں زہر بھوئیں تیغ ہیں خنجر آنکھیں
سارے چلتے ہوئے پُرزوں سے ہیں بڑھکر آنکھیں

ڈر تو یہ ہے جو بدل لے وہ ستمگر آنکھیں
اُلٹی چھُریاں کہیں ہو جائیں نہ پھر کر آنکھیں

دل چھپاؤں کہاں دُزدیدہ نظر سے تن میں
میری رگ رگ سے ہیں واقف تری نشتر آنکھیں

انکا جادو ہی غضب اُسکے ہیں پھندے بے ڈھب
زلف ہے دامِ بلا اور فسوں گر آنکھیں

یہ تماشا ہی نیا صلح بھی ہے جنگ بھی ہے
دل ملے پر بھی لڑا کرتی ہیں اکثر آنکھیں

پُتلیاں شوقِ زیارت میں ترے ہیں بےچین
کہیں گھبرا کے نکل آئیں نہ باہر آنکھیں

چشمِ بینا نہیں افسوس وہ ہے جلوہ نما   دیکھتے ہم بھی اگر ہوتیں میسّر آنکھیں

دم شماری میں شبِ ہجر کیا کرتا ہوں   شام سے تا بہ سحر گنتی ہیں اختر آنکھیں

اب مجھے سوجھے گا کیا۔ پردہ نشیں آبھی جا   انتظار اتنا کیا ہوگئیں پتھر آنکھیں

نشۂ مے بھی ہے شوخی بھی ہے جادو بھی ہے   ہم نے دیکھی نہیں ایسی پری پیکر آنکھیں

یادِ دنداں میں جو منہ ڈھانک کے میں روتا ہوں   دامنوں میں مرے بھر دیتی ہیں گوہر آنکھیں

ڈھونڈھتی رہتی ہیں یہ اک بتِ ہرجائی کو   مجھکو کمبخت لئے پھرتی ہیں گھر گھر آنکھیں

میرے رونے پہ یہ ہنسکر کبھی اس نے پھبتی   اشک کے قطرے ہیں شبنم۔ تو گُلِ تر آنکھیں

دُور کی سوجھنے لگتی ہے مجھے مے پیکر   لامکاں پہنچتی ہیں نشہ میں چڑھکر آنکھیں

چوکڑی بھولیں غزالانِ ختن ہوکے دوچار   منہ کی کھائیں گے ہرن تجھسے لڑا کر آنکھیں

مست ہوجاتا ہے ساقی انھیں جو دیکھتا ہے   تری گردن ہے صُراحی تری ساغر آنکھیں

تو وہ تیرِ نظر بن گیا کیوں آئینہ   توڑ دیں یہ نہ کہیں سدِّ سکندر آنکھیں

دیکھی جاتی نہیں اُس رُخ کی تجلی ہرگز   کوئی سورج کے مقابل کرے کیونکر آنکھیں

سیدھی ہوتی ہی نہیں تیری نگاہیں ظالم   بن گئیں کیا مرا برگشتہ مقدر آنکھیں

دیکھنے ہی کی ہے۔ بے نور ہے چشمِ نرگس   مجھکو اللہ نے بخشی ہیں منوّر آنکھیں

چشمِ تصویر میں ہے رنگِ زباں اپنا **خلیق**
لکھ کے دکھلائے کوئی ایسی سخنور آنکھیں

قاضی سید محمد قاسم صاحب رئیس منگلور ضلع سہارنپور

ہر اک ہے عجب عالمِ تقدیر میں تصویر   ملتی نہیں لیکن تری تصویر میں تصویر

اللہ رے تمکیں۔ نہ تکلّم نہ تبسّم   قدرت نے لکھی ہے مری تقدیر میں تصویر

اصنام میں ہم دیکھتے ہیں جلوہ کسی کا   ایک اور نظر آتی ہے تصویر میں تصویر

کھینچا ہے تصور نے وہ نقشہ مرے آگے   تحریر میں تصویر ہے تقریر میں تصویر

گم نام ہوا ہوں مرا خاکہ نہ اُڑاؤ   حیرت سے بنو گے مری تشہیر میں تصویر

گیسو میں تمہارے ہے کسی کا دلِ حیراں   اور مجھکو نظر آتی ہے زنجیر میں تصویر

انصاف تمھیں پر ہے کہ **قاسم** کی طرح سے
مانی نے کبھی کھینچی ہے تقریر میں تصویر

ایڈیٹوریل

جنرل ولیم بوتھ | جنرل بوتھ کا شمار دنیا کے مشہور آدمیوں میں ہوتا تھا۔ یہ ایک مسیحی جماعت "مکتی فوج" کے بانی تھے۔ شروع میں اس جماعت کی تعداد بہت قلیل تھی مگر رفتہ رفتہ اسقدر ترقی ہوئی کہ اسکے شرکا کا شمار لاکھوں تک پہنچ گیا۔ چونکہ ابتدا میں مکتی فوج کی روش دوسری مسیحی کلیساؤں کے خلاف تھی اسلئے اسکے شرکا کو سازشی گروہ، باغی جماعت، مفسدہ پرداز فرقہ خیال کیا جاتا رہا، اور اس بنا پر ہزاروں قسم کی تکلیف انھیں اٹھانی پڑیں مگر جوں جوں مکتی فوج کے ذریعہ سے اچھے اچھے کام ظہور میں آنے لگے، وہ دشمنیاں الفت سے تبدیل ہوتی گئیں اور آخر وہ دن آیا کہ مکتی فوج کو اپنا کام کرنے کے لئے کامل آزادی بخشی گئی۔ ہم ذیل میں جنرل بوتھ کی سوانح حیات کا خلاصہ درج کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوگا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کیا کیا کام کئے ہیں :—

۱۸۲۹ء (۱۰ اپریل) پیدائش بمقام نوٹنگھم واقعہ انگلستان۔

۱۸۴۴ء اصطباغ بعمر پانزدہ سالگی و آغاز وعظ۔

۱۸۵۰ء عام کام چھوڑ کر کلیسائی خدمت اختیار کی۔

۱۸۶۵ء لنڈن کے شرقی گوشہ میں وہ خاص مشن قایم کیا جس کو پوری ترقی ہوئی۔

۱۸۷۸ء اپنے مشن کا نام مکتی فوج (سالویشن آرمی) رکھا۔

۱۸۸۰ء سیاحت امریکہ و آسٹریلیا۔ پہلا مدرسہ قایم کیا۔ اخبار نکالا۔ اپنی فوج کے سپاہیوں کے لئے وردی اور بٹے تجویز کئے۔

۱۸۸۱-۸۲ء فرانس ہندوستان سویڈن اور کنیڈا میں ترقیِ مشن کی تجویز کی۔ سوکٹوریہ اسٹریٹ (لنڈن) میں اپنا ہیڈ کوارٹر (صدر مقام) قایم کیا۔

۱۸۸۳ء جنوبی افریقہ، نیوزیلینڈ، سوئٹزرلینڈ کی سیاحت۔ جزیرہ وکٹوریہ میں قیدیوں کی تعلیم و تلقین کا خاص انتظام کیا۔ اس وقت فوج کے ۲۳۴ دستے اور ۱۴۸۵ افسر تھے۔

۱۸۸۶ء ایثارِ نفس کی عام تعلیم کی غرض سے لندن میں انٹرنیشنل کانگریس قایم کی۔

۱۸۸۸ء امریکہ اور کینڈا کی سیر۔

۱۸۹۰ء بیوی کا انتقال "تاریک انگلینڈ" نامی کتاب شایع کی۔ کرسٹل پیلس میں بڑا بھاری جلسہ کیا۔

۱۸۹۱ء آسٹریا، جنوبی افریقہ، اور ہندوستان کا سفر۔

۱۸۹۴ء مکتی فوج کی پچاس سالہ جوبلی۔

۱۸۹۷ء مسٹر گلیڈسٹون (وزیر اعظم انگلستان) سے ملاقات۔

سنہ ۱۹۰۱ء - تجویز بنک -

سنہ ۱۹۰۳ء - پریسیڈینٹ صوبجات متحدہ امریکہ سے ملاقات -

سنہ ۱۹۰۴ء - بکنگھم پیلیس میں حضور ملک معظم سے مصافحہ کیا -

سنہ ۱۹۰۵ء - موٹر پر چار دفعہ سیر خطاب ڈی - سی - ایل - لنڈن اور نوٹنگھم میں تعلیم و تلقین کی آزادی کا حکم - بنک کی ترقی -

سنہ ۱۹۰۶ء - شاہان ناروے و ڈنمارک سے ملاقات - جاپان کی سیر اور شہنشاہ جاپان سے ملاقات -

سنہ ۱۹۰۸ء - پانچویں دفعہ موٹر کی سواری - سات ہزار کے مجمع کو لیکچر -

سنہ ۱۹۰۹ء - شاہان انگلستان و اسپین سے ملاقات - سیاحت روس - اسّی ویں سالگرہ - چھٹی دفعہ موٹر کی سواری اور ٹانگ میں ضرب آنا -

سنہ ۱۹۱۱ء - بڑی سوشل کانگریس -

سنہ ۱۹۱۲ء - (۲۰ اگست) انتقال بعمر ۸۴ سال -

ہمارے ملک میں بھی مکتی فوج کا بہت کام ہو رہا ہے - شرکا کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہے - ہندی، اردو، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، گورکھی، تامل، تلیگو، وغیرہ مختلف ہندوستانی دیسی زبانوں میں کام ہوتا ہے - بہت سے ابتدائی مدارس ہیں جنمیں دس ہزار سے زائد بچے تعلیم پاتے ہیں - دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے بنک بھی قایم ہیں جن کے ذریعہ سے کسانوں سے بہت میل جول ہے - ہندوستان کی صنعتی ترقی کے متعلق بھی مکتی فوج نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں - صدہا کرگھے جلاہوں کو کم قیمت پر دیئے گئے ہیں اور کپڑا بننے کی تعلیم کے لئے کئی مقامات میں مدرسے کھولے ہیں - تمام قیدیوں اور مختلف جرائم پیشہ فرقوں کی اصلاح و تعلیم میں مکتی فوج نے بہت حصہ لیا ہے جس میں اسکو کامیابی بھی خوب ہوئی ہے - قحط کے دنوں میں بھی مکتی فوج نے بہت کام کیا - ہندوستان میں مکتی فوج کے چیف افسر کمشنر بوتھ ٹکر ہیں جنکا صدر مقام پنجاب میں ہے - اُن کی کوشش سے پنجاب میں کئی آبادیاں قایم ہوگئی ہیں جہاں جرایم پیشہ لوگ آباد ہیں اور مکتی فوج اُن کی اصلاح و تعلیم میں مصروف رہتی ہے -

نادر مرحوم ناظرین ادیب یہ حسرت انگیز خبر پڑھکر رنجیدہ و غمگین ہوں گے کہ ۲۰ اکتوبر کو صبح کے ۹ بجے منشی نادر علیخاں صاحب نادر (کاکوروی) نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی - مرحوم عرصہ چھ ماہ سے علیل تھے - گلے میں خناق پاک کر زہر بادی اثر پیدا ہوگیا تھا جس کا تین جگہ اپریشن بھی کیا گیا، مگر مشیت سے کوئی چارہ نہیں -

نادر مرحوم اخباری دنیا میں ایک مشہور شخص تھے - ادیب مئی سنہ ۱۹۱۱ء میں اُن کی تصویر بھی شایع ہو چکی ہے - مرحوم کے چھوٹے بھائی نے نزع کی شب میں مصرعۂ ذیل پڑھا ع قفس میں مرغ بسمل کے تڑپنے کا مزا کیا ہے، تو انھوں نے فی البدیہ دوسرا مصرعہ پڑھا ع نکل جانِ حزیں اس جسم خاکی میں دھرا کیا ہے، اسکو مرحوم کی شاعری کا آخری نمونہ کہنا چاہیئے - مرحوم کی تصانیف اُن کے بھائی مولوی شاکر علی صاحب جمع کر رہے ہیں - نادر مرحوم نے دو خورد سال بچے چھوڑے ہیں، جو ماں کے سایۂ عاطفت سے پہلے ہی محروم تھے - اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے ان بدنصیبوں کی نگہبانی فرمائے -

دربار نواب میر نظام علی خاں بہادر ادیب کے اس نمبر میں نواب میر نظام علی خاں بہادر آصفجاہ ثانی کے دربار کی ایک تصویر شایع ہوتی ہے، جسکے لئے ہم بابو ہمنت راو صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں - آپ نے تصویر کے ساتھ جملہ اصحاب کے متعلق نوٹ بھی ارسال فرمائے ہیں، جنکو ہم اس جگہہ درج کرتے ہیں :—

نواب میر نظام علیخاں بہادر آصفجاہ ثانی آپ نواب میر قمرالدین خاں نظام الملک آصفجاہ اول کے چوتھے فرزند تھے سنہ ۱۱۴۶ھ میں پیدا ہوئے - سنہ ۱۱۶۶ھ میں برار کے صوبہ دار بنائے گئے - سنہ ۱۱۷۱ھ میں امیرالممالک نواب صلابت جنگ (جو اُن کے بھائی تھے) نے انھیں آصفجاہ ثانی کا خطاب دیکر اپنا ولیعہد مقرر کیا - ولی عہد ہوتے ہی انھوں نے ریاست کا کام انجام دینا شروع کیا اور پانچ سال تک نہایت اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ اپنا فرض ادا کرتے رہے - سنہ ۱۱۷۶ھ میں جب ارکین ریاست کے مشورہ سے امیرالممالک قلعہ میں نظربند کئے گئے تو نواب صاحب معز مستقل رئیس ہوئے - سن تمیز ہی سے ان کو نبرد آزمائی کا شوق رہا - کوئی لڑائی ایسی نہ تھی جس میں انھوں نے داد مردانگی نہ دی ہو - انھوں نے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ انگریزوں کا ساتھ دیا - ۴۲ برس حکومت کرکے ۷۰ سال ۶ ماہ ۷ یوم کی عمر میں ۷ ربیع الثانی سنہ ۱۲۱۸ھ کو انتقال کیا -

ابوالخیر خاں تیغ جنگ بہادر - آپ کا سلسلہ نسب شیخ فرید شکر گنج تک پہنچتا ہے - پدر بزرگوار کا نام شیخ بہاؤالدین تھا - جب حضرت آصفجاہ اوّل عازم دکن ہوئے اسوقت یہ بھی اُن کے ساتھ آئے - حضرت موصوف نے انھیں دو ہزار منصب پانچسو سوار اور ۳۰۰ ہزار پیادہ کی جاگیر مرحمت فرمائی - آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ بابو نایک کا مقابلہ کرکے فتح پائی - جسوقت ناصر جنگ شہید اپنے والد ماجد آصفجاہ اول سے معرکہ آرا ہوئے انھوں نے انھیں اپنا طرفدار بنانا چاہا مگر انھوں نے انکار کر دیا - تخت نشینی کے بعد ناصر جنگ نے ان کو شمشیر جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا - صلابت جنگ نے پالکی جھالردار اور امام جنگ کے خطاب سے ممتاز کیا - ۲۶ ربیع الاول سنہ ۱۱۶۴ھ کو فالج سے انتقال فرمایا -

سکندر جاہ آصفجاہ ثالث - آپ نواب میر نظام علیخاں بہادر آصفجاہ ثانی کے سب سے بڑے فرزند تھے - آپکا نام میر اکبر علی خاں تھا - سنہ ۱۱۸۲ھ میں

پیدا ہوئے۔ آصفجاہ ثانی کے انتقال کے بعد اعیان دولت وارکان سلطنت نے انھیں ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ کو تخت نشین کیا تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد آپنے نواب ارسطوجاہ کو بدستور خدمت مدار المہامی پر بحال کیا اور اپنے گورنمنٹ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے درمیان سابق کے معاہدوں کی تصدیق کرکے اتحاد قایم رکھا۔ ۸ صفر ۱۲۲۱ھ کو راجہ چندولعل کو خدمت پیشکاری سے اور ۱۵ رجب ۱۲۲۴ھ کو نواب منیرالملک کو مدار المہامی سے سرفراز فرمایا۔ نواب صاحب نہایت تنومند اور بہادر تھے۔ طب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ ۲۰ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ کو ۲۶ سال سلطنت کرکے ۶۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور مکہ مسجد میں دفن ہوئے۔ **راجہ چندولال** آپ رائے نارائن داس کے فرزند تھے ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ مشکل دس سال کے ہوں گے کہ آپکے والد کا انتقال ہوگیا۔ چچا نے آپ کی پرورش کی۔ آپ کی ہوشیاری و کارپردازی دیکھکر نواب شمشیر جنگ نے اپنے تعلقہ کا کارپرداز مقرر کیا۔ نواب ارسطوجاہ مدار المہام نے ۱۲۱۲ھ میں انباری، خطاب راجگی و بہادری پیشگاہ حضوری سے سرفراز کراکر چار ہزار سوار اور چار ہزار پیادے ان کے ماتحت کئے نواب شمس الامرا بہادر کے جمعیت کے پیشکار بھی تھے۔ بعد میں آپ کو خدمت کروڑگیری ملی۔ نواب سکندر جاہ کے عہد میں جب میر عالم بہادر دیوان ہوئے تو ۶ صفر ۱۲۲۱ھ کو آپ خدمت پیشکاری پر مقرر کئے گئے۔ ۱۲۳۵ھ میں نواب ممدوح نے آپ کو خطاب مہاراجگی پالکی جھالردار اور نوبت سے سرفراز فرمایا۔ ۱۲۴۶ھ میں نواب ناصرالدولہ نے راجایان راجہ مہاراجہ راجہ چندولال بہادر کا خطاب عطا فرمایا۔ بعد انتقال منیرالملک بہادر راجہ موصوف ہی کل ملکی ومالی انتظامات فرماتے رہے۔ آپ کی فیاضی اور خیرات مشہور عام ہے۔ آپ میں علاوہ فیاضی کے جوہر شناسی کا بھی مادہ تھا۔ صاحب علم اور ذی کمال لوگوں کے قدردان اور غریب الوطن مسافروں پر خاص طور پر عنایتیں فرمایا کرتے تھے آپ کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ شاداں تخلص کرتے تھے۔ ایک دیوان فارسی اور ایک دیوان اردو ان سے یادگار ہے۔ آپ نے اپنے خاندانی حالات کے متعلق عشرت کدۂ آفاق کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی ہے۔ ۸ ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ کو ۸۶ سال کی عمر میں قضا کی۔ **فریدونجاہ** - آپ میر نظام علیخاں آصفجاہ ثانی کے پانچویں فرزند تھے۔ آپ کا نام میر سبحان علیخاں تھا۔ عشرۂ اول ربیع الاول ۱۲۳۰ھ میں انکا انتقال ہوا **غنی یار خاں** - یہ صاحب آصفجاہ ثانی کے عہد میں خانسامانی کی خدمت رکھتے تھے۔ غنی محل انھیں کے اہتمام سے تعمیر ہوا تھا۔ **موسی رحموں** - یہ پہلے پانڈیچری میں ملازم تھے، بعد میں سرکار نظام کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ آصفجاہ ثانی کے ساتھ کھرڑلہ کی مشہور جنگ میں شریک تھے

انھیں سیف الدولہ عمدۃ الملک کا خطاب عطا ہوا تھا۔ پانچ ہزار فوج ان کی ماتحتی میں تھی۔ ۱۵ **اسد نواز جنگ** - انکا نام میر حسین تھا۔ یہ اور ان کے بھائی جعفر یار جنگ بہادر میر مہدی کے فرزند تھے حضرت غفران مآب میر نظام علی خان کے وقت میں نوکر ہوئے اور اپنے اہلیہ کو رضاعت کی خدمت پر مامور کیا۔ سکندر جاہ جوقت مسند نشین ہوئے انھوں نے ان کو اسی طرح اپنا مصاحب رکھا جیسا کہ صاحبزادگی کے زمانہ میں تھے۔ **ارسطوجاہ** - انکا نام غلام سید خاں تھا۔ قوم کے سندل کیانی اور نوشیروان عادل کی نسل سے تھے۔ ان کی ولادت ایلچپور میں ہوئی تھی۔ ابتداءً یہ حضور باش تھے۔ رکن الدولہ نے اورنگ آباد کی صوبہ داری پر مامور کراکر ان کو حضور باشی سے موقوف کرادیا۔ بعد چار سال کے صوبہ داری سے بھی موقوف کرکے قلعہ اوسہ میں رکھے گئے۔ رکن الدولہ کے انتقال کے بعد بربنا سفارش شمس الامرا مرحوم قلعہ اوسہ سے طلب کرکے خدمت وکالت پر مامور کئے گئے۔ اسکے بعد قلمدان وزارت سے سرفراز ہوئے ۱۲۱۵ھ سے منجانب آنریبل کمپنی انگریز بہادر ایک لاکھ روپیہ سالانہ مقرر ہوا ۱۲۱۹ھ میں فوت ہوئے۔ **احتشام جنگ** - انکا نام مرزا ابراہیم بیگ اور خطاب ظفرالدولہ مبارزالملک تھا۔ ترچناپلی کے جنگ میں جو نمایاں بہادری انھوں نے کی اسکو دیکھکر رکن الدولہ نے والاجاہ سے انھیں مانگا۔ والاجاہ نے بتقضائے وقت انکا ہاتھ رکن الدولہ کے ہاتھ میں دیکر ان کے حوالہ کردیا اور رکن الدولہ نے بغرض نگہداشت جمعیت محالات نرمل، ایلگندل، بال کنڈہ، ورنگل تعلقہ اشوارا وغیرہ دیکر خطاب مرقوم الصدر سے سرفراز کیا۔ حضرت غفران مآب کے عہد میں انتقال ہوا۔ **میر عالم** - نواب ابوالقاسم میر عالم ۱۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۲۴ ربیع الثانی ۱۲۱۹ھ کو خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے۔ جب ارسطوجاہ دوسال تک مرہٹوں کی کفالت میں تھے اسوقت میر عالم ہی اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ آپ سرکار انگریزی کے بھی خیرخواہ تھے۔ وہاں سے انھیں دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن ملا کرتی تھی۔ تالاب میر عالم آپ ہی کی یادگار ہے۔ ۳۰ شوال ۱۲۲۳ھ کو بحالت مدار المہامی قضا کی **گھانسی میاں** - المخاطب بہ سرفرازالدولہ سردارالملک بہادر، شمس الامرا بہادر کے ہمزلف تھے۔ انھیں کی اعانت سے بہ خطاب و جمعیت سرفراز ہوئے۔ افغانان مہدوی نے بباعث بغض و عداوت قلبی ان کو مار ڈالا تھا **منیرالملک** - یہ صاحب غیور جنگ ابن شیر جنگ بہادر کے بیٹے تھے۔ بعد انتقال میر عالم حضرت غفران مآب کے عہد میں خدمت دیوانی سے سرفراز ہوئے۔ **طاہر علیخاں مردہہ** - یہ محمد ہاشم کے بیٹے تھے جو ناصر جنگ شہید کی عملداری میں چوبداروں کے چوکی سے سرفراز ہوئے تھے۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد چوبداروں کے تین چوکیاں سے

ذ نے شاہجہاں آباد سے دکن کا ارادہ کیا اسوقت لشکر خان کو اپنے ہمراہ لاکر براڑ و اورنگ آباد وغیرہ میں بیس ہزار روپیہ وغیرہ کی جاگیر اور پانچ ہزار سوار کی جمعیت سے سرفراز فرمایا۔ خان مذکور مقربان حضور سے
* ممدوح کے عہد میں بڑے بڑے معرکوں پر بھیجے گئے تھے۔ **غلام سید خاں** المخاطب بہ سہراب جنگ معین الدولہ صوبہ براڑ کے ناظم تھے۔ **امجد علیخاں** المخاطب بہ امجد الملک۔ ان کا تعلق امرا پائیگاہ سے تھا

کیکئی اور منتھرا

انڈین پریس الہ آباد

سب سے پہلے اِس کو ملاحظہ فرمائیے

اِس نمبر کے ساتھہ ادیب کا تیسرا سال ختم ہو گیا جن معززین نے شروع سال سے خریداری فرمائی تھی' یا جنوری سے ابتک کے پرچے مجموعی طور پر طلب فرما لئے تھے' اُن کی عطایہ قیمتیں ختم ہو گئیں - اُمید ہے کہ وہ اپنی سرپرستی آیندہ بھی قائم رکھیں گے' اور اس علمی خدمت میں مہتممان رسالہ کی مالی امداد فرماکر اپنی علمی قدردانی کا ثبوت دینگے' جو اس کے عظیم اخراجات کی کفالت کے لئے نہایت ضروری ہے - ہم اپنے معاونین کی عنایتوں کو ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۱۳ع تک انتظار کرینگے - اس عرصہ میں خواہ قیمتیں بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائی جائیں خواہ جنوری کا پرچہ ویلو پے ایبل بھیجنے کی اجازت عطا فرمائی جائے - بحالت سکوت منظوری خریداری متصور ہوگی' اور جنوری نمبر ویلو پے ایبل ارسال خدمت ہوگا - لہذا اگر خریداری نامنظور ہو تو میعاد معینہ کے اندر مطلع فرما دیا جائے تاکہ معاونین واپسی رسالہ کی زحمت سے اور دفتر نقصان سے محفوظ رہے -

خادم منیجر ادیب - انڈین پریس الہ آباد

علوم تجربیہ

علم کی ابتدا

سائنس کی ابتدا کب سے ہے؟ اسکے جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب سے انسان کے اندر اپنے اردگرد کی چیزوں کے مشاہدہ کا مادہ پیدا ہوا ہے اسوقت سے علم کا آغاز ہوا ہے۔ شروع میں انسان نے مظاہر فطرت مثلاً آندھی، طوفان، زلزلہ، سورج کا طلوع و غروب وغیرہ وغیرہ دیکھے اور ان باتوں کا اسے ہر روز تجربہ ہوتا رہا۔ لیکن اس نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ یہ کیوں وقوع میں آتے ہیں۔ علاوہ ازیں رفتہ رفتہ اس نے بھدے بھونڈے اوزار بنائے کیونکہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ اس نے اپنی زندگی کی روزانہ ضروریات سے مجبور ہو کر اپنے کام کی چیزیں بنا لیں جن سے اسکے آباو اجداد پہلے نا آشنا تھے مگر اس نے اپنی عقلی کوششوں سے معلوم کر کے اپنے حسب منشا انھیں تیار کر لیا۔ مثلاً اس نے اپنے کام کے پودوں اور جانوروں کی دیکھ بھال کی، ان کے عادات معلوم کئے۔ اس طرح علم الحیواۃ کی بنیاد پڑی۔ اسی طرح اس نے جڑی بوٹیوں کے خواص، تاثیر اور استعمال معلوم کئے۔ ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کو جوڑنے کی مشق بہم پہنچائی۔ اس طرح طب اور جراحی کی ابتدا ہوئی۔ اسطرح علم ترقی پکڑتا گیا۔ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جب عقل انسانی کچھ وسعت اختیار کر چکی تھی تو متفکر ذہن مظاہر فطری کے اسباب کی تحقیقات کی طرف رجوع ہوا۔ مگر چونکہ عقل اسباب اور نتائج کا پتہ لگانے کے قابل نہ تھی اسلئے ظہوراتِ طبعی کی مسبب فوق العادت ہستیاں قرار دی گئیں۔ طوفان، آندھی وغیرہ کو غیر مرئی ہستی کے فعلِ قبیح سے منسوب کیا گیا جیسے انھوں نے اصلیت اور جبلت میں ہو بہو اپنے جیسا سمجھا۔ مثلاً آفتاب سورج دیوتا کا آتشی رتھ قرار پایا جو ہر روز بلا ناغہ آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف بڑی آب و تاب کے ساتھ جاتا ہے۔ گو یہ خیالات محض طفلانہ تھے مگر قابلِ قدر تھے۔ کیونکہ ابتدائی زمانہ کے لوگوں کا مظاہر کی نسبت کوئی خاص خیال نہ تھا۔ ایک طرف تو ان خیالات سے شاعرانہ بلند پروازی اور صناع کی صناعی کے واسطے عمدہ موضوع دستیاب ہو گئے اور دوسری طرف ایک نظریہ ہاتھ لگ گیا جسکی بدولت عالمانہ تحقیقات کے واسطے راستہ کھل گیا۔ زمانہ مابعد کے حکیموں اور عالموں نے اس نظریہ کی بنیاد پر منطقی استدلال میں معقول دستگاہ پیدا کر لی گو بعد ازاں یہ نظریہ مظاہر کی تشریح و توضیح میں غیر مکتفی ثابت ہوا

ظہوراتِ طبعی میں انسان کا دل پہلے پہل اجرام فلکی کی طرف مائل ہوا تھا جنکی حرکتوں کو وہ دن رات دیکھتا تھا۔ صبح کے وقت ایک بڑا درخشاں قرص ایک طرف سے نکلتا اور کچھ دیر تک دور و نزدیک کے خطہ کو روشن اور گرم رکھنے کے بعد غائب ہو جاتا، چاروں طرف تاریکی چھا جاتی، کبھی کبھی اس گول روشن کُرے کے چھپ جانے کے بعد ایک اور چھوٹا سا گولہ چمکتا دمکتا دکھائی دیتا۔ جسکی روشنی آنکھوں کو خوشگوار اور دل کو لبھانے والی معلوم ہوتی۔ جب یہ نہوتا تو گنبد آسمان ننھی ننھی درخشاں گولیوں سے جگمگاتا نظر آتا۔ ان تبدیلیوں کا اثر انسان کے دل پر بہت گہرا ہوا اور اس نے اسکی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح فلکیات کا آغاز ہوا۔ پُرانے زمانہ کے کتبوں، تحریروں، اور یادگاروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نہایت قدیم زمانہ سے انسان مشاہدات فلکی کی طرف مائل رہا ہے۔ ہندوؤں کی پُرانی کتابوں سے اسکی بابت نہایت صحیح اور معتبر شہادت ملتی ہے۔ کلدانیوں نے بھی اس میں کچھ ترقی کی تھی۔ زمانۂ قدیم بعید کے مصری بھی ہئیات سے آشنا تھے۔ یونانیوں نے علمی خیالات ہندوؤں اور دیگر ایشیائیوں سے حاصل کئے تھے۔ قدیم مغربی قوموں میں یونانی محقق تالیس (۶۰۰ ق م)، نے کائنات کی بابت پہلے پہل معقول خیال ظاہر کیا تھا جو مظاہر طبعی کے مشاہدہ اور ان سے استدلال کر کے قائم کیا تھا۔ اسکے بعد انکسی مینس نے قطبی تارہ کو کچھ عرصہ تک دیکھکر یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ افلاک اسکے گرد طواف کرتے ہیں، اسکے اوپر جو گنبذ نظر آتا ہے وہ ایک کُرے کا نصف معلوم ہوتا ہے۔ اس نے زمین کو چپٹی قرار دیا اور ساکن مان کر اسے مرجع عالم ٹھہرایا۔ کائنات کے اندر جتنے تغیرات ہوتے ہیں، اس نے انھیں خاص اسباب سے منسوب کیا۔ فیثاغورس کے زمانہ میں زمین گول قرار دی گئی تھی۔

افلاطون اور ارسطاطالیس کے زمانہ میں منجملہ دیگر مسائل طبعیہ و حکمیہ کے علم کی ماہیت سے بحث ہوئی۔ اوّل الذکر نے اسکی بابت یہ کہا۔ علم پہلے جنم کی بھولی بسری باتوں کی یاد کی تروتازگی اور افشا ہے، اور یہ عمل رفتہ رفتہ ہوتا ہے۔ اسکی ترقی ہمارے قوائے عقلیہ و طبعیہ کے متناسب ہوتی رہتی ہے۔ مؤخر الذکر حکیم نے علم کی بابت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ محسوسات کو ذہن میں رکھنے، ایک دوسرے سے ملانے، اور پھر انھیں ترتیب دیکر نتائج کلّیہ اخذ کرنے سے علم حاصل ہوتا ہے۔[1]

علوم کی تقسیم و ترتیب

ہر زمانہ کے عالم اور حکیم علم کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور اسکی ضرورت بھی ہے۔ علم کو اگر ایک شاندار حویلی سمجھا جائے تو اسکے اندر دالان، ہال، کمرے، کوٹھریاں وغیرہ، تصور کرنا لابدی ٹھہرتا ہے۔ سائنس یا علم کا موضوع اور اسکا حلقۂ اثر تمام عالم ہے۔ تجربہ میں جو امر آتا ہے اور جسکی تصدیق ہو سکتی ہے، وہ سائنس کے معلومات کے زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسوجہ سے عالموں نے علم کو مختلف شاخوں میں تقسیم کرنیکی کوشش کی ہے۔ ترتیب و تقسیم عقل انسانی کا خاصہ ہے جسکے بغیر وہ نہیں رہ سکتی۔ درخت، پودے، حیوانات، معدنیات، جمادات وغیرہ، سب تقسیم و ترتیب کے تابع کئے گئے۔ اور جبکہ انسان خود بھی اس سے نہ بچ سکا تو یہ کب ممکن تھا کہ ہمارے تخیلات اور معلومات اس قاعدۂ عامّہ کے اثر سے مامون رہ سکتے۔ بیکن کہتا ہے کہ علوم کی تقسیم اُن مختلف خطوط کی طرح نہیں ہے جو ایک زاویہ سے ملتے ہیں بلکہ یہ درخت کی شاخوں کی طرح ہے جو ایک ہی تنہ سے پھوٹتی ہیں۔ علوم کا ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرا ربط ہے۔ گویا اسکی جتنی شاخیں ہیں وہ ایک عظیم کل کے جزئیات معلوم ہوتے ہیں۔ تجربی علم میں انسانی عقل کی مصروفیتوں کے جملہ نتائج شامل ہیں۔

ارسطاطالیس ارسطاطالیس علوم قدیمہ کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ اسکی تحقیقی اور علمی مصروفیتیں گوناگوں تھیں۔ اسکا فلسفہ ہمارے زمانہ کے سائنس کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔[2] اس نے اسے اصولی اور عملی دو حصّوں میں

[1] ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹانکہ طبع جدید جلد نمبر ۲۴ صفحہ ۳۹۰ و ۳۹۹

[2] ماخوذ از ہارمس ورتھ انسائیکلوپیڈیا، صفحہ ۵۳۰۷ - ۵۳۰۰

منقسم کیا تھا۔ اصولی میں ریاضیات، طبعیات، اور مابعد الطبعیات (جسے اس نے اپنی اصطلاح میں فلسفہ اولین یا الٰہیات قرار دیا تھا) عملی میں اخلاقی سیاسی علم اور صناعی کو شامل کیا تھا۔ ارسطاطالیس نے نہ صرف علوم کی تقسیم و تفریق کی بلکہ کئی ایک کی اس نے خود بنیاد ڈالی تھی اور مختلف علوم کے مفہوم کی تشریح کرکے ان کی حدِ وسعت مقرر کی۔ اس نے جو امتیازی اصول وضع کئے تھے وہ علمی دنیا میں ہمیشہ مسلم رہے ہیں۔

فرانسس بیکن | فرانسس بیکن زمانۂ جدید کے علوم کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے تحقیقات کے نئے اصول قایم کئے جنکی بدولت علوم تجربیہ میں اتنی ترقی ہوئی ہے۔ اس نے علوم کی تقسیم اپنے ڈھنگ کے مطابق کی ہے جو اسکی مشہور کتاب "ایڈوانس منٹ آف لرننگ" (Advancement of Learning) میں پائی جاتی ہے۔ اس نے علم کے تین بڑے حصے کئے ہیں یعنی تاریخ، نظم، اور فلسفہ، تاریخ کی بنیاد دیاد داشت قرار دیکر اسے طبعی اور ملکی میں تقسیم کیا۔ نظم یا شاعری کا مبداء تخیل ٹھہرایا۔ فلسفہ یعنی سائنس کو عقل سے منسوب کیا۔ اس میں الٰہیات بھی شامل ہے، جسکا مبحث دینیات اور مکاشفۂ ربانی ہے اور فلسفہ طبعی کا موضوع خدا، کائنات، اور انسان کو بتایا گیا ہے۔ علم کا جو شعبہ کائنات سے بحث کرتا ہے اس میں ریاضیات، طبعیات، اور مابعد الطبعیات شامل ہے۔ بیکن کہتا ہے علوم کے شعبے درخت کی شاخوں کی مانند ہیں جو ایک ہی تنہ سے نکل کر ادھر اُدھر پھیل جاتی ہیں اسلئے یہ لازم آتا ہے کہ ہم سب سے پہلے ایک عالمگیر سائنس مقرر کرلیں جو باقی تمام علوم پر حاوی ہوجائے اور وہ علم کی سب شاخوں کا تنہ مان لیا جائے۔ اور یہ عالمگیر سائنس فلسفۂ اولین ہے۔ اس تحقیقات میں اس نے غیر مرئی ہستیوں کو بھی شامل کیا ہے۔ بیکن کا قاعدہ آج کل بہت مفید نہیں ثابت ہوسکتا گو فرانس کے قاموس دانوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا تھا۔ بیکن کی بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے حافظہ، تصور، اور ذہن کو جدا گانہ قوتیں تسلیم کیا ہے (حالانکہ زمانۂ حال کے عالم انھیں ایک ہی قوت کے شعبے مانتے ہیں) جنکی وجہ سے علم کے مختلف شعبے وقوع میں آئے بیکن کا خیال بہت اُلجھا ہوا ہے۔ اس نے تاریخ کو سائنس سے اور انسان کو موجودات سے علیحدہ کردیا۔

کونت | اگست کونت (۱۷۹۸ء-۱۸۵۷ء) فرانس کا مشہور فلاسفر تھا جس نے فلسفۂ اثباتیہ اور انسان پرستی (Religion of Humanity) بھی رائج کی تھی جواب پازیٹوازم (Positivism) کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے چھ بنیادی علوم تسلیم کئے ہیں جو یہ ہیں۔ ریاضیات، فلکیات، طبعیات، کیمسٹری، علم الحیوٰۃ، اور علم المعاشرت اور ساتواں علم جو اس نے سب سے بڑا مانا ہے علم الاخلاق ہے۔ کونت (Compte) کہتا ہے کہ "ان علوم کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور انھوں نے اسی ترتیب سے ارتقا کیا ہے"۔ اسکے اصول کے مطابق علم اولین دیگر علوم سے پہلے ہونا چاہیئے جو اور شاخوں کا سبب ہوتا ہے۔ کونت کا یہ بھی خیال ہے کہ "علوم سے انسان کو اپنی کردار میں ہدایت پذیر ہونا چاہیئے کیونکہ اخلاق میں علمی تجسس اور ترقی کا ترکیبی انجام تکمیل پاتا ہے"۔ دوسرے لفظوں میں اسکے یہ معنی ہیں کہ ہیئتِ انسانی کے لئے جن ہدایات اور اصول کی ضرورت ہے وہ سائنس سے حاصل کئے جائیں۔ اسکا ایک اور خیال یہ ہے کہ جو علوم پیچیدہ حقایق سے بحث کرتے ہیں وہ اُن علوم کے محتاج ہیں جو سادہ واقعات پر اکتفا کرتے ہیں۔ مگر یہ واضح نہیں ہوتا کہ واقعاتِ زندگی کی کیمسٹری یا طبعیات کے اصولوں کی روشنی میں کس طرح تشریح و توضیح ہوسکتی ہے، اور عالم بیالوجی تمدنی مسائل کو کس طرح حل کرسکتا ہے۔ مگر یہ امر تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بیالوجی، طبعیات، اور کیمسٹری، کے علوم سے معاشرت کے مسائل کے سلجھاؤ میں بہت مدد ملتی ہے۔ کونت نے علوم کو[1] ایک دوسرے کے

---

[1] علوم و فنون کی تقسیم و ترتیب کی مفصل بحث کونت کی سب سے بڑی تصنیف "Fundamental Principles of Positive Philosophy" میں پائی جاتی ہے۔

لئے لازم و ملزوم ٹھہرایا، اور یہ قرار دیا کہ وہ ایک دوسرے کے دست نگر ہیں۔ اس کے بغیر ان کی ترقی اور نمو محال ہے۔

کونت کے اُصول کے مطابق بیالوجی کیمسٹری یا فزکس سے نہیں نکلی ہے مگر فلکیات کو کیمسٹری اور طبعیات سے الگ کر کے بنیادی علم نہیں قرار دیا جا سکتا، اور نہ اس سے طبعیات کے بنیادی اُصول ماخوذ ہو سکتے ہیں۔ ریاضیات بلاشبہ بنیادی علوم میں سے ایک ہے اور سب سے آزاد ہے۔ سائیکالوجی کو فزیالوجی کا شعبہ قرار دینا گویا اس علم کے جداگانہ امتیاز کو مٹانا ہے۔

ہربرٹ اسپنسر

ہربرٹ اسپنسر زمانۂ حال کا سب سے بڑا فلاسفر ہے۔ اس نے اس امر پر سب سے زیادہ زور دیا ہے کہ ان علوم میں خاص امتیاز کرنا چاہئے جو مجردات اور محسوسات سے بحث کرتے ہیں۔ مثلاً منطق اور ریاضیات جس میں علمی طرز ادا کے طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ اور وہ علم عقلی ہے۔ اسکا اطلاق سب چیزوں پر ہوتا ہے مگر یہ اشیا کی ماہیت سے بحث نہیں کرتا۔ پروفیسر رابرٹ فلنٹ مرحوم نے اپنی ایک کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "علوم کی طبعی تقسیم یہ ہے کہ ایک طبقہ میں وہ علوم شامل ہیں جو موجودات کے صرف بیان پر اکتفا کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو حقائق الاشیا سے بحث کرتے ہیں"۔ محسوسات سے جو علوم بحث کرتے ہیں ان میں فلکیات، ارضیات، علم الحیوٰۃ، علم النفس، او علم المعاشرت ہیں اور جو موجودات کی مرئی کیفیتوں سے علاقہ رکھتے ہیں مثلاً کیمسٹری، طبعیات، اور علم جر ثقیل، وہ محسوس مجرد علوم میں شمار کیئے ہیں۔ وہی عالم پھر کہتا ہے "شروع سے عقلی، معنوی، و محسوس، اور علوم متعلقہ محسوسات پہلو بہ پہلو ترقی کرتے چلے آئے ہیں۔ اوّل الذکر طبقہ کے علوم کی مدد سے طبقہ دوم اور سوم کے علوم کے مسائل حل کئے گئے اور اس طرح ان میں ترقی ہوتی رہی جب درجۂ دوم کے علوم کے مسائل طبقۂ اوّل کے علوم کے اُصول سے سلجھانے میں مدد لی گئی تو تیسرے زمرہ کے علوم کو ترقی نصیب ہوئی۔ یہ تینوں قسم کے علوم ایک دوسرے پر اثر ڈالتے اور ایک دوسرے کی تحریک سے ترقی کرتے رہے"۔

ہربرٹ اسپنسر کے خیال کے مطابق علوم کی تقسیم اس طرح ہونا چاہئے طبقۂ اوّل: علوم عقلیہ جنمیں منطق اور ریاضیات ہیں۔ درجہ دوم: علوم مجرد و محسوس جر ثقیل، طبعیات، کیمسٹری۔ درجہ سوم: علوم متعلقہ محسوسات فلکیات، ارضیات، بیالوجی، سائیکالوجی، اور سوشیالوجی۔

سائنس کے ان تینوں زمروں کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے (۱) قانون صوریہ (۲) قانون حقایق (۳) قانون نتائج۔ اوّل طبقہ کے علوم طبقہ دوم و سوم کے مسائل سلجھانے میں بہت کارآمد ثابت ہو چکے ہیں، مگر طبقہ ثانی کے علم صرف تیسرے طبقہ کے علموں کی ترقی کے موید ہوتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے طبقہ کے علم درجۂ اوّل کے علوم کے لئے معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ اور تیسرے طبقہ کے علوم دوسرے درجہ کے لئے سامان مہیا کرتے ہیں، مگر تیسرے درجہ کے علوم دوسرے طبقہ کے مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتے۔ عقلاً علوم ایک دوسرے کے محتاج ہیں کیونکہ مظاہر کا ایک دوسرے سے طبعی تعلق ہے۔ جسم کے اندر کیمیائی اور طبعی عمل ہوتے رہتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے ایک گہرے طبعی رشتہ سے مربوط ہیں۔ مگر یہ عمل بیالوجی نہیں کہلاتے گو اجسام کے کیمیائی اور طبعی عملوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنکا ہماری زندگی کے افعال اور اعمال سے بہت گہرا اور لازمی تعلق ہے بلکہ ایک بڑی حد تک انکا تعلق اسکے قیام سے ہے۔ مگر ان اُمور سے بیالوجی کے مسائل حل نہیں ہو سکتے کیونکہ انکا تعلق زندہ جانوروں کے عادات اور خواص سے ہے۔

پروفیسر کارل پیرسن

یہاں ولیم اوکن، اور پروفیسر بین (Bain) کی تقسیم کو نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے مضمون کے مطول اور پھیکا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسلئے مشہور جرمن عالم پروفیسر کارل پیرسن (Pearson) کے خیالات ہدیہ کئے جاتے ہیں۔ آپ نے ایک معرکتہ الآرا علمی کتاب "گرامر آف سائنس" لکھکر بہت نام پیدا کیا ہے۔ یہ

ولادت مسیح

انڈین پریس الہ آباد

کتاب مطالعہ کرنے کے قابل ہے جس میں سائنس کے اُصول، مسائل اور
دیگر معاملات تحقیق سے خوب عالمانہ پیرایہ میں بحث کی گئی ہے - پروفیسر موصوف
نے علوم عقلیہ اور علوم حقایق الاشیا میں خاص امتیاز رکھا ہے - اوّل الذکر
میں طریقۂ امتیاز اور تفریق سے بحث کی جاتی ہے - منطق اور ریاضیات
مع علم شمار و اعداد وغیرہ کے اس طبقہ کے علوم میں شامل ہیں - ان علوم
کی رو سے بال کی کھال اُتاری جاتی ہے - علوم متعلقہ محسوسات میں
حقایق الاشیا سے یعنی جو چیزیں ظاہر ہیں اور موجودات میں شمار ہوتی ہیں،
ان سے بحث ہوتی ہے -

اس طبقہ میں (۱) علوم طبعیہ ہیں - جو اُن مظاہر پر حاوی ہیں جو غیر
ذی روح موجودات کے درمیان واقع ہوتے ہیں (۲) علوم حیات - انکا
تعلق کائنات ذی روح کے ظہورات اور واقعات سے ہے - علوم طبعیہ
معین (Precise) اور غیر معین (Synoptic) یعنی اجمالی اور
تفصیلی میں منقسم ہیں - جوں جوں اوّل الذکر کی ترقی کا میدان کشادہ ہوتا
جاتا ہے آخر الذکر کا دائرہ تنگ ہوجاتا ہے - ہئیات تفصیلی میں میٹرالوجی
(Meteorology) یعنی علم حوادث ارض وسما اجمالی علم ہے -

علوم طبعیہ کی ترتیب حسب ذیل ہے جو صرف موجودات غیر ذی روح
(Inorganic Phenomena) کے ظہورات و حالات سے علاقہ
رکھتے ہیں - اوّل علوم طبعیہ تفصیلی (۱) ایتھری فزکس جو حرارت، روشنی،
برق، اور مقناطیس کے مسائل سے بحث کرتا ہے (ب) طبعیات سالماتی
(Atomic Physics) جس میں اُصولی کیمسٹری اور نشر اسپکٹرم
(Spectrum Analysis) سے بحث ہے - (ج) طبعیات
اتصالی (Molecular Physics) جو لچک، آواز، جر ثقیل، آبی،
مدو جزر، گیسوں کی قوت معروف وغیرہ کے مسائل پر حاوی ہے (د)
طبعیات اجرام (Motor Physics) جو جر ثقیل، کشش سیارگان اور
مسائل ماہتابی سے علاقہ رکھتی ہے - دوم - علوم طبعیات اجمالی میں کیمسٹری
معدنیات، ارضیات، جغرافیہ، علم حوادث ارض وسما، کائنات غیر ذی روح
اور اجرام فلکی کا ارتقا شامل ہیں - علم طبعیہ اجمالی گویا علم طبعی تفصیلی کا ابتدائی
مرحلہ ہے -

علوم حیوٰۃ جو ذی روح اشیا کے حالات اور کوایف سے علاقہ رکھتے
ہیں پروفیسر پیرسن نے ان کی تقسیم اس طرح پر کی ہے :-

اوّل بیالوجی کی ایک شاخ وہ ہے جو جانداروں کے تعلقات
جغرافیائی سے بحث کرتی ہے یعنی ایک خاص نوع کے جانور دنیا کے
کس حصہ میں رہتے ہیں - کورالوجی اور اکالوجی اسی شعبہ میں شامل
ہیں - کورالوجی کا علاقہ جانوروں کے تعلقات جغرافیائی سے ہے اور
اکالوجی کا یہ مقصد ہے کہ وہ اس امر کی تحقیقات کرے کہ کیفیات کا جاندار
کے عادات پر کیا اثر ہوتا ہے - کچھ عرصہ پیشتر اس علم کا اطلاق نیچرل ہسٹری
یعنی تاریخ طبعی کے جزو اعظم پر ہوتا تھا - بیالوجی کا ایک اور شعبہ ہے جو جانداروں
کی نمو اور تغیر طبعی کے واقعات پر حاوی ہے - جانداروں کی زندگی میں جن
باتوں کا اعادہ نہیں ہوتا وہ ارتقا سے علاقہ رکھتی ہیں اور جو آئے دن
واقع ہوتی رہتی ہیں وہ نمو کے ذیل میں شمار ہوتی ہیں - بقول پروفیسر ممدوح
بیالوجی کے تین بڑے طبقے ہیں (۱) ظاہری صورت اور ترکیب طبعی (مارفالوجی)
تشریح - ہسٹالوجی وغیرہ (۲) نمو اور اولاد پیدا کرنے کا کام جو نظریۂ توارث
یعنی مورثی اثر، امبریالوجی، اور نر و مادہ کے تعلقات کی ابتدا و ارتقا سے
متعلقہ مسائل سے بحث کرتا ہے (۳) جانداروں کے حرکات و افعال
جنکا طبعی (فزیالوجی) یا ذہنی پہلو (سائیکالوجی) سے مطالعہ کیا جاتا ہے -
سائیکالوجی کا جو شعبہ انسان کے تمدنی اور معاشرتی معاملات سے بحث کرتا
ہے سوشیالوجی (علم المعاشرت) کہلاتا ہے اور اس کی بڑی بڑی شاخیں
علم الاخلاق، سیاسیات، اقتصادیات، اور قانون ہیں -

پروفیسر پیرسن کی تقسیم و ترتیب علوم کا خلاصہ حسب ذیل ہے: (۱)
علوم عقلیہ: منطق، ریاضیات، علم شمار و اعداد، ریاضیات عملیہ اور نیز وہ علوم

جو عقلی و عملی علوم کے درمیانی پیوند کا کام دیتے ہیں (ب) علوم موجودات
انہیں علوم تفصیلی اور علوم اجمالی شامل ہیں۔ انکا مفصل ذکر پیچھے ہو چکا ہے
(ج) علوم حیواۃ جن میں کورالوجی، اکالوجی، محدود معنی میں علم الحیواۃ، سائیکالوجی
سوشیالوجی، اور تاریخ ہے۔ پروفیسر صاحب نے ایک اور اصطلاح وضع کر کے
اسے ایک علم پر عاید کیا ہے جو طبعیات اور علم الحیواۃ کے درمیان سلسلہ قایم
کرتا ہے اسے بیا فزکس (Bio-Physics) یعنی علم طبعی حیاتی پکارا جاتا ہے

تازہ ترین تقسیم | پروفیسر آرتھر جے۔ ٹامسن ایک نامآور انگریز عالم
ہیں۔ آپ ایڈنبرا میں "نیچرل ہسٹری" کے پروفیسر ہیں۔ آپ نے کئی علمی کتابیں
تصنیف کر کے خاص نام پیدا کیا ہے، اسلئے آپ کی تقسیم علوم قابل غور ہے۔
سب عالموں کی تقسیم اور ترتیب علوم پر غور کرنے کے بعد آپ نے حسب ذیل
طریقہ اختیار کیا ہے۔ اوّل علوم عقلیہ۔ انکا تعلق استدلال و استخراج نتائج تحقیقات
کے عقلی وسائل بہم پہنچانا، اور علمی بیانات و استدلال کی صحت و تکمیل کی
تصدیق کرنا ہے۔

اوّل طبقہ (۱) ریاضیات، جس میں علم شمار و اعداد بھی شامل ہے (ب)
علم مناظرہ (ج) مابعد الطبیعیات۔ دوسرا زمرہ: اس میں علوم تجربیہ شامل
ہیں جو تجربہ کے واقعات و حقایق سے بحث کرتے ہیں اور ان واقعات سے
استخراج نتائج کرنا بھی انھیں میں شامل ہے۔ ان میں پانچ تو ابتدائی علوم
ہیں اور باقی ان سے مخرج ہیں۔ بنیادی علوم یہ ہیں: (۱) سوشیا لوجی
(علم المعاشرت)، (۲) سائیکالوجی (علم النفس)، (۳) بیالوجی (علم الحیات)
(ان تینوں کا علاقہ ذی روح جانداروں کے حالات و واقعات سے بحث
کرنا ہے) (۴) طبعیات (۵) کیمسٹری (ان دونوں کا علاقہ موجودات کے
کوالف سے ہے) سوشیالوجی میں انسان کے تمدنی تعلقات، ان کی ابتدا،
ان کے بتدریج ارتقا اور نظام تمدن سے بحث ہوتی ہے۔ سائیکالوجی انسان
اور حیوانات کی ذاتی و معنوی کردار پر حاوی ہے۔ بیالوجی، انسان اور
حیوانات کے جسم کی بناوٹ، ان کے مختلف اعضا کے افعال، نسل بڑھانے
اور اولاد پیدا کرنے کے مسائل سے واسطہ رکھتی ہے۔ طبعیات قوت کے
مختلف انقلاب قبول کرنے کا علم ہے۔ کیمسٹری اجسام کے اجزائے ترکیبی
کے ارتباط و انتشار، مادہ کے مختلف صورتیں اختیار کرنے اور اجسام کے
ایک دوسرے پر اثر ڈالنے (کشش) سے علاقہ رکھتی ہے۔ بنیادی علوم
کی کئی کئی شاخیں بھی ہیں گویا ان پانچ بنیادی علوم سے اور کئی علوم ماخوذ
ہوئے ہیں۔ مثلاً بیالوجی کے کچے بچے مارفالوجی، فزیالوجی جیالوجی
(امبریالوجی اور پلیانٹالوجی)، اٹیالوجی، علم نباتات، اور علم حیوانات ہیں۔
علوم ترکیبی میں بعض بہت مشکل اور پیچیدہ بھی ہیں جیسے انتھروپولوجی یعنی
علم نسل انسان۔ جیالوجی ترکیبی علم ہے۔ ان کے واسطے اور کئی علوم کی بھی
ضرورت ہے۔ پھر بعض ایسے علوم ہیں جنکا ایک دوسرے سے بہت قریبی
تعلق ہے۔ طبعیات، کیمسٹری، ہیئیات، ارضیات، ایک دوسرے سے کس قدر
قریب قریب ہیں۔ سوشیالوجی کا سیاسیات، تاریخ، جغرافیہ، اقتصادات،
اور علم قانون سے کتنا گہرا رابطہ ہے اور ان کی ترکیب سے علم المعاشرت
پیدا ہوتا ہے۔ علوم عملیہ جس سے ہم اپنے روزمرہ کے کاروبار میں دوچار
ہوتے ہیں، اور جن پر ہمارا آرام و آسائش منحصر ہے حسب ذیل ہیں:۔
سیاسیات، اقتصادات، علم انتظام شہری علم اخلاق، علم تعلیم، یوجنکس
(Eugenics) طب، جنگلات، جہازرانی، انجنیری، فن تعمیر، زراعت
دھاتیں صاف کرنا اور فلزات نکالنا وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ انہیں اور بیسوں
چھوٹے موٹے علوم ہیں جو بنیادی علوم کی بیشمار فروعات ہیں جیسے درخت کا
ایک بڑا تنہ ہوتا ہے، اور تنہ سے کئی بڑی بڑی شاخیں نکلتی ہیں اور پھر ایک شاخ
کی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ بعینہ یہی کیفیت علوم
کی ہے۔

جے۔ آر۔ رائے

میں نے کیا دیکھا

ہجر کی شب شکلِ راحت سے حجاب آنے لگا ❖ بندکیں آنکھیں اگر آنکھوں میں خواب آنے لگا

میں ایک شب عالمِ بالا کے خیال میں تاروں بھری رات کا نظارا کر رہا تھا۔ اگرچہ چمکتے ہوئے تارے چادرِ آسماں میں کچھ بے ترتیبی سے ٹنکے ہوئے نظر آتے تھے مگر اندھیری رات میں اُن کی سہانی روشنی ایک مایوس پژمُردہ دل کے واسطے واقعی ایک خوش کن نظارا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تارا دوسرے تارے کو گھور رہا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کوئی اور آسمانی جرم اُن میں فیصلہ کرا دے۔ آنکھیں تھک کر رہ جاتی تھیں مگر تاروں کی شوخ چشمی کم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ تارے تو گویا ساری رات کی شرط بدکر نکلے تھے۔ مجھ پر رات اجیرن ہوگئی۔ آخر آنکھ لگ گئی خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک وسیع مربع باغ میری آنکھوں کے سامنے ہے عالمِ بالا کی طرح دلفریب دلکش منظر جلد جلد اُس میں بن رہے ہیں۔ اُس کی طرف میں جس قدر غور اور امعان سے دیکھتا ہوں اُسی قدر اُس کی خوبصورتی دلکشی بڑھتی جاتی ہے۔ اُسکے وسط میں سرو کی شکل کا ایک درخت اس قدر لمبا چلا گیا ہے کہ اُس کے قدوقامت کو کوئی دوسرا درخت نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرے تمام درخت اُسکے سامنے کل کے پودے معلوم ہوتے تھے۔ مختلف رنگوں کے جانور چاروں طرف سے آکر اُس پر بیٹھ بیٹھ کر اُڑ جاتے تھے۔ اُن کی بولیاں ایسی خوش آیند اور سُریلی تھیں کہ دنیا کی کوئی آواز

اُن کی حلاوت اور خوبی کو نہیں پہنچ سکتی ؎

جو یادِ مصحفِ رخ میں مرا دل نالے کرتا ہے
وہ کہتے ہیں مزہ دیتا ہے کیا الحانِ قاری کا

پرند اُڑتے اور راگنیاں گاتے گاتے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا ہجوم سرور میں دیوانہ ہو رہے ہیں۔ مختلف جانور درختوں کے سایہ کے نیچے سبز گھاس پر اس خوبصورتی سے بیٹھے تھے جو بیان نہیں ہو سکتی۔ جس قدر عجیب وغریب کرشمے اور خوبیاں ہمیں اپنی دنیا میں نظر آسکتی ہیں وہ سب اس باغ میں موجود تھیں۔ سوائے اسکے کہ میرے سوا انسان اور کوئی نہیں تھا۔ اسی کا مجھے تعجب بھی تھا۔ یا الٰہی! انسانی مخلوق نے کیا گناہ کیا ہے جو نام کو بھی نہیں۔

تفرقہ پرداز بھی کیا آنکھ اُس صیاد کی
مجھ میں اور دل میں سرے پلہ ہے سو سو تیر کا

اگرچہ اس باغ میں ہر ایک طرح کا سامانِ مسرت مہیا کیا گیا تھا اور کسی چیز کی کمی نہ تھی، جس چیز اور جس سماں کا میرے انسانی دل میں خیال آتا تھا وہی چیز اور وہی سماں فوراً موجود ہو جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا چلتا طلسم تھا جسکی تہ کو میں اخیر تک نہیں پہنچ سکا۔ لیکن جب میں کسی انسانی مخلوق کا خیال کرتا تھا تو وہ صورت صورت پذیر نہیں ہوتی تھی یہی چیز اور یہی کمی تھی جو مجھے رہ رہ کر ستاتی تھی اور جس کی وجہ سے میں بے دل ہو کر اس جنت سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔

دل چاہتا تھا کہ کھل کر یہ راز دریافت کروں اور ارد گرد کے پرند چرند سے پوچھوں کہ یہ کیا بات ہے لیکن اجنبیت کی وجہ سے جرارت نہیں کر سکتا تھا ؎

آتا ہے یہ دل میں کہ کروں عرضِ تمنا
لیکن تری تمکین اجازت نہیں دیتی

باوجود اس قدر نظاروں اور خوبیوں کے میرا جی بھر گیا۔ وہ سیری نہیں ہوا بلکہ اُکتا بھی گیا۔ اگرچہ رنگا رنگ خوش گلو جانوروں کی خوش آیند آوازیں انسانی مزامیر سے سو درجہ دلاویز اور دلکش تھیں مگر جب میں اپنے تئیں بغیر کسی اور ابنائے جنس کے تنِ تنہا دیکھتا تھا تو مارے یاس وحزن کے

ساری خوشیاں کرکری ہو جاتی تھیں ؎

ملے درہم داغ و دُرہائے اشک
ہمیں عشق سے یہ تمتع ہوا

عالمِ خواب میں یہ خواہش تھی کہ کہیں نیند آئے اور اس یاس و حزن سے جان چھٹے۔ گو ایک خیال کے ساتھ دوسرا خیال آسکتا ہے لیکن خواب میں خواب نہیں آسکتا۔ یہ ایک مجبوری تھی۔ اگر یہ بھی علم ہوتا کہ میں ایک خواب میں ہوں تب بھی کوئی ڈھارس بندھتی۔ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک بیداری میں باغ کی سیر کر رہا ہوں۔ لیکن یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اپنی مرضی سے نہیں آیا ہوں۔ کوئی مجبوری ہے۔

مجھے خیال تھا کہ میری بولی کوئی نہیں سمجھتا ہوگا مگر میرے اردگرد سب پرند چرند ہی تھے گو کہ اُن کی شکلیں کسی قدر انوکھی تھیں مگر اُن کے جانور ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔ جب میں اس اجنبیت سے بالکل گھبرا گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں ایک یاس کے عالم میں آخر بول اُٹھا کہ بغیر اپنے ابنائے جنس کے یہ تمام دلچسپیاں، خوبیاں، اور لطافتیں ہیچ ہیں۔ گو میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سُنتا ہوں مگر اسکا فائدہ۔ میں یہاں محض اجنبی ہوں ؎

اور سب حسن ان گلوں میں تیرے ہی تھا لیکن نہیں
رنگ لالہ کوں بو نہیں رکھتا چمن تصویر کا

میری دردناک صدائیں ایسی نہ تھیں کہ میرے ہموطنوں تک پہنچتیں پرندوں، چرندوں، اور درندوں کے جھنڈ کے جھنڈ میرے اردگرد جمع ہوگئے۔ ایک عرصہ تک میری طرف تکتے رہے۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ بھی میری حالت اور میری کیفیت سے متاثر ہو رہے ہیں کیونکہ وہ اپنی اپنی جنس میں موجود اور خوش گزران تھے۔ ایک میں ہی اُن میں ایسا تھا جو اپنی جنس سے دُور تھا۔

ایک خوبصورت پرند میری طرف خراماں خراماں بڑھا اور پر پُرزے سنوار کر خوش الحانی سے بولا "میں دیکھتا ہوں کہ تم ہمارے مجمع میں آکر خوش نہیں ہوئے۔ یہ وہ باغ ہے جو باغِ ارم سے بھی فوق رکھتا ہے یا یہ کہیئے کہ یہی باغِ ارم ہے۔ تم دیکھتے ہو تمہاری دنیا میں شروع سے لیکر اخیر تک اسکی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ تمہاری آنکھوں نے کیا کسی انسان کی آنکھ نے بھی ایسا باغ نہ دیکھا ہوگا اور اسکی خوبصورتی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس پر خدانخواستہ حضرتِ انسان کی نظر نہیں پڑی۔ انسان کی نگاہوں میں ایک زہریلی تاثیر ہے جس میں شر اور فساد بھرا ہوا ہے۔ خدا کی شکرگذاری میں انسان ناکامل ثابت ہوا ہے اور اسی وجہ سے اُسکے ساتھ ناگفتہ بہ نحوستیں اور مصیبتیں لگائی گئی ہیں۔ خداوند کریم نے انسان پر جس قدر احسانات کیئے ہیں اُن کا معاوضہ جو اُس نے دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ قدرت اُس کا اعتراف کرے۔ ہم پرند چرند باوجودیکہ انسانوں سے کئی درجہ کم ہیں، اپنی زندگی اس شکرگذاری کے ساتھ گزارتے ہیں کہ خود قدرت اُسکا اعتراف کرتی ہے۔"

میں اس ننھے سے جانور کی ان باتوں سے بالکل حیران رہ گیا اور دل ہی دل میں خیال کرنے لگا کہ اللہ میاں نے یہ بھی ایک مخلوق بنائی ہے جو انسان کو ناشکرا قرار دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتی اور اپنی حالت پر ایسی صابر و شاکر اور شاداں ہے کہ انسان کو ایسا سماں کبھی خواب میں بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا ہوگا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔

میں - اے ننھی سی مخلوق! کیا یہ خیالات تیرے ہیں یا تیرے ابنائے جنس کے؟ یہ تو تسلیم ہے کہ تم جس خطہ اور جس باغ میں رنگ رلیاں مناتے اور رہتے ہو اُس کی نظیر ہماری دنیا میں نہیں ملتی اور ہماری آنکھیں ان چیزوں اور ان شگفتگیوں سے ناآشنا ہیں لیکن پھر بھی قدرت نے انسان کا جو درجہ بنایا ہے اُس تک کوئی دوسری مخلوق کب پہنچ سکتی ہے۔ اگرچہ ہم میں نقص اور کمزوریاں بھی ہوں مگر دوسری مخلوق کی کیا سکت اور کیا مجال کہ دعوئ ہم سری کرسکے ؎

یہ کیا طاقت کہ اب بھی محتسب پامال کر ڈالے
ملا تو خاک میں پر ہے وہی توقیر شیشہ کی

پرند - ہماری کیا مجال کہ ہم انسانی مخلوق کا مقابلہ کریں - خدا نے انسان کو جو فضیلت اور جو رتبہ و شرف بخشا ہے وہ صرف اُسی کا حصہ بجز ہمارا تو کیا اور گروہوں سے بھی وہ بازی لے گیا - لیکن تم ہی اپنے دل میں انصاف کرو کہ کیا انسان نے اپنے اس اعزاز اور امتیاز کی کوئی قدر و منزلت بھی کی ہے ؟ رہنے دو اُن چند نفوس مقدسہ کا ذکر جو تم میں سے دستار فضیلت باندھ چلے ہیں - ذکر کرو اُس جم غفیر کا جو اُن کے سوا ہے تم خود اپنے دل پر ہاتھ رکھکر دیکھو کہ کس قدر الجھنوں میں گرفتار ہو - تمہاری زندگی جس کش مکش میں گذرتی ہے اُس کا مقابلہ کوئی دوسری مصیبت نہیں کر سکتی ہے - شب و روز مختلف بکھیڑوں میں تمہاری زندگی وقت گزار رہی ہے کبھی کچھ کیفیت ہوتی ہے کبھی کچھ - کسی پہلو قرار ہی نہیں -

نہ آبادی میں جی بہلا نہ گلشن کی ہوا بھائی
کیا آخر توطن آ کر ہم نے دشت مجنوں میں

میں - پرندو ! یہ تو بتلاؤ تمھیں ہماری اس کش مکش کا حال کیونکر معلوم ہوا ؟ تم ہماری صحبت میں کب آئے اور تمھیں یہ موقعہ کیونکر ملا ؟ چہ نسبت حضرتِ انساں بہ حیواں -

پرند - پیارے انسان ! گو ہم تمہاری نگاہوں میں ایک ناچیز سی مخلوق ہیں مگر تمھیں یہ باور کر لینا چاہیئے کہ ہم بھی اُس مقدس ہاتھ کی کاریگری اور صنعت ہیں جس کی تم ہو - ہم میں اور تم میں ایک نسبت وحدت رکھی گئی ہے - تمام مخلوق مختلف درجوں میں سارنگی کے تاروں کی طرح ایک ہی آواز نکالتی ہے - سارنگی میں کتنے ہی تار ہوتے ہیں مگر آواز ایک ہی ہوتی ہے - تماشا کرو اس سماں کا - کیا تم کہہ سکتے ہو کہ ہم اور تم جدا ہیں ؟ جب اس قدر رشتہ اور وابستگی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم انسانوں کی حالت سے آشنا نہ ہوں - ور مخفی [illegible] نداں خبرے نیست کہ نیست -

میں - ہم تو تمہارے حالات سے بہت ہی کم واقفیت رکھتے ہیں - ہم نہ تمہاری بولی سمجھیں اور نہ تمہارے اشاروں کنایوں سے واقف ہوں تو تم کس طرح آشنا ہو ؟

پرند - سمجھنے والے تم میں سے بھی سمجھتے ہیں - خدا کی مخلوق خدا کی کائنات کا مشاہدہ کرنا ہی ہمیں سمجھنا ہے - انسان اگر ہمیں سمجھنے کی کوشش کرے تو گویا عبادت کا ایک بہت بڑا حصہ پورا کرے - ہم اگرچہ انسان کا جزو نہیں ہیں لیکن اُس کی ہستی اور اُسکے صانع سے ایک خاصہ تعلق رکھتے ہیں - ہم میں بھی صانع کی حکمت مستتر ہے اور ہم بھی اُسکی ذات پر شاہد ہیں - فلسفی بہت دُور چلا جاتا ہے اور خالی ہاتھ واپس آتا ہے اگر ہماری چھان بین کرے تو اُسکے واسطے بہت کچھ مصالح بہم پہنچ سکتا ہے اور ایک ایسا خوش آیند نظارہ جس کی دنیا بھر میں نظیر نہیں -

آتا نہ غش سے حضرت موسیٰ کو ہوش پھر
نظارہ تمام جو ہوتا جمال کا

میں - ہم تو سمجھتے ہیں کہ شاید تمہاری کوئی بولی ہی نہیں محض اشاروں ہی سے تم گفتگو کرتے ہو -

پرند - یہ کس طرح سمجھ لیا کہ ہماری کوئی بولی ہی نہیں - ہم بھی تمہاری ہی طرح بولتے چالتے ہیں - جس طرح تمھیں ہماری بولیاں غوغو - غوغو معلوم ہوتی ہیں اسی طرح ہم تمہاری بولیوں کی تاویل کرتے ہیں جب تم بھی کسی دوسرے ملک کی بولی سُنتے ہو تو فوراً ہی نہیں سمجھ لیتے - کوشش کرکے سمجھتے اور بولتے ہو - یہی حال اور یہی کیفیت ہماری بولیوں کی بھی ہے - تمہاری مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے - پروفیسر گارنر نے کوشش سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ بندروں کی بولی صرف بیس لفظوں سے مرکب ہے - پروفیسر موصوف بندروں کی بولی کچھ کچھ سمجھ بھی سکتا ہے - اسی طرح اور حیوانات کی بھی بولیاں اور اُن کے الفاظ ہیں جب میاں مٹھو تمہاری بولی بول سکتا

ہے تو کیا وجہ ہے کہ تم ہماری بولیاں نہ بول سکو یا نہ سمجھ سکو۔ میاں مٹھو سے بھی گئے گذرے تمہاری فضیلت کا سوال تو حل ہو گیا کہ تم باوجود اس فضیلت کے بھی ہماری بولیاں نہ بول سکتے ہو اور نہ سمجھ سکتے ہو لیکن ہم ہی میں سے میاں مٹھو بول اور سمجھ سکتا ہے۔

میں۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں تم پر برتری اور فضیلت ہے۔

پرند۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ مگر بے ادبی معاف قبلہ! یہ اچھی فضیلت ہے کہ وہ کمزوریاں اور وہ برائیاں جو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آتی ہیں آپ ہی کی بدولت تمہاری دنیا میں چکر لگا رہی ہیں کذب بہتان فریب و مکر چوری چکاری وغیرہ وغیرہ آپ ہی کی دنیا سے نکلی ہیں۔ حسنات بھی ہیں لیکن خرابات کی بھی کمی نہیں یہاں تک کہ ہم غریب بھی آٹے کے ساتھ گھن ہو گئے۔

میں۔ کیا تم میں بری روحیں نہیں ہیں۔ دیکھو کوا کیسا شریر جانور ہے لومڑی کیسی فریبن ہے۔ شیر اور بھیڑئے خونخوار جانور ہیں۔ ہم میں سے بھی کچھ ایسے نکل آتے ہیں۔

پرند۔ گستاخی معاف! میں تو یہ کہونگا کہ یہ سب کچھ آپ ہی کی بدولت ہے۔ کوا اگر آپ لوگوں کی صحبت میں نہ رہتا تو بدنام کیوں ہوتا

جنوں سے کچھ ایسا تغیر رہا
جب آئینہ دیکھا تحیر رہا

میں۔ کیا شیر اور بھیڑئے نے بھی ہم ہی سے یہ تعلیم پائی ہے؟

پرند۔ پھر انھیں کون اچھا کہتا ہے۔ مگر فرق بھی ہے۔ شیر اور بھیڑئے کا جب ایک مار یا ایک شکار سے پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر وار نہیں کرتا۔ بھوک ہی وار کراتی ہے۔ خلاف اسکے انسان باوجود سیر ہونے کے بھی خود غرضی کا شکار بنا رہتا ہے۔ اخیر عمر تک حرص و آز اسکا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

بحثِ نالہ رہی مرغانِ چمن سے کیا کیا
اے صبا پر نہ بخارِ دلِ نالاں نکلا

میں۔ تیری گفتگو میں بہت کچھ صداقت ہے لیکن اس سے ہماری فضیلت میں کیا بٹہ لگ سکتا ہے۔ یہ ایک قدرتی عطیہ ہے۔

پرند۔ اس میں کلام ہی کیا۔ لیکن آپ انسان ہیں۔ انسانیت اور حیوانیت میں ایک ہی درجہ کا فرق نہیں بہت کچھ فرق ہے۔ آپ علیہ السلام بابا آدم کی نسل سے ہیں اور ہمیں اپنے مورث کا پتہ ہی نہیں گو مسٹر ڈاردن نے ہم سے بھی یہ سلسلہ ملایا ہے مگر پھر بھی آدم مقدم ہے۔ ایسی مستند نسل غلطیاں کرے تو شرم کی بات ہے۔ خیر ایک سہولت ہے۔ جو کوئی غلطی کرتا ہے تقدیر کے ذمہ تھوپ دیتا ہے گویا انسان کی تمام لغزشوں کا جواب دہ نعوذ باللہ خود خدا ہے۔

نہ پوچھو خوب ہے بدعہدیوں کی مشق اسکو
ہزاروں عہد کئے پر وہی تخلف تھا

میں۔ باوجود اس تخلف اور انحراف کے بھی ہم جس قدر اطاعت اور عبادت کرتے ہیں وہ اور کون کرتا ہے۔

پرند۔ یہ خوب کہی عبادت تو پتھر، جمادات، کنکر، روڑے بھی کرتے ہیں۔ پانی تسبیح و اذکار میں ہیں۔ آگ سجدہ میں ہے۔ پہاڑ سرنگوں ہیں چٹانیں رو رہی ہیں۔ لق و دق جنگل دعا مانگ رہے ہیں۔ ہر مخلوق خدا کے خوف سے سربسجود اور لرزاں ہے۔ انسان کے سوائے اور کون خدا سے انکار کرتا ہے؟ اور کون دہریہ ہے؟ اور کون فلسفہ اور سائنس کے زور پر خدائی کاموں کی اتفاقات سے تعبیر کرتا ہے؟ یہ حضرتِ انسان ہی کا حوصلہ ہے کہ باوجود ان الطافِ صمدی اور اکرام سرمدی کے اُسکے مقابلہ میں کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی ہیچ ہستی کے گھمنڈ پر خدائی ہستی کو فراموش کر دیتا ہے۔ فرعون ہم میں سے نہیں ہوا۔ شداد ہماری جماعت کا اہم عنصر نہ تھا۔ بریڈلا کی روح ہم میں سے نہیں اُٹھی تھی۔ ہکسلے ہماری ذریات میں سے نہیں تھا۔ یورپ کے پرندے دہریت کے بانی نہیں ہیں بلکہ یورپ کی انسانی ذریات شرم شرم۔

تم سے تدوین ہوئی عشق و محبت کی کمال
اس سے پہلے کوئی اس علم میں تصنیف نہ تھی

میں - (شرم و خجالت سے) بیشک یہ بدعہدی ہم ہی سے شروع ہوئی ہے ہم ہی اس لغزش کے ذمہ دار ہیں۔

پرند - جس شکش میں تمہاری زندگی گذرتی ہے صرف تم ہی اُس کے ذمہ دار ہو - خواہ مخواہ اس قدر بوجھ اُٹھا لیا کہ اب نہ چھوڑتے بنتی ہے نہ اُٹھاتے - جس تہذیب کا تمہاری منڈلیوں میں رات دن شور رہتا ہے وہ سوائے اسکے اور کیا ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کو سادگی سے ہٹا کر چند در چند پیچیدگیوں میں ڈال لیا ہے - سب دکھاوے کی باتیں ہیں - دل میں کچھ کا کچھ منصوبہ ہوتا ہے اور بظاہر تہذیب کی کاپی ہاتھ میں ہوتی ہے -

اِدھر جلن ہے اُدھر غم سے جوشِ رقّت ہے
تضاد دیدہ و دل میں ہے آگ پانی کا

میں - اگر ہم بھی تمہارے حالات سے واقف ہوں تو اس قسم کی سرگزشتیں بیان کر سکیں - ممکن ہے کہ تم میں بھی ایسی ہی لغزشیں ہوں -

پرند - عیب اور لغزش سے کوئی خالی نہیں مگر خدا نہ کرے کہ انسانی لغزشیں ہم میں نشو و نما پائیں - انسان میں جتنی فراست زیادہ ہے اُتنی ہی بغاوت بھی زیادہ ہے - دیکھو انسان بڑھ بڑھا کر کتنے منصوبے باندھتا ہے - سائنس نے تمہاری انسانی دنیا کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچایا جس قدر نقصان پہنچایا ہے - تم اپنے بزرگوں کو کبھی کبھی یہ کہکر بدنام کرتے ہو کہ وہ آپس میں لڑتے بھڑتے تھے اور دنیا کے اکثر حصوں میں طوائف الملوکی تھی مگر سوچو کہ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے - کوئی دن دور بھی اگر یہی حالت رہی تو انسان کو جینا دوبھر ہو جائے گا -

یوں ہی ہوگا جو ہجوم نگہہ شتاقاں
دیکھنا بند کسی دن درِ جاناں ہوگا

میں - ہر چیز کے دو ہی رُخ ہوتے ہیں بُرا اور بھلا -

پرند - ہوتے دو ہی ہیں لیکن پھر ہمیں حیوان کہکر جی خوش کر لینا اور خود تہذیب کے زور شور میں ایک دوسرے کی جان لینا کونسی فراست ہے - خدا کرے انسانوں میں کوئی بدقسمت فلاکت زدہ نہ ہو - جو کمزور ہوا تہذیب نے ہڑپ کر لیا - انسانیت غالب آگئی - آدمیت سر پہ سوار ہوگئی ہماری کیا طاقت کہ ہم ایسی انسانیت ایسی تہذیب ایسی آدمیت ایسی عقل و فراست اور ایسی دانش و بینش کا مقابلہ کر سکیں -

کریں مقابلہ انسان کا مسایل میں
کھروں کے سامنے کب کھوٹے دام چلتے ہیں

میں - دیکھو پھر بھی ہم تم سے گھاٹے میں نہیں - یوم نشور میں تمہاری ہستی کہاں ہوگی - ہمیں ہی حشر اجساد یا حشرِ ارواح کا فخر نصیب ہوگا - یہ تھوڑی بات ہے ! ہمیں فنا نہیں اور تمھیں بقا نہیں !

پرند - اس بقا کی خوب کہی -

موسم عیش کو دنیا میں نہیں کچھ وقفہ
کم ہے یاں برق کی چمک سے بقا ساون کی

ہم فنا اور بقا کے جھگڑوں سے آزاد ہیں - تمہاری بقا اور فنا کا یہ اثر ہے کہ ایک مذہب والا دوسرے مذہب والے سے ہاتھا پائی کر رہا ہے بہشت دوزخ نرک سورگ کے مناقشوں میں انسانیت کا خاتمہ ہوا جاتا ہے حشر اجساد یا حشر ارواح سے پہلے تمہارا اپنا ہی حشر ہو رہا ہے - تمہاری بھی کیا اچھی ہستی ہے - اس ہستی پر بھی کوئی اترا سکتا ہے !

جب کوئی کہتا ہے ہستی کو کہ ہستی خوب ہے
اُسکی غفلت پر فنا اُس وقت ہنستی خوب ہے

میں - کیا تمھیں یقین نہیں کہ انسان دیگر مخلوق سے افضل ہے اور کیا انسان کا یہ خیال محض خیال ہی خیال ہے ؟

پرند - کوئی شخص موتی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ موتی نہیں ہے - لیکن اگر

موتی بدقسمتی سے گندگی میں پڑا ہو تو یہ کون کہہ سکے گا کہ وہ گندگی میں نہیں پڑا ہوا ہے۔ انسان بیشک اشرف اور افضل ہے۔ لیکن ناشکرگزاری کی گندگی میں پڑا ہوا ہے۔ جب قدرت نے ہمارے واسطے اپنے فیاض ہاتھوں سے ایسا سندر اور خوبصورت باغ تیار کیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان کے لئے مختلف نعمات نہ ہوں۔

میرے پیارے اور محترم انسان! خفا نہ ہونا۔ تم بڑے ناشکرے ہو تم میں خلوص اور محبت نہیں۔ تمہاری خودغرضیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اب تمہارا ایمان اور دھرم صرف دولت اور ثروت ہے۔ تمہارے بزرگوں کی یہ کیفیت نہ تھی بلکہ اُن میں خلوص اور سچی انسانیت تھی۔ اب تم آسایش ذاتی کے بندے یا غلام ہو۔ اب مفلس اور غریب کا کام نہیں کہ تم میں رہ سکے جس طرح وہ بیل کاشتکار کے پاس نہیں رہ سکتا جس سے جتائی ہو سکے اسی طرح اس زمانہ میں وہ انسان زندہ نہیں رہ سکتا جو روزی کمانے کے قابل نہ ہو۔ تمہارے بزرگ اور اسلاف مشترکہ خاندانوں کی پرورش کرتے تھے۔ اب اُصول تمدن اور قوانین اکونمی کے اعتبار سے ایسا کرنا بیوقوفی ہے

کیا ہو ہم رندوں کے آگے شیشہ گردوں کی قدر
گر گیا نظروں سے جب خالی قرابہ ہو گیا

میں۔ ننھے پرندہ! انسانی زندگی کی ضرورتیں بڑھ گئی ہیں اسواسطے ایسے خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ یہ رَو کس طرح رُک سکتی ہے۔

پرندہ۔ اچھی ترقی کی اور اچھا نشوونما پایا۔ اس سے تو وہ تنزل ہی خوب تھا۔ دراصل سادہ زندگی انسان کے واسطے ایک برکت تھی اور وہی صادق انسانیت کا ایک صحیح نشان بھی تھی۔ جب سے وہ رخصت ہوئی آفات اور بلیات کا تہذیب کے لباس میں زور ہو گیا۔ یہ رَو گو چند صدیوں تک نہ رُکے لیکن تاریخ ہمیشہ خود کو دُہراتی ہے۔ جب انسان ترقی کے مدارج اقصا تک پہنچ جاتا ہے تو پھر تنزل کی طرف آنا شروع ہوتا ہے۔ جہاں جہاں اس زمانہ میں تہذیب فل سپیڈ میں ہے وہاں خال خال اب اسکے آثار پائے جانے لگے ہیں۔ پہلا زینہ اسکا خودغرضی ہوتی ہے سو اس کی مہذب ممالک میں کمی نہیں۔

میں۔ خودغرضی کب نہ تھی؟ کیا وحشیوں میں خودغرضی نہیں؟ ایک جانور دوسرے جانور کو کب دانہ چگنے دیتا ہے؟

پرندہ۔ ہم تو ہوئے وحشی، ہمارا ذکر ہی کیا؟ جانوروں کو کون الزام دیتا ہے ذکر تو انسانوں کا ہے۔ چشم بد دور۔ تم تو انسان ہو۔

میں۔ اب میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اس قدر خوش کیوں رہتے ہو حالانکہ ہماری طرح تم ذرایع زندگی بھی نہیں رکھتے ہو؟

پرندہ۔ مہربان! ہم قدرت اور خدا کے شکرگذار ہیں۔ ہم میں حسد اور بغض اُس حد تک نہیں جو ہماری زندگی کو تمہاری طرح کشمکش میں ڈال سکے۔ تم یقین جانو تمہاری نسبت ہم میں محبت اور خلوص زیادہ ہے اور ہماری خودغرضی تمہاری خودغرضی سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ تمہاری زندگیاں ہماری زندگیوں کی نسبت لاکھ کشمکش میں گزرتی ہیں۔

ایک تم اور لاکھ غمزہ و ناز   بزم میں چپقلش بلا کی ہے

میں۔ پرندہ! میں چاہتا ہوں کہ تیری پیاری پیاری باتیں اپنے ابنائے جنس کے گوش گزار کروں شاید کہ ہماری زندگیاں بھی آشتی اور محبت سے گزریں اور ہم بھی تمہاری طرح رنگ رلیاں منائیں۔

پرندہ۔ خدائے کریم سے دعا ہے کہ تم انسانیت کے وارث بنو اور تم میں انسانیت کا بول بالا ہو۔ محبت تمہاری کھیتی ہو اور خلوص تمہاری چراگاہ۔ تمہاری زبانیں خدا کی حمد و ثنا سے صبح و شام بھرپور رہیں اور تمہارے دلوں میں خدا کی عظمت کا جوش موج زن ہو۔ خدا کا قانون انسان کے حق میں بہت کچھ فیاض ہے لیکن انسان شکرگزاری کے ساتھ اُس کا خیر مقدم نہیں کرتا۔ اچھا رخصت۔ خدائے مہربان تمہارے ساتھ ہو!۔

اُمید ناخدا کی کہاں بحرِ عشق میں   شانِ خدا کی اس تباہی میں ملی

سلطان احمد

سیتا جی اور سرما

انڈین پریس الہ آباد

نظارۂ بہشت و دوزخ

ڈانٹی (سنہ ۱۲۶۵ء لغایت سنہ ۱۳۲۱ء) کے نقطۂ خیال سے

اٹلی کے مشہور و معروف شاعر ڈانٹی نے دنیا کے لئے جو دو عظیم الشان عطیات اپنے پیچھے چھوڑے ہیں، وہ اس کے اشعار کی موسیقی اور مذہبی خیالات کا عمق ہیں۔ ان دونوں باتوں کے علاوہ اس کے کلام کی دلچسپی کا ایک اور بھی باعث ہے، اور وہ یہ کہ اس سے اُس زمانہ کی معاشرت و خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنی مشہور و معروف نظم زمزمۂ الٓہی میں ہمیں سارے عالم کے اندر ایک حیرت خیز سفر کراتا ہے۔ کہیں تو وہ ہمیں زمین کے اندر لے جاتا ہے، کہیں بالائی کرۂ ہوا میں پہنچاتا ہے، اور کہیں عالمِ سیارگان سے بھی پرے لے جاتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تیرھویں صدی میں جبکہ ڈانٹی اس دنیا میں موجود تھا، وسعتِ عالم کے متعلق یورپ کا وہ خیال نہ تھا جو آج بیسویں صدی میں ہے۔ امریکہ اور آسٹریلیا کے عظیم الشان براعظم اس وقت تک دور و دراز سمندروں میں کولمبس اور کک کے جہازوں کی آمد کے منتظر تھے۔ لاکھوں ستارے ابھی باقی تھے جن کو گلیلیو کی دوربین کی مدد سے نہیں دیکھا جا چکا تھا نیز زمین کا جو صحیح تعلق آفتاب اور سیاروں سے ہے، اُسے اسوقت تک کوپرنیکس، کیپلر، اور نیوٹن نے دریافت نہ کیا تھا۔ بایں ہمہ ہومر کے زمانہ کی بہ نسبت اُس زمانہ میں، ارضی و سماوی علوم میں بہت کچھ ترقی ہو چکی تھی۔ ہومر کے دنوں میں زمین کی نسبت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ایک چھوٹی اور چپٹی طشتری کی مانند سطحِ آب پر تیر رہی ہے، اور آسمان ایک نیلا خیمہ ہے جو زمین کے اوپر چھایا ہوا ہے اور افق میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت کے بڑے بڑے جغرافیہ دانوں اور ماہرین علم ہیئت نے جو دریافتیں کی تھیں ان کا خلاصہ سنہ ۱۴۰ء کے قریب اسکندریہ کے مشہور و معروف مصری منجم بطلیموس نے اپنی کتابوں میں پیش کیا ہے۔ تاریک زمانہ میں یہ کتابیں اہل یورپ کے لئے ناپید ہو چکی تھیں، لیکن ایشیا کے بعض حصوں میں ان کے مسودات موجود تھے، جو آخر کار خلفائے بغداد کے عہد میں پھر دنیا کے روبرو پیش کئے گئے۔ اس کے بعد گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں یونانی لٹریچر پھر ایک مرتبہ ایشیا سے یورپ میں پہنچا، اور بطلیموس نے جو خیال وسعتِ عالم کے متعلق ظاہر کیا تھا، وہی کسی قدر ترمیم کے ساتھ جو عربوں اور مسیحیوں کے ہاتھوں اس میں ہو چکی تھی، صحیح تسلیم کیا گیا اور اُسی کی تلقین کی جانے لگی۔

مختصر طور پر اس زمانہ میں وسعت عالم کا اندازہ حسب ذیل تھا:-

دُنیا ایک بہت بڑا کُرہ سمجھی جاتی تھی، اور اس کی جسامت اُس زمانہ میں بھی قریب قریب اتنی ہی تصور کی جاتی تھی، جتنی اب ہے۔ اُس زمانہ کے لوگ خیال کرتے تھے کہ اسکا صرف چوتھائی حصہ آباد ہے۔ تمام جنوبی اور نصف شمالی کُرہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے خشکی کو ممالک ذیل پر مشتمل خیال کیا جاتا تھا، یورپ، ایشیا، اور شمالی افریقہ۔ خشکی کی مغربی حد جبل طارق اور مشرقی حد دہانۂ گنگا تصور کی جاتی تھی، اور یروشلیم کو اس قطعہ کے عین وسط میں واقع خیال کیا جاتا تھا۔

ڈانٹی کے زمانہ کے بعض نقشوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باغِ عدن دہانۂ گنگا سے بھی پرے مشرق میں واقع ہے، لیکن چونکہ بیچ میں بہت بڑا سمندر حائل ہے اسلئے اُس تک پہنچنا ناممکن ہے۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ طارطارش، جہاں مُردوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں، زمین کے اندر ہے، اور اسی خیال کی بنا پر بعض مسیحی مفسرین نے دوزخ کو زمین کے اندر قایم کیا۔

یونانی فیلسوفوں نے عرصۂ دراز کے مشاہدہ اور غور و خوض کے بعد جو نتائج حاصل کئے، وہ یہ تھے، کہ زمین مع سمندر عالم کے مرکز میں بحالت سکون واقع ہے، اور اسکے ہر طرف ہوا اور اوپر تمام اطراف میں کرۂ نار ہے جس طرح

تمام بھاری چیزیں زمین کے مرکز کی طرف، جو تمام عالم کا مرکز ہے، گرتی ہیں اُسی طرح شعلے اور تمام ہلکی اشیا، اس کرۂ نار کی طرف اُٹھنے کا رجحان رکھتی ہیں؛ گویا اس امر میں وہ قانون قدرت سے مجبور ہیں۔ لیکن اجرام فلکی، جو نہ ہلکے ہیں نہ بھاری، وہ گرنے یا اُٹھنے کے بجائے مرکز عالم کے گرد دوامی طور پر گول دائروں میں گھومتے ہیں۔ ایک فریق کا قول تھا کہ ستارے نہیں بلکہ زمین گھومتی ہے۔ بعض دوسرے فریق کچھ اور ہی رائے رکھتے تھے؛ لیکن وہ سب غیر تشفی بخش یا حد سے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ستاروں کی جو حرکات ظاہر میں نظر آتی ہیں، اُن کی تشریح اس طرح پر کی جاتی تھی کہ وہ ایک بہت بڑے کھوکھلے طبقہ پر جڑے ہوئے ہیں، جو زمین کے گرد محیط ہے، اور دن رات میں صرف ایک دفعہ وقت معینہ پر گردش کرتا ہے۔ لیکن سورج، چاند، اور وہ پانچوں سیارے جو ننگی آنکھ کو نظر نہیں آتے، اس میں جڑے ہوئے خیال نہ کئے جاتے تھے۔ ان کے متعلق خیال تھا کہ یہ ہم سے مختلف فاصلوں پر ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی حرکات مخصوص ہیں۔ اسی بنا پر سورج، چاند، عطارد، مریخ، مشتری، زحل، اور زہرا، کو سیارے کہا جاتا تھا۔ بطلیموس نے ان کی پیچیدہ حرکات کی تشریح اس طرح پر کی ہے کہ ان کے اپنے جدا گانہ طبقات ہیں، جو شفاف ہونے کے علاوہ عالم سیارگان کے اندر واقع ہیں اور ہاتھی دانت کے چینی کھلونوں کی طرح ایک دوسرے کے اندر لپٹے ہوئے ہیں۔ چھوٹے طبقات کی نسبت خیال تھا کہ وہ بڑے طبقات پر جڑے ہوئے ہیں، اور جو حرکات مشاہدہ میں آتی تھیں اُن کے مطابق اس سارے نظام کو، از روئے علم ریاضی بڑی صحت کے ساتھ ثابت کیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بطلیموس نے ان طبقات کو محض قیاس کے طور پر قایم کیا تھا، تاہم عرب انھیں ایک مادی شے خیال کرتے تھے، اور انکا عقیدہ تھا کہ وہ اُسی سماوی ایتھر کے بنے ہیں جس سے ستارے بنے ہیں۔

سب سے چھوٹا اور زمین سے قریبی طبقہ چاند کا تصور کیا جاتا تھا، اور اسکی جسامت اور اس کا فاصلہ اُس زمانہ کے ماہرین کو معلوم تھا۔ فاصلہ و جسامت کی زیادتی کے اعتبار سے باقی سیاروں کی ترتیب حسب ذیل تھی:-

(۱) عطارد (۲) زہرا (۳) سورج (۴) مشتری (۵) زحل۔

زحل کے طبقہ کے بعد قایم ستاروں کا طبقہ بہت بڑے فاصلہ پر تصور کیا جاتا تھا۔ یہ فاصلہ ہر چند کہ عظیم تھا تاہم نا قابل پیمایش نہ تھا۔ عربوں نے غلط دلائل کے ذریعہ سے، اس فاصلہ کو زمین کے قطر سے دس ہزار گنا بڑا سمجھ رکھا تھا۔ ان سب کے اوپر ایک اور عظیم الشان طبقہ کا وجود خیال کیا جاتا تھا۔ ہر چند کہ اُس پر کوئی ستارہ یا سیارہ واقع نہ تھا، تاہم ان کے نزدیک وہ عظیم الشان سُرعت سے گھومتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تمام اندرونی طبقے بھی گھومتے تھے، اور اس طرح پر سارے آسمانی طبقات کی گردش عمل میں آتی تھی۔

اس طرح پر گویا ۹ بڑے طبقات کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان میں سے سات طبقے سات مختلف سیاروں کے، ایک طبقہ قایم ستاروں کا، اور ایک ان سب پر حاوی خیال کیا جاتا تھا۔ مسیحی خیال کے مطابق ان سب کے علاوہ ایک اور آسمان ہے جو نہ تو خود کسی کے اندر ہے اور نہ کوئی اور اُس کے اندر ہے۔ وہ آسمان خدا، اور برکت یاب روحوں، کا مسکن ہے۔

ان ۹ متحرک طبقات کی نسبت خیال تھا کہ ان پر روحیں حکمراں ہیں۔ اُن روحوں کو یونانی فیلسوف فہم (Intelligences) کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے۔ اور مسیحی انھیں اُن فرشتوں کی ۹ سلطنتیں تسلیم کرتے تھے، جن کے وجود کی تلقین عقیدۂ کیتھولک کی رو سے کی جاتی ہے۔ صرف زمین کو عالم کا ایسا حصہ سمجھا جاتا تھا جس پر انسان آباد ہیں، اور جس میں تبدیلی و زوال واقع ہو سکتا ہے۔ اجرام فلکی، اور ان کے طبقات، میں تبدیلی و زوال واقع نہیں ہوتا، اور قادر مطلق ان کی حرکات سے لوگوں کی قسمتوں کو باقاعدہ بناتا ہے۔ مرنے کے بعد گنہگار انسانی روحیں زمین کے نیچے، دوزخ میں، تکالیف برداشت کرتی ہیں اور نیک روحیں آسمان پر جا کر ابدی راحت پاتی ہیں۔

غرض قرون وسطیٰ میں وسعتِ عالم کے متعلق تعلیم یافتہ لوگوں کے اندر یہ خیالات پائے جاتے تھے اور جیسا کہ ہم ڈانٹی کی تحریروں سے معلوم کر سکتے ہیں یہی خیال اُس کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ لیکن اپنی نظم میں اُس نے اس زمانہ کے خیالات سے ایک خاص اختلاف کیا ہے کیونکہ وہ اپنے ناظرین کو بتاتا ہے کہ اعراف زمین کے اندر دوزخ کے قریب واقع نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑے بلند پہاڑ پر یروشلم کے عین مقابل کی سمت میں سمندر کے اندر موجود ہے اور اس پہاڑ کی بالائی چوٹی پر باغ عدن جہاں حضرت آدم و حوا رکھے گئے تھے، واقع ہے۔ اس طرح پر وہ نہ صرف دوزخ، اعراف اور بہشت (باغِ عدن) کے محلِ وقوع میں اختلاف رائے ظاہر کرتا ہے بلکہ اس کے بیان سے مادی اور روحانی دنیا کے تعلقات بھی زیادہ قریب ثابت ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اسکی نظم اول سے آخر تک ذو معنی ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ موت کے بعد روحوں کی حالت بیان کرتا ہے اور دوسری طرف اسکے ساتھ ہی کنایۃً اُس روح کی حالت کا اظہار بھی کرتا جاتا ہے جو گناہ اور توبہ کے مدارج سے گزر کر تقدیس کے درجہ تک پہنچتی ہو۔

شاید اس بات کا بہترین ثبوت کہ قرون وسطیٰ میں وسعت عالم کے متعلق جو خیال تھا، اسکی تشریح ڈانٹی کی تحریروں سے کہانتک ہو سکتی ہے اور کیونکر وہ اسے روحانی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کے لئے کام میں لاتا ہے اس طرح پر مل سکیگا کہ اس نقطۂ خیال سے اُس کے مفروضہ سفر کی داستان بالاختصار بیان کر دی جائے۔

مذکورہ نظم (Divina Comedia) کے افتتاحی سین میں شاعر کی اُس تکلیف کا خاکہ کھینچا گیا ہے جو وہ خود کو ایک تاریک، ویران، اور خوفناک جنگل میں پاکر محسوس کرتا ہے۔ وہ اس جنگل سے نکلنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر تین خوفناک جنگلی جانور اُس کے راستہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اس وقت بیٹریس (Beatrice) یعنی وہ عورت جس سے اس دنیا میں اسکی محبت پرستش کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی اور جسکی بے وقت موت پر وہ یہانتک رویا تھا کہ کچھ عرصہ کے لئے اُسے باقی ہر بات فراموش ہو گئی تھی، بہشتی آسمان سے اُسکی طرف دیکھتی ہے اور اپنے عاشق پر رحم کھا کر ورجل (لاطینی شاعر) کو اس غرض سے اس کے پاس بھیجتی ہے کہ وہ اُسے دوزخ اور اعراف کے اندر سے گزار دے جسکے بعد اُسکا ارادہ خود اُسے آسمان پر لیجانے کا تھا۔ اس تمام بیان کو اگر ایک استعارہ سمجھ لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ روح گناہوں اور غلط کاریوں میں پھنسی ہوئی ہے فلسفہ اُسے گناہ کی تاریکی اور مصائب دکھاتا اور استغفار کے راستہ پر لے جاتا ہے۔ اس کے بعد خدائی شفقت جس سے کبھی اُسکی محبت تھی لیکن اب اُس سے الگ ہو چکی ہے اسے حقیقی مذہب بتاتی ہے حتی کہ اسکی پاک آنکھیں تمام نیکیوں کے اُس منبع (یعنی خدا) کی طرف دیکھ سکتی ہیں۔

جس وقت ڈانٹی اور ورجل دوزخ کے دروازہ میں داخل ہو کر نیچے کی طرف اُترنے لگے اُس وقت شفق پھولی ہوئی تھی۔ اسی راستہ سے وہ زمین اور دنیا کے مرکز کی طرف جانے والے تھے۔ زمین کے نیچے کے طبقہ میں بے حد سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گناہ کی تاریکی کا اظہار کرتی ہے اس میں کہیں کوئی ستارہ نہیں چمکتا اور نہ سورج کا کہیں ورجل نے ذکر کیا ہے جہاں کہیں اس نے وقت کا ذکر کیا ہے وہاں طلوعِ آفتاب کا حوالہ دینے کے بجائے بدر کے غروب ہونے کا حوالہ دیا ہے۔ یا قارون کے غائب ہونے یا چاند کے پاؤں تلے آنے کا ذکر کیا ہے۔

دروازہ پر ہر روح کا موازنہ کیا جاتا ہے جس کے بعد وہ سب نیچے کی طرف اپنی اپنی مقررہ جگہ کی طرف جانے لگتی ہیں۔ ان میں جو زیادہ گناہ آلود ہوتی ہیں وہ اور بھی زیادہ نیچے جاتی ہیں جس طرح تمام وزنی چیزیں مرکز زمین کی طرف جانے کا رجحان رکھتی ہیں اُسی طرح گنہگار روحیں اپنے گناہ کے بار سے نیچے ہی نیچے چلی جاتی ہیں۔ دوزخ ایک بہت بڑی اُلٹی مخروطی شکل کا ہے جس کے اندرونی پہلوؤں میں بڑے بڑے چوڑے پُشتے ہیں۔ ان پُشتوں کو دونوں شاعر یکے بعد دیگرے عبور کرتے ہیں۔

دروازہ کے قریب گول دریا کے اندر نیک بُت پرستوں اور اُن بچوں کے رہنے کی جگہ ہے جنکا بپتسمہ نہیں ہوا - اسکی وجہ یہ تھی کہ ڈانٹے کے زمانہ میں جو مذہبی خیالات لوگوں کے اندر موجود تھے اُن کو مدنظر رکھکر وہ اس بات کی جراءت نہ کرسکتا تھا کہ اُن لوگوں کی روحوں کو جو راسخ العقیدہ نہوں خواہ وہ نیک ہی کیوں نہو، دائرۂ دوزخ سے باہر کرے - اس کے بیان کے مطابق یہ روحیں ایک قسم کی ہلکی روشنی میں رہتی ہیں، اور انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی -

اس سے نیچے ان لوگوں کے طبقات آتے ہیں جنھوں نے شہواتِ نفسانی، حرص، طمع، یا غصہ کے بس میں آکر خطائیں کیں اور اب اُن خطاؤں کی سزا بھگت رہے ہیں -

جن لوگوں نے زیادہ خوفناک جرم کئے اُن کے بوجھ زیادہ بھاری ہوتے ہیں - ان طبقات تک پہنچنے کے لئے، جہاں ان کی روحیں رہتی ہیں، ڈانٹے کو ڈیس کے شیطانی شہر کی فصیل دار دیواروں کے اندر سے گزرنا پڑتا ہے جنکے محافظ خدائی قہر ہیں - اس کے بعد وہ ایک عمودی ٹیلے سے نیچے کی طرف اُترتا ہے جہاں اس کے پاؤں لڑھکتے ہوئے پتھروں سے مس ہوتے ہیں، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ میں ورجل یا ان گنہگار روحوں کیطرح خود بھی ایک روح نہیں ہوں جنکی حفاظت جفاکش نرگھوڑ (Centaur = ایک خیالی مخلوق جو نصف انسان اور نصف گھوڑے کی شکل رکھتی ہے) کرتے ہیں - راستہ میں اُسے ایک خون کی اُبلتی ہوئی ندی نظر آتی ہے - ایک خوفناک جنگل نظر آتا ہے جس میں انسانی درخت اُگے ہوئے ہیں - جلتی ریت کا ایک صحرا ہے، جہاں آگ کے شعلے برف کے گالوں کی طرح گرتے ہیں - ان طبقات میں ظالموں، بدکاروں، اور مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کی روحیں رہتی ہیں -

جلتی ریت کے کنارے پر ایک بہت بڑا ٹیلہ ہے جس سے پیدل اُترنا ناممکن نظر آتا ہے - اس جگہ درجل کا اشارہ پاکر ایک صورت نمودار ہوتی ہے، جسکا چہرہ فیاض آدمی کا سا لیکن بدن ایک بہت بڑے اژدہے کی مانند تھا - ڈانٹے کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی کی پیٹھ پر بیٹھکر اُتریں گے، تو وہ بہت ڈرتا ہے - یہ دیو دراصل فریب مجسم ہے، کیونکہ دغابازی جرسے بھی روح کو نیچے گرادیتی ہے - یہ طبقہ دس گڑھوں پر منقسم ہوتا ہے، جو مرکزی گہرائی کے گرد اس طرح نظر آتے ہیں جیسے قلعہ کے گرد خندقوں کا سلسلہ - ڈانٹے کو مع اپنے رہبر کے، ان میں سے ہر ایک پر سے گزرنا پڑتا ہے اور آگے بڑھکر انھیں چور، جھوٹے مشیر، سرکاری اور مذہبی عہدوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے والے، جادوگر وغیرہ اپنی سزا پاتے ہوئے نظر آتے ہیں - اس جگہ اگرچہ کہیں کہیں مصورِ حقیقی کے قلم کی جھلک نظر آتی ہے، تاہم کرۂ ہوائی زیادہ تاریک اور غلیظ ہوتا جاتا ہے، اور روحیں بھی زیادہ وحشی اور تند نظر آتی ہیں - آگے چل کر دونوں شاعر پھر ایک عمودی گہرائی کے مقام پر پہنچتے ہیں، جہاں سے ایک بہت بڑا دیو انھیں اُتار کر نیچے لے جاتا ہے - یہاں وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک منجمد جھیل پر چل رہے ہیں، اس جھیل کے اندر اُن لوگوں کی روحیں غرق ہیں، جنھوں نے عہدشکنی کی، اور جو اپنے رشتہ داروں، ہموطنوں، اور ہواخواہوں کے لئے دغاباز ثابت ہوئے -

آخرکار تاریک کرۂ ہوائی میں ڈانٹے کو ایک چیز نظر آتی ہے جسکو پہلے پہل وہ پون چکی کے بادبان تصور کرتا ہے، جن کی گردش سے برف کی طرح سرد ہوا پیدا ہوتی ہے - لیکن قریب پہنچکر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو تمام بدیوں کے منبع و سرچشمہ "شیطان" کے پر ہیں - کسی زمانہ میں وہ بلندترین آسمان پر روشنی کا فرشتہ تھا، لیکن اپنی جگہ سے ایسا گرا کہ عالم کے مرکز میں جا پہنچا، جہاں اب اُس میں تمام گناہوں کی کشش پائی جاتی ہے -

اس وقت ورجل کہتا ہے "آؤ چلیں - رات ہونے لگی ہے اور ہم سب کچھ دیکھ چکے ہیں"۔ ڈانٹے اسوقت بہت خائف ہوتا ہے جبکہ دونوں اس دیو کے ساتھ لٹک کر اس کے جسم سے آہستہ آہستہ نیچے اُترتے ہیں، حتی کہ وسط میں پہنچکر ورجل بہت بڑی کوشش کرکے پلٹتا ہے، اور ڈانٹے کو ساتھ لیکر

پھر ایک بار اوپر کو چڑھنے لگتا ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد، جب وہ دم لینے کے لئے ٹھہرتے ہیں، ورجل بتاتا ہے کہ اب صبح کا وقت ہے اور اسکے اظہار استعجاب پر بیان کرتا ہے کہ جس مقام سے ہم ابھی اس قدر کوشش سے گذرے ہیں وہ دنیا کا مرکز ہے۔ ہم شہر یروشلم کے نیچے اتر چکے ہیں اور اب کرہ کی سمت مقابل کی طرف جا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ آفتاب جو شہر یروشلم پر غروب ہو رہا ہے اس طبقہ پر جہاں ہم جا رہے ہیں طلوع ہونیوالا ہے۔ ناظرین اس فقرہ کا استعارہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے شاعر کا منشا یہ ہے کہ جب گنہگار گناہ کے انتہائی عمق تک پہنچ جاتا ہے تو اُسوقت بہت بڑی کوشش کرکے پلٹتا ہے اور ایک نئی زندگی کی طرف اُٹھنے لگتا ہے، جس کے ساتھ ہی رات دن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

آرام کا خیال نہ کرکے دونوں شاعر پوشیدہ زینہ پر چڑھنے لگتے ہیں اور آخرکار کوئی ۲۰ گھنٹے کے بعد ڈانٹے کو چٹان کے اندر ایک گول شگاف نظر آتا ہے، جس کے اندر سے "وہ تمام خوشنما چیزیں جو آسمان پر ہیں" جھلکتی ہیں جب وہ باہر نکلتا ہے تو ستارے نظر آتے ہیں۔ دوزخ کے اندر وہ رات کے وقت داخل ہوئے تھے اور اعراف میں اُسوقت پہنچے جبکہ پو پھٹنے والی تھی۔ اس جگہ نظم کے ایک نہایت نفیس حصہ میں صاف وشفاف آسمان کی خوبصورتی کی کیفیت بیان کی گئی ہے جس میں ستارہ زہرا چمکتا ہے اور جنوبی ستارے اسوقت تک چمکتے نظر آتے ہیں حتی کہ طلوعِ آفتاب سے اُن کی روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ ڈانٹے نے خصوصیت کے ساتھ قطب جنوبی کے چار چمکدار ستاروں کا ذکر کیا ہے جنھیں شمال کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے جب سے حضرت آدم کو اُس فردوسِ بریں سے، جو اس پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا، نکالا گیا کسی انسان کی نظر ان ستاروں پر نہیں پڑی۔ شام کے وقت جب یہ ستارے کسی قدر نیچے کی طرف ہوتے ہیں تین اور ستارے ان کی جگہ نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ ساتوں ستارے سات نیکیاں ہیں، جن سے انسان کے گناہ میں مبتلا ہونے کیوقت سے عدم توجہی برتی گئی ہے۔

اس جگہ روحیں ایک جہاز میں سوار ہو کر آتی ہیں جس کی رہبری سمندر میں ایک فرشتہ کرتا ہے۔ اتنے میں دونوں شاعر کوہ اعراف پر چڑھنے لگتے ہیں۔ یہ ایک طویل اور تکلیف دہ سفر ہوتا ہے، کیونکہ دنیا میں اس سے اونچا اور کوئی پہاڑ نہیں، اور اس کے پہلو بالکل عمودی نہیں۔ لیکن جوں جوں گناہ کے بوجھ سے دبی ہوئی روح آزاد ہوتی جاتی ہے، اوپر چڑھنے کے عمل میں بھی سہولیت ہو جاتی ہے۔ ۲۴ گھنٹے کا عرصہ جو دوزخ میں بسر ہوا تھا، ایک طویل اندھیری رات کی مانند تھا۔ بہشت میں ہمیشہ روشنی رہیگی، لیکن اعراف میں باری باری رات اور دن ہوتے ہیں۔ آفتاب دونوں شاعروں کی رہبری کرتا ہے اور اسکی روشنی پہاڑوں کی شمالی ڈھلوان پر پڑتی ہے۔ یہ دونوں سورج، چاند اور ستاروں سے وقت کا حساب رکھتے ہیں۔ اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس جگہ ڈانٹے نے مختلف اوقات، موسموں اور طول بلد و عرض بلد کے لحاظ سے اجرامِ فلکی کی حرکات کا حساب بڑی صحت کے ساتھ درج کیا ہے۔

کنارے پر اور پہاڑ کی نچلی ڈھلوانوں پر بعض ایسی روحیں تھیں جو پاک ہونے کے عمل کی ابتدا ابھی نہیں کر سکتیں، کیونکہ انھوں نے دنیا میں اپنی زندگی کے آخری حصہ سے پہلے توبہ نہ کی تھی۔ حقیقی اعراف کی ابتدا اسوقت سے ہوتی ہے جب وہ اس دروازہ میں داخل ہو جائیں جو پہاڑ پر اس قدر بلند واقع ہے کہ اس سے نکل کر وہ روحیں بادلوں سے اوپر کے طبقہ میں داخل ہو جاتی ہیں، جہاں ارضی ہوائی لہروں کا کچھ اثر نہیں پڑتا، یا جہاں بارش، اولے اور برف نہیں پڑتی۔ یہ خیال یونانیوں سے لیا گیا ہے، اور اس میں بھی صاف استعارہ نمایاں ہے، کیونکہ جو روحیں اس طبقہ میں داخل ہو جائیں وہ دنیوی جذبات اور ترغیب سے مبرا ہو جاتی ہیں۔ اس پہاڑ کے پہلو میں سات چبوترے اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ نچلے چبوترہ سے شروع ہو کر بالائی چبوترہ تک زینہ کے طور پر پہنچ سکتے ہیں۔ غرض تین دن تک ڈانٹے اور اس کا رہبر دونوں اوپر کی طرف

بڑھتے گئے، اور راستہ میں اُن روحوں سے گفتگو کرتے گئے جو اس خیال سے خوش تھیں کہ جونہی ہم اُن گناہوں سے پاک ہو جائیں گی جو دنیا میں ہم سے سرزد ہوئے ہیں، تو ہم بہشت میں جا پہنچیں گی۔

تیسری شام کو ڈانٹے چٹان کے آخری زینہ پر سو جاتا ہے، اور دن نکلنے پر اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا پاتا ہے۔ درختوں پر پرندے چہچہاتے ہیں۔ زمین پر پھول اُگے ہوئے ہیں، اور شفاف پانی کی ندیاں گھاس کے اندر سے بہتی ہوئی گزرتی ہیں۔ دراصل وہ اعراف کے چبوتروں سے بھی بالائی کرۂ ہوائی میں پہنچ چکا ہے۔ کیونکہ جب وہ طلوع ہونے والے سورج کی طرف دیکھتا ہے تو مدھم چلنے والی بادِ نسیم اس کے چہرہ سے آکر لگتی ہے، اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ طبقات کی حرکت کا اثر ہوا پر بھی پڑتا ہے، اور ہوا مشرق سے مغرب کی طرف چلتی رہتی ہے۔ فردوس میں (باغِ عدن) کو اس جگہ قایم کرنے کی اہمیت اب واضح ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی معصومی کی ابتدائی حالت میں یہاں، آسمان کے قریب، رہا کرتا تھا، اور اسکی روح جب دوبارہ پاکیزگی حاصل کرتی ہے تو اسوقت بھی یہیں پہنچ جاتی ہے تاکہ وقتِ مناسب پر آسمان کی طرف چلی جائے۔

اس جگہ ڈانٹے اور اُسکی معشوقہ، بیٹرس، دونوں آمنے سامنے ہوتے ہیں، اور ورجل انھیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے کیونکہ اسکا فرض رہبری یہاں پر ادا ہو چکا۔ ایک پر اسرار جلوس اور بعض دیگر نظارے ڈانٹے کی نظر سے گذرتے ہیں اور بیٹرس اس سے گفتگو کرتی ہے۔ اس کے بعد جب دوپہر کا وقت ہو جاتا ہے اور آفتاب نصف النہار پر پہنچ جاتا ہے تو بیٹرس اپنی شاندار آنکھیں اُسپر جما دیتی ہے۔ ڈانٹے اسکی طرف دیکھنے لگتا ہے، اور وہ یکایک حیرت خیز موسیقی اور چندھیانے والی روشنی کو محسوس کرتا ہے لیکن بیٹرس اُس کے خطرات کو دور کرتی اور کہتی ہے کہ "اب تم زمین پر نہیں ہو، بلکہ تمہاری روح گناہ سے پاک ہو کر اُسی طرح قدرتی طور پر آسمان کی طرف جا رہی ہے جس طرح دریا وادیوں کے اندر سے ہو کر گزرتے ہیں"

موسیقی کی جو آواز اسکے کانوں میں پڑتی ہے وہ طبقاتِ سماوی کی ہم آہنگی اور کرۂ نار سے نکل کر آنے والی روشنی ہے۔ وہ اس سُرعت سے اوپر کو اُٹھتے ہیں کہ فوراً ہی بیٹرس اُسے خوش ہونے کے لئے کہتی ہے، کیونکہ اب وہ ستارۂ اوّل (چاند) میں پہنچ چکے ہیں۔

ڈانٹے نے ساتوں ستاروں کی کیفیت، جن میں وہ یکے بعد دیگرے پہنچتا ہے، جو کچھ لکھی ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔ ان میں اسے راحت کے مختلف مدارج کی روحیں نظر آتی ہیں، جو اس سے ملاقات کرتی ہیں۔ وہ سب بلند ترین آسمان ہی میں رہتی ہیں جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے تیرھویں صدی میں سیاروں کی طبعی ماہیت کے متعلق چونکہ کچھ علم نہ تھا، اسلئے یقین کیا جاتا تھا کہ زمین میں اور اُن میں کسی قسم کی یکسانیت نہیں پائی جاتی، اور وہ سماوی ایتھر سے مرکب ہیں۔ لہذا ڈانٹے ان سیاروں کی سطح پر اس طرح نہیں اُترتا جیسے کوئی جاندار سطح زمین پر اُتر سکتا ہے، بلکہ چاند کے اندر داخل ہو کر وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے تو اُسے بادل کی طرح کی کوئی سفید اور موٹی چیز نظر آتی ہے جو موتی کی طرح شفاف اور پالش شدہ ہے اور جس پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے۔ وہ اور بیٹرس اسکے اندر سطح داخل ہوتے ہیں جیسے روشنی کی کرن پانی کو کاٹنے کے بغیر اس کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ اس عجیب ظہور سے اسکی یہ خواہش اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی ہے کہ بہشت میں جا کر خدائی اور انسانی فطرتوں کے توحد کے ناقابل تشریح اسرار کا مشاہدہ کرے۔ زمانۂ قدیم کے منجموں نے سایۂ زمین کی لمبائی کا اندازہ کر لیا تھا، اور ڈانٹے نے معلوم کیا کہ یہ سایہ زہرا کے فاصلہ سے پرے تک پہنچتا ہے۔ اس پر شاعر کو ایک اور خیال سوجھتا ہے، اور وہ ان روحوں کا ذکر کرتا ہوا جو چاند، عطارد، اور زہرا، میں اُسے ملتی ہیں لکھتا ہے کہ زمین پر نیکی کی زندگی بسر کر کے انھوں نے جو عظمت حاصل کی تھی اس میں کسی قسم کی ارضی کمزوری سے فرق آچکا ہے۔ آفتاب میں اسے مذہب کے بڑے بڑے استاد اس قسم کے روشن لباس میں نظر آتے

ہیں جو آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ چمکدار ہیں۔ مریخ میں، جو سُرخ رنگ
کی وجہ سے ہمیشہ ستارۂ جنگ مانا جاتا رہا ہے، مذہب کی خاطر لڑنے والے
لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ سفید مشتری میں عادل حکمران، اور زحل میں جو
زمین سے بہت دُور ہے، عابد اور مذہبی بزرگ پائے جاتے ہیں۔

آٹھویں آسمان پر پہنچکر جب وہ برجِ جوزا میں داخل ہوتا ہے تو تمام
طبقاتِ زیریں پر نظر ڈالتا ہے، اور اس فلکی مسافت میں اسکی نظر چونکہ
تیز ہو چلی تھی اسلئے کرۂ زمین میں سے باوجود اس قدر فاصلہ کے صاف
طور پر نظر آ سکتا ہے اور وہ یہ معلوم کر کے مُسکراتا ہے کہ سارے عالم
(برہمانڈ) کے مقابلہ میں یہ کس قدر بے حقیقت ہے۔

اسکے بعد پھر ایک بار وہ بیٹرس کے ہمراہ اوپر کی طرف پرواز کرنے
لگتا ہے، اور بلند ترین آسمان پر پہنچتا ہے، جس کو بیٹرس ایک گلدستہ سے
مشابہ قرار دیتی ہے، جس کے اندر شجرِ وقت کی جڑیں پوشیدہ ہیں اور جسکے
پتے دیگر طبقات میں نمودار ہوتے ہیں، کیونکہ حقیقت میں یہی طبقہ سُورج،
چاند، سیاروں، اور ستاروں کی حرکت و گردش کا منبع ہے جس سے
دن اور رات پیدا ہوتے ہیں۔

آخر کار یہ سیاح آسمان کے اس حصہ میں پہنچتا ہے جو "آسمانوں کا
آسمان" کہلاتا ہے، جہاں وقت یا جگہ کا کچھ حساب نہیں، اور نہ کسی قسم کی
حرکت ہوتی ہے، بلکہ ہر شے اپنی اپنی درست جگہ پر موجود ہے۔ معنوی
طور پر اسکا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ صرف محبت اور خوشی کا راج ہے
تمام شکوک رفع ہو جاتے ہیں، اور اعلیٰ ترین نیکی کے سامنے تمام خواہشیں
پوری ہو جاتی ہیں۔ انسانی روح کی حوصلہ افزائی کر کے اسے اس
روشنی کی طرف دیکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے جس سے سارے عالم
کا وجود نکلا ہے، اور اس تصوّر کے ساتھ ہی اس کے اپنے وجود کا
منشا پورا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی خواہش اور وہ محبت ایک ہو جاتی
ہیں جو آفتاب اور ستاروں کو حرکت دیتی ہے۔

(ترجمۂ انگریزی)

تیرتھ رام

مسلمانوں کا علمی شوق

یورپ کے بعض مؤرخ مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ اُنھوں نے غیر ممالک
کے علوم کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ان بزرگوں کو اس وقت تک خبر
نہیں کہ اہلِ اسلام نے کس کوشش اور تشویق کے ساتھ غیر زبانوں کی کتابیں
عربی میں ترجمہ کیں، اُن کی شرحیں لکھیں، اور بلا مُبالغہ پبلک میں نئے جلوہ
کے ساتھ پیش کیا۔ جناب شمس العلما علامہ شبلی نعمانی نے اس بحث پر ایک
مستقل کتاب لکھی ہے جس میں بالتفصیل عنوان دے کر ثابت کیا ہے کہ ہر علم و
فن کی کس قدر کتابیں مسلمانوں نے عربی میں ترجمہ کیں اور اُن کو کس طریقے سے
ایڈٹ مرتب کیا۔ بلا شبہ یورپ صحت کا جو طریقہ غیر ملکی تصانیف کے ساتھ
برت رہا ہے وہ مسلمانوں کا ایجاد ہے۔

ہم اس مضمون میں صرف ان یونانی تصانیف کا ذکر کرینگے جو مختلف علوم
وفنون کے عنوان میں آسکتی ہیں۔

فسانے یونانی ادب کی جان ہومر کا کلام ہے جس کی نسبت یورپ مان
گیا ہے کہ اس سے بڑھکر اعلیٰ درجہ کی نظم آجتک نہیں ہوئی۔ کلیاتِ ہومر کا
ترجمہ خلیفہ مہدی کے عہد میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ تاؤفیلس
نے سُریانی میں کیا[1] اور اصل یونانی زبان سے حال میں پروفیسر سلیمان بستانی
نے عربی میں کیا۔ اسکے علاوہ اور بہت سے یونانی افسانے جو انشا کی حیثیت
رکھتے تھے ترجمہ کئے گئے مثلاً سمسہ و دمن، مور دیانوس، انطوس سیاح،

[1] دائرۃ المعارف جلد ۵ صفحہ ۲۶۲

دیوان و جیل وغیرہ ۔

تواریخ یونانی زبان میں جس قدر تاریخی سرمایہ ہاتھ آیا اس سب کو مسلمانوں نے اپنے یہاں لے لیا اور واقعی امر یہ ہے کہ جس وسعت کے ساتھ روم و یونان کے حالات عربی میں ملتے ہیں اس قدر کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ مورخ مسعودی کی تصانیف اس بیان کی شاہد ہیں مسعودی سے پہلے بھی مورخان اسلام نے اکثر یونانی تواریخ سے امداد لیکر تاریخیں لکھی ہیں مثلاً قیس ماروفی کی تاریخ شاہان روم و ممالک مختلفہ ابن قسطنطین کی کتاب فرقہ نکیہ کے حالات میں، سعید بن بطریق کی تاریخ، اشناوس کی تاریخ ابتدائے حضرت آدم سے شاہنشاہ قسطنطین کے حالات تک، ان کے علاوہ یعقوب اور ابو زکریا کی تاریخیں بہت مستند اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

یہ اسلام ہی کا طفیل ہے کہ افلاطون، بقراط، ارسطو وغیرہ حکمائے یونان کا نام بچہ بچہ جانتا ہے۔ ان سب کی تصانیف کو مسلمانوں نے عربی میں ترجمہ کیا اور مضامین کی تشریح کی۔ اگر طب یونانی کو طب اسلامی کہا جائے تو بالکل درست ہے۔ مسلمانوں نے یونانی طب کو بالکل اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا۔ رہا یونانی فلسفہ اسکی جانب مسلمانوں کا اس قدر شغف بڑھا کہ ایک نیا علم علمائے دین نے ایجاد کیا جس کا نام علم الکلام ہے کیونکہ اسی فلسفہ کے اثر نے لوگوں کے خیالات کو الٹ پلٹ کر دیا تھا اور بعد کو شاہان اسلام نے اس کا دفعیہ خاص طور پر کیا۔

فن حرب فن حرب کے متعلق یونان میں دو شخص مصنف الیانوس و پولوبیس گذرے ہیں۔ ان کی تصانیف نہایت اعلیٰ پایہ کی ہیں چنانچہ کل کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا گیا اور بعض یورپ میں چھپ بھی گئی ہیں۔

نیرنجات قالس تانس (ارسطو کا شاگرد) غالباً شعبدات و نیرنجات کا یونان میں بانی ہے۔ چنانچہ اس کی کتاب عربی میں ترجمہ ہو گئی ہے۔[1] اس کا نام الجامع فی النیرنجات والخواص ہے۔ ایک اور شخص بلیناس نامی گذرا ہے۔ اسکی کتاب کا بھی عربی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

قیافہ و فال قیافہ و فال کے متعلق حسب ذیل تصانیف عربی میں ترجمہ ہوئیں:۔ کتاب الفراسۃ۔ کتاب زجر الروم۔ کتاب الخیلان۔ کتاب فیثاغورس فی القرعۃ۔ کتاب قرعۃ ذی القرنین۔ کتاب القرعۃ المنسوبۃ الی الاسکندر بالسہام۔[2]

تعبیر خواب تعبیر خواب کے متعلق حسب ذیل کتب ترجمہ ہوئیں:۔ کتاب ارطامیدروس۔ کتاب النوم والیقظۃ افرفوریوس۔

کیمیا یہاں اور کتابیں ترجمہ کی گئیں وہاں اس لغو فن کو بھی نہ چھوڑا۔ غرض یہ ہے کہ جس قدر علمی سرمایہ ہاتھ آیا خواہ وہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو اپنے یہاں لے لیا۔ کیمیا کے متعلق ذیل کی کتابیں عربی میں موجود ہیں:۔ کتاب ولیقرس فی الصنعۃ۔ کتاب الاسکندر فی الحجر۔ کتاب ولیقرس فی جواب بدلیوس۔ کتاب قطو لبصرہ۔ کتاب مقتاس۔ کتاب دوتمیتوس۔ کتاب کرمانوس۔

عربی پر یورپ کا احسان

بہت بڑا احسان یورپ کا عربی زبان پر یہ ہے کہ جو کتابیں نایاب اور مسلمانوں کے واسطے مایۂ فخر و ناز تھیں ان کو نہایت جد و جہد سے تلاش کیا اور برسہا برس تک ایک ایک کتاب کو لائق علماء نے درست کر کے شائع کیا۔ اس کام میں پہلا درجہ ہالینڈ کا ہے اور مخصوص فخر مسٹر برل کے پریس کو حاصل ہے۔ یہ مطبع لیڈن میں واقع ہے۔ ہالینڈ کے بعد جرمنی و فرانس ہیں۔ علمائے یورپ نے حقیقت میں یہ ایسا کام کیا ہے کہ ہم مسلمان ان کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کس قدر صدمہ وہ بات ہے کہ مسلمانوں کی یہ نایاب تصانیف دوسروں کے ہاتھ آئیں اور ہم ایسے ناخلف ہوں کہ اپنے بزرگوں کے علمی سرمایہ کو تلاش بھی نہ کر سکیں۔ مصر وغیرہ میں جو کتابیں چھاپی گئی ہیں وہ اکثر یورپ کے مطبوعات ہی سے منقول ہیں۔

مستشرقین یورپ کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔ ان کے ملاحظہ سے

---

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۳۱۲

[2] کتاب الفہرست صفحہ ۳۱۴

آیۃ الکرسی

(حیدرآباد [دکن] کی خطاطی کا ایک نمونہ)

انڈین پریس الہ آباد

واضح ہوگا کہ علمی تحقیقات یوں کرتے ہیں:۔

(۱) کتاب الفہرست کی جس جرمن مستشرق نے تصحیح کی اسکی عمر کے بیس سال اس کام میں صرف ہوئے۔ یہ ایسی نایاب کتاب ہے کہ علم التاریخ کو اسکے شایع ہونے سے بہت مدد ملی۔

(۲) ڈاکٹر فلیڈ ہرشل (جرمن مستشرق) نے تاریخ القرآن اٹھارہ سال صرف کرکے لکھی ہے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے اسکو بحسن و خوبی طبع کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے اور میں بار بار مولف کی تحقیق و محنت کا قائل ہوجاتا ہوں۔ ہمارے علما، اگر یورپین کوششوں کو نہ سراہیں تو کیا لیکن مصر وغیرہ کے علما کیونکر انکار کرسکتے ہیں۔

(۳) پروفیسر زاخو (جرمن) اور دیگر علما، نے طبقات ابن سعد کا کامل نسخہ (۱۲ جلدوں میں) برسوں کی محنت کے بعد تصحیح کرکے شایع کیا۔

(۴) پروفیسر وانٹ نے دیوان جریر اٹھارہ برس کی محنت میں شایع کیا۔

علاوہ ان کے پروفیسر رنیان، پروفیسر سیدی یو، ڈاکٹر لی بان، پروفیسر ڈوزی[1] وغیرہم نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کردی ہیں۔ ذیل میں ایک نقشہ صرف عربی تواریخ کا دیا جاتا ہے جن کو یورپ نے شایع کیا ہے: تاریخ طبری (۱۲ جلد) اسلام میں اس سے زیادہ معتبر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اپنی مستند تاریخ میں جابجا طبری سے مدد لی ہے۔ اخبار الطوال ابوحنیفہ دینوری۔ کتاب التنبیہ والاشراف علامہ مسعودی۔ انساب الاشراف علامہ بلاذری۔ تاریخ یعقوبی۔ فتوح البلدان علامہ بلاذری۔ الفہرست علامہ ابن الندیم بغدادی۔ رحلتہ ابن جبیر اندلسی۔ المعجب۔ البیان المغرب فی اخبار المغرب علامہ مراکشی۔ سیرۃ صلاح الدین قاضی بہاؤالدین بن شداد۔ الفتح القسی۔ علامہ عماد الاصفہانی۔ ذیل للطبری۔ المشتبہ علامہ ذہبی معجم بن ابار۔ اخبار مکہ علامہ ازرقی۔ المنتقی باخبار ام القری۔ اعلام باعلام بیت اللہ الحرام استبصار فی عجائب المصار۔ الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ کتاب الاعتبار علامہ ابن منقذ۔ المام علامہ مقریزی۔ البیان والاعراب بما بارض مصر من الاعراب۔ کتاب الہند علامہ ابوریحان بیرونی۔ الخبر عن اول من دول الاشراف العلویین۔ عیون والحدایق۔ زبدۃ الحلب فی تاریخ حلب۔ تاریخ آل سلجوق۔ زبدۃ النصرۃ فی اخبار الوزراء السلجوقیۃ۔ سلسلۃ التواریخ۔ اخبار العصر۔ اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس۔ تاج التراجم لقاسم بن قطلوبغا۔ الفخری فی الاداب السلطانیۃ۔ مروج الذہب علامہ مسعودی۔ کتاب الصلت ابن بشکوال۔ بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس۔ طبقات المفسرین علامہ سیوطی۔ اخبار ملوک المغرب والفارس علامہ مقریزی۔ عجائب الہند بزرک بن شہریار۔ بکتۃ صقلیۃ۔ تہذیب الاسماء علامہ نووی طبقات الانساب علامہ مقدسی۔ فتوح الشام علامہ بلاذری۔ ملخص طبقات الحفاظ علامہ سیوطی۔ معارف ابن قتیبہ۔ یہ سب کتابیں بیش قیمت اور نایاب ہیں۔ خیال فرمانے کی بات ہے کہ اول تو علماء یورپ نے عربی زبان میں تبحر پیدا کیا اور بعد ازاں ان کتابوں کو تلاش کرکے ان پر مفید حواشی اور شروح لکھیں۔ بلاشک اُن کی ہمت و محنت پر آفریں ہے۔

تواریخ کے علاوہ اسلامی مصنفین کے جغرافیوں کا بھی ایک سلسلہ چھاپا گیا ہے۔ یہ کتابیں بھی نہایت دشواری سے ہاتھ آئی ہیں اور بلا مبالغہ امر ہے کہ ہم محض یورپ کی بدولت اس بات سے واقف ہوئے ہیں کہ مسلمانوں نے جغرافیہ میں کس قدر مستقل تصانیف چھوڑی ہیں اور کیا کمال اس فن میں پیدا کیا تھا۔

جغرافیہ کے متعلق کتب ذیل شایع ہوچکی ہیں۔ معجم البلدان علامہ یاقوت حموی (چار جلد) مشترک علامہ یاقوت حموی۔ مراصد الاطلاع۔ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم۔ جغرافیہ ابن حوقل بغدادی مختصر کتاب البلدان ابن الفقیہ ہمدانی۔ کتاب البلدان علامہ یعقوبی تقویم البلدان

[1] پروفیسر ڈوزی نے ایک بڑا معرکۃ الآراء کام کیا ہے۔ پرانی عربی کتب میں ہزاروں ایسے الفاظ ہیں جو موجودہ عربی لغات میں نہیں ملتے چنانچہ پروفیسر ممدوح نے ایک لغت ان الفاظ کی سترہ سو صفحوں میں لکھی ہے۔ اس کتاب کے شایع ہونے سے یہ دقت بالکل رفع ہوگئی۔

المسالک والممالک علامہ ابن خرداذبہ - مسالک الممالک علامہ اصطخری - نزہتہ المشتاق علامہ ادریسی -

مندرجہ بالا مضمون بہت مختصر ہے مگر اس میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ مختلف علوم و فنون کی جس قدر کتابیں یونانی سے مسلمانوں نے ترجمہ کیں قریب قریب سب کا ذکر آجائے اور اسکے ساتھ ہی علماء یورپ کی کوششوں کا بھی حال معلوم ہو - جو کچھ اس مضمون میں لکھا ہے یہ بھی بہت ہے - سلف کے مفاخر کا کیا ذکر ہم نے کہا کیا -

گرفتم کز حریفاں بیش یا کم میتواں گفتن
ز دستت تا چہ آمد آخر ایں ہم میتواں گفتن

محمد شفیع الدین خاں

ملکۂ زمانیہ

تقدیر میں ترقی لکھی ہوتی ہے تو آدمی کو تدبیر کا مذاق دامنگیر ہوتا ہے لیکن اسپر انسان کو بھروسہ نکرنا چاہیئے - ہوتا تو وہی ہے جو منظور خدا ہے - آدمی نے کچا دودھ پیا ہے اس سبب سے اسکا دل نہیں مانتا -

شاہی زمانے کا ذکر ہے - غازی الدین حیدر بہادر کا زمانہ ہے - ملک اودھ زر ریز ہو رہا ہے اور لوگ تقدیر آزمائی کو دور دور سے چلے آتے ہیں - بنارس میں ایک متوسط درجہ کا شریف پٹھان رہتا تھا - سپہگری پیشہ تھا غلے کی ارزانی سے نہایت خوشحالی سے بسر ہوتی تھی - بی بی کا نام بی حسینی خانم تھا جو نہایت خوبصورت اور رنگین مزاج تھی - قضائے الٰہی سے شوہر کا انتقال ہو گیا - بیوہ عورت اور وطن شاہجہاں آباد - پردیس میں کون پوچھنے والا تھا - مصیبت اور تکلیف کے دن کچھ کہکر نہیں آتے - دور کے عزیزدار جیون خاں قاسم خاں بہت آسودہ حال تھے مگر اس سے خبر تک نہوے - کچھ دنوں وارث علی خاں اور فتح علیخاں کہ ان کے بھائیوں میں ہوتے تھے اور شاہجہاں آباد کے عزت دار آدمی تھے متکفل حال رہے - پھر مرزا جوان بخت کے یہاں رہنے لگی - لیکن اُس دکھیا کے جاتے ہی ان پر بھی تباہی آئی اور چار و ناچار ان کو اُس گھر سے نکلنا پڑا - جب بنارس میں کوئی صورت قیام کی نہوئی تو اس نے خیال کیا کہ دیس چھوڑ پردیس بھیک اچھی ہے - بنارس میں تو بہت سے لوگ ہمارے جاننے والے ہیں اگر یہاں ماماگیری کی نوکری کی تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی اب لکھنؤ چل کر تقدیر آزمائی کرنا چاہیئے - شاید مسبب الاسباب کوئی صورت رزق کی پیدا کر دے - ایک لڑکا گود میں تھا اور لڑکی دودھ پیتی تھی - دونوں کو ساتھ لیکر توکل بخدا گھر سے نکل کھڑی ہوئی - پیادہ پا مصیبت جھیلتی ہوئی لکھنؤ پہنچ گئی - مگر غریب کا یہاں کون جاننے والا تھا - ایک فیلبان[1] نے خدا ترسی کر کے اپنے یہاں ٹھہرا لیا - مفت کی روٹیاں کھلانا تو کسی کو اچھا نہیں معلوم ہوتا وہ اس فکر میں تھا کہ کسی بہانے سے ان کو گھر سے نکالے - حسن اتفاق سے اسی زمانے میں ولیعہد مرزا نصیر الدین حیدر بہادر کے محل میں افضل محل عرف براتی خانم کے بطن سے نور نظر شہزادہ مرزا محمد مہدی فریدوں بخت بہادر عرف منا جان پیدا ہوا - محل کی خوشی کا کیا پوچھنا - ہر طرف ناچ رنگ مبارکباد کی دھوم تھی - بادشاہ بیگم پھولے نہ سماتی تھیں - انعام اکرام کی انتہا نہ تھی - محلدارنی کو حکم ملا کوئی صورتدار جوان شریف خاندان کی انا ڈھونڈھکر لاؤ - شدہ شدہ یہ خبر فیلبان کو معلوم ہوئی - اس نے نواب معتمد الدولہ تک خبر پہنچائی کہ سرکار میں انا کی تلاش ہے - ایک شریف خاندان خانم صاحب بیوہ لکھنؤ میں حال وارد ہیں جن کے ساتھ دو بچے ہیں - لڑکی سال بھر کی دودھ پیتی ہے

---

[1] بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ لڑکا اور لڑکی اسی فیلبان سے عقد کرنیکے بعد پیدا ہوئے شوہر اول سے نہ تھے

اگر حضور شرفا پروری کے لحاظ سے محلدار کو حکم بھیجدیں تو اس پردیسن کی پرورش ہو جائے۔ آغامیر نے کہا اسکی ضرورت کیا ہے ڈیوڑھی پر اطلاع کردو وہاں سے طلبی کا حکم آجائیگا۔ اس نے پہرہ دارنی کی منت خوشامد کی۔ اس نے ترس کھاکر محلدار سے کہدیا۔ سنتے ہی محلدار نے ایک چوپہلہ فیلبان کے ساتھ بھجوادیا۔

فیلبان نے گھر پہنچ کر یہ خوشخبری بی حسینی خانم کو سنائی۔ اُمید تو تھی کہ خانم صاحبہ بہت خوش ہوں لیکن اسکے خلاف وہ غریب عورت سناٹے میں آگئی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا شکر ہے خدا کا ہمارا منہ تو انّا بننے کے قابل بھی نہ تھا۔ اب جب کوئی وارث نہیں رہا تو جو کچھ قسمت میں لکھا ہے پورا ہوگا۔ یہ کہکر بھلک بھلک رونے لگی اور جب خوب دل کھول کر رو چکی آنسو پوچھ کر کپڑے بدلے۔ کنگھی چوٹی کی اور چوپہلے میں سوار ہوکر محل میں داخل ہوئی۔ یہاں تو انّا کی پکار مچی تھی فوراً ہاتھوں ہاتھ لے لی گئی۔ محلدار نے زچہ خانے میں داخل کردیا۔ بیگم صاحبہ کو بہت ادب قاعدے سے سلام کیا۔ حکم ہوا انّا جی کو حمام خانے میں لیجاؤ۔ نہلا دھلا کر پوشاک بدلواؤ۔ لڑکے کے واسطے کھلائی مقرر ہوئی اور لڑکی کے لئے دوسری انّا بلوائی گئی۔ ان کو رہنے کے لئے خاص کمرہ مرحمت ہوا۔ مسہری لگائی گئی پیش خدمتیں مقرر ہوئیں۔ شہزادے کو گود میں لیکر دودھ پلایا۔

مثل ہے کہ چھب کہاں گٹھری میں صورت کہاں طباق میں حسینی خانم ماشاءاللہ خوش صورت شکل کی اچھی تھی اور کمسن بھی تھی۔ خاندان کی شریف تھی مصیبت اور تکلیف نے چہرہ بگاڑ دیا تھا۔ چار دن عمدہ غذا اچھی پوشاک ملی حسن پھٹ پڑا۔

ایک دن مرزا ولیعہد بہادر یعنی شہزادہ نصیرالدین حیدر نے دیکھ لیا عورت آنکھوں میں کھپ گئی۔ نکھ سکھ سے درست پایا۔ دل میں کہا کہ بیگم سے تو انّا لاکھ درجے اچھی ہے۔ بادشاہ بیگم کے لحاظ سے منہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔ لیکن اس آگ کے شعلے کچھ ایسے بھڑک اُٹھے کہ اپنا مافی الضمیر نواب معتمدالدولہ بہادر سے بطور راز کہدیا معتمدالدولہ بہادر کو اسوقت اس امر کی ضرورت تھی کہ جناب عالیہ متعالیہ بادشاہ بیگم صاحبہ والدہ مرزا نصیرالدین حیدر بہادر کے خلاف کوئی کار نمایاں ہو۔ اس موقع کو بہت غنیمت سمجھے۔ سبب یہ تھا کہ غازی الدین حیدر بادشاہ بیگم سے ناراض تھے۔ معتمدالدولہ بہادر نے صورت حال ملاحظہ کرکے مبارک محل و سلطان محل کا رنگ جمادیا۔

حضرت نے ان کی طرف سے عدم توجہی اختیار کی۔ یہاں تک کہ بادشاہ بیگم کے متوسلین فقر و فاقے میں مبتلا ہوئے۔ طلائی زیور فروخت ہونے لگا۔ صرف نصیرالدین حیدر بہادر کو اپنی آنکھوں کی پتلی جانتی تھیں۔

معتمدالدولہ نے مرزا نصیرالدین حیدر بہادر سے وعدہ کیا کہ آپ کا حکم بصیغہ راز رہے گا اور بہت احتیاط سے بی حسینی خانم کو حسن باغ میں بلواکر بادشاہ سے نکاح پر راضی کیا اور عقد مرزا نصیرالدین حیدر بہادر حسن باغ میں ہوا۔ بی حسینی خانم کی تقدیر چمک گئی اور بہت تزک و احتشام سے بسر ہونے لگی۔

لیکن حسینی خانم بادشاہ بیگم کے حالات سے واقف تھی۔ اس نے خیال کیا کہ ہمارا تنہا یہاں رہنا اچھا نہیں۔ اگر کچھ اونچ نیچ پڑی تو ولیعہد بہادر کے نزدیک آسمان پر چڑھانا اور زمین پر گرانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اور یہ ضرور ہونا ہے۔ بادشاہ بیگم کا صبر رنگ لائیگا۔ آخر اپنا پورا قصہ مالن کے ہاتھوں بادشاہ بیگم سے کہلا بھیجا۔ انھوں نے کہا تم میری زندگی چاہتی ہو تو نصیرالدین حیدر کو لیکر چلی آؤ۔

یہ پھر محل میں داخل ہوئی اور بیگم نے اُسی عزت اور احترام سے رکھا جس طرح ولیعہد کے اور محل رہتے تھے۔ اس اثنا میں غازی الدین حیدر بہادر سخت بیمار ہوئے۔ بادشاہ بیگم حضور کے دیکھنے کے لئے تشریف لے گئیں۔ خواجہ سرا نے بیگم کی تشریف آوری سے مطلع کیا۔ بادشاہ نے

به اشارۂ ابرو بیٹھنے کی اجازت دی اور آبدیدہ ہوئے۔ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ڈبڈبا آئے۔ اتنے میں بندگان عالی کی حالت غیر ہونے لگی اور بمشیت الٰہی ۲۷ ربیع الاول دیوالی کے روز چھ گھڑی رات رہے انتقال فرمایا۔ اسی وقت نصیر الدین حیدر بادشاہ نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ معتمد الدولہ وزیر ہوئے۔ صمصام الدولہ دہنی طرف اور مہاراجہ میوہ رام بائیں طرف مورچھل جھلنے لگے۔ سات روز تک برابر جشن رہا۔ بانی بیگم خانم کے کوکب اقبال نے ترقی کی۔ بادشاہ نے نواب ملکۂ زمانی خطاب دیا اور جو فرزند ان کے ہمراہ تھا اس کو کیوان جاہ کا خطاب ملا اور چھ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر مرحمت ہوئی اور تیس لاکھ روپیہ کا بنگلا جو جناب عالیہ کا فیض آباد سے آیا تھا وہ بھی مرحمت ہوا۔ کئی لاکھ روپیہ میر غلام حسین چکلہ دار سابق سلطان پور کا ضبط کر کے تاج الدین حسین خان نے اپنے عہد نظامت میں سرکار میں داخل کیا وہ بھی ملکۂ زمانیہ کو عطا کیا گیا۔ خدا کی شان ہے وہی حسینی خانم جو فقر و فاقے اور مصیبت سے مبتلائے عذاب تھی چشم زدن میں اس عروج کو پہنچ گئی۔

محمد علی خاں مرزا کیواں جاہ بہادر فوج کے جرنیل مقرر ہوئے اور اقبال الدولہ ان کے نائب ہوئے۔ بنارس سے وارث علیخاں اور فتح علیخاں دونوں بھائی بہن سے ملنے آئے۔ یہاں خلعت فاخرہ سے ممتاز اور سرفراز ہوئے۔ جاگیر کے ناظم ہوئے۔ نظامت پر پہنچ کر خوب مزے اڑائے۔ سو طائفے پریزاد حور پیکر رنڈیوں کے ہر وقت حاضر دربار رہتے تھے اور دن رات دور جام ارغوانی چلتا تھا۔ دسترخوان پر بہت سے دوشالہ پوش زریں قبا رفیق موجود رہتے تھے۔ جب ہوادار پر سوار ہو کر سیر کے لئے نکلتے تھے تو سیکڑوں رنڈیاں حلقے میں گھیرے ہوتی تھیں۔ نواب سلطان عالیہ بیگم (دختر نواب ملکۂ زمانیہ) کے بہت دور دورے ہوئے۔ ان کی انّا (ماما پیاری فیلبانی) خاص محلدار ہوئی اور ان کی شادی فریدوں مرتبت نواب ممتاز الدولہ مرزا حسین علیخاں بہادر سے ہوئی۔ عنایت باغ (مکان محمد آفرین علیخاں

خواجہ سرا نواب ناظر رسکونت کے لئے مرحمت ہوا۔

نواب نصیر الدین حیدر کے جلوس تمام اقربائے شاہی نے نواب ملکۂ زمانیہ کو نذریں دیں۔ لیکن نواب نصیر الدولہ محمد علی شاہ نے مجبوری نہایت آبدیدہ ہو کر نذر پیش کی۔

قاسم علی خاں بھی پریشان ہو کر بامید پرورش لکھنؤ آئے۔ نواب ملکۂ زمانیہ نے ان کی گذشتہ بے التفاتیوں کا کچھ خیال نہ کیا اور ان کو داروغہ ڈیوڑھی مقرر کر کے پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ یہ قاعدہ ہے کہ عروج کے زمانے میں ہزاروں ہوا خواہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ملکۂ زمانیہ کے عہد ترقی میں خدا جانے کہاں کہاں سے رشتہ دار پیدا ہو گئے۔ لیکن اس مخیر اور سیر چشم عورت نے سب کے ساتھ علیٰ قدر المراتب سلوک کئے۔

لیکن نواب ملکۂ زمانیہ کے یہاں بادشاہ سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس بات کا ان کو بہت قلق تھا۔ اسی آرزو میں ہر نوچندی کو حضرت عباس علیہ السلام کی درگاہ جاتی تھیں اور نہایت تزک و احتشام سے دس ہزار روپیہ کا ایک دسترخوان کرتی تھیں جس میں سادات اور سیدانیاں شریک ہوتی تھیں۔ ملکۂ زمانیہ کی سواری نہایت تزک و احتشام سے نکلتی تھی۔ دو سو ہاتھی طلائی ہودوں سے کسے ہوئے کارچوبی جھولیں پڑی ہوئیں دو بڑی رتھوں میں مغلانیاں اور خواصیں سوار ہوتی تھیں۔ طلائی مرصع پنکھے جنبر بادلے کی کرن چوطرفہ ٹکی ہوئی مہریاں ہاتھوں میں لئے ہوئے۔ خواصی کے آدمی سورج مکھی اور چھتر لگائے ہوئے۔ سکھ پال نقرہ و طلا کار زربفت کے جھکے پالکیاں نالکیاں ہمراہ ہوتی تھیں۔ محل میں محلدار پیش خدمتیں مغلانیاں مصاحبین ببلے والیاں گلوری والیاں کہاریاں چھٹی نویس ایک سے ایک طرحدار نوکر ہوئی۔ بادشاہ سلامت کا پیار دن دونا رات چوگنا ہوتا گیا۔ بیگم بھی بہت خوش مزاج بہت فیاض اور بہت سخی تھی۔ سارا نوکر مالامال ہو رہے تھے۔ جو کوئی آیا اس کو دولت و جاگیر مل گئی۔ لوگ ڈیوڑھی کی خاک کو اکسیر سمجھنے لگے۔ کہاریوں نے سونے کے محل تیار

کر لئے۔ تمام محل میں خوش پوشاک وضعدار عورتوں کی چہل پہل تھی۔ جو چیز دیکھی بے بدل۔ خوبصورت کماریاں وردیاں پہنے ہوئے ٹہل رہی ہیں۔ بڑی مہری کا اندر باہر راج ہے۔ ایک طرف بادشاہ کی اتا بڑے ٹھسے سے گاؤ تکیہ لگائے ہوئے ماش کے آٹے کی طرح پھولی بیٹھی ہیں۔ خود بخود اینٹھی جاتی ہیں۔ دائی چھوچھو دائیں اتائیں لونڈیاں باندیاں اصیلیں بڑھیاں کمسنیں ادھیڑیں باتوں باتوں میں آوازے کس رہی ہیں کہیں مغلانیاں جوڑے سی رہی ہیں۔ کوئی چمپا ٹانک رہی ہے کوئی بنت بنا رہی ہے۔ لونڈیاں باندیاں جنشنیں گرجنیں ہتھیار کمر سے لگائے بندوق کندھے پر رکھے پہرہ دے رہی ہیں۔ پاندانوں کی کھڑکھڑاہٹ ہو رہی ہے۔ اچھے پانوں کی کتر بیونت ہوتی ہے۔ خواجہ سرا نواب ناظر اپنی اپنی خدمت پر حاضر ہیں۔ گاہنیں خوش گلو ساز ملا رہی ہیں ڈومنیاں نقل کر رہی ہیں۔ باورچی خانے کے شور و غل سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ فراش خانے میں ہجوم ہے۔ توشہ خانہ بہت بہار کا ہے۔ خزانے میں چھن چھن کی آواز آ رہی ہے۔ کھانے خوان بھرے ہوئے سر بمہر رکھے ہیں۔ آبدار خانے میں شربت اور آبشورے تیار ہو رہے ہیں۔ صراحیاں برف میں جھلی جاتی ہیں۔

ایک نورانی بارہ دری جس میں تمام شیشہ آلات سجا ہے۔ جھاڑ دیوار گیریاں تمامی کا فرش کمروں میں بچھا ہے۔ مخمل دی اور دو دامی کے پردے لگے ہیں۔ زربفت کی سنہری اور روپہلی چلمنیں پڑی ہیں۔ جڑاؤ چھپر کھٹ اور پلنگ بچھے ہیں جن میں پردے اور اوچھے عمدہ سے عمدہ ڈوریوں سے کسے ہوئے۔ مینے کی مسہریاں۔ منہ ہاتھ دھونے کی چیزیں تمام مرصع کاری رکھی ہیں۔ گرمی اس شدت کی پڑ رہی ہے جیٹھ بیساکھ کی دھوپ ہے۔ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے۔ پسینے پر پسینے آ رہے ہیں۔ آدمی کا عرق نکل رہا ہے لیکن محل میں جاڑے کی کیفیت نظر آتی ہے۔ سنگ مرمر کا تہ خانہ ہے جس میں خس کی ٹٹیاں چنی ہیں۔ مٹھوں پر اطلس کی پٹیاں بندھی ہیں۔ خس کے عطر سے ٹٹیاں بسائی جاتی ہیں۔ سقنیاں مشک کندھے پر رکھے ہوئے چھڑکاؤ لگا رہی ہیں۔ ٹٹیاں کیوڑے اور گلاب سے دمبدم تر کی جاتی ہیں۔ برف کے پانی میں خالص کیوڑہ اور گلاب ملایا جاتا ہے وہ سب ہزاروں میں بھر کر ٹٹیوں پر چھڑکا جاتا ہے۔ دس بیس پنکھے برابر کھینچ رہے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔ اوٹوں پر پھولوں کے ہار پڑے ہیں۔ ہر طرح کا سامان عیش و نشاط محل میں موجود ہے۔ لیکن اس سلطنت اور اس عیش پر بھی ملکۂ زمانیہ نے سادہ مزاج پایا ہے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ محل کا حساب کتاب لکھنے کے واسطے ایک داروغہ خوشنویسی کی ضرورت ہوئی۔ ممو جان مصاحب خاص سے فرمایا کہ ہمکو محل کے لئے ایک کارگزار عورت کی ضرورت ہے۔ ان کے محلے میں بسم اللہ جان عرف عمدہ خانم ایک خوبصورت لڑکی رہتی تھی جو بہت پڑھی لکھی تھی۔ غریب کے ماں باپ نہ تھے۔ ماموں کو لالچ دیکر محل کی نوکری کے واسطے لے آئیں۔ جیسے ہی محل میں عمدہ خانم کی سواری اتری تمام محل کا ساز و سامان دیکھکر ہکا بکا ہو کر رہ گئی محل میں ایک غل مچ گیا کہ جو نوکری کے واسطے آئی ہیں ایک قلمدان بھی ساتھ ہے۔ جب تہ خانے کے اندر پہنچیں جاڑے سے تھر تھر کانپنے لگیں۔ ممو جان نے ایک دوشالہ اڑھا دیا۔ سامنے شہ نشین میں ملکۂ زمانیہ اور اسکے پہلو میں نصیر الدین حیدر بادشاہ بیٹھے تھے۔ باہم پیار اور اخلاص کی باتیں ہو رہی تھیں۔ عمدہ خانم نے جھک کے بادشاہ کو سلام کیا اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خوشخط قطعہ نذر میں پیش کیا۔

ملکۂ زمانیہ کی نذر ایک پر تکلف موباف کیا۔ نذر قبول ہوئی اور تنخواہ مقرر ہوئی۔ یہ وہی بی عمدہ خانم ہیں جو آخر میں نواب قدسیہ بیگم کے نام سے مشہور ہو کر بادشاہ کے محل میں داخل ہوئیں۔

ایک مرتبہ بادشاہ سلامت نے خوش ہو کر کابی دار روپیہ کا پورا خزانہ مرحمت فرمایا۔ اس روپیہ سے گولہ گنج میں ایک عالیشان امام باڑہ

بنوایا۔چودہ ہزار روپیہ سالانہ امام باڑے کا مصارف تھا۔اسی قدر جائداد اور نوٹ امام باڑے کے لئے وقف کردیئے مجلسیں بہت دھوم دھام سے ہوتی تھیں۔

آٹھویں رجب کو اسی امام باڑے میں کونڈے ہوتے تھے۔بے کم وکاست ایک ایک کونڈا تین تین گز سے کم عریض نہ ہوتا تھا۔اس میں آٹھ من حلوا آتا تھا۔سو آدمی ایک ایک کونڈے پر بیٹھ جاتے تھے اور چاندی کے بڑے بڑے کفگیرے رکھے تھے۔اس سے لوگ اپنے اپنے آگے حلوا کھینچ لیتے تھے۔یہ مجلس عام ہوتی تھی اور پانچ چھ ہزار آدمی سے کم نہ ہوتا تھا۔پانچ کونڈے ہوتے تھے اور کئی مرتبہ بھرے جاتے تھے۔ایک مجلس محرم کی ساتویں تاریخ کو ہوتی تھی۔امام باڑے کے صحن میں ایک نہر تھی (جو اب تک موجود ہے) ساتویں تاریخ کو دودھ اور قند سے لبریز کی جاتی تھی اُس پر حضرت عباس علمبردار کی نیاز ہوتی تھی۔شرفا اور غربا گھڑے بھر بھر کے لیجاتے تھے۔امام باڑے کے پہلو میں ایک مسجد تھی جس میں رمضان شریف میں مہینہ بھر تک روز روزہ داروں کو پلاؤ کے طباق تقسیم ہوتے تھے۔مجلس میں مرثیہ خواں سوز خواں حدیث خواں روضہ خواں کتاب خواں کو نقد روپیہ دوشالے اور رومال تقسیم ہوتے تھے۔خاص خاص مجلسیں توڑہ بندی کی نہایت شان وشوکت سے ہوتی تھیں۔

مرثیہ مرزا دبیر صاحب پڑھتے تھے۔جناب عالیہ مرزا صاحب کو بہت عطا فرماتی تھیں اور مرثیہ گوئی میں ان کی شاگرد تھیں۔مرزا دبیر کے مزاج میں خیر بہت تھی۔جو کچھ روپیہ جناب عالیہ سے مرحمت ہوتا تھا سب خرچ کر ڈالتے تھے اور ایک پیسہ پس انداز نہ کرتے تھے۔ہمیشہ کچے مکان میں رہا کئے۔

قدسیہ محل کی قدر ومنزلت کے سامنے نواب ملکہ زمانیہ کی محبت کا بازار سرد پڑ گیا تھا۔لیکن اس غیرت مند بیگم نے اپنی اولوالعزمی کو برقرار رکھا۔یہی سبب تھا کہ شاہی کا سارا عملہ ان کے ساتھ خصوصیت رکھتا تھا۔

نصیرالدین حیدر کا خاص محل تو نواب سلطان مریم بیگم مرزا سلیمان شکوہ کی دختر تھیں لیکن بادشاہ سے موافقت مزاج نہ تھی۔اسلئے کربلائے معلیٰ تشریف لے گئیں اور وہیں انتقال کیا۔اسی طرح ولایتی محل، تاج محل، بادشاہ محل، پھول محل، سلطان محل، نور محل، صاحبہ محل، عباسی محل، مہتاب محل، آفتاب محل، کنگال محل بادشاہی محل ہوئے لیکن ملکۂ زمانیہ کی ترقی مدارج ہمیشہ ملحوظ خاطر رہی ۱۸۲۵ء بادشاہ نے باسٹھ لاکھ چالیس ہزار روپیہ سرکار کمپنی بہادر کو قرض دیا۔شرط یہ تھی پانچ روپیہ فی صدی منافع دیا جائیگا۔اس میں نواب ملکہ زمانیہ کا وثیقہ دس ہزار روپیہ ماہوار کا کیا گیا اور چار ہزار ماہوار نواب سلطان عالیہ زوجہ نواب ممتاز الدولہ بہادر کا مقرر ہوا۔

آخر زمانے کی بہار نے اپنا ورق الٹا۔پہلے نواب مرزا کیواں جاہ بہادر نے دفعتہً انتقال کیا۔بیمار کچھ نہ تھے یکایک ہیضے میں مبتلا ہوئے اور جانبر نہ ہوئے۔تال کٹورے کی کربلا میں اپنا خاص امام باڑہ بنوایا تھا اسی میں دفن ہوئے۔ابھی اس غم سے نجات حاصل نہ ہوئی تھی کہ چوتھی ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ میں اعلیٰحضرت نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ نے انتقال کیا۔بادشاہ کا سن ابھی پینتیس ۳۵ برس کا تھا۔مرنے کے دن تو نہ تھے لیکن قضا سے کیا چارہ ہے۔ملکۂ زمانیہ کی سلطنت مٹ گئی۔زندگی سے تو انسان مجبور ہے جینے کو تو بادشاہ کے بعد بہت زمانے تک زندہ رہیں لیکن ہمیشہ اپنے عیش وآرام کو روتی رہیں اور اسی رنج وغم میں انتقال کیا۔کیواں جاہ کے فرزند رشید نواب وزیر مرزا صاحب چونکھی والے مشہور تھے۔انکا خطاب نواب والا قدر تھا۔یہ شاعر بھی تھے اور بھاکا زبان خوب جانتے تھے۔اکثر ٹھمریاں کہا کرتے تھے۔قدر تخلص تھا۔غدر کے بعد انتقال کیا۔کثیر الاولاد تھے۔

نواب سلطان عالیہ بیگم کی دو اولادیں تھیں۔نواب سعید الدولہ اور نگن صاحبہ۔نواب سعید الدولہ عرف آغا صاحب کی پہلی شادی آخری شاہ اودھ کی صاحبزادی سے ہوئی۔خاص محل سے کوئی اولاد نہ تھی۔دوسری

شادی بی عزیزن صاحبہ سے ہوئی جن سے ایک دختر پیدا ہوئی جنکا نام
پتن صاحبہ ہے اور یہ بفضلہ بقید حیات ہیں۔

نگن صاحبہ کی شادی نواب قمرالدین حیدر بہادر چھوٹے صاحب
عالم خلف نواب مصطفےٰ علی خاں بہادر سے ہوئی۔ نگن صاحبہ اپنے شوہر
کی بہت فرمانبردار اور بہت سخی تھیں۔ افسوس عین جوانی میں انتقال کیا
اور کوئی اولاد بھی نہ چھوڑی۔

اب نواب سلطان عالیہ بیگم کی یادگار صالح صرف ایک نواب پتن صاحبہ
کی ذات ہے اور کیواں جاہ بہادر کی نواب والاقدر کی اولاد ہے جنکے
حالات آیندہ لکھے جائیں گے۔ نواب ملکہ زمانیہ اپنے دگولہ گنج والے،
امام باڑے کے اندر ایک تیرہ و تاریک کوٹھری (قبر) میں خاک کے
بستر پر میٹھی نیند سو رہی ہیں۔ نہ بچھونا ہے نہ تکیہ نہ پھولوں کی مسہری نہ
خس کی ٹٹیاں نہ پیش خدمت نہ مغلانی۔ ہاں جو کچھ اپنے ہاتھ
سے اُٹھا کر خدا کی راہ میں دیا تھا وہی اس آڑی مشکل میں کام آتا ہو
باقی خیریت ہے۔

امام باڑے کی ظاہری شان و شوکت بھی باقی نہیں۔ قبر پر کوئی فاتحہ
پڑھنے بھی نہیں آتا۔ روشنی اور چادر اگر اور شمع کو کون پوچھے۔ مگر قبر کی
اُداسی زبانِ حال سے داستان دہرا رہی ہے کہ یہ وہی بیگم ہے جو کبھی
پھولوں میں تلتی تھی اور کروڑوں روپیہ کا زیور پہنے ہوئے بصد کرشمہ و
ناز نصیرالدین حیدر بہادر کے پہلو میں جلوہ افروز تھی۔ آج ایک
جھنی ہوئی قبر بوسیدہ کفن کے اندر ہڈیوں کی خاک کا ڈھیر بنی
ہوئی پڑی ہے۔ فقط

عشرت لکھنوی

دیاسلائی

کیا تم نے کبھی اس امر پر غور کیا ہے کہ آگ ہمارے کتنے اور کیسے بڑے
بڑے کاموں میں استعمال ہوتی ہے؟ ذرا اُس دنیا کا نقشہ اپنے تصور
میں باندھکر دیکھو جس میں آگ کا وجود نہو۔ فرض کرو کہ موسم سرما میں کسی
روز جب ہم صبح کو بیدار ہوں اور سردی کا سخت زور ہو اور اس وقت
دنیا میں ہر کہیں آگ بجھی ہوئی ہو یا ہمارے پاس آگ جلانے کا کوئی
ذریعہ نہو، یا یوں سمجھ لو کہ ہم آگ جلانا ہی بھول گئے ہوں تو اس وقت
ہماری کیا حالت ہوگی؟ ہم سب سردی کے مارے ٹھٹھرنے لگیں گے
کیونکہ انگیٹھیوں، بھٹیوں، اور الاؤں سے ہمیں مطلق حرارت حاصل
نہو سکے گی۔ ہمیں بہت جلد بھوک محسوس ہونے لگے گی، پر ہم کھانا تیار
نہ کر سکیں گے۔ ہم سب بیکار ہو جائیں گے۔ انجن ٹرینوں دریل گاڑیوں
کو نہ چلا سکیں گے۔ پتلی گھروں کے کام بند ہو جائیں گے۔ بیوپار اور
تجارت رُک جائے گی۔ رات کے وقت ہم تاریکی میں راستہ ٹٹولتے پھرینگے
کیونکہ آگ کے بغیر نہ تو ہم لیمپ سے کام لے سکیں گے اور نہ گیس اور بجلی سے
اس حالت میں یہ معلوم کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ آگ کی عدم وجود کی
میں روشنی اور حرارت، دونوں چیزوں کے حاصل نہ ہونے سے انسان
کی زندگی سخت افسوسناک اور مصیبت سے بھری ہوئی ثابت ہونے لگے گی۔

دنیا میں کوئی ایسا وقت نہیں گزرا ہے کہ آگ موجود نہ رہی ہو۔ ہاں!
ایک ایسا وقت ضرور گزرا ہے جبکہ انسان آگ جلانے کا طریقہ نہیں جانتا
تھا۔ جب اُسے آگ جلانے کا طریقہ معلوم ہو گیا تو مدتِ مدید کے بعد وہ
اسے بہت سہل سمجھنے لگا۔ آجکل ہم بلا دقت آگ جلا سکتے ہیں کیونکہ ہمیں
بآسانی "دیاسلائی" دستیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے
کہ "دیاسلائی" دنیا کی سب سے زیادہ عجیب چیزوں میں شمار کی جاتی ہے اور

انسان کو اس کے بنانے کا طریقہ سیکھنے میں ہزارہا سال گزارنے پڑے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ "دیاسلائی" کیا چیز ہے۔ مگر بہت کم لوگ اسکی تاریخ سے واقف ہوں گے۔ آؤ، ہم اس کے تاریخی پہلو پر غور کریں۔

سب سے پہلے انسان کو آگ براہِ راست قدرت سے مہیا ہوئی تھی۔ جب کسی پاس کے آتش فشاں پہاڑ سے نکلی ہوئی چنگاریوں کے ذریعہ سے جنگل میں آگ لگ جائے یا بجلی گرنے سے کسی درخت میں سے شعلے نکلنے لگیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قدرت کی جلائی ہوئی دیاسلائی ہے۔ دنیا کی ابتدائی تاریخ میں ہر قسم کی آگ قدرت ہی کو جلانی پڑتی تھی کیونکہ انسان اپنی کوشش سے ایک چنگاری بھی پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ آگ حاصل کرنے کا ابتدائی طریقہ انسان کے لئے یہ تھا کہ وہ کسی شعلے میں جو قدرت نے کسی آتش فشاں پہاڑ یا بجلی کے ذریعہ سے جلایا ہو لکڑیاں سُلگا لاتا تھا۔ اس طرح پر سُلگائی ہوئی لکڑیاں گھر لے جا کر، ان کی مدد سے آگ جلائی جاتی تھی۔ اس طرح پر جو آگ حاصل کی جاتی تھی، اُسے بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا تھا، اور حتی الامکان کوشش کی جاتی تھی کہ وہ بُجھنے نہ پائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خواہ آگ کی کتنی ہی حفاظت کی جائے وہ کبھی نہ کبھی ضرور بجھ جاتی ہوگی۔ آندھی چلنے یا پانی برسنے سے اس کا بجھ جانا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ ایسی حالتوں میں دوبارہ لکڑیاں سلگا کر لانی پڑتی تھیں اور اس مطلب کے لئے بسا اوقات طویل سفر طے کرنے اور سخت مصائب جھیلنے پڑتے تھے۔

رفتہ رفتہ دنیا کے کسی حصہ میں کسی شخص کو ایک ایسا طریقہ معلوم ہوا جس کے ذریعہ سے وہ خارجی طور پر آگ حاصل کئے بغیر آگ جلا سکتا تھا۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے مصنوعی طور پر آگ جلانے کا طریقہ معلوم کر لیا۔ وہ پہلے ہی سے یہ بات جانتا تھا کہ اگر ہاتھوں کو زور زور سے ملا جلائے تو وہ گرم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اُس نے تجربہ سے یہ بات معلوم کی کہ اگر خشک لکڑی کے دو ٹکڑوں کو آپس میں رگڑا جائے تو انھیں بھی بہت گرم کیا جا سکتا ہے۔ اس تجربہ سے اُسکے دل میں یہہ سوال پیدا ہوا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر لکڑی کے دو ٹکڑوں کو آپس میں زور سے رگڑا جائے تو آگ پیدا ہو جائے؟ پس اُس نے بالکل خشک لکڑی کا ایک ٹکڑا زمین پر رکھکر اس کی سطح کو دوسری چھڑی کے نوکدار سرے سے یہاں تک رگڑا کہ اس میں ایک نالی بن گئی۔ رگڑنے کے عمل کے دوران میں اُس نالی کے اندر ایک قسم کا لکڑی کا بُرادہ سا جمع ہو گیا۔ اس پر بھی وہ تیزی اور سختی کے ساتھ لکڑیوں کو رگڑتا گیا حتیٰ کہ وہ بُرادہ جو نالی میں جمع ہو گیا تھا، دہکنے لگا۔ اس دہکتے ہوئے بُرادہ پر اُس نے تھوڑی سی خشک گھاس رکھی اور اس کے بعد یہاں تک پھونکیں مارتا رہا کہ اُس میں شعلہ پیدا ہو گیا۔[1] یہہ پہلا موقع تھا کہ انسان نے اپنے لئے خود آگ جلائی۔ شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہہ "دیاسلائی" کی ابتدا تھی، ہاں! اُسی "دیاسلائی" کی ابتدا، جو تاریخِ عالم میں سب سے بہترین ایجاد کہلائے جانے کی مستحق ہے!

سہولت کی غرض سے آگ جلانے کے اس طریقہ کا نام ہم "چھڑی کے ذریعہ سے لکڑی میں نالی تیار کرنا" رکھ لیتے ہیں۔ واقعی یہ طریق آگ کو محفوظ رکھنے اور بجا لیے پھرنے کے طریقے سے زیادہ اچھا تھا، لیکن اس پر بھی وہ ایک بہت بھدا اور غیر موزوں طریقہ تھا۔ اس مطلب کے لئے بالکل خشک لکڑی درکار ہوتی تھی، اور رگڑنے کا عمل صبر کے ساتھ، بہت دیر تک جاری رکھنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات ایک چنگاری پیدا کرنے میں کئی گھنٹے صرف ہو جاتے تھے۔ ایک عرصہ دراز کے بعد کسی شخص نے یہ بات دریافت کی کہ لکڑی کو اُوپر نیچے لیجا کر رگڑنے سے یہ طریقہ بہتر ہے کہ اُسے ایک ہی جگہہ رکھکر گھمایا جائے۔ اس طرح گھمانے سے نیچے کی لکڑی میں ایک سوراخ پیدا ہو جاتا تھا، اور رگڑ کے ذریعہ سے جو حرارت پیدا ہوتی تھی اُس سوراخ ہی کے

---

[1] مسٹر والٹر ہو بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ محض دو لکڑیوں کو رگڑنے سے آگ پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس عمل سے صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ وہ دہکنے لگیں۔

کُھلّنا و دھن پتی

انڈین پریس الہ آباد

اندر مرکوز رہا کرتی تھی۔ ابتداءً چھڑی کو گھمانے کا عمل ہاتھ کی ہتھیلیوں سے کیا جاتا تھا، لیکن اس سے ہاتھوں کو تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا آگ جلانے والوں نے ہتھیلیوں کے بجائے چھڑی کو ایک رسی یا تسمہ کے ذریعہ سے گھمانا شروع کیا۔ جب چھڑی سے برمے کا کام لیا جاتا تھا، اسکا بالائی سرا دانتوں میں دبایا جاتا تھا۔ اگر تم اس طرح آگ جلانے کا تجربہ کرکے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ برمے کی حرکت سے جبڑوں کو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

ان دونوں مذکورۂ بالا طریقوں میں آگ رگڑ کے ذریعہ سے پیدا کی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ کے تمام لوگ اسی رگڑ کے طریقہ سے کام لیتے تھے، اور اب بھی دُنیا کے مختلف حصّوں میں وحشی قومیں اسی سے کام لیتی ہیں۔

آگ جلانے کے سلسلہ میں دوسرا قدم اُس وقت اُٹھایا گیا جب یہ بات دریافت ہوئی کہ پتھر اور لوہے کی خام دھات کو ایک دوسرے سے ٹکرانے سے آگ کا شرارہ پیدا ہوسکتا ہے۔ اسکا اصول یہ تھا کہ چقماق (آتشیں پتھر) کا ایک ٹکڑا خام لوہے کے ایک ٹکڑے سے ٹکرایا جاتا تھا، اور اس عمل سے متعدد شرارے نکلتے تھے۔ اگر ان شراروں کو خشک کاہی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں یا کوئلہ کے سفوف میں گرنے دیا جائے تو فوراً آگ پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن مخفی نہ رہے کہ اس طرح پر جو آگ پیدا ہوتی ہے اس میں سے بھی شعلے نہیں نکلتے بلکہ وہ صرف دہکنے لگتی ہے۔ اب اگر اس دہکتی آگ پر خشک لکڑی رکھکر پنکھے سے ہوا کریں یا پھونکیں ماریں تو شعلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر لکڑی کے ٹکڑے کو دہکتی آگ میں ڈالنے سے پیشتر گندھک میں ڈبو لیا جائے تو فوراً شعلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ آگ جلانے کا وہ طریقہ تھا، جو رگڑ سے آگ پیدا کرنے کے طریقہ کے بعد مروج ہوا۔ اور فی الحقیقت یہ ایک اصلاح یافتہ طریقہ تھا، کیونکہ اس میں آگ جلانے کے لئے نہ صرف کم محنت کرنی پڑتی تھی بلکہ وقت بھی بہت کم صرف ہوتا تھا۔ اس طرح پر آگ جلانے کیلئے جو سامان درکار ہوتا تھا اُسکی تفصیل حسب ذیل ہے: (۱) ایک اس قسم کی ڈبیا (ٹنڈر بکس) جس میں کاہی کے کٹے ہوئے ٹکڑے اور کوئلہ کا سفوف وغیرہ موجود ہو (۲) ایک ٹکڑا فولاد (۳) ایک ٹکڑا چقماق (۴) گندھک لگی ہوئی تیلیاں۔ چقماق اور فولاد کو آپس میں ٹکرایا جاتا تھا اور اس طرح جو شرارے پیدا ہوتے تھے وہ اُس ڈبیا میں گرائے جاتے تھے جس میں کاہی کے ٹکڑے اور کوئلہ کا سفوف ہوتا تھا۔ شرارے ڈبیا میں گرتے ہی دہکنے لگتے تھے۔ اسکے بعد فوراً گندھک لگی ہوئی تیلی اس دہکتی آگ میں ڈال دی جاتی تھی جو فوراً روشن ہوجاتی تھی۔ اسکے جلتے ہی موم بتی کو جلا لیا جاتا تھا جو ٹنڈر بکس پر لگی رہتی تھی۔ تیل میں آگ لگتے ہی ٹنڈر بکس کو بند کردیا جاتا تھا تاکہ دہکتا ہوا مصالحہ بجھ جائے اور پھر دوسرے وقت کام میں لایا جاسکے۔

آگ جلانے کا یہ طریقہ اب سے ہزارہا برس قبل[1] دریافت ہوا تھا، اور دُنیا کی قریب قریب تمام مہذب اقوام اسے اپنے اپنے وقت استعمال کرچکی ہیں۔ اس طریقہ کو چھوڑے ہوئے بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اب بھی بہت لوگ ایسے ہوں گے جنھیں وہ وقت یاد ہوگا جبکہ فولاد، چقماق، اور ٹنڈر بکس کا استعمال ہر گھر میں ہوا کرتا تھا۔

اب سے کوئی ۲۰۰ سال قبل آگ جلانے کا ایک اور طریقہ دریافت ہوا۔ اگر گندھک کے تیزاب کی تھوڑی سی مقدار کلوریٹ آف پوٹاش اور کھانڈ کے مرکب پر ڈالی جائے تو فوراً شعلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ آگ جلانے کا ایک نیا طریقہ دریافت کرنے کے لئے یہ ایک اشارہ تھا۔ چنانچہ آخرکار سترھویں صدی میں وائنا کے ایک سمجھدار شخص نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ ٹنڈر بکس کے ہمراہ جو گندھک لگی ہوئی تیلیاں استعمال کی جاتی تھیں، اُس نے انہیں سے

---

[1] قدیم اہل یونان آتشی شیشہ کے ذریعہ سے آگ جلایا کرتے تھے۔ آفتاب کی شعاعیں شیشہ کے اندر سے گذر کر کسی چیز پر مرکوز ہوتی تھیں جس میں باسانی آگ لگ جاتی تھی لیکن آتشی شیشہ کا دیاسلائی کے ارتقاء سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔

ایک تیلی لیکر اُسے گندھک کے تیزاب میں ڈبویا، اور اس کے بعد اسے کلوریٹ آف پوٹاش اور کھانڈ کے مرکب میں ڈالا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ تیلی میں فوراً آگ لگ گئی اور شعلہ پیدا ہوگیا۔ یہ طریقہ آگ پیدا کرنے کے پہلے دونوں طریقوں سے مختلف تھا۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی تھی کہ چند کیمیائی اجزا کو ایک دوسرے سے ملا دیا جائے۔ پھر ان میں خودبخود آگ لگ جاتی تھی۔ مطلب یہ کہ کیمیائی طریق پر آگ پیدا ہوجاتی تھی۔

وآئنا کے اس شخص کی دریافت کی بدولت لوگوں کی توجہ نئی قسم کی دیاسلائی (یعنی کیمیائی دیاسلائی) کی طرف رجوع ہوئی۔ اب آگ جلانے کے لئے جن اشیا کی ضرورت ہوئی تھی وہ حسب ذیل تھیں: ایک بوتل گندھک کے تیزاب کی؛ ایک بنڈل تیلیوں کا جن کے سروں پر گندھک اور کلوریٹ آف پوٹاش و کھانڈ کا مرکب لگا ہوا ہو۔ اس قسم کی دیاسلائیوں پر بہت زیادہ لاگت آتی تھی یعنی قریباً پندرہ روپیہ میں سو دیاسلائیاں تیار ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ لوں بھی غیر طمانیت بخش تھیں۔ بسا اوقات جب تیلی کو تیزاب میں ڈالا جاتا تھا تو اس میں آگ نہ لگتی تھی، اور وہ دھک دھک تیزاب کو اِدھر اُدھر اڑانے لگتی تھی اس سے کپڑے بھی خراب ہوتے تھے اور مزاج بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھارھویں صدی میں اس قسم کی دیاسلائیوں کو صرف وہی لوگ استعمال کیا کرتے تھے جنکو یہ پسند تھیں یا جو انھیں خریدنے کی توفیق رکھتے تھے۔ عام طور پر ٹنڈربکس کے ذریعہ سے آگ جلانے کا طریقہ رائج رہا۔

آخر کار اُنیسویں صدی یا یوں کہنا چاہیئے کہ اُس صدی میں جس کے اندر بہت سی عجیب وغریب دریافتیں عمل میں آئیں دیاسلائی کے ارتقار میں چوتھا قدم اُٹھایا گیا۔ ۱۸۲۷ء کا ذکر ہے کہ انگلستان کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں جان واکر نامی ایک دوا فروش نے تیلیوں کے سروں پر گندھک کلوریٹ آف پوٹاش اور سلفائڈ آف اینٹی منی کا مرکب لگا کر انھیں ریگ مال پر رگڑا۔ تیلیاں فوراً جلنے لگیں۔ یہ رگڑنے والی کیمیائی دیاسلائی وہ تھی جس کا استعمال، کم وبیش اصلاح کے ساتھ، ہم آج تک کرتے ہیں۔ اسے رگڑنے والی کیمیائی دیاسلائی اسوجہ سے کہا جاتا ہے کہ اسے چند کیمیائی ادویہ کے مرکب سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہرچند کہ جان واکر کی دیاسلائی کے لئے ایسڈ کی بوتل درکار نہوتی تھی، تاہم وہ اچھی قسم کی دیاسلائیاں نہ تھیں انھیں صرف اسی صورت میں جلایا جاسکتا تھا کہ خوب زور سے رگڑا جائے اسکا شعلہ پھڑپھڑانے لگتا تھا اور ہر طرف آگ گرتی تھی۔ اس کے چند سال بعد اینٹی منی کے بجائے تیلیوں پر فاسفورس لگایا جانے لگا۔ اس سے دیاسلائی کی صنعت میں انقلابِ عظیم واقع ہوا۔ اب دیاسلائی معمولی رگڑ سے روشن کی جاسکتی تھی۔ اب اس میں وہ پھڑپھڑاہٹ بھی باقی نہ رہی تھی۔ یہی وہ فاسفورس کی دیاسلائی تھی جس سے ہم سب اچھی طرح آشنا ہیں۔

جب اس طرح پر آسانی سے جلنے والی فاسفورس کی دیاسلائیاں ایجاد ہوگئیں تو پھر تیزاب میں تیلی ڈبوکر یا ٹنڈربکس کے ذریعہ سے آگ جلانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ رفتہ رفتہ آگ جلانے کے پُرانے طریقے لوگوں کو فراموش ہوتے گئے۔ اس وقت اس قسم کی دیاسلائیاں بارہ آنہ فی پیکٹ کے حساب سے فروخت ہوتی تھیں۔ ایک پیکٹ میں ۱۴۴ دیاسلائیاں ہوا کرتی تھیں۔ بہت کم لوگ ان کے استعمال کی توفیق رکھتے تھے۔ مگر اب ایک پیسہ میں عمدہ قسم کی سو دیاسلائیاں خریدی جاسکتی ہیں۔ اب انکا رواج اس قدر عام ہوگیا ہے کہ صرف صوبجات متحدہ امریکہ میں اندازاً ۱۵۰۰۰۰۰۰۰۰ دیاسلائیاں ہر سال استعمال ہوتی ہیں یعنی فی کس ۵ دیاسلائی روزانہ۔

فاسفورس کی دیاسلائی میں ایک نقص ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں آگ فوراً لگ جاتی ہے۔ اگر فرش پر کہیں ایک دیاسلائی پڑی رہ جائے تو ممکن ہے کہ اس پر کسی شخص کا قدم پڑنے یا کوئی چیز گرنے سے اس میں آگ لگ جائے۔ ممکن ہے کہ بیخبری میں ہمارا پاؤں فاسفورس کی دیاسلائی پر پڑجائے اور وہ جلنے لگے، اور ہم اُسے جلتا ہوا چھوڑکر چلے آئیں اور گھر میں آگ لگ جائے۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ چوہوں نے فاسفورس

شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی

انڈین پریس الہ آباد

کی دیاسلائی کو رگڑا ہے اور وہ جلنے لگیں اور اس طرح مکان میں آگ لگ گئی۔ ایک شہر کا ذکر کرتے ہیں جس میں تیس تباہی خیز آتش زدگیاں صرف چوہیوں کے دیاسلائی کترنے سے واقع ہوئیں تھیں۔

ان دیاسلائیوں کے حوادث سے محفوظ رہنے کے لئے کچھ مدت سے "سیفٹی دیاسلائیاں" ایجاد ہوئی ہیں۔ ان دیاسلائیوں میں فاسفورس نہیں ہوتا، بلکہ اسے ایک قسم کی باریک ریت میں ملا کر اس ڈبیا کے پہلو پر لگا دیا جاتا ہے جس میں دیاسلائیاں رکھی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک ان دیاسلائیوں کو ان کے خاص بکس پر نہ رگڑا جائے وہ نہیں جلتیں یہ دیاسلائیاں فاسفورس کی معمولی دیاسلائیوں سے اس قدر بہتر ہیں کہ دن بدن فاسفورس کی دیاسلائیوں کی مانگ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور بعض ممالک میں اس قسم کے قوانین نافذ ہو چکے ہیں کہ سیفٹی دیاسلائی کے علاوہ کسی اور قسم کی دیاسلائی فروخت نہ کی جائے۔

آگ جلانے کی طویل تاریخ میں سیفٹی دیاسلائی کی ایجاد آخری قدم ہے۔ ابتداءً آگ رگڑ سے پیدا کی جاتی تھی، اور اب ہمارے زمانہ میں بھی رگڑ ہی سے پیدا کی جاتی ہے۔ مگر ذرا غور کیجیے کہ دونوں طریقوں میں کس قدر فرق ہے۔ برمے کے ذریعہ سے آگ پیدا کرنے یا چھڑی کو لکڑی پر رگڑ کر آگ جلانے کے لئے فرصت اور مہارت درکار ہوتی تھی، لیکن سیفٹی دیاسلائی کے ذریعہ سے ایک بچہ بھی ایک لمحہ میں آگ جلا سکتا ہے۔

لیکن ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ اس قسم کی عمدہ دیاسلائی تیار کرنے میں کتنا زمانہ صرف ہوا ہے۔ اس سادہ اور چھوٹی سی سیفٹی دیاسلائی کے ایجاد سے پیشتر دخانی انجن، تار، ٹیلیفون، اور برقی روشنی وغیرہ چیزیں مستعمل ہو چکی تھیں۔

نظیر اکبر آبادی

شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی ایک بے نظیر شاعر ہیں۔ ان کے سوانحی حالات کچھ کم دلچسپ نہیں ہیں لیکن مفصل اور یکجائی حالات اس طور پر قلمبند نہیں ہو سکے جن سے پوری واقفیت ہو۔ غالباً اسکا باعث یہ ہے کہ انکا تعلق کسی سرکار سے نہیں رہا اور نہ کسی ہمعصر شاعر سے تقابل کی نوبت آئی۔ بعض تذکرہ نویسوں کے بیان سے یہ پایا جاتا ہے کہ نظیر نے خود ہی کسی سرکار سے تعلق پسند نہیں کیا اور ان کی عمر معلمی میں گزری۔ ابھی تلاش کرنے سے ایک دو شخص ایسے نکل سکیں گے جنھوں نے نظیر کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ تذکروں اور نیز بعض بیان کرنے والوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معلمی سے ان کو خاص ذوق تھا۔

نظیر گو فقیرانہ طبیعت کے آدمی تھے مگر ان میں شاہانہ خو بو بھی۔ معلمی بھی ایک قسم کی فرمانروائی ہے۔ بھلا نظیر سا آزاد مزاج امرا کے دربار میں کیا خوش رہ سکتا۔ اسلئے کہ امرا کا دربار زمانہ ساز اشخاص کی قدر کرتا ہے۔ نظیر شرفائے اکبر آباد میں سے ہیں اور اپنے والدین کے بہت ہی پیارے تھے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ کسی شاعر نے نہیں لکھی ہے۔ لیکن ان کی تاریخ وفات سنہ ۱۲۴۶ھ ہے۔

نظیر کی عمر قریباً سو برس بیان کی گئی ہے۔ مگر یہ اپنی زندگی بھر ہوش و حواس سے رہے۔ آخر عمر میں ان پر فالج گرا تھا لیکن یہ اس سے بھی جانبر ہوئے اور اپنا معمولی کام کر سکتے تھے۔ اتنی عمر میں مفلوج ہونے کے بعد بھی اپنے معمولی مشاغل کو سر انجام دے لینا نظیر کے قوائے ظاہری و باطنی کی صحت وعمدگی کی بین دلیل ہے۔ انکا حافظہ بہت قوی تھا۔ تحصیل علمی بھی معقول تھی۔ فارسی میں تبحر تھا اور عربی میں بھی اتنی قابلیت تھی کہ وہ کچھ عربی میں موزوں کر سکتے تھے۔ ہندی سنسکرت اردو پنجابی وغیرہ زبانیں بھی

جانتے تھے۔

نظیر کی سادہ وضعی اور بے تکلفی میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ ان کے
مذہب کی نسبت مؤلف زندگانی بے نظیر لکھتے ہیں کہ یہ شیعہ تھے مگر ان کے
والد کا نام محمد فاروق بیان ہوا ہے اور شاید ایسا نام شیعوں میں نہیں سنا۔
بہرحال وہ شیعہ ہوں یا سنی مگر وہ فقیرانہ مذاق کے شخص تھے اور تعصب سے
بالکل پاک۔ نظیر کے تلامذہ میں اکثر قابل اور ذی استعداد اشخاص تھے۔
ہندوؤں کو بھی ان سے تلمذ تھا۔ نظیر کے مرنے کے بعد شاگردوں نے
ان کو اپنے طریق کے موافق اُٹھانا چاہا۔ اگر یہ بیان سچ ہے تو ان کی
موت غالب سے ملتی ہوئی ہے۔ نظیر غالباً کسی کے شاگرد شاعری میں نہیں
ہوئے اور ہیں تو شہرت نہیں ہوئی۔ شاگرد اگر ہوتے تو میر ہی کے ہوتے
نظیر کا ایک ایسے مشاعرہ میں شریک ہونا جس میں میر بھی تھے بیان کیا گیا
ہے اور ان کے ایک شعر کو مشاعرہ میں میر نے پسند بھی کیا تھا۔ لیکن میر کی
شاگردی کا حال دیکھنے میں نہیں آیا۔

اُردو کے سوا نظیر فارسی کے بہت اچھے انشا پرداز تھے۔ ان کی نثر
مشہور اساتذہ فارسی کے رنگ سے ملتی ہوئی ہے اور دقیق و بلیغ ہے بعض
نثریں بہت سلیس اور سادہ ہیں اور ہر رنگ میں نثر لکھی ہے اور پھر لطف
یہ کہ فقرات بہت چست اور شوخ۔ عاشقانہ مزاجی اور رنگین طبعی لفظ لفظ
سے مترشح ہے۔ نظیر نے تمام اقسام نظم و نثر میں حسن طبیعت اور لیاقت
کو ظاہر کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو شاعری اور انشا پردازی
سے خاص مناسبت تھی اور ساری عمر ان کی انھیں مشاغل میں گزری۔
اور ان مشاغل کی دلچسپی اور تکمیل فن کے سامنے انھوں نے دنیاوی
جاہ و دولت کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ لکھنؤ اور بھرت پور (بیان کیا
گیا ہے کہ ان دونوں مقامات سے ان کی باصرار طلبی ہوئی مگر وہ نہیں گئے)
میں انکا تعلق مثل دیگر شعرا کے ہو جاتا۔

نظیر اکبر آبادی کی شہرت سابق اساتذہ اُردو سے کسی طور پر کم نہیں
اُن کا رنگ سخن طرازی معاصرین سے بالکل جُدا گانہ ہے۔ نظیر نے قریباً
تمام اصنافِ سخن پر قلم اُٹھایا ہے لیکن ان کی طبیعت کا میلان ہر رنگ میں
ظاہر ہو جایا کرتا ہے۔ ان کے ہمعصر غزل سرا شعرا نے کامل شعرائے فارسی
کی تقلید کی ہے۔ تغزل کا پیمانہ جو عرصہ سے قایم کیا گیا ہے وہی اب تک ہے
قدیم زمانہ کے غزل گو شعرا فارسی اور اُردو کلام میں جتنا زیادہ دردمندانہ
رنگ پیدا کر سکے اتنا ہی زیادہ لوگوں نے پسند کیا اور بعض نے یہ فیصلہ
کر دیا ہے کہ جس شعر میں درد اور سوز و گداز نہ ہو وہ شعر ہی نہیں۔ خیال
کی لطافت اور جذبات کی پُر تاثیری دل پر خاص اثر ڈالتی ہے محاورہ
اور لطف زبان کے بھی لوگ والہ و شیدا رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی
کلام نہیں کہ شاعر کو ان اوصاف کا پیدا کرنا سہل کام نہیں ہے۔ تاہم
ایک قدیم شاہراہ پر شعرا قدم رکھتے چلے آئے ہیں۔ مگر نظیر کو آزادانہ
رنگ کے لئے خاص طور پر شہرت حاصل ہے وہ ہر صنفِ شاعری میں
در آئے ہوئے ہیں۔ تقریبات اور موسم و فصل مختلف مراتب زندگی
بے ثباتی عالم کی خوب مصوری کی ہے مگر تعجب ہے کہ ان اوصاف پر
میلوں ٹھیلوں سیر و تماشا ناچ رنگ وغیرہ وغیرہ مشاغل جن سے ثقات
کو ہمیشہ پرہیز رہا ہے نظیر کو ان سے حد درجہ دلچسپی تھی لیکن یہ دلچسپی محض
مناظر قدرت کی سیر اور دنیا کی نیرنگی دیکھنے کے لئے تھی تاکہ اُن مختلف
مناظر اور جذبات کو قلمبند کریں جن کو اب تک کسی نے نہیں لکھا۔ وہ ایک
بے ہمہ و باہمہ شخص تھے۔ صوفیوں میں صوفی، رندوں میں رند، بوڑھوں
میں بوڑھے، جوانوں میں جوان، اور درحقیقت ایک قابل شاعر کے لئے
اسی بات کی ضرورت ہے کہ وہ ہر رنگ میں ڈوبا رہے۔

عاشقانہ مزاجی شاعری کا ضروری جزو ہے۔ یہ حُسن پرست بھی تھے
مگر ان کی پاکبازی میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نسبت پروفیسر شہباز
نے جو ایک قابل شخص اور نظیر کے خاص ماننے والوں میں تھے بیان کیا ہے
اور یہ بیان در اصل خود نظیر کا ہے کہ ایک بزم عیش میں ایک شوخ

حسین سے انکا سامنا ہوا اور اس سے خطاب کر کے یہ شعر پڑھا سے

کرم کردن باحوالِ غریباں   ز دلداراں ز دلداری توان گفت

تھوڑی دیر بعد اس نے جانا چاہا۔ نظیر نے اسکی آستین پکڑی۔ اس نے کہا اب میرا دل ٹھہرنے کو نہیں چاہتا۔ انھوں نے کہا میرا تو چاہتا ہے۔ اس نے کہا کیا بوسہ کے طلبگار ہو؟ نظیر نے کہا میں پارسا ہوں۔ اُس نے کہا تم رند ہو جاؤ۔ نظیر نے کہا ابھی تک یہ نہیں ہوا۔ اس نے کہا آیندہ ہو جاؤ۔ نظیر نے کہا آیندہ خدا جانے۔ الغرض وہ چلی گئی۔

نظیر کے یہ پاکبازانہ جذبات معمولی شے نہیں ہیں۔ سعدی نے پاکبازانہ عشق کے متعلق اس قسم کے بعض خیالات اپنی ایک تصنیف میں ظاہر کئے ہیں۔ اور یہ گویا سرگذشتِ حسن و عشق ہے۔ فرماتے ہیں:۔

یاد دارم کہ یارِ عزیزم از در درآمد چناں بیخود از جائے بجستم کہ چراغم بآستیں کشتہ شد و ازیں حال معشوق در عتاب آمد و گفت کہ در حال مرا بدیدی و چراغ بکشتی بچہ معنی۔ گفتم بدو معنی یکے آنکہ گمان بردم کہ آفتاب برآمد و دیگر آنکہ ایں بیت در دل گذشت۔

چوں شکر خندہ الیست شیریں لب   آستینش بگیر و شمع بکش

پھر ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

"یکے را از علما پرسیدند کہ کسے با ماہروئے در خلوت نشستہ و در بستہ و رفیقاں خفتہ ہیچ باشد کہ بقوت پرہیزگاری از وے بسلامت بماند۔ گفت از مہرویاں بسلامت ماند و از بدگویاں بسلامت نماند۔"

سعدی کے جذبات کو نظیر کے جذبات سے ملا کر دیکھے دونوں میں کتنا گہرا تصوف اور زہد ہے۔ اور مذاق بھی یکساں ہے۔ ہر چند نظیر کی جوانی بہت رنگ رلیوں میں گزری ہے لیکن آخر کار انکا مشرب صوفیانہ طرز پر آگیا۔ یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ایک صوفی کو ماسوی اللہ سے کیا تعلق اور اس نے اپنی شاعری میں ہزلیات کو کیوں آنے دیا۔ انکا جواب صرف اس قدر کافی ہے کہ دیگر شعرائے فارسی نے بھی اس مذاق کو جائز رکھا ہے اور سعدی ایسے صوفی اور فلاسفر نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ لکھا ہے اور کہیں کہیں فحش بھی آگیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ گو ایسے مذاق کا اظہار خلافِ تہذیب ہے لیکن یہ جذبات مصنوعی نہیں ہیں۔ مگر ایسا شخص جو غور و تامل کا عادی نہیں ہے یہ کہہ سکتا ہے کہ نظیر اوباشانہ طبیعت کے آدمی تھے مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ وہ مختلف جذبات کی موشگافی کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے، اور ان کو شرمناک الفاظ کے بیان کرنے میں ذرا بھی باک نہ تھا۔

نظیر کا درجہ شاعری میں کیا حیثیت رکھتا تھا اور انکا رنگ شاعری اساتذہ میں سے کس سے ملتا تھا؟ اسکی نسبت کسی کی کچھ ہی رائے کیوں نہ ہو لیکن میرے خیال میں نظیر نے مثل غالب کے شاعری میں ایک نیا راستہ پیدا کیا اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے نظیر کا درجہ گرا ہوا قائم کیا ہے اور یہ رائے اس وجہ سے ظاہر کی ہے کہ نظیر نے بعض مبتذل خیالات کو موزوں کیا ہے یہ خیال ایک حد تک درست ہے مگر دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان مبتذل خیالات میں کس درجہ صداقت ہے۔ جب ایک شاعر موجوداتِ عالم یا مختلف جذباتِ انسانی پر محققانہ نظر ڈالتا ہے تو اسکو اختیار رہے کہ وہ اعلیٰ خیالات کے ساتھ ادنیٰ خیالات کو بھی قلمبند کرے۔ نظیر نے مزاح آمیز اور ہزل انگیز خیالات کے ساتھ بعض ایسے متصوفانہ اور زاہدانہ خیالات موزوں کئے ہیں جن سے انسان حد درجہ متاثر ہوتا ہے۔ دنیا کے مال و دولت کی تذلیل کس شاعر نے نہیں کی ہے مگر نظیر نے بالکل نئے رنگ سے دولتِ دنیا سے تنفر پیدا کرایا ہے مگر آزادانہ رنگ کی جھلک اس میں بھی نظر آرہی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تارک الدنیا وعظ دے رہا ہے۔ ذیل کے دو ایک بند ملاحظہ ہوں۔ اس میں سخاوت اور ایثارِ نفس کی تعلیم و تلقین کس موثر طریقہ سے کی ہے اور گرہ کے مصرعہ کی نرمی اور لفظ "بابا" کی دلاویزی ملاحظہ ہو۔ بخیل بھی ان خیالات سے ضرور کچھ متاثر ہوسکتا ہے

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا   دکھ اس میں تری روح بہت پائیگی بابا
ہر کھانے کو ہر پہننے کو ترسائے گی بابا   دولت جو ترے یاں ہے نہ کام آئیگی بابا
پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائیگی بابا

دولت جو ترے پاس ہو رکھ یاد تو یہ بات   کھا تو بھی اور اللہ کی راہ میں بھی دے خیرات
دینے سے اسی کے ترے اونچا ہے گا ہاتھ   اور یاں بھی تری گزرے گی سو عیش سے اوقات
اور واں بھی تجھے سیر یہ دکھلائیگی بابا

یہ تو نہ کسی پاس رہی ہے نہ رہے گی   جو اور سے کرتی رہی وہ تجھ سے کرے گی
کچھ شک نہیں اس میں جو یہ تجھ سے دغا کھیلیگی   جتنا تو بڑھے گا یہ تجھے چین نہ دے گی
اور مرتے ہوئے پھر یہ غضب لائیگی بابا

یہ ساری نظم حد سے زیادہ دلچسپ اور موثر ہے اور جس طرح بھگت کبیر اور سورداس کے بعض اشعار قلوب پر جادو کا اثر کرتے ہیں اسی طرح یہ اشعار بھی دلوں کو نرم کرتے ہیں۔ ان اشعار کی وقعت اس بات سے نہیں گھٹ سکتی کہ بعض فقیر اور سادھو اس کو فقیرانہ صدا میں پڑھتے ہیں کلام کا لطف یہی ہے کہ وہ ادنیٰ اور اعلیٰ سوسائٹی میں یکساں اثر کرے نظیر کے ان خیالات سے نہ صرف فقیر بلکہ اعلیٰ درجہ کا مدبر بادشاہ بھی متاثر ہو سکتا ہے۔

ذیل کے شعر میں نظیر نے جس خیال کو ظاہر کیا ہے اس کو حافظ شیرازی کے شعر سے ملائیے ؎ نظیر

جا بیٹھ میکدوں میں سب درد و غم سے چھٹکر   جھمکا گلابی مے کی پیالے الٹ پلٹ کر

حافظ ؎
ساقیا برخیز و درده جام را
خاک بر سر کن غم ایام را

نظیر نے جس خیال کو ذرا وسعت دے کر بیان کیا ہے حافظ نے اختصار سے کام لیا ہے مگر مفہوم قریباً ایک ہی ہے۔

ہمہ اوست کے خیال کی تشریح نظیر نے اپنی ایک نظم میں خوب کی ہے۔ میں اسکا صرف ایک بند نمونہ کے طور پر لکھتا ہوں ؎

پنہاں اسے اپنے دل تنگ میں پہچان   ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں با رنگ میں نیرنگ میں پہچان   منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

برسات کا طرب افزا سماں ان اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

کالی گھٹا ہے ہر دم برسے ہیں مینہ کی دھاریں   اور جس میں اڑ رہی ہیں بگلوں کی سو قطاریں
کوئل پپیہے کوکیں اور کوک کر پکاریں   اور مور مست ہو کر جوں کو ملا جھنکاریں
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

صبح کا منظر اور بعض جانوروں کا ترنم انھیں کی زبان میں بیان کرنا بالکل نئی ترکیب ہے۔ اور لطف یہ کہ توحید باری تعالیٰ کی تصویر آ رہی ہے۔ ذہن کو تو ملاحظہ کیجئے ؎

وقت سحر کی روحیں کیا کیا ہوں ہوں ہوں ہوں کرتی ہیں
ہوں ہوں ہوں کر کر ذکر کن اور فیکوں کرتی ہیں
سانجھ سویرے چڑیاں ملکر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

نظیر نے بھی مثل دیگر اساتذہ فارسی کے تصوف کے مضامین میں ایک فرضی معشوق (مجازی) کو مخاطب کیا ہے۔ حافظ نے مے و معشوق اور زلف و رخ کے پیرایہ میں بعض ایسے مضامین لکھے ہیں جن سے عامیانہ خیال کا آدمی دھوکہ میں پڑ سکتا ہے۔ نظیر نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ مثلاً ؎ ذیل کی نظم میں وہ شان ایزدی کا تماشا ہر رنگ میں دیکھتے اور دکھاتے ہیں

ہوں کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا   یا رب تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا
لے عرش سے تا فرش نئے رنگ نئے ڈھنگ   ہر شکل عجائب ہے ہر اک شان تماشا
افلاک پہ تاروں کے جھمکتے ہیں طلسمات   اور روئے زمیں پر گل و ریحان تماشا
جب حسن کے جاتی ہے مرقع پہ نظر آہ   کیا کیا نظر آتا ہے ہر اک آن تماشا

اسی ذیل میں یہ شعر ملاحظہ ہو جس سے معشوق کی تعریف ثابت ہوتی ہے:-

چوٹی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہو لہریں رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا

ذیل کے شعر میں عاشق کی حالت دکھاتے ہیں :-

مُنھ زرد بدن خشک جگر چاک الم ناک غل شور تپش نالہ و افغان تماشا

کسی اُستاد فارسی کا یہ مصرعہ بہت مشہور ہے - نظیر اس مضمون کو کس وسعت سے بیان کرتے ہیں - لطفِ زبان اور صفائی ملاحظہ ہو ؎

زر کے دیئے سے پیر او استاد نرم ہو زر کے سبب سے دشمن ناکام نرم ہو
جو شوخ سنگ دل ہے پری زاد نرم ہو زر وہ ہے جس کو دیکھ کے فولاد نرم ہو

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

عمدہ ہیں جتنے خلق میں کیا شاہ کیا وزیر اللہ ہی بس غنی ہے میاں اور سب فقیر
کیا گنج و ملک و مال مکاں تاج کیا سریر جو مانگنا ہے اس سے ہی مانگو میاں نظیر

غیر از خدا کے کس میں یہ قدرت جو ہاتھ اٹھائے
مقدور کیا کسی کا وہی دے وہی دلائے

غزلیات کا انتخاب ملاحظہ ہو - متصوفانہ رنگ میں کہتے ہیں ؎

تن مُردہ کو کیا تکلف سے رکھنا گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا

ہوں تیرے تصور میں مری جاں ہمہ تن چشم دل ہے مرا جوں آئینہ حیران ہمہ تن چشم
مت تختۂ نرگس سمجھ اے گلبدن اس کو ہے عشق میں تیرے یہ گلستاں ہمہ تن چشم
اس آئینہ رو کے جو تصور میں نظیر اب حیرت زدہ نظارہ پریشاں ہمہ تن چشم

بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چراغِ مزار ہوا کے بیچ کوئی دم رہے رہے نہ رہے

نظیر کے اشعار ذیل عبرت و خبر کے لئے ایک تارک الدنیا واعظ یا صوفی کا کام دے رہے ہیں - بغیر سچے صوفیانہ مذاق کے ایسے پر اثر مضامین کا لکھنا دشوار ہے - مضامین کی صداقت اور جذبات لطیفہ کی دل نشینی کی کیا تعریف کی جا سکتی ہے - ؎

جو تو کہتا ہے اے غافل یہ میرا ہے یہ تیرا ہے یہ جسکا ہے اُسی کا ہے نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تو اوّل بیچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے نمازی ہے شرابی ہے اُچکا ہے لُٹیرا ہے

فرشتہ ہے پری ہے دیو ہے یا آدمی جن ہے بلا ہے بھوت ہے یا من مزورا یا کمیرا ہے
تری کیا ذات ہے کیا نام ہے کیا کام کرتا ہے مسافر بیوطن ہے یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے

یہ اشعار دراصل اس قول کی تشریح ہیں "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا دراصل خدا شناسی کا یہ کلیہ تسلیم کر لینے کے قابل ہے - میں نے اس غزل کے کئی اشعار بخیال طوالت چھوڑ دیئے ہیں - اسی زمین کا یہ مقطع ملاحظہ ہو -

نظیر اللہ اللہ اس جہاں میں دم غنیمت ہے کہاں ہم اور کہاں پھر تم کوئی دم کا بسیرا ہے

کبیر نے بھی اس مضمون کو خوب کہا ہے -

کنکر چُن چُن محل بنایا لوگ کہیں گھر میرا ہے نا گھر میرا نا گھر تیرا چڑیا رین بسیرا ہے

نظیر کو ایسے آزادانہ اور صوفیانہ مضامین لکھنے میں کامل دستگاہ ہے لیکن عاشقانہ رنگ میں بھی کچھ کم شوخی نہیں دکھائی ہے اور وہ ایسے عاشقانہ رندانہ رنگ لکھ جاتے ہیں جس سے ان کے صوفی اور درویش ہونے میں ناواقف شک کر سکتا ہے - مثلاً ذیل کے شعر میں کس خیال کو نظم کر گئے ہیں تغزل کے سوا نازک خیالی بھی حد کی ہے ؎

آغوش تصور میں جب ہم نے اُسے ملکا لب ہائے نزاکت سے اک شور تھا بس بس کا

امانت کا یہ شعر ؎

یاں گرہ کھل گئی دل کی اُدھر انگیا مسکی لب نازک سے صدا آنے لگی بس بس کی

نظیر کے شعر کے سامنے نقش ثانی ہے - اس کے سوا اس میں کھلی ہوئی شوخی ہے - نظیر نے نہایت متانت سے ایک اعلیٰ خیال کو نظم کیا ہے اور نزاکت معنوی کے لحاظ سے نظیر کا شعر حزیں کے اس شعر سے کم نہیں ہے ؎

آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار ما بس نازک است شیشۂ دل در کنار ما

عاشقانہ رنگ ملاحظہ ہو ؎

ادھر اس کی نگہ کا ناز سے آ کر پلٹ جانا اِدھر مرنا تڑپنا غش میں آنا دم اُلٹ جانا

اسی غزل میں یہ دو شعر پھر تصوف کے رنگ میں بالکل جدید طرز سے لکھ گئے ہیں ؎

یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی　　بکھرنا سبز ہونا لہلہانا پھر سمٹ جانا

یہ یکتائی یہ نیرنگی لَٹِس اوپر یہ قیامت ہو　　نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹجانا

ذیل کے شعر میں بالکل میرؔ کا رنگ ہے۔ صفائی اور ادا بندی ملاحظہ ہو کس رنگ میں متصوفانہ خیال کو قلمبند کیا ہے ؎

نہ آئی بُو جو ذرا تیرے مصحفِ رخ کی　　نسیم پھاڑ گئی آکے ہر ورق گل کا

ذیل کے شعر میں ناتوانی کے پردہ میں عدم تابِ نظارہ کو کس طور پر لکھ گئے ہیں مضمون بھی بالکل نیا ہو ؎

یہ ناتواں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو　　تو صورت اس کی اٹھا کر پلک نہ دیکھا گیا

اس شعر میں غالبؔ کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

فرصتِ عمر قطرۂ شبنم　　وصلِ محبوب گوہرِ نایاب

بیزاری اور گلہ ؎

گو آتش گل بھڑکی ہے پر یہ نہیں توفیق　　چھو سکے جو اسیرانِ چمن کے قفس تک

بکار افاصد اشک آج فوجِ غم کے ہاتھوں سے　　ہوا تاراج پہلے شہرِ جان دل کا گر پیچھے

سنو میں خون تو ساتھ اپنے سے آیا ہوں و باقی　　چلے آتے ہیں اٹھتے بیٹھتے لختِ جگر پیچھے

سبھوں کو بوسے دیئے ہنس کے اور ہمیں گالی　　ہزار شکر بھلا اس قدر تو پیار ہوا

ابتو تری جفا سے یہ مانگوں ہوں میں دعا　　ظالم خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل

شوخی اور ادا بندی ؎

ساقی کو جام دینے میں اس خوش نگہ کو آہ　　ہر دم اشارتیں ہیں کہ اسکے تئیں نہیں

دیر سے آج جو نکلے بُتِ ذی شان کئی　　لے گئے صبر کئی- دل کئی- ایمان کئی

ذیل کے شعر میں کس قدر جدت ہے- یہ خیال تو شاید ہی کسی نے موزوں کیا ہو- مصرعہ ثانی میں سونے کا لفظ کس حسن سے کھپایا گیا ہے ؎

گر بس ہو مرا تو میں کسی چورسے کہدوں　　جا آج پلنگ اسکے تو سونے کا اٹھالا

تجھ میں تو یہ شمیم نہ تھی سچ کہہ اے نسیم　　کس کی پھری تو زلفِ معنبر کے آس پاس

ذیل کے شعر میں کس فقرے کی بناوٹ ہے دلِ عاشق پر چشمِ یار نے کیا ستم ڈھائے ہیں ؎

نگاہ لڑائی ہے اس نے جس دم جھپک لیا جھپ تو دل کو میرے

ادا و آن نے ادھر دبوچا پلک پلک نے ادھر اچھالا

نظیرؔ نے کہیں کہیں بعض مصرعے بے جوڑ بھی لگائے ہیں گو تُک تو پورا دیا ہے مگر اول مصرعہ کا رنگ دوسرے سے بالکل الگ ہو گیا مثلاً یہ شعر ؎

نہیں تو صفِ محشر میں بھی لونگا تجھے پہچان　　رانجھا کو نہ بھولے گا کبھی ہیر کا نقشا

پہلا مصرعہ رنگ تغزل کو لئے ہوئے ہے مگر دوسرا مصرعہ تلمیحی ہے جس میں کوئی دلچسپی نہیں -

ان اشعار کی ندرت ملاحظہ ہو ؎

چراغِ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ　　یہ بزم تم کو مبارک ہو ہم تو چلتے ہیں

حکمت کا الٹ پھیر نہیں جنکی نظر میں　　وہ کہتے ہیں غافل یہ بقا ہی یہ فنا ہے

ا- ز- لکھنوی

تنقیدِ کتب

پرستانِ حکمت انگریزی میں مس ارے بیلہ بی بکلے کی بعض درسی کتابیں جو ہندوستان کے اسکولوں میں بھی نصابِ تعلیم کا کارآمد جزو بنی ہوئی ہیں اپنے دلکش طرزِ بیان اور سادگی عبارت کے اعتبار سے واقعی قابلِ ستایش ہیں انھیں میں "فیری لینڈ آف سائنس" بھی ہے جس کا ترجمہ پرستانِ حکمت المعروف بہ پرستان سائنس کے نام سے "پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی" کی ایما پر کیا گیا ہے- لالہ جیا رام ایم اے آنجہانی سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اسکے مترجم ہیں اور پروفیسر مولوی حاکم علی صاحب بی اے (اسلامیہ کالج لاہور) کی ترمیم و تصحیح کے بعد یہ کتاب شایع ہوئی ہے- کاغذ چھپائی

مجددالوقت مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت (میرٹھی) مدظلہ

انڈین پریس الہ آباد

تقطیع کے لحاظ سے اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو پنجاب کی درسی کتابوں کی ایک عام امتیازی نوعیت سمجھی جاتی ہے۔ نفس ترجمہ کے متعلق ہماری رائے میں اگرچہ انگریزی مطالب کو اردو کا جامہ پہنانے میں محنت و سعی سے دریغ نہیں کیا گیا تاہم ایک ایم اے مترجم اور ایک بی اے مصحح کی مشترکہ کوششیں اُسے والا و برنبانے میں خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوئیں۔

انگریزی کی اصل کتاب جن لوگوں نے دیکھی ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قابل مولفہ نے سائنس کے اہم اور دقیق مسایل پر کس سلاست اور خوش اسلوبی سے بحث کی ہے کہ اسکول کی ابتدائی جماعتوں کے لڑکے بھی انھیں بلا امداد غیرے ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ خوبی ترجمے میں مفقود ہے اور نقش اول کی بیند یدہ شان نقش ثانی میں نظر تک نہیں آتی۔ یہ ترجمہ طلبہ کے لئے کیا گیا ہے اور اس صورت میں زبان کی خوبی اور پاکیزگی کا کافی خیال ہونا چاہیئے تھا۔ یہ ضرور ہے کہ جن طالب علموں کو ان مسائل پر انگریزی میں تھوڑا بہت عبور ہو چکا ہے وہ اس کتاب کے مطالب سے بالکل ناآشنا نہیں رہ سکتے لیکن اگر کسی مبتدی کے ہاتھ میں یہ ترجمہ دیدیا جائے تو یقینی طور پر اُسے اکثر مقامات پر الجھن ہوگی۔ اس جگہ اُن مشکلات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو مترجم کو لازمی طور پر پیش آتی ہیں لیکن جہاں معمولی تغیر و تبدل سے زبان عام فہم اور بامحاورہ ہو سکتی ہو وہاں لفظی ترجمہ کی پابندی اس قدر سختی سے نہیں کی جاتی۔ اس ترجمہ میں ایسے کئی مقامات ہیں جہاں فقرات کی ترتیب اور الفاظ کی موزونیت اور تقدیم و تاخیر میں احتیاط سے کام لیا جاتا تو مضمون میں گنجلک نہ رہنے پاتی۔ اسی طرح بکثرت ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن پر لفظی ترجمہ کا اطلاق ہو سکتا ہے مثلاً کہلان، سست رو، اور تاریک جنبشیں، روز بنائے زمین، خلل یافتہ ہوا، بجنے والا کانٹا، وغیرہ۔ بعض لفظ ہیں تو اردو کے لیکن اُن کا استعمال یا تو غلط ہوا ہے یا وہ فصیح نہیں ہیں جیسے لمبوترے، صدمہ لگانا، ما نجھ دھار وغیرہ اصل کتاب کے ابتدائی حصہ میں کہیں کہیں با موقع اشعار بھی درج کئے گئے ہیں۔ مترجم صاحب نے بھی ترجمہ میں نظم کو نظم کی شکل ہی میں قایم رکھا ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کا ہر ایک شعر لفظی، معنوی اور اصولی اغلاط کا ایک معجون مرکب ہے مثلاً یہ اشعار ؎

ہمشیر مری نکل جہاں وہ میں وہاں ہوں — میں شیفتۂ غنچۂ بر گاؤزباں ہوں

گھر ہے وہ مرا اور میں سوتی ہوں وہاں جا — جب رات کو بوم اپنا ہے کھڑاگ سناتا

جب شدت گرما سے میں کچھ ہوتی ہوں مضطر — گلگشت کیا کرتی ہوں شپرک کے اوپر

کھڑاگ غالباً ڈھکڑے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ آخری مصرعہ وزن سے گرا ہوا ہے۔ شپرک کی پ پر تشدید دی گئی ہے لیکن پھر بھی موزونیت نہیں آئی۔ حالانکہ زباندانی کے انھیں اختیارات کے رو سے ک مشدد کر دیا جاتا تو وزن تو درست ہو جاتا۔

اسی قسم کے اور اشعار بھی دو چار جگہ ہیں۔ نظم کا ترجمہ نثر میں بھی کر دیا جاتا تو شاید اس سے بہتر ہوتا۔ پڑھنے والا ان شعروں کو پڑھکر لطف کیا خاک حاصل کریگا

درسی کتب میں اس قسم کی فروگذاشتیں حد درجہ قابل تاسف ہیں۔ اس خیال سے اور بھی افسوس ہوتا ہے کہ کتاب پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کی سرپرستی میں شایع ہوئی ہے اور اُن نونہالوں کے ہاتھ میں دینے کے لئے، جن سے آیندہ کبھی اپنے لٹریچر کی خدمت کی توقع ہو سکتی ہے۔ کمیٹی موصوف اپنی اس سہل انگاری کے لئے کبھی مستحق مبارکباد نہیں ہوگی۔ اسی قماش کی بے اصولیاں نظمیں رسالہ راوی میں بھی اکثر اوقات نکلتی رہتی ہیں - اسکا تعلق بھی کمیٹی سے ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ اردو لٹریچر کے ساتھ بے اعتنائی کا یہی عالم رہا تو ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب کی شہرت و عظمت کو صدمہ پہنچے بغیر نہ رہے گا۔

ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ بوستانِ حکمت کے آیندہ ایڈیشن میں نظر ثانی کر کے یہ تمام عیوب دور کر دیئے جائیں گے۔ اُسکے بعد یہ ترجمہ بہت قابل قدر ہو جائیگا اور ۱۲ میں جو اسکی موجودہ قیمت ہے، خریداروں کو گویا خزانۂ سائنس کی کنجی مل جائے گی۔

مقالاتِ شبلی | شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی ذات بابرکات بہی خواہانِ اردو

کے لئے مایۂ ہزار نازش ہے - آپ کا محققانہ طرز بیان اپنی آپ نظیر ہے - مختصر سا مختصر مضمون بھی تحقیق و تفتیش علمی کا ایک آئینہ ہوا کرتا ہے - گویا جو مابہ الامتیاز خصوصیات الفاروق و المامون کی دلچسپی کی کفیل سمجھی جاتی ہیں اُن سے وہ مضامین بھی مُعرا نہیں ہوتے جو ماہانہ رسالوں میں کبھی کبھی شایع ہوا کرتے ہیں اسکا تازہ ترین اور مزید ثبوت اُس کتاب کے صفحات سے بھی ملتا ہے جو مقالات شبلی کے نام سے، خوشنما چھپائی کے ساتھ، دبیز کاغذ پر آسی پریس لکھنؤ میں چھپکر حال میں شایع ہوئی ہے - مقالات شبلی نوعیت کے اعتبار سے رسایل شبلی کا نقش ثانی ہے یعنی اس میں ۱۵ مضامین ایسے جمع کئے گئے ہیں جو آخر الذکر کی اشاعت کے بعد لکھے گئے ہیں اور جن کی ترتیب و تدوین اس وقت تک نہوئی تھی - ان میں سے مسلمانوں کی علمی بے تعصبی بیچ بھاشا اور مسلمان اہل شعر ہندوستان میں اسلامی حکومت کا اثر، زیب النسا، جہانگیر اور تو زک جہانگیری خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں - پہلے اور دوسرے مضامین کے مطالعہ سے مسلمانوں کی من حیث القوم معارف پروری اور علمی بے تعصبی آئینہ بن کر سامنے آجاتی ہے - جو لوگ مسلمانوں کو برج بھاشا سے غفلت اور لا پرواہی برتنے کا الزام دیتے ہیں اُن کی زبان مولانا شبلی کے مورخانہ استدلال سے یقیناً بند ہو جائیگی البتہ یہ افسوس ضرور ہے کہ یہ شغف مسلسل قایم نہ رہا ورنہ ملک محمد جایسی اور امیر خسرو ایسے صاحب دل شعراء کے جانشینوں کا کلام تاثیر اور مذاق کے اعتبار سے آج اس قدر گرا ہوا نہ ہوتا -

زیب النساء والا مضمون ہے تو مختصر لیکن اسکی ضرورت تھی کہ اُن بیجا اور فضول روایات کی تردید مولانا شبلی ہی ایسے محقق کے قلم سے ہوتی جو اس بیکمال خاتون کے علمی و اخلاقی شہرت کو صدمہ پہنچانے والی ہیں - مولانا شبلی کو رائج الوقت دیوان مخفی کے زیب النساء کی تصنیف ہونے سے اختلاف ہے لیکن اُسکے کسی شعر کا ایک مصرعہ اس وقت ہمارے ذہن میں ہے ع

دخترِ شاہم ولیکن رُو بہ فقر آوردہ ام

اس لحاظ سے زیب النساء اور مخفی کی حیثیت جداگانہ معلوم نہیں ہوتی یہ بھی ضرور ہے کہ روایت و درایت سے مولانا شبلی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اُن کا ابطال بھی آسانی سے نہیں ہوسکتا - جہانگیر اور تو زک جہانگیری میں شاہنشاہ جہانگیر کے مشاغل و مصروفیت کی اس قدر صحیح اور سچی تصویر دکھائی گئی ہے کہ باید و شاید اسی طرح او باقی تمام مضامین علمی معلومات اور محققانہ خیالات سے لبریز ہیں - ہندوستان میں کسی علم دوست کا کتب خانہ اس مجموعہ سے خالی نہ رہنا چاہئے جو شایقین کو لکھنؤ، ندوۃ العلماء، کے پتہ پر حضرت مصنف سے مل سکتا ہے قیمت کتاب پر کہیں نہیں لکھی -

تاریخ جنگ طرابلس مصوّر | اسوقت تک جنگ ٹرکی و اٹلی پر اُردو میں کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں لیکن مضامین کی ترتیب، اور معلومات کی بہتات کے لحاظ سے کتاب زیر تنقید سب پر فوقیت رکھتی ہے - اس میں آغاز جنگ سے لیکر مارچ سنہ ۱۹۱۲ء تک کے سارے واقعات چشم دید نہایت سلیقے اور قابلیت کے ساتھ اس طریقے سے قلمبند کئے گئے ہیں کہ ہر ایک واقعہ کے علل و نتایج پر بھی ساتھ ہی ساتھ ضروری بحث ہوتی گئی ہے - شروع میں طرابلس کا جغرافیہ ہے - پھر جنگ کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے - دولتہائے ٹرکی و اٹلی کے مابین جو خط و کتابت ابتداءً ہوئی ہے اُسکا مطالعہ یقیناً ہر ایک کے لئے دلچسپ ہوگا - اس سے یہ ظاہر ہوسکتا ہے کہ زیادتی کدھر سے ہوئی ہے - کتاب کا وہ حصہ بھی غایت درجہ دلچسپ ہے جہاں دکھایا گیا ہے کہ انگلستان اور ہندوستان کے بڑے بڑے انگریزی اخبارات نے اس خدا واسطے کی خونریزی پر کس عنوان سے نظر ڈالی ہے -

معرکۂ بن غازی کے علاوہ اور بھی کئی معرکتہ الآرا لڑائیوں کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ وہی حالات حتی الوسع کتاب میں جگہ پائیں جنکے مستند اور مسلم ہونے میں شک نہو - حق یہ ہے کہ قاضی عبد اللطیف صاحب ایم اے سابق ایڈیٹر دار السلطنتہ و حال مترجم حبل المتین نے اس تاریخ کی ترتیب و تدوین میں کمال عرقریزی سے کام لیا ہے اور اسکے لئے وہ پبلک کے شکریہ کے مستحق ہیں -

کتاب ٹائپ میں صفائی سے چھپی ہے اور تصویروں سے مزین ہے۔ سلطان روم محمود شوکت پاشا، غازی انور بے وغیرہ کی جداگانہ تصاویر کے علاوہ کئی تصویریں ایسی ہیں جو افواج کی کسی نہ کسی خاص حالت یا نقل و حرکت کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ سین نہایت دردناک ہے جس میں پردہ نشین عرب عورتیں بحالت قید اطالوی سپاہیوں کی نگرانی میں اپنے مقتول وارثوں اور عزیزوں کی نعش پر سے گذر رہی ہیں۔ تصاویر کسی قدر دھندلی ضرور ہیں۔ پھر بھی کتاب ان سے رونق دار بن گئی ہے۔ جو شائقین بیسویں صدی کی اس مشہور جنگ کے حالات شرح و بسط سے معالعہ کرنا چاہیں وہ دفتر حبل المتین کلکتہ سے قیمت پر منگوا سکتے ہیں۔

اخبار نویسوں کے حالات منشی محمد الدین صاحب فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین لاہور نے اس نام سے حال میں ایک کتاب شایع کی ہے جس میں ہندوستان کے بعض اردو اخبار نویسوں کے بالتصویر حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ مضامین کم و بیش دلچسپی سے خالی نہیں لیکن عجلت میں دو ایک باتوں کی کمی ضرور رہ گئی ہے۔ مثلاً ایڈیٹر صاحبان کی تصویریں اس قدر ناقص اور مسخ ہیں کہ بحالت موجودہ ان کا نہ ہونا ہی اچھا تھا۔ بہتر تو یہی تھا کہ چھوٹے چھوٹے جداگانہ بلاک بنوا کر ان صاحبوں کی ہاف ٹون تصویریں کتاب میں شامل کی جاتیں۔ اور اگر اس قدر اخراجات کا تحمل ہونا ممکن نہ تھا تو کسی ویسے گروپ سے بہ آسانی کام نکل سکتا تھا جیسا کہ کچھ دنوں پیشتر ادیب میں نکل چکا ہے۔ ایک فروگذاشت یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ جہاں بعض رسمی ایڈیٹروں کو پبلک سے روشناس کرانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں اکثر پرانے اخبار نویسوں کا خیال تک نہیں کیا گیا۔ مولوی ممتاز علی، بابو گنگا پرشاد ورما، مولوی وحید الدین سلیم، مولوی بشیر الدین، اور ایڈیٹر صاحبان اخبار عام و اودھ اخبار بہ حیثیت اپنی قدامت اور قابلِ قدر خدمات کے بہر نوع اس تذکرہ میں شامل ہونے کا حق رکھتے تھے۔ اسی طرح مفصلات کے اور بہت سے اخبار نویس رہ گئے ہیں۔ زمیندار، وطن، اور ملت کے ناگوار قضیے اور جھگڑے اگر اس میں جگہ نہ پاتے تو زیادہ مناسب تھا کیونکہ اس سے اردو جرنلزم کا نہایت تاریک اور قابل نفرت پہلو نظر آتا ہے تاہم موجودہ صورت میں بھی کتاب دلچسپ ہے۔ امید ہے کہ حسب وعدہ آیندہ ایڈیشن میں یہ نقایص دور ہو جائیں گے اور مضامین کی ترتیب و تکمیل اس طریقے پر کر دی جائے گی کہ اردو اخبار نویسی کی تاریخ مدون ہونے کی حالت میں اس سے کافی مدد مل سکے گی۔ قیمت ۸ رکھی ہے جو کچھ زیادہ ہے۔ مؤلف صاحب سے مل سکتی ہے۔

مضامین خواجہ حسن نظامی مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب کا نام نامی با خبر علمی حلقوں میں معرفی سے مستغنی ہے۔ آپ کے مضامین زمانہ مدید سے ذی بصیرت اصحاب کے لئے علمی، اخلاقی، اور روحانی معلومات کا خاص ذریعہ ثابت ہو رہے ہیں اور آجکل تو آپ کی مختصر سی مختصر تحریر بھی غایت درجہ کی دلچسپی کا سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔ اندازِ کلام، طرز بیان، اور خوبیِ زبان کے ساتھ آپ کے مضامین میں تصوف کی چاشنی سونے میں سہاگے کا کام دیتی ہے اور ان کے مطالعہ سے ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق حظ اٹھا سکتا ہے۔ آپ کے اسی قسم کے اکثر قدیم و جدید مضامین کا مجموعہ سالِ حال میں شایع ہوا ہے۔ ہم نے اس کتاب کو غایت ذوق و شوق کے ساتھ دیکھا ہے اور ہمیں بلا خوفِ تردید یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ہر ایک مضمون اپنی نوعیت اور شان کے لحاظ سے انوکھا اور نرالا ہے۔ کہیں کہیں مضامین کی ترتیب زمانہ تصنیف کے اعتبار سے الٹ پلٹ گئی ہے لیکن اس سے مجموعہ کی دلفریبی میں کوئی نقص نہیں آنے پایا۔ شروع میں میر نیرنگ کے قلم سے ایک مختصر سا دیباچہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ کاش مصنف کی سوانح عمری کے لئے بھی دو چار صفحوں کی گنجایش نکالی جاتی! یا اسی دیباچہ میں اختصار کے ساتھ اس بات کی صراحت کر دی جاتی کہ خواجہ صاحب کا یہ رنگ، کتنے تغیر و تبدل کے بعد یا کن کن اثرات کے باعث، بحالت موجودہ پختہ ہوا ہے۔

جدت خیال کے ساتھ بعض عنوان بھی اس انداز سے قایم کئے گئے ہیں کہ بادی النظر میں انہیں کوئی وقعت نہیں دیجا سکتی مثلاً دیا سلائی، الو، جونک

مٹی کا تیل۔ ان کو دیکھکر نیچرل طور پر یہی خیال ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی نوعیت اور معلومیت کے متعلق اظہار رائے سے کام لیا گیا ہوگا لیکن جب اصل مضمون پر عبور ہوتا ہے تو حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ اخلاق و تصوف کے کیسے کیسے اہم مسایل کے آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے غدر ۱۸۵۷ء کے متعلق بعض عبرت انگیز اور دردناک مضامین خصوصیت سے ذکر کے لایق ہیں۔ اس قسم کے کئی مضمون اس مجموعہ میں موجود ہیں جن کے دیکھنے سے بدنصیب بہادرشاہ اور اُسکی اولاد کی کس مپرسانہ زندگی کا حسرت خیز فوٹو آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے "بھکاری شہزادے" کے عنوان سے کئی سال ہوئے آپ کا ایک مضمون پیسہ اخبار اور وکیل میں نکلا تھا، اور عام طور پر موثر و مقبول ثابت ہوا تھا۔ اسی قبیل کے کئی مضمون اس کتاب میں دیکھنے کے لایق ہیں قیمت ۸ر جو چنداں زیادہ نہیں۔

اسلام کا انجام | دیار مصر کے ایک نامور بزرگ علامہ سید توفیق بکری کے رسالہ "المستقبل الاسلام" کا یہ اُردو ترجمہ ہے جو حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کے ایما سے حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی نے شایع کرایا ہے اور غالباً حضرت خواجہ صاحب موصوف اسکے مترجم بھی ہیں جیساکہ اس رسالے کے نام سے ظاہر ہے اس میں بعض اسباب و قراین کی بنا پر یہ بات دکھائی گئی ہے کہ مذہب اسلام کی حالت آخر کار کیا ہوگی لیکن درمیان میں بعض ایسے مباحث اور اقتباسات بھی شامل ہوگئے ہیں جنکا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ مثلاً اسلامانانِ عالم کی مجموعی تعداد، تمدن جدید و قدیم کا موازنہ، اور اشاعتِ اسلام کے عنوان سے جو باتیں درمیان میں آگئی ہیں وہ دیکھنے کی چیز ہیں۔ جابجا یورپ کے مسلم الثبوت فضلا و حکما کی آرا سے استناد کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ تحقیقات قدیم کا نمونہ نہیں ہے بلکہ انداز جدید پر اسکی ترتیب ہوئی ہے اور آجکل جبکہ آثار و قراین سے مسلمانوں کا اور اُن کے ساتھ اسلام کا خاتمہ نظر آرہا ہے اس مختصر سی کتاب کا مطالعہ دلبستگی کا ذریعہ ہوگا قیمت ۴ر ہے۔

اسرار | یہ تیسری کتاب زیر تنقید بھی مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب کے مخصوص عالمانہ و متصوفانہ مذاق کے ثبوت کے طور پر بغرض ریویو دفتر ادیب میں موصول ہوئی ہے۔ یہ "ذکر الاسرار" کا ترجمہ ہے جو بابیہ فرقے کے بانی جناب بہاء اللہ افندی نے تصنیف فرمایا تھا اور خواجہ صاحب کو اُن کے گذشتہ سفر مصر کے موقع پر مصنف کے فرزند و جانشین نے تحفۃً مرحمت فرمایا تھا۔ اس میں تصوف اور روحانیت کے بہت سے اسرار اور رموز فرقۂ بابیہ کے نقطۂ خیال سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ ترجمہ میں یہ بات اچھی کی گئی ہے کہ اصل متن بھی شامل ہے۔ جن صاحبوں کو تصوف کا ذوق ہو وہ اسے ضرور منگائیں۔ اوپر کی تینوں کتابیں منیجر صاحب رسالہ نظام المشایخ۔ فیض بازار دہلی سے طلب کرنا چاہیئے۔ اسرار کی قیمت بھی ۴ر مع محصول ہے۔

حدایق البیان | مولانا محمد عبد الغفور صاحب فاروقی ضلع اعظم گڈھ کے رئیس ہیں اور ایک عرصہ تک معو بجات متحدہ میں سب جج کے فرایض خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے کے بعد اب پنشن لیکر خانہ نشین ہیں۔ شیدائیان علم و فن کے لئے یہ امر قابل اطمینان ہے کہ آپ کا یہ زمانہ علمی مشاغل میں گذر رہا ہے۔ تصانیف کی تعداد کے لحاظ سے تو آپ کا نام مشہور مصنفین کی فہرست میں نمایاں جگہ شاید نہ پا سکے لیکن جو دو ایک کتابیں ابتک آپ کے قلم سے نکل چکی ہیں وہ اپنے محاسن و فضایل کے اعتبار سے بہرصورت قابل قدر ہیں یہ ضرور ہے کہ مباحث و مضامین کے لحاظ سے یہ کتابیں صرف مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کو پورا کر سکتی ہیں لیکن جس غرض سے وہ لکھی گئی ہیں اُسکے بوجہ احسن پورا ہونے میں شک نہیں۔ آپکے قلم سے کچھ سال پیشتر مصباح الکلام فی طریق الاسلام نکل چکی ہے اب اسی نوعیت کی ایک اور دوسری کتاب حدایق البیان فی معارف القرآن کے نام سے شایع ہوئی ہے۔ اس میں قرآن شریف سے متعلق بہت سی عجیب و غریب تحقیقات سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن، سورۃ، آیۃ، مکی، مدنی وغیرہ کی لفظی، معنوی و اصطلاحی تحقیق قابلیت سے کی گئی ہے۔ اسی طرح بہت سی تاریخی معلومات مستند و معتبر حوالوں سے فراہم کی گئی ہے مثلاً

قرآن کب اور کیونکر بہ شکلِ کتاب جمع کیا گیا' ایجاد علم الخط' تذکرہ وضع حرکات۔ ان بحثوں میں اکثر کارآمد نکات کا جاننا بلا اختلاف مذہب ہر شخص کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ مصنف نے اختلافی اُمور میں صرف دوسروں کی رائیں نقل کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ روایت کے ساتھ درایت کے اُصول سے بھی ضرورتاً کام لیا ہے' قرارت فاتحہ اندر نماز' بیان تعوذ' فضائل قرارت قرآن' آداب تلاوت' وغیرہ ان تمام عنوانوں سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خالص مسلمانوں کی ضرورت کی چیز ہے لیکن کہیں کہیں سیاق کلام و عبارت میں کوئی ایسا مسئلہ بھی آگیا ہے جس کی نزاکت اور ندرت بالعموم ہر ایک مذہبی آدمی کے لئے قابل غور ثابت ہوگی۔ مثال کے طور پر حدیقہ اول "وحی اور تذکرہ تنزیل" کے تحت میں مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ انبیاء و مُرسلین کا عقل و فہم کے اعتبار سے عام طبقۂ انسانی سے افضل اور بالاتر ہونا بیان کرتے ہیں :-

خداوند عالم نے اپنی بے شمار مخلوقات میں مختلف قسم کے جذبے مختلف طرح کی قوتیں ودیعت رکھی ہیں جس سے دنیا کا کوئی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا۔ دوسرے انواع سے قطع نظر خود نوعِ انسان کے افراد میں ڈھونڈھنے والوں کو ظاہری باطنی ادراکی وغیر ادراکی قوتوں کے مختلف مدارج نظر آتے ہیں اور ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کوئی قوت کسی انسان کی ایسے اعلیٰ درجہ پر ترقی کرجاتی ہے کہ دیکھنے والے اُس کو شعبدہ خواہ جادو سمجھتے ہیں یا خوش اعتقادی کے ساتھ حلقۂ کرامت میں داخل کر لیتے ہیں۔ قوتوں کے عام تفاوت پر نظر کرکے انصاف پسند دانشمند بسہولت باور کرسکتا ہے کہ ہمارے ہمجنسوں میں خدا نے جن لوگوں کو واسطے خدمت رسالت اور ہدایت خلق کے منتخب کیا اُن کو بالضرور ایسی کامل قوتیں عطا کی ہوں گی جو اس خدمت کا اہم بار اُٹھا سکیں......

مولانا فاروقی نے راستہ تو وہی اختیار کیا ہے جو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سیکڑوں سال ہوئے دکھا گئے تھے لیکن اندازِ بیان ضرور ایسا رکھا ہے جو عام فہم اور قرین عقل کہا جاسکتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے کتاب سقم سے خالی ہے۔ البتہ کہیں کہیں مولویانہ رنگ آگیا ہے اور الفاظ میں بلاضرورت تقدیم و تاخیر پیدا ہوگئی ہے۔ ایک آدھ لفظ انگریزی اس طرح استعمال ہوا ہے کہ مضامین کی بلندی اور متانت اُسے قبول نہیں کرتی۔ اس سے قطع نظر کتاب کا کاغذ خط چھپائی سب نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے اور ساڑھے تین سو صفحے کا یہ نادر و نفیس مجموعہ ۱۲ رعایتی قیمت پر بالکل مفت ہے۔ رعایتی قیمت آخر محرم تک رہیگی اور مؤلف سے محمد آباد گہنہ، ضلع اعظم گڈھ کے پتہ سے ملے گی۔

آئینہ عظمت ہند | ضخامت کے لحاظ سے یہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن نوعیت مضامین نے اسکو دلچسپ بنا رکھا ہے۔ ملک راج صاحب شرما کا ممنون ہونا چاہیئے جنہوں نے نہایت جانفشانی سے قدیم سیاحان ہند از قبیل میگستھینز' پلائنی' اور ایرین کے سفرناموں کا خلاصہ اُردو میں کیا ہے۔ یہ سیاحت نامے انگریزی میں بھی کمیاب ہیں۔ جیسا کہ مترجم کے دیباچہ مشمولہ سے مترشح ہوتا ہے۔ کاش خلاصے کے عوض مکمل ترجمہ ہوتا تو کتاب اور بھی قابلِ قدر ہوجاتی۔ بحالت موجودہ اگرچہ فٹ نوٹ وغیرہ کے ذریعہ تفہیم واقعات کی کوشش کی گئی ہے لیکن کہیں کہیں سلسلۂ بیان ٹوٹ سا گیا ہے۔ پھر بھی ہندوستان قدیم کے بعض دلچسپ حالات ایسے موجود ہیں جنکا مطالعہ فایدہ سے خالی نہیں۔ انتظامِ حکومت' واقعاتِ سلطنت' فلسفۂ ہنود' ملکی پیداوار کے متعلق حیرت خیز معلومات جو اس میں قلمبند کئے گئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُسوقت ہندوستان کو جنت نشان کہنے میں مبالغہ کو مطلق دخل نہ تھا۔ مشہور لڑائیوں اور حملہ آور اقوام و سلاطین کا بھی مختصر حال دلچسپی کی چیز ہے۔ ہاں پُرانے نام اس کثرت سے آگئے ہیں کہ تاوقتیکہ اُن کی اصلیت نہ دریافت ہو' پڑھنے والا اُلجھن میں پڑ جاتا ہے۔ بہت سے ناموں کی تشریح فٹ نوٹ میں کردی گئی ہے اور یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ ۶ر قیمت بھی چنداں زیادہ نہیں ناولسٹ ایجنسی' لاہور روڈ' لاہور سے مل سکتی ہے۔

فن گھڑی سازی | بابو تیرتھ رام صاحب فیروزپوری کے مضامین رسایل اُردو میں بسا اوقات نکلتے رہتے ہیں اور اس اعتبار سے اُن کا نام تصریح کا

محتاج نہیں۔ مندرجہ عنوان نام سے آپ کی ایک تالیف حال میں شایع ہوئی ہے جو نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ لوگوں کو بابو صاحب ایسے 'ادبیات کے شیدائی' کے قلم سے اس قسم کے ٹھوس مضامین پر مستقل کتاب کا نکلنا تعجب خیز ضرور ہوگا لیکن اس کوشش کے بجائے خود فائدہ مند ہونے میں کلام نہیں غالباً اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو گھڑی سازی کے متعلق اتنی مبسوط لکھی گئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ساری معلومات کا ماخذ انگریزی کتب ہیں لیکن منشی صاحب نے مختلف شاخوں سے خوبصورت پھول جمع کرکے جو گلدستہ تیار کیا ہے اس سے اُن کی سلیقہ شعاری کی داد دینا پڑتی ہے۔ کتاب باتصویر ہے۔ اگرچہ تصویریں اس قدر صاف نہیں ہیں جتنی لیتھوگرافی کی مشکلات کے باوجود ہو سکتی تھیں۔ گھڑی کے مختلف پُرزوں کا اور اُن کی حرکات اور افعال کا تذکرہ شرح و بسط کے ساتھ کیا گیا ہے اور بگڑ جانے پر اُن کی درستی اور صفائی کے متعلق کارآمد ہدایتیں درج کی گئی ہیں۔ جابجا انگریزی نام ایسے ہیں جو معنوی نقاہت کا باعث قرار پا سکتے ہیں لیکن مؤلف کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ انہیں مترادف اصطلاحات کی عدم موجودگی سے ایسا مجبوراً کرنا پڑا ہے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی ہر شخص ضرورت کے وقت اس کتاب سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور ہندوستانی گھڑی سازوں کے لئے تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ملنے کا پتہ = مسرس لال برادرس۔ مادھوی بھنڈار نمبر ۷ پارسنز روڈ۔ نولکھا۔ لاہور۔ قیمت (عر)

علاج بلا ڈاکٹر | یہ کتاب بھی بابو تیرتھ رام صاحب کے قلم سے شایع ہوئی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں روزمرہ کے اکثر امراض و عوارض کے اسباب و علاج پر کافی ہدایتیں درج کی گئی ہیں اور اُن مقامات میں جہاں حکیم یا ڈاکٹر نہ مل سکتا ہو اسکی مدد سے آدمی بہت فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اولاد والوں کو اسکا ایک نسخہ اپنے یہاں ضرور رکھنا چاہیے قیمت عر ملنے کا پتہ وہی ہے جو "فن گھڑی سازی" کے تحت میں لکھا گیا ہے۔

انگریزی محاورات | اس نام سے دو رسالے، جلد اول و دوم کی تشریح کے ساتھ ہمیں بغرض ریویو وصول ہوئے ہیں۔ ان کے لئے بھی ہمیں بابو تیرتھ رام صاحب فیروزپوری کا ممنون ہونا چاہیے جنکی ہمہ گیر طبیعت کا قایل ہونا پڑتا ہے کہ وہ جس رنگ میں لکھتے ہیں اُسے اپنا بنا لیتے ہیں۔ یہ دونوں جلدیں اس قسم کے انگریزی فقروں اور جملوں سے لبریز ہیں جنکا استعمال انسان کی روزمرہ زندگی میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی شخص ان کے مطالعہ پر کاربند ہو تو انگریزی بول چال میں تھوڑی سی مدت میں بہت کچھ ترقی کر سکتا ہے۔ انگریزی جملوں کے سامنے اُردو ترجمہ موجود ہے جس سے مبتدی بھی بلا اُستاد کے اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ یہ دونوں رسالے درسی کتب کی ذیل میں آتے ہیں۔ اگر مدارس کی ابتدائی جماعتوں کے نصاب میں شامل کر دیے جائیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ حصہ اول کی قیمت ۶ر اور دوم کی ۱۲ر ہے ملنے کا پتہ = لال برادرس نمبر ۷ پارسنز روڈ۔ نولکھا۔ لاہور کافی ہے۔

تلاطم ایران | ملک الشعرائے انگلستان یعنی شکسپیر کے ایک مشہور عالم ڈرامے کا ترجمہ مسٹر سُہراب جی پیشنجی کانگا مددگار معتمد محکمہ فنانس حیدرآباد دکن نے تلاطم ایران کے نام سے اُردو میں چھپوایا ہے۔ شکسپیر کی اصلی تصنیف کی تعریف اس جگہ لاحاصل ہے کیونکہ اسکی ادبی خوبیاں اور ظاہری و معنوی محاسن سارے عالم میں مسلم ہیں۔ ترجمہ میں بھی ایک حد تک اصل کی نقل عمدگی سے کی گئی ہے۔ مترجم نے اس قدر جدت سے ضرور کام لیا ہے کہ قصہ کا منظر ایران کو بنایا ہے اور اشخاص ناٹک کے نام بھی اُسی مناسبت کے اعتبار سے رکھے گئے ہیں۔ قیمت وغیرہ کتاب پر درج نہیں۔ غالباً مترجم صاحب کے پتہ پر مل سکے گی۔

موتیوں کی کان | اس چھوٹی سی کتاب میں جناب بدر النسا بیگم صاحبہ (لدھیانہ) نے نامور حکما و علما اور مشایخ کی سودمند نصایح کو یکجا کیا ہے جو ایک مفید کام ہے۔ کمسن بچوں کے لئے اسکا مطالعہ از بس کارآمد ہوگا۔ پبلک کو بیگم صاحبہ موصوفہ کی اس علمی خدمت کا ممنون ہونا چاہیے۔

آجکل جبکہ تعلیم نسواں ہندوستان میں عام نہیں ہوئی ہم موتیوں کی کان" ایسی چھوٹی چھوٹی کتابوں کا خواتین کے قلم سے نکلنا غنیمت سمجھتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اسی مختصر سی بُنیاد پر کبھی سرفلک عمارت کھڑی ہوگی کتاب کے ملنے کا پتہ یہ ہے :- لُدھیانہ چھتی گلی متصل بورڈنگ ہاؤس - مکان سید عبداللطیف صاحب ڈسٹرکٹ جج -

جاماسپ نامہ | یہ حکیم زرتشت بانی مذہب آتش پرستی کے خلیفہ اعظم حکیم جاماسپ کی پشینگوئیوں کے مجموعہ کا اُردو ترجمہ ہے جو فارسی سے مُلّا محمد الواحدی ایڈیٹر نظام المشایخ دہلی نے کیا ہے - اس میں شک نہیں کہ اصل تصنیف قدامت کے لحاظ سے قابل قدر ہے اور چونکہ اسے حکیم جاماسپ ایسے ذی شہرت آدمی سے نسبت دیجاتی ہے اسلئے تاریخی حیثیت سے بھی اسکی دلچپسی مسلّم ہے - یہ بھی سچ ہے کہ اس میں بہت سی پشینگوئیاں ایسی درج ہیں جو اپنے اپنے وقت پر بالکل صحیح ثابت ہوچکی ہیں لیکن اسلامی نگاہ سے بھی جسکے صریح احکام علم نجوم پر اعتقاد رکھنے کے منافی ہیں، اس کتاب کے ساتھ حُسن اعتقادی کا ثبوت بمشکل دیا جاسکتا ہے - البتہ اسی کے ساتھ ایڈیٹر صاحب نظام المشایخ کی کوششوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے ایک مشہور اور قدیم کتاب کا ترجمہ کرکے اُردو میں اضافہ کیا ہے - جو لوگ ان معرکتہ الآرا پشینگوئیوں کو مطالعہ کرنا چاہیں وہ دفتر نظام المشایخ دہلی سے ۳ر میں منگا سکتے ہیں -

علاج الطیور | اس نام کا ایک رسالہ جو چھوٹی تقطیع کے تقریباً ۵ جزو پر ہے، ڈاکٹر صدیق حسین صاحب برنی معالج حیوانات، متعینہ مرزاپور نے چھپوا کر شایع کیا ہے - اس میں مختلف جانوروں اور پرندوں کے عوارض اور اُن کے اسباب وعلامات، علاج کے متعلق معقول تدابیر اور ہدایات مندرج ہیں - ان کی افزایش نسل اور پرورش کے بارے میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ نہایت مفید ہیں اور مرغیوں اور انڈوں کی تجارت کرنے والوں اور تیتر بٹیر کے پالنے والوں کو ان سے کافی مدد مل سکتی ہے - بظاہر یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے کیونکہ بیماریوں کے نام عموماً غیر زبان کے ہیں تاہم یہ غنیمت ہے کہ ہر ایک نام کے آگے قوسین میں اسکا اُردو مرادف بھی لکھدیا ہے - قیمت ۸ر کسی قدر زیادہ ہے - مولف سے طلب کیجئے -

کاشت زعفران | اب تک عام خیال یہی تھا کہ کشمیر کے علاوہ اور ہندوستان میں کہیں زعفران پیدا نہیں ہوسکتی لیکن بابو کنج بہاری لال زمیندار کندرکی ضلع مُرادآباد نے اپنے ہی علاقے میں اسکی کاشت کامیابی کے ساتھ کی ہے اور ایک پُرانے قیاس کو جو بمنزلہ عقیدے کے تھا باطل ٹھہرادیا ہے - رسالہ زیر تنقید میں بابو صاحب نے اپنے تجربہ کو بہ تفصیل درج کیا ہے اور طریق کاشت بھی بیان فرمایا ہے - آپ اسکے متمنی ہیں کہ اور لوگ بھی مختلف مقامات پر آپ کی تقلید کریں ہندوستان کے لئے وہ دن بہت مبارک ہوگا جب زعفران کی پیداوار یہاں عام ہوجائے گی اور زمینداروں اور کاشتکاروں پر اقتصادی فواید کا ایک اور دروازہ کھُل جائے گا - اس رسالہ کے شروع میں جس کی ضخامت بمشکل ایک جزو تک پہنچ سکتی ہے مولف کی ایک ہاف ٹون تصویر بھی شامل ہے اور رسالہ حضور بیگم صاحبہ بھوپال کے نام نامی پر معنون کیا گیا ہے - ہندوستان کے ذی حوصلہ زمینداروں کو اس کی ایک ایک کاپی ضرور منگا کر دیکھنا چاہیئے - قیمت کتاب پر درج نہیں ہے -

سید القلم

جیاجی پرتاپ - یہ ہفتہ وار اخبار ریاست گوالیار کی طرف ہندی و انگریزی زبان میں شایع ہوتا ہے اور نہایت محنت سے تیار کیا جاتا ہے - قیمت سالانہ ے ر مع محصول - زمینداروں کے لئے یہ بہت مفید ہے - بعض دوسری دیسی ریاستوں کی طرف سے بھی اخبارات نکلتے ہیں مگر انکا عدم وجود برابر ہے - جیاجی پرتاپ چوٹی کا اخبار ہے - حال میں اسکا سالگرہ نمبر شایع ہوا ہے جو بہت دلچسپ اور خوشنما ہے - تمام سیندھیا مہاراجگان، اراکین ریاست، ریاست کے بعض مناظر وغیرہ کی تصویریں بھی اس پرچہ میں شامل ہیں - حجم ۷۰ صفحات کلاں - قیمت ۸ر بہت کم ہے - ناظرین ضرور طلب فرمائیں -

اثرِ عشق

وہ وقت نہایت عجیب تھا جبکہ فوج کے آرمور رشاپ میں میرے سامنے خدماتِ منصبی کے باعث لوہے کے کام کا ایک انبار پڑا تھا ہاتھ کام میں مصروف تھے لیکن دماغ اور دل اپنا کام کر رہے تھے پہلو میں پنسل اور کاغذ بھی رکھا تھا اور ایک نظم "نمازِ عشق" لکھی جا رہی تھی - اُسی حالتِ کیف و حال میں ایک مولوی صاحب جو کہ ایک مسجد کے پیش امام تھے مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے اور اس کیفیت میں دیکھکر اُنھوں نے جو کچھ فرمایا اُسکے اندازنے بعد میں اثرِ عشق کی اندرونی کیفیات سے جذبات کو نظمِ ذیل کی صورت میں ظاہر کیا جو ناظرینِ ادیب کے پیشکش کیجاتی ہے۔

دلِ حمید ہوا جب شہیدِ خنجرِ ناز   کھلی عجیب مگر اُس پہ راہِ راز و نیاز
ہوا وہ مستِ تمنائے بادۂ صافی   مقامِ فوج کو اُس نے بنا لیا شیراز
ہر ایک جلوہ کو دیکھا بصد نگاہِ عمیق   بگوشِ ہوش وہ سُنتا رہا ہر اک آواز
فریبِ عشق میں اُس نے وہ حسن دیکھ لیا   کہ جسکا سارے جہاں سے ہے دلربا انداز
قدم قدم پہ وہ ہونے لگا جو سر بسجود   نیاز مند بنا جب تو دیکھی اوجِ فراز
جہاں میں چاروں طرف اُس نے وہ ضیا دیکھی   ہے جسکی سارے زمانہ سے طرفہ تر پرواز

مگر وہ مستِ محبت جہاں فدائے نفاق   عجیب تر ہے یہ انجام کار کا آغاز
خدا ہی ہم سے طلبگار مہر و انس و خلوص   یہاں ہے بغض و عداوت دلوں میں فتنہ طراز
جو شے کہ چاہیئے دل میں ہمیں خبر ہی نہیں   غرور و کبر و ریا کی سند ہے اپنی نماز
بُرا جہاں کو سمجھنا ہے فلسفہ اپنا   اسی جہاں میں مگر بند ہے نجات کا راز
زباں پہ نامِ خدا او صنم کدے دل میں   دماغ کفر کا مخزن دلوں میں ذوقِ حجاز
عجب طرح کے تذبذب سے پُر ہے یہ اسلام   کئے ہیں سب نے گلیمِ خرد سے پاؤں دراز

ہنسا میں جبکہ ملے ایک مولوی صاحب   لگے وہ کہنے کہ اے قاضیٔ فدائے نیاز
یہ فوج اور یہ آہنگری کے کام کا شغل   تفنگ سازی کے اس کام میں یہ سوز و گداز
اُدھر وہ ذوقِ سخن اور اِدھر یہ حالِ عجیب   سپاہیوں میں برابر ہے ہر طرف تگ و تاز
یہ جاہلوں کی ہی مجلس تمھیں ہے علم کی دُھن   پھر اُس پہ کام بھی لوہے کا ہے عجیب یہ راز
کبھی کبھی وہ سُناتے ہو مسئلے ہم کو   کہ جنکو سُن کے سبھی کہتے ہیں کہ ہے اعجاز
یہ کام سخت ہے تم چھوڑ کیوں نہیں دیتے   خُدا نے دی ہے تمھیں طرفہ قوتِ پرواز

سُنیں جو میں نے یہ باتیں مجھے ہنسی آئی   کہ ہیں یہ مولوی صاحب پُرانی طرز کے ساز
سمجھتے ہیں یہ فقط ٹیپ ٹاپ کو مذہب   ہے اُن کے زہد و ورع کا مگر یہی انداز
یہ محنت اور مشقت کو جانتے ہیں فضول   ہے اِن کے دل میں فسوں ساز ذوقِ عزت آز
نہیں نیازِ خرد آفریں کی اِن کو خبر   یہ مومنوں کو سکھاتے ہیں رازِ نذر و نیاز

کہا یہ میں نے کہ ہاں سچ ہے مولوی صاحب   یہ میری راحتِ پنہاں کی داستاں ہے دراز
سمجھ لیا ہے یہ میں نے کہ عام کیا شے ہے   میں جانتا ہوں مرے کام کی ہے کیا پرواز
میں دیکھتا ہوں کہ ہے فوج میں خردے نفور   مری نگاہ میں محمود بھی مگر ہے ایاز
نہیں ہے پیشہ کوئی بھی منافیِ اسلام   اسی طریق سے ہوتی ہے عاقلوں کی نماز
جمالِ دوست مرے سامنے ہے کام میں بھی   نگاہِ شوق میں کوئی نہیں خلل انداز
ہر ایک چیز مرے واسطے ہے آئینہ   وہ آئینہ کہ ہے جس میں شہودِ سوز و گداز
نیاز مند بنا جب تو بے نیاز ہوں میں   اب اس سے آگے نہ پوچھو حدیثِ عالمِ راز
حمید کو بھی نہیں ہے خبر حمید کی اب   وہ بیخودی ہے کہ جس پر فدا ہیں ناز و نیاز
بلا سے کوئی کہے یہاں بُرا بھلا مجھکو   مری زباں ہے دعاگوئے ہند و چین و حجاز
اگر ہو چشمِ بصیرت تو ہر جگہ حق ہے   کہاں کا روئے حسیناں کہاں کا عشقِ مجاز

منم کہ دیدہ بدیدارِ دوست کردم باز
چہ شکر گویمت اے کارساز بندہ نواز (حافظ)

قاضی حمید الدین احمد حمید

میر امجد حسین صاحب ماہ عظیم آبادی

انڈین پریس الہ آباد

گورِ غریباں

کچھ عجب گورِ غریباں ہے مقامِ راحت ۔ نہ کسی سے انھیں مطلب نہ کسی سے حاجت
ایک حالت سے یہاں شاہ و گدا رہتے ہیں ۔ نظر آتی ہے فقط اس میں خدا کی قدرت
اپنے بیگانے یہیں آکے ہوئے ہیں لاکھوں ۔ یوں جدا ہیں کہ زمانے سے ہو جیسے نفرت
کہیں اُکھڑے ہوئے تعوید لحد کے دیکھے ۔ ٹوٹی پھوٹی ہوئی قبروں سے ہے ظاہر غربت
کہیں افسوس میں پروانوں نے دی جانیں ہیں ۔ کہیں ٹپکے ہوئے ہیں شمع کے اشکِ حسرت
پھول پژمردہ کسی جا دلِ عاشق کی طرح ۔ کہیں اُلٹے ہوئے رکھے ہیں چراغِ تربت
بے ثباتیِ جہاں پر کہیں گل ہنستے ہیں ۔ پاسبانی کو فقط ہے کہیں یاس و حسرت
جا بجا ہے بھی جو سبزہ تو وہ خوابیدہ ہے ۔ انقلاباتِ زمانہ نے وہ بدلی ہیئت
ایک سناٹا سا چھایا ہوا ہے چار طرف ۔ خس و خاشاک سے پوشیدہ ہے ایک اک تربت
چشم بھر آئی یہ سامان جو دیکھے آکر ۔ دل میں آیا کہ ذرا پوچھیے ان کی حالت
پوچھا اے اہلِ قبور آہ ہو کن حالوں میں ۔ درد و اندوہ میں گذری کہ اُٹھائی راحت
کس طریقے پہ ملے لوگ یہاں کے تم سے ۔ کینہ و بغض کی صورت ہے کہ ہے کچھ اُلفت
واں چمن کیسا ہے تم جا کے جہاں اُترے ہو ۔ پھول دنیا کے وہاں یا ہے نرالی رنگت
آئی آواز کہ کچھ پوچھ نہ افسوس اے دوست ۔ کیا کہیں تجھ سے کہ ناگفتہ ہے یاں کی حالت
نہ یہاں دوست نہ احباب نہ صحبت نہ مذاق ۔ جو ہے تنہا ہے یہاں اور ہے اندھیری تربت
وہ تجھے یاد ہو شاید مری نازک بدنی ۔ عطر مٹی کے بھی ملنے سے مجھے تھی نفرت
رات دن جمع رہا کرتے تھے اربابِ نشاط ۔ جمگھٹے رہتے تھے کٹتی تھی بعیش و عشرت
یا وہی ہم ہیں اب اور گوشۂ تنہائی ہے ۔ ہُو کا عالم ہے یہاں اور مقامِ حسرت
پُرسشِ اعمال کی اور آہ اندھیری راتیں ۔ ہم سمجھتے تھے کہ کچھ مر کے ملے گی راحت
شمعِ تربت کے سوا اور کوئی دل سوز نہیں ۔ وہ بھی ہو جاتی ہے رو دھو کے سحر تک رخصت
غیر تو غیر ہے کیا اُس کی شکایت کیجیے ۔ جبکہ اپنوں میں وہ باقی نہ رہی کچھ اُلفت
نہ ہمیں کہنے کی فرصت نہ تمھیں سننے کی ۔ سب کہیں حال کہاں اتنی بھلا ہے فرصت
فاتحہ سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ۔ آج کیا ہو گئی افسوس وہ پہلی چاہت
بات رہ جائے گی یہ وقت گذر جائے گا ۔ ایک دن اُن کی بھی آخر یہی ہو گی نوبت

جانتے ہیں کہ ہمارا بھی یہی ہے انجام
اس پہ بھی اہلِ جہاں کو نہیں ہوتی عبرت

ماہ عظیم آبادی

تحریکِ علم

مژدہ اے قوم ترقی کا زمانہ آیا ۔ مژدہ اے قوم کہ ہے فضلِ خدا کا سایا
مژدہ اے قوم بلندی پہ ہے تیرا پایا ۔ مژدہ اے قوم محبت کا شجر پھل لایا
مست ہیں اپنے خیالات میں بھولے بھالے ۔ بادۂ علم و فضیلت سے ہوئے متوالے
اہلِ مغرب کی ترقی پہ نظر کرتے ہیں ۔ دل میں تہذیب کے الفاظ اثر کرتے ہیں
تنگدستی سے مصیبت سے بسر کرتے ہیں ۔ علم کے شوق میں لندن کا سفر کرتے ہیں
فکر در پیش ہے بگڑی کو بنائیں کیونکر ۔ قوم کو قعرِ مذلت سے بچائیں کیونکر
کوئی کہتا ہے تجارت سے ترقی ہوگی ۔ کوئی کہتا ہے زراعت سے ترقی ہوگی
کوئی کہتا ہے سیاحت سے ترقی ہوگی ۔ کوئی کہتا ہے لیاقت سے ترقی ہوگی
کوئی کہتا ہے جوانوں کی ہو پوری تعلیم ۔ کوئی نسواں کی سمجھتا ہے ضروری تعلیم
سب ترقی کے خیالات میں دیوانے ہیں ۔ ایک ہی شمعِ شب افروز کے پروانے ہیں
رتبے اسلاف کے [illegible] پہچانے ہیں ۔ گوش زد اپنے مشاہیر کے افسانے ہیں
عقل کہتی ہے فقط علم کی تحصیل کرو ۔ جس طرح ہو سکے تعلیم کی تکمیل کرو
علم ہے قوم کو سوتے سے جگانے والا ۔ علم ہے گردِ کدورت کو مٹانے والا
علم ہے دولت و عزت کو بڑھانے والا ۔ علم ہے صنعت و حرفت کا سکھانے والا
علم وہ بحر ہے گوہر ہیں ہزاروں جس میں ۔ علم وہ تیغ ہے جوہر ہیں ہزاروں جس میں
علم ہی جلوہ دکھاتا ہے نظر بازوں کو ۔ علم ہی سر پہ چڑھاتا ہے سرافرازوں کو
علم ہی کھولتا ہے عقل کے دروازوں کو ۔ علم ہی جانتا ہے غیب کی آوازوں کو
ناخدا علم سمندر میں ہے ہر کشتی کا ۔ رہنما علم ہے صحرا میں دلِ وحشی کا
کون ہے عدل کی دنیا میں نشانی جس سے ۔ دودھ کا دودھ ہو پانی کا ہو پانی جس سے

منکشف ہو گئے اسرارِ نہانی جس سے
سیکھ لی نطق نے اعجاز بیانی جس سے

علم دیتا ہے سبق مرشدِ کامل ہو کر
رونقِ بزمِ جہاں زینتِ محفل ہو کر

روشنی علم کی ہے نورِ خدا میں کیا ہے
علم کا سحر ہے موسیٰ کے عصا میں کیا ہے

علم سے علم ہوا ورنہ بقا میں کیا ہے
آب میں خاک میں آتش میں ہوا میں کیا ہے

جلوہ گر علم کی صورت میں خدا ہوتا ہے
علم کب ذات سے خالق کی جدا ہوتا ہے

علم سے ہوتا ہے ہر کام بخوبی انجام
علم نے چرخ پہ باندھا ہے ستاروں کا نظام

علم کے زور سے گردش ہے زمانے کو مدام
شمس کو ہے نہ قمر کو نہ زمیں کو ہے قیام

صبح ہوتی ہے یونہی شام یونہی ہوتی ہے
عمر آخر دلِ ناکام یونہی ہوتی ہے

علم دنیا میں زر و مال کا سرچشمہ ہے
علم اجلال کا اقبال کا سرچشمہ ہے

علم آداب کا افعال کا سرچشمہ ہے
نیک اخلاق کا اعمال کا سرچشمہ ہے

کھیتیاں اس سے مرادوں کی ہری رہتی ہیں
ندیاں آبِ فضیلت سے بھری رہتی ہیں

دولت علم کے بنتے ہیں خزانے سینے
ایسی دولت ہے جسے چور نہ رہزن چھینے

بام اونچا ہے بتدریج ہیں اسکے زینے
نام پایا ہے اسی علم سے خاقانی نے

مدتیں ہو گئیں فردوس میں فردوسی ہے
شاہنامے سے مگر نام ابھی باقی ہے

اہلِ تصنیف کو دنیا میں بقا حاصل ہے
زندہ رہتا ہے سدا علم کا جو فاضل ہے

علم ہے حسنِ جہاں تاب مہِ کامل ہے
آنکھ میں نورِ نظر خانۂ تن میں دل ہے

علم زیور ہے پہنتی ہیں اسے بھولی بھالی
بیبیاں نیک حیادار گھرانے والی

علم سے تار لگا ڈاک گئی ریل چلی
لگ گئی آب رسانی کے لئے نل کی نلی

لیمپ روشن ہوا ہانڈی کہیں بجلی سے جلی
رشکِ مہتاب نظر آتے ہیں بازار گلی

کام کرتا ہے خدا جانے کہاں پر انجن
پنکھے بجلی سے چلا کرتے ہیں گھر میں سن سن

یا کہ فونوگرافوں نے اڑائی آواز
ہائے کس ناز سے انداز سے آئی آواز

تال سر سے کہیں پنجم میں لگائی آواز
پڑ گیا کان میں اس دل میں سمائی آواز

علم کی ٹیلی گرافی ہے عجب وائرلیس
عقل کی بیٹری کا قیدِ عجب وائرلیس

انڈی پینڈنٹ قلم کی ہے نرالی ایجاد
دیکھو صناعی میں یورپ کو ہیں کیا کیا استاد

باسر و چشم کریں فوٹوگرافی پر صاد
چوم لیں ہاتھ اگر دیکھ لیں مانی بہزاد

اس زمانے میں ترقی جو نمو حیرت ہے
شرم کی جا ہے جوانوں کے لئے غیرت ہے

اہلِ اسلام مددگار ہیں سارے اپنے
اور ہندو بھی طرفدار ہیں سارے اپنے

مونس و ہمدم و غمخوار ہیں سارے اپنے
علم و دانش کے طلبگار ہیں سارے

سرپرست علم کی اسوقت ہیں بیگم بھوپال
حوصلہ مند بلند ہمت و فرخندہ خصال

نیک دل نیک نفس نیک سیر نیک نہاد
قومی بچوں کو سمجھتی ہیں یہ اپنی اولاد

یہ تماشوں کے لئے سخت ہیں مثلِ فولاد
ورنہ اس دور میں بھوپال ہے بالکل آزاد

بد سے بد ملتے ہیں نیکوں سے بھلے ملتے ہیں
روز ہندو و مسلمان گلے ملتے ہیں

بات ملکہ[1] کی خوشی میں ہے نکالی معقول
ایسی تحریک زمانے میں رہے گی مقبول

لڑکیوں کے لئے کھولا ہے زنانہ اسکول
قاعدے خوب ہیں تعلیم کے اچھے ہیں اصول

شاد آباد رکھے ان کو خدا تا بہ ابد
کرتی رہتی ہیں مصیبت میں غریبوں کی مدد

علم گہنا ہے خواتین کی زیبائش کا
علم جھومر ہے رخِ صاف کی آرائش کا

خانہ داری میں یہ سامان ہے آسائش کا
دھیان بیوی کو ہے خاوند کی فرمائش کا

منحرف اس سے نہیں کوئی خدا کی بندی
سیکھ جاتی ہیں تمیز اور سلیقہ مندی

ماں کی تعلیم کا بچوں پہ اثر ہوتا ہے
حوصلہ مند سکھانے سے پسر ہوتا ہے

نیک دل نیک صفت نیک سیر ہوتا ہے
راحتِ جان و جگر نورِ نظر ہوتا ہے

آپ کے پاک خیالوں کے مبارک ہیں پھول
فائدہ بخش ہے دلی میں زنانہ اسکول

اسکی تائید میں ہیں فیض رساں اجمل خاں
حاذق الملک شفا بخشِ جہاں اجمل خاں

علمِ حکمت میں فلاطونِ زماں اجمل خاں
طبیہ مدرسہ کے روحِ رواں اجمل خاں

شہر دہلی کے مطب ہیں عدیم الفرصت
علمی جلسوں میں مگر رکھتے ہیں پھر بھی شرکت

انکی کوشش سے عجب کیا ہے زمانہ بدلے
قوم کے رنج و مصیبت کا فسانہ بدلے

باغ میں بلبلِ نالاں کا ترانہ بدلے
سرو پابند ہو قمری کا ٹھکانہ بدلے

فارغ البال رہے قوم خلیق مضطر
ہند والوں میں رہے علم کا چرچا گھر گھر

خلیق دہلوی

---

[1] علیا حضرت ملکہ معظمہ میری قیصرۂ ہند دام اقبالہا۔

غمِ نادر

مرگِ نادر کی خبر کاش نہ آئی ہوتی　باعثِ گریہ نہ پوچھو اِنہ شنائی ہوتی
اک چہکتی ہوئی بلبل کا گلا یوں گھونٹا　ہائے او موت! تجھے موت ہی آئی ہوتی
کیا اندھیر ہے اے بادِ فنا کے جھونکو!　آہ یہ شمع تو تم نے نہ بجھائی ہوتی!
اے فلک! اور بھی نادر کو تو جینے دیتا　کونسی اس میں بھلا تیری برائی ہوتی
ندرت آمیز یہ تصویرِ تخیل افسوس!　دستِ بیدادِ اجل نے نہ مٹائی ہوتی
کب سے ہیں نالہ کشِ جورِ فنا دو معصوم　ان غریبوں کی فغاں کی شنوائی ہوتی
ہند میں آج جو تھا تو موجدِ نو طرزِ سخن　کوئی دن اور تری تازہ نوائی ہوتی
ترے جذباتِ مصفا تھے جواہرِ نادر　کوئی دن اور بھی دولت یہ لٹائی ہوتی
ابھی اترے ہی نہ تھے یاد سے آزاد و ہو　ترے سر میں تو سفر کی نہ سمائی ہوتی

مرنے والے جو یہ تعداد بڑھے جاتے ہیں
داغ تیرے دلِ ناشاد بڑھے جاتے ہیں

گلشنِ ہند کی رونق تھا ترانا تیرا　کون سے کنج میں اب ہوگا ٹھکانا تیرا
دیر تک تجھکو نہ بھولیں گے زمانے والے　گو بسر ہو گیا یوں جلد زمانہ تیرا
روئیں گے خلدۂ شعر میں آنے والے　چھیڑے گا پیرِ مغاں جب کہ فسانہ تیرا
ساغرِ نو میں مئے کہنۂ سرمد کی جھلک　برق شعلوں میں وہی سوز پرانا تیرا
بوئے گل پھاند کے دیوارِ گلستاں نکلی　بس یہی گلشنِ امکاں سے ہے جانا تیرا
محفل آرائے گلستانِ ارم ہو اب تو　یا اسی باغ میں پھر گونجے ترانا تیرا
چشمِ ظاہر سے تجھے دیکھ نہیں سکتے ہم　لے کہ تھا عیدِ احباب نظر آنا تیرا

کارسازاں کہ بہ اسرار زبانت دادند
مہرِ خاموشیٔ حسرت بہ زبانت دادند

کمھلایا ہوا پھول

ہے وہی تختۂ چمن ہے وہی موسمِ بہار　ہے وہی ابرِ دُرفشاں ہے وہی بادِ خوشگوار
بادِ صبا کا ویسا ہی باغ میں ہے خرامِ ناز　شاخوں کے درمیاں وہی جاری ہے گفتگوئے راز
سرو کھڑے ہیں ویسے ہی اپنی جگہ پہ باادب　ہے وہی شاخسار پر نغمۂ شادی و طرب
نرگسِ عشوہ ساز کی ہے وہی چشمِ نیم باز　سوسنِ بے تمیز کی ویسی ہی ہے زباں دراز
ہے وہی غنچوں کی ادا ہمہ تن گوش و بستہ لب　مثلِ بتانِ صغر سن جنکی ہو سادگی غضب
پتوں کا طرز ہے وہی پھولوں کا ہے وہی　پانی کی ہے وہی روش سبزہ کا ڈھنگ ہے وہی
باغ میں ہے ہر ایک چیز پہلے جہاں پہ تھی پڑی　ہے مگر ایک پھول یاں اپنی جگہ پہ جو نہیں
خاک پہ ہے پڑا ہوا بسکہ خراب و خستہ حال　پہلے کا رنگ اور بو ہو گیا سارا پائمال

کالی گھٹائیں چھا گئیں یک بیک آسمان پہ　اڑنے لگے پرند سب زور سے تان تان پر
ابرِ سیہ برس کے کچھ آپ ہی بند ہو گیا　چہرۂ عروسِ باغ کا آیا تھا دھونے دھو گیا
سارے چمن میں اس گھڑی اور ہی کچھ نکھار ہے　اور ہی کچھ کرشمہ ہے اور ہی کچھ بہار ہے
آئیں جب پھول توڑنے باغ میں پھول والیاں　وہ اٹھا انکا دستِ ناز وہ جھکیں نیچے ڈالیاں
یاں یہ بتانِ شوخ کچھ گرمِ خرامِ ناز ہیں　دیر سے کچھ جمے ہوئے واں پہ نظارہ باز ہیں
جلوہ فروز مہر کی کرنیں ہیں آسمان پر　جوشِ نشاط میں یہی شعر ہے ہر زبان پر
بادۂ دلکشا بجو تازہ بتازہ نو بنو　مطربِ خوشنوا بگو تازہ بتازہ نو بنو
بیٹھی ہے یاں پہ کوئی شاہدِ ناز آفریں　ایک ادائے دلفریب ایک نگاہِ شرمگیں
سرخ و سپید ہیں عذار غیرتِ لالہ و سمن　آنکھوں میں ہے بسی ہوئی مستیٔ بادۂ کہن
ابرواں کا کھنچاؤ کیا گیسوؤں کا بناؤ کیا　جاتی ہے تیر سی چبھی سینہ میں اسکی ہر ادا
چہرہ سے آشکار ہے جلوۂ ماہِ نیم ماہ　اس پہ ستم کہ بیٹھی ہے نیچی کیئے ہوئے نگاہ
شوخ ہوا و بیقرار ہائے یہ وہ نظر نہیں　دیکھتے ہیں سب اسکی سمت لیکن اسے خبر نہیں
ایسا کوئی خیال ہے ایسا کسی کا دھیان ہے　رکھا ہوا ہے بت کوئی لوگوں کو یہ گمان ہے
جھونکا ہوائے سرد کا آیا اسے جگا گیا　دیکھ کے مجھکو سامنے لب پہ تبسم آ گیا
دوش پہ اپنے ڈالکر آنچل اٹھی وہ مہ جبیں　چلنے لگی تو پیار سے لینے لگی قدم زمیں
پڑتا ہے ناز سے کہیں ڈالتی ہے کہیں قدم　کھٹکا جو ہوتا ہے کہیں جاتی ہے یہ وہیں سہم
چل تو رہی ہے دل مگر محوِ خیالِ یار ہے　چہرہ پہ کچھ ملال ہے آنکھوں میں کچھ غبار ہے

آ گیا کچھ اسے نظر ورنہ یہاں یہ کیوں رُکی
غور سے دیکھنے کو کچھ دیکھو وہ نیچے کو جھکی

ٹوٹا ہوا کبھی کا ایک پھول پڑا ہوا ہے یہاں
جسکا اُڑا ہوا ہے رنگ سوکھی ہوئی ہیں پتیاں

بیٹھ گئی وہیں اسے دیکھ کے وہ ادائے شرم
لب پہ تھی ایک آہِ سرد آنکھ میں یک اشک گرم

بیٹھی رہی وہ دم بخود پہلے تو دیر تک مگر
جب نہ رہا گیا تو یوں بولی جگر کو تھام کر

آہ گلِ شکستہ رنگ تو ہی نہیں خراب حال
ٹھوکروں سے زمانے کی میرا بھی دل ہے پائمال

جس طرح فصلِ گل تری آنکھ کا ہو گئی ہے خار
یونہی کھٹکتا ہے جہاں میری نظر میں بار بار

آتشِ تیز کی طپش نکہتِ گل کی ہے لپٹ
بادِ صبا کی چھیڑ ہے دستِ اجل کی اک جھپٹ

بدلیوں کی ہر ایک بوند پانی ہے تیغِ تیز کا
جھونکا نسیم کا ہر اک تیر ہے زہر کا بجھا

اگلے دنوں کی یاد میں جیسے تڑپ رہا ہے تو
ویسے ہی ہو کے بیقرار پیتی ہوں اپنا میں لہو

ہائے کہاں چلے گئے کیا ہوئے اب وہ دن رات
یاد ہیں پہلی صحبتیں جیسے ہو کوئی کل کی بات

اک وہ زمانہ تھا کہ تو شاخ سے نکلا تھا نیا
گود میں لے کے ہمدم تجھکو کھلاتی تھی صبا

میں بھی کبھی اسی طرح پالی گئی تھی ناز سے
کھیلنے کے سوا نہ تھا کام کوئی مرے لئے

تیری ترقی دیکھ کر بادِ بہار کہہ چلی
طرز کا اپنے ایک پھول کھل کے بنے گی یہ کلی

میری بھی دیکھ کر اُٹھان کہتے تھے لوگ یوں بہم
ہوگا بڑا تو فتنہ یہ ڈھائے گا کیا نہ کیا ستم

میری اداؤ ناز کا شیفتہ اک زمانہ تھا
شوخیاں کرتی جان کر کمسنی کا بہانہ تھا

جسکی بڑی امید تھی وہ گھڑی آخر آ گئی
آئی نسیم صبح اور تجھکو بھی گدگدا گئی

ہنس پڑا کھل کھلا کے تو دل کی ترے کلی کھلی
تجھکو ملا نرالا رنگ اور نرالی بو ملی

مستیِ بادۂ غرور تیرے چڑھی دماغ میں
کہنے لگا کہ مجھ سا پھول ہے نہیں سارے باغ میں

یاد ہے وقت تجھکو وہ جبکہ گلوں کے درمیاں
پتوں کی اک آڑ میں ہوتی تھیں دستبازیاں

گردشِ روزگار کی تجھکو نہ تھی ذرا خبر
نام کو بھی نہ تھا کہیں دل میں ترے خزاں کا ڈر

انگلیاں اُٹھی تھیں تری سمت مثالِ ماہِ نو
بلبلِ بے نوا کی بھی تجھ سے لگی ہوئی تھی لو

عارضِ نوعروس تھا تیرے نکھار پہ فدا
سچ تو یہ ہے کہ تو ہی اک سارے چمن کی جان تھا

اب وہی تو پڑا ہوا لوٹ رہا ہے خاک پر
حالِ تباہ کی ترے لیتا نہیں کوئی خبر

میں نے بھی تیری ہی طرح ہوش سنبھالا جس گھڑی
آنکھ ہر ایک کی وہیں میرے شباب پر پڑی

شور کچھ ایسا مچ گیا ایسی کچھ آفت آ گئی
رکھتی جو میں قدم تو لوگ کہتے قیامت آ گئی

بجلیاں تھیں ملی ہوئیں میری نگاہِ ناز میں
جادو چھپا ہوا تھا اک چشم کرشمہ ساز میں

میری اداؤں میں بھری شوخی بھی تھی حیا بھی تھی
چھپتی تھی پردہ میں کبھی اور کبھی برملا بھی تھی

جوشِ شباب کے تھے دن دل پہ رہا نہ اختیار
بن گئی اپنے آپ ہی ایک نگاہ کا شکار

سینہ میں جب سے ہے خلش دل میں ہے جب سے ہی جنوں
لب پہ ہے آہ آنکھ میں اُمڈے ہوئے ہیں اشکِ خوں

شاق زبسکہ جان کو صدمۂ ہجرِ یار ہے
جینے سے آ گئی ہوں تنگ موت کا انتظار ہے

میرے بھی خط و خال سے یاس ٹپک رہی ہے اب
تیرے بھی رنگ روپ سے بیدلی کے عیاں ہیں طور

آ کے کرینگے دونوں ہم گردشِ چرخ کا گلا
محرمِ راز آ مرے سینے سے لوں تجھے لگا

تیری یہی رہی ہوس ہوتا کسی پہ تو نثار
میری یہی ہوس رہی بنتی کسی گلے کا ہار

کہکے یہ اپنے ہاتھ میں اُس نے وہ پھول اُٹھا لیا
لیتے ہی اُسکی ہو گئی پنکھڑی پنکھڑی جُدا

سُکھدیال

عیدِ قرباں

بہارِ باغِ عشرت پر مدارِ عیدِ قرباں ہے
سُرور افزا ہوائے خوشگوارِ عیدِ قرباں ہے

خدا کی راہ میں قربان ہونا وہ سعادت ہے
کہ ہر مرغِ دلِ انساں شکارِ عیدِ قرباں ہے

کھُلی جنسِ خدا بینی - لگا بازار مسجد میں
متاعِ طاعتِ رب - افتخارِ عیدِ قرباں ہے

سحر نے آج پھیلایا ہے دامن مُنہ اندھیرے سے
سعادت کے لئے اُمیدوارِ عیدِ قرباں ہے

بڑی نعمت میسر ہو رہی ہے اہلِ ایماں کو
نمایاں رحمتِ رحماں جوارِ عیدِ قرباں ہے

ہزیمت لشکرِ غم کو ملی فوجِ مسرت سے
مکانِ قلبِ انسانی حصارِ عیدِ قرباں ہے

ہوا قربان شاید آہوئے چشمِ حسیناں بھی
کہ عین اضطرارِ دل سے خواستگارِ عیدِ قرباں ہے

بھریں اللہ والے بادۂ عرفاں سے پیمانے
صبوحی لے کے حاضر آبکارِ عیدِ قرباں ہے

کوئی حج کو - کوئی سمتِ عبادت خانہ جاتا ہے
خدا کی راہ روشن - رہگذارِ عیدِ قرباں ہے

ملا دیتی ہے باہم دو دلوں کو جب ہم آغوشی
جبھی ہر شخص کا دل زیر بارِ عیدِ قرباں ہے

جھکا سمتِ زمیں سُنکر صفاتِ ناقۂ صالح
مگر ثورِ فلک بھی پاسدارِ عیدِ قرباں ہے

رائے بہادر مسٹر آر - این - مدھولکر

پریسیڈنٹ، انڈین نیشنل کانگرس، سنہ ۱۹۱۲ء

انڈین پریس الہ آباد

دلِ عالم طرب سے شادماں ہو چشم دل روشن　　مسرت بار ایسا اہلکارِ عیدِ قرباں ہے

رہے قبضہ جہاں کا امن او ایمان پر طالب

دلوں پر جس طرح آج اختیارِ عیدِ قرباں ہو

طالب بنارسی

بڑا دن

اے بڑے دن ہند میں اللہ رے تیری شانِ عیش　　کھل گیا آتے ہی تیرے دفترِ دیوانِ عیش

ملکے کرتے ہیں مسیحی "برتھ ڈے" کی سب خوشی　　آج ہیں آپس میں سب یوروپین مہمانِ عیش

بجتے ہیں پیانو کہیں پر اور کہیں پر جلترنگ　　جمع ہیں بنگلوں میں سب سازِ طرب سامانِ عیش

خانساماں ہیں کہیں پر محوِ سامانِ سپر

اور کہیں میز و نیپ ہے آراستہ خوانِ ڈنر

مطلعِ نورِ مسیحا ہے تو اے یومِ سعید　　حضرتِ عیسیٰ کی پیدائش کا ہے تو روزِ عید

اے بڑے دن تیری عظمت کا دلوں میں نقش ہے　　قابلِ تعظیم ہے بیشک تری شانِ مجید

ہند کے ہندو مسلماں بھی مناتے ہیں تجھے　　سب کے اوپر چڑھ گیا یکساں ترا رنگِ جدید

تو ہے۔ اُل جشن اس سے تیرا رتبہ بڑھ گیا

سب کی نظروں پر اسی سے تو بڑے دن چڑھ گیا

سادے سادے ہیں لباسِ نازنینانِ فرنگ ق اور سجے ہیں زیورِ گل سے عروسانِ فرنگ

چاند سی صورت پہ ہے اک سادگی ہی سو بناؤ　　چاند سورج کیوں لگائیں مہ جبینانِ فرنگ؟

ہاتھ میں شانہ ہے، رکھے ہیں مقابل آئینہ　　محوِ آرائش و زینت ہیں حسینانِ فرنگ

صرفِ تزئیں آج ہیں انگریز، بابا، لیڈیاں

کر رہے ہیں چرچ میں جانے کی سب تیاریاں

سنتے ہی گرجا کا گھنٹہ "انگ بل" جماعت کے لئے　　چلدئے اللہ کے گھر کو سب عبادت کے لئے

لوگ فوٹو لے رہے ہیں مجمعِ احباب کے　　شغل ہے اک یہ بھی دلچسپی کی صورت کے لئے

لکھتے ہیں احباب کو خط میں کوئی سوشل مذاق　　پڑھ رہے ہیں کوئی آج انجیل برکت کے لئے

رحمتِ حق ہے بڑے دن تو خدائی کے لئے

ایک دفتر چاہیئے تیری بڑائی کے لئے

بینڈ باجا اے بڑے دن ہو ترا چنگِ نشاط　　اور "ہُرے" کی صدا ہے تیری آہنگِ نشاط

مغربی ہے انجمن کا تیرے اندازِ طرب　　اور عیسائی ہے تیرے بزم کا رنگِ نشاط

ایک ہی دن کے مگر ہیں سب یہ سامانِ عجیب　　ہیں طلسمی اے بڑے دن تیرے نیرنگِ نشاط

ختم ہوتے ہی ترے بڑھ جائیگا شغلِ شراب

ہے دعا زیادہ رہے کچھ آج دورِ آفتاب

آتے ہی تیرے بڑے دن کیسۂ زر کھل گئے　　"چیریٹی" ہونے لگی خیرات کے در کھل گئے

عاشق و معشوق ہیں ہے پارکوں میں کورٹ شپ　　آج سارے عقدہ ہائے قلبِ مضطر کھل گئے

جھگڑے ہیں دنیا کے جھگڑے وہ کچہری بند ہیں　　اور پند و وعظ کے گرجوں میں دفتر کھل گئے

آج ہیں صرفِ نصیحت سارے گرجوں کے خطیب

اور ہیں یوروپین سب محوِ تعظیمِ صلیب

ٹون ہے انگلش او عیسائی ہیں اربابِ نشاط　　ہیں سب انگریزی طریقے اور آدابِ نشاط

دن نکلتے ہی ہوئے آزاد قیدِ غم سے سب　　اے بڑے دن آتے ہی تیرے کھلا بابِ نشاط

نوکروں کو ساتھ لیکر آج میمیں اور مسیں　　آئی ہیں بازار میں لینے کو اسبابِ نشاط

لیچلے اشیا کی نوکر کھانچیوں پر کھانچیاں

اور گئیں میووں کی گھر گھر ڈالیوں پر ڈالیاں

اے بڑے دن رنگ محفل کا ترے شاہانہ ہے　　بادشاہوں کا جو جشن شاہانہ ترا میخانہ ہے

تو مبارک "فسٹول" ہے شاہِ انگلستان کا　　امپر جس میں ہے مہماں وہ ترا کاشانہ ہے

جشنِ جمشیدی ہے جو، وہ ہے تری بزمِ نشاط　　جامِ جم کہتے ہیں جس کو وہ ترا پیمانہ ہے

چونکہ شاہی شان و شوکت تیرے دربار میں ہے

ہند میں تو اس سے افضل سارے تیوہاروں میں ہے

حفظ الکریم حفیظ

پانی

رنگ لاتا ہے ہزاروں یہی کا فر پانی　　یوں تو کہنے کو ہے اک بادۂ احمر پانی

کیوں تباہی میں نہ آئیں جو ہیں سرگرداں
ہو فنا زیرِ زمیں کھائے جو چکر پانی

اصل اور نقل میں یہ فرق ہے کھلتا ہے تگرگ
ہوتے دیکھا ہے کسی نے کبھی گوہر پانی

رزقِ طیب نہ ملے گا جو ملے مالِ حرام
کہہ تو دے کوئی کہ پیتا ہے سمندر پانی؟

زندگی تلخ کرے قطرۂ زہر آب کہیں
ایک دو گھونٹ میں کرنے کہیں جانبر پانی

نہ رہا ہے نہ رہیگا یہ غرور اے مغرور
پانی کی طرح سے بہہ جائے گا ہو کر پانی

حیف! انسان سے انسان دبا جاتا ہے
دیکھو پانی کو کہ رہتا نہیں دب کر پانی

سچ کو کیا آنچ ہے کھلتی ہے ملمع سازی
سب اُڑا دیتا ہے دو پھونک میں زرگر پانی

جب پڑی پھوٹ تو نوبت بہ عدالت پہنچی
بات کی بات گئی زر کا ہوا زر پانی

کیا عجب قابلِ صحبت جو نہ ہو ہر انساں
کہ مناسب نہیں پینے کے لئے ہر پانی

ہر دلِ صاف نصیحت یونہیں کرتا ہے قبول
جذب کر لیتی ہے جس طرح سے چادر پانی

نہیں ملتی کبھی وہ شے جو مقدر میں نہ ہو
پی نہ آیا سوئے ظلمات سکندر پانی

عقل کو راہ ملا کرتی ہے ٹھوکر کھا کے
کاٹ دیتا ہے زمیں کھا کے جو ٹھوکر پانی

طرفہ قسمت ہے کہ بہتا ہے زمیں پر آ کر
اُڑتا پھرتا ہے گھٹا بن کے ہوا پر پانی

کہیں گرنا کہیں بہنا کہیں مرنا اس کو
ایک انداز کا رہتا نہیں خوگر پانی

بن کے تارا سا چمکتا ہے کنوئیں کی تہ میں
رات بھر تارے دکھاتا ہے زمیں پر پانی

نہ رہیں گے یہ جوانی کے طرارے باقی
دیکھتے ہیں کہ اُتر جاتا ہے چڑھ کر پانی

کر دیا یوں تو عزیزوں نے لہو پانی ایک
تیری تقدیر میں دولت تھی تو نگر پانی

نفع پہنچائے نہ کس طرح سے ہر انساں کو
جب کرے خاک کو لحظہ میں مطہر پانی

کیا رُکے طبعِ رواں صورتِ بحرِ مواج
بہا جاتا ہے ٹھہرتا نہیں دم بھر پانی

جو غنی ہیں نہیں اُن کو غم و فکرِ دنیا
نہیں پیتا کسی دریا میں شناور پانی

طالبِ دولتِ دنیا نہ ہوں مردانِ خدا
کون دیتا ہے تہہ نخلِ تناور پانی

خستہ حالی سے پریشان ہوئے اہلِ دیار
پھر گیا نکبت و ادبار کا سر پر پانی

ہند میں جہل و تعصب کا ہے طوفاں برپا
آ نہ جائے کہیں طوفان کا گھر گھر پانی

سختیوں میں طلبِ عیش نہیں اشک روا
مانگے کب مردِ دلاور تہہ خنجر پانی

تازہ غزلیں

مہاراجہ بہادر سر کشن پرشاد صاحب بالقابہ

گر ملے مجنوں تو پوچھوں یہ مرے دل میں ہے
کیا کوئی تیرے سوا اس پردۂ محمل میں ہے

یوں تو ہیں حور و ملک بھی گلشنِ قدرت کے پھول
ہاں مگر قدرت نمائی اسکی آب و گل میں ہے

قیس بیچارہ نہ یہ سمجھا کہ محمل کون ہے
عمر بھر کہتا رہا لیلیٰ مری محمل میں ہے

مثلِ موسیٰ طالبِ دیدار ہیں آنکھیں مری
اور شوقِ وصل اک مدت سے میرے دل میں ہے

یہ مثل سچ ہے کہ دل سے دل کو اک ہوتی ہے راہ
ذکر میرا ہے وہاں یاد اسکی میرے دل میں ہے

مرحلہ گر قبر کا طے ہو تو بیڑا پار ہے
سخت دشواری مسافر کو اسی منزل میں ہے

مٹ نہیں سکتی خلش اسکی کسی تدبیر سے
ایک کانٹا ہے کہ اے ظالم تمنا دل میں ہے

حسرتیں لاکھوں بھری ہیں آرزوئیں بیشمار
اُس نے اتنا بھی نہ پوچھا تیرے کیا کیا دل میں ہے

یہ ادا رُک رُک کے چلنے کی کہاں سے آ گئی
یا الٰہی کس کی شوخی خنجرِ قاتل میں ہے

خواہشِ دنیا ادھر ہے شوقِ عقبیٰ اُس طرف
یا الٰہی زندگی بھی میری کس مشکل میں ہے

میں بتا دوں قیس میں اور مجھ میں کتنا فرق ہے
یار ہے محمل میں اُسکا اور میرا دل میں ہے

تیرے عاشق کے لئے اے یار پھر کیا چاہیئے
جام و مینا اور ساقی سب تری محفل میں ہے

اس سے بڑھکر اور عاشق کے لئے کیا چاہیئے
تیرا سودا سر میں ہے تیری تمنا دل میں ہے

ڈھونڈھتا ہے جا کے تو دیر و حرم میں کیوں عبث
شاد وہ تو ہر جگہ ہے اور ہر اک دل میں ہے

سیّد ریاض احمد صاحب ریاض خیرآبادی

ساتھ ہے قیس سے صحرائی کا
کیا ٹھکانا ترے سودائی کا

کام کیا دل میں شکیبائی کا
پاس ہے حسن کی رسوائی کا

رنگ دے جائیگا تجھ میں مل کر
اے حنا دل ہے تمنائی کا

نہیں خورشیدِ قیامت واعظ
داغ ہے دامنِ رسوائی کا

آنکھ میں سحر نظر میں جادو
لب میں اعجاز مسیحائی کا

جا کے فرہاد سے ٹکراتا ہے
سر پھرا ہے ترے سودائی کا

شاخِ گل سیکھے صبا سے انداز بُتِ طنّاز کی انگڑائی کا
نگہِ شوخ یہ کہتی آئی دل میں کیا کام شکیبائی کا
دلِ پُر داغ ہیں گلدستوں میں شوق ہے انجمن آرائی کا
رنگ لاناکہ ہے اے جوشِ شباب دامن اب جامۂ زیبائی کا
تھوڑی پیتا ہوں بڑھاپے میں بھی کہ سبب ہو یہ توانائی کا
سر پہ اب دھوپ نہیں جین سے ہوں سایہ ہے لالۂ صحرائی کا
کیا درِ دیر تک آیا تھا ریاضؔ
ہے نشاں ناصیہ فرسائی کا

سید نظیر حسن صاحب نظیرؔ

فرس اُٹھائے جو وہ شہسوار جاتا ہے سموں کو چومتا اپنا غبار جاتا ہے
کیا ہے اُن کو رقیبوں نے بدگماں اتنا بہنچ ہ۔ دکو مرا اعتبار جاتا ہے
لپٹ لپٹ کے گلے رو رہی ہے مایوسی جہان سے ترا امیدوار جاتا ہے
مریضِ عشق کی صحت فنا پہ ہے موقوف یہ کوئی عالمِ غش میں پکار جاتا ہے
رقیب بیٹھے ہیں آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر تمہارے دل سے ہمارا غبار جاتا ہے
شہیدِ عشق کی میت کے ساتھ ہے انبوہ کوئی خموش کوئی اشکبار جاتا ہے
رہے تجھی کو مبارک یہ سلطنت اے عشق دیارِ دل سے مرا اختیار جاتا ہے
نہ جانے سیر ہے کیا کس طرح کے جلسے ہیں وہیں رہا جو سیانِ مزار جاتا ہے
وہ چشمِ ابر سے گرتا ہے اشک بن بن کر ہمارے دل سے جو اُٹھ کر بخار جاتا ہے
ارے ذرا کوئی سُننا نظیرؔ ہے شاید
کراہتا ہوا اک دلفگار جاتا ہے

منشی محمد حسین صاحب محویؔ لکھنوی

مے کش نواز ساقی بہلا نہ گفتگو میں بس آج تو پلادے جو کچھ بھی ہو سبو میں
ناصح تری گلی سے کعبہ کو لے چلا تھا اچھا ہوا نہ آئے ہم اسکی گفتگو میں
اندوہِ بیکسی میں جینا نہ تھا مناسب دنیا سے چلدئے ہم راحت کی جستجو میں
اوصرِ صرِ حوادث برباد کر نہ دینا کچھ پھول ہم لئے ہیں دامانِ آرزو میں
رو رو کے چشمِ تر نے عاشق کی بات رکھ لی آنسو رہے نمایاں موتی سی آبرو میں
خاموشیوں نے غم کا خوگر بنا دیا ہے لطف آئے اب ہمیں کیا تشریحِ آرزو میں
حسرت نصیب آنکھیں کچھ اتنا خون روئیں ٹکڑے دل و جگر کے بہ آئے ہیں لہو میں
فرقت کی شب کسی نے تسکین دی نہ دل کو تڑپا کیا زمیں پر لوٹا کیا لہو میں
شوخی بھی بے حیا بھی تمکیں بھی ہے جفا بھی اُس شوخِ تند خو میں اُس یارِ خوبرو میں
کچھ آج خود بخود جی رونے کو چاہتا ہے پہنچے نہ ہوں الٰہی وہ محفلِ عدو میں
غربت میں دل تپاں ہے یادِ وطن سے محویؔ
ہیں دردمند ہوتا اے کاش لکھنؤ میں

منشی محمد عبد الحمید صاحب حمیدؔ میرٹھی

تمہارے در پہ جو چلمن پڑی نہیں رہتی تو شوقِ دید میں خلقت کھڑی نہیں رہتی
اُڑائے پھرتے ہیں اندازو ناز و کبر و غرور تری سواری میں کب چوکڑی نہیں رہتی
فغاں سے میری شبِ وصل وہ چونک کر بولے یہ غل مچاتی ہے چپکی پڑی نہیں رہتی
ہمارا دستِ جنوں زور پر جب آتا ہے پھر آستین تو کیا ہتکڑی نہیں رہتی
وہ ہم سے ملتے ہیں کیا آتے ہیں نہ جاتے ہیں کہ دل لگی بھی گھڑی دو گھڑی نہیں رہتی
شراب کا ہمیں ہوتا نہیں نشہ ساقی جو آنکھ۔ آنکھ سے تیری لڑی نہیں رہتی
ہے زیور اُنکا، ادا، ناز، حسن، شرم، حجاب جو ایک بھی نہ ہو تو بچلڑی نہیں رہتی
ذرا اُٹھی بھی قیامت وہ بڑھ کے کہنے لگے قدم بڑھاتی ہے پیچھے کھڑی نہیں رہتی
ہمارے بس میں ہماری طبیعت اے ناصح! خدا کے بندے تجھے کیا پڑی نہیں رہتی
ہنسینگے لوگ زیادہ نہ مُسکراؤ تم کہ اتنی دیر کوئی پھلجھڑی نہیں رہتی
پلادے مے کہ غنیمت ہے ساقیا برسات ارے یہ بارہ مہینے جھڑی نہیں رہتی
وہ میرے مرنے میں آئیں تو ہے کرم ورنہ کسی غریب کی میت پڑی نہیں رہتی
حمیدؔ شوق اگر خضرِ راہ ہوتا ہے
تو دشتِ عشق کی منزل کڑی نہیں رہتی

جانے دو نہ اتفاق کو قابو سے اچھی نہیں یہ جنگ کسی پہلو سے
پابندِ صفی ہے صُلحِ کل کا ایسا لڑتی نہیں آنکھ بھی بُتِ ہندو سے
صفی حیدرآبادی

الوداع

ادیب کا یہ نمبر میرے زمانۂ ایڈیٹری کا آخری نمبر ہے اور اس نمبر کے ساتھ ادیب سے میرا قطع تعلق ہوتا ہے۔ میں نے ایک برس سات ماہ ادیب کی جو کچھ اچھی یا بُری خدمت کی ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکا اپنی بساط بھر میں نے اُس میں کوتاہی نہیں کی اور میں نہایت خوش ہوں کہ میری ناچیز خدمات کا اعتراف میری اُمیدوں سے بڑھکر ہوتا رہا ہے۔ اس موقعہ پر میں اپنے اُن تمام مہربانوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے بیش بہا مضامین سے میری امداد کرتے رہے؛ اور نیز اُن اخبارات کا بھی جو وقتاً فوقتاً میری ناچیز خدمات کا اعتراف کر کے میری عزت افزائی فرماتے رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی اُن کی نظرِ عنایت ادیب پر مبذول رہیگی۔ مجھے اُمید ہے کہ جدید انتظام اور معاونین کی مسلسل عنایات سے ادیب کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوگا۔

میں اُن تمام حضرات سے صدق دلی کے ساتھ خواستگارِ معافی ہوں جنکو میری کسی تحریر، کسی فقرہ، کسی لفظ کی وجہ سے، جو نادانستہ میرے قلم سے نکلا ہو صدمہ پہنچا ہے۔ انسان ہزار پھونک پھونک کر قدم رکھے مگر ایسی لغزشوں کا ہو جانا بعید از امکان نہیں ہے۔

میں اس امر کی بھی درخواست کرتا ہوں کہ آئندہ ادیب کے متعلق کسی قسم کی خط و کتابت میرے نام پر نہ کی جائے، بلکہ حسب قاعدہ تمام خط و کتابت بنام منیجر صاحب ادیب انڈین پریس الہ آباد ہو۔ اس اطلاع پر خصوصیت کے ساتھ عمل کیا جائے۔

میرا آئندہ شغل کیا ہوگا؟ اس کے متعلق میں نے ابھی کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ بالفعل کچھ دن آرام کرنے کا ارادہ ہے۔ بہر حال

ابتو جاتے ہیں بتکدہ سے **میر**   پھر ملیں گے اگر خدا لایا

۹ دسمبر ۱۹۱۲ء   خادم پیارے لال شاکر (میرٹھی)

1001

تصریح تصاویر

(۱) اس ماہ کی رنگین تصویر کیکئی اور منتھرا کی ہے جو انڈین پریس کے ایک چابکدست مصور کے زورِ قلم و صناعی کا نمونہ ہے۔ اس میں وہ سین دکھایا گیا ہے جبکہ منتھرا کیکئی کے حضور میں آکر اسکو ورغلاتی ہے کہ رام چندر جی کو جلاوطن کرا دیا جائے۔ اُمید ہے کہ یہ تصویر دلچسپی کے ساتھ دیکھی جائے گی۔

(۲) سیتا جی اور سرما۔ اس تصویر میں وہ سین دکھایا گیا ہے جبکہ سیتا جی اشوک بن (باغِ راون) میں اپنے پتی کی یاد میں بیکل ہیں۔ اس موقعہ پر بھبیشن کی بیوی سرما آتی ہے اور بیٹھکر سیتا جی کو صبر و استقلال کی تلقین کرتی ہے۔

(۳) کھلنا اور دھن پتی۔ یہ تصویر ایک قصہ سے متعلق ہے۔ کھلنا (ایک سوداگر کی دختر) اپنی سہیلیوں کے ساتھ گلگشت میں مشغول تھی کہ ایک تھکا ماندہ کبوتر آکر اُس کے قریب گرا۔ کبوتر کو اُس نے اٹھا لیا۔ حسنِ اتفاق سے کبوتر کی تلاش میں دھن پتی بھی جو خود بھی ایک سوداگر کا فرزند تھا، وہاں آنکلا۔ کھلنا کے ہاتھ میں اپنا کبوتر دیکھکر اُس نے طلب کیا، مگر وہ ہنسی میں ٹال گئی۔ بہت دیر تک آپس میں چھیڑ خانی ہوتی رہی جسکا آخر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ایکدن دونوں کی شادی ہو گئی (تصویر نمبر ۲ و ۳ بھی انڈین پریس کے ایک اور مصور کی صناعی کا نمونہ ہیں)

(۵) مولانا شوکت مدظلہ ایک بلند پایہ عالم اور زبانِ اُردو کے زبردست مصنف و شاعر ہیں۔ جن اصحاب نے آپ کی شرح دیوان غالب، شرح نکاتِ بیدل، شرح قصائد خاقانی کا مطالعہ کیا ہے وہ آپ کے تبحر علمی اور زورِ طبع کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ادیب میں بھی آپ کے کئی نادر مضامین نظم و نثر شائع ہو چکے ہیں۔ دعا ہے کہ عرصہ تک آپکا فیض جاری رہے۔

(۶) میر امجد حسین صاحب ماہ عظیم آبادی کی تصویر اُس شکر گذاری کے طور پر شائع کی جاتی ہے جو آپ کی قلمی اعانت سے ادیب پر فرض ہے۔ آپ کے کلام سے نظرین ادیب [illegible]